جنوری سنہ ۱۹۳۶ع

قیمت فی کاپی ۱ روپیہ ۸ آنہ

نرخنامۂ اجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱- اجرت ہر حال پیشگی لی جائیگی۔ وی پی کے ذریعہ وصولی منظور نہیں۔

۲- جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہے گا۔

۳- اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے۔

مینیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر...... پانچ رو

ششماہی ہندوستان کے اندر...... تین

سالانہ بیرون ہند...... بارہ شـ

ششماہی بیرون ہند...... ۶ شلنگ

نوٹ:- رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شا
ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے،
کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گ
حصول جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط
میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔ "منیـ

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعہ استفسار و جواب

یہ جلد اول ہے جس میں ۲۲ء سے لیکر ۲۵ء تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ باقی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کی بیت کو جو حضرات جانتے ہیں ان سے مخفی نہیں۔ اس مجموعہ میں علمی ادبی تاریخی تنقیدی مسائل ہیں۔
قیمت علاوہ محصول ۲ روپے

مکتوبات نیاز

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری و سلاست بیان، رنگینی اور ادبیت کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل نئی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ مع تصویر حضرت نیاز۔ اینٹک کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔
قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے ۲۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان، قدرت بیان، اعلیٰ تخیل و پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار ہیں۔ علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔
قیمت چار روپیہ (للعمر) علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تام
اور غیر فطری قسموں کے حالات
تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر
ربط کے ساتھ محققانہ تبصرہ
جس میں بتایا گیا ہے کہ
کب اور کس کس طرح برا
نیز یہ کہ مذاہب عالم نے ا
رواج میں کتنی مدد کی۔ ا
ایک حیرت انگیز واقعات نظ
قیمت تین روپیہ دستی ۲
علاوہ محصول۔

ہندی شاعری

اڈیٹر - نیاز فتحپوری

جلد (۲۹) | جنوری سنہ ۱۹۳۶ء | شمارہ (۱)

ہندی شاعری کی تاریخ

تمہید جب سنہ ۶۴۶ء یا سنہ ۶۴۷ء میں ہرش کا انتقال ہوا تو وہ شمالی ہندوستان میں ایک وسیع سلطنت چھوڑ گیا، لیکن اس کے بعد برہمی و بدنظمی، تفریق و انتشار کا جو دور شروع ہوا تو پھر اس وقت تک کوئی باقاعدہ نظام حکومت قائم نہ ہو سکا، جب تک مسلمانوں نے آکر اس تمام منتشر شیرازہ کو ایک رشتہ سے وابستہ نہیں کر دیا۔

تمام راجپوت قبائل نے اپنی اپنی جگہ خودسری و خودمختاری اختیار کر لی تھی، باہمہ گر خونریزی کا بازار گرم تھا، کہ مغرب کی طرف سے مسلمان آئے اور تمام ہندو ریاستیں اپنے ان مشترک دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو گئیں۔

ہر چند کابل، پنجاب اور سندھ اس سے قبل مسلمان مجاہدین کے قبضہ میں آ چکے تھے، لیکن ہندوستان پر ان کا پہلا،

اثر اس وقت تک قائم نہیں ہو سکا، جب تک سنہ ۱۱۷۵ء میں محمد غوری نے حملہ کی ابتدا نہیں کی، پہلے تو ہندوؤں کو اسکا خیال بھی نہ تھا کہ مسلمان اندرون ہندوستان تک چلے آئیں گے، لیکن جب محمد غوری کی جارحانہ کارروائیاں زیادہ بڑھنے لگیں تو راجپوت بیدار ہوئے۔ اور سنہ ۱۱۹۱ء میں پرتھی راج فرمانروائے اجمیر کو اپنا متفقہ سردار بنا کر محمد غوری کا مقابلہ کیا، اس میں شک نہیں کہ اس جنگ میں راجپوتوں نے اپنی قدیم روایات جانبازی کو از سر نو زندہ کرکے دکھا دیا اور محمد غوری کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی، لیکن چونکہ قدرت کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک جدید باب کا اضافہ کرنا تھا، اس لئے دوسرے سال کوہستان غور کا یہ سردار پھر آیا اور پرتھی راج کو قتل کرکے دہلی پر قابض ہو گیا، اس کے بعد مسلمانوں کے لئے فتوحات کا دروازہ کھل گیا، یہاں تک کہ سنہ ۱۳۴۰ء میں محمد تغلق نے سارے ہندوستان کو زیر نگیں کر لیا، یہ تھا واقعات تاریخ کا ظاہری خاکہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ بہت سی ہندو ریاستیں مغلوب ہو گئیں، بڑے بڑے زبردست قلعے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے، لیکن راجپوت قبائل ہنوز موقعہ کے منتظر تھے، چنانچہ محمد تغلق کے بعد ہی ان میں سے بعض قبائل نے خودسری اختیار کرکے اپنی ریاستیں الگ قائم کر لیں۔

یہی تھا وہ زمانہ جب ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی بنیاد قائم ہو رہی تھی اور راجپوتانہ میں رزمیہ شاعری کا رواج شروع ہو گیا تھا، چونکہ وہ زمانہ جنگ و جدل کا تھا اس لئے شعراء ہند کے لئے کافی مواد داستانِ رزم مرتب کرنے کا فراہم تھا اور راجپوتوں کے شاہی خاندان اُن کی قدر بھی کرتے تھے۔

یہ یقینی ہے کہ اُس عہد کی ان نظموں کو تاریخی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ ان میں بہت سے دور از کار واقعات اور بیجا تعریفوں کے مبالغے پائے جاتے ہیں لیکن کم از کم وہ اس امر کے سمجھنے میں ضرور مدد دیتی ہیں کہ اس وقت راجپوتوں کے اندر کون سی روح دوڑ رہی تھی، اور وہ کس جرات کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

اس عہد کا سب سے زیادہ مشہور رزم گو شاعر جس کو آج بھی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں چند بردائی تھا جو دربار پرتھی راج کا بھاٹ یا رزم خواں مطرب تھا اور اس کے بعد جگ نایک تھا، جسے چند کا ہمعصر سمجھنا چاہیئے، اس کے بعد چودھویں صدی میں سارنگ دھر پیدا ہوا جس نے ہمیر راجہ رنتھنبور کے افسانہائے شجاعت نظم کئے۔

اس کے بعد پندرھویں صدی کی ابتدا میں رام کی پرستش عام ہوئی اور اس نے اُس وقت کے لٹریچر میں ایک نئی روح پھونک دی، اس سے وشنوئیوں کی ایک جماعت وشنو کی پرستش صرف کرشن کی صورت میں کیا کرتی تھی لیکن جب رامانند نے رام کو موضوع پرستش قرار دینے کی تبلیغ کی تو بہت سے لوگ اس طرف مائل ہو گئے۔ یہ سارا عہد تو خالص بت پرستی کا تھا لیکن جب مسلمان یہاں آئے اور باہم میل جول سے تبادلۂ خیالات نے جذبات و حسیات کو بھی متاثر کیا تو زمانہ نے کبیر کو پیدا کیا جو صرف موحد تھا، اور بت پرستی کے خلاف۔ پھر اسی زمانہ میں علاوہ کبیر کے

نام دیو، ودیاپت، میرا بائی، ہندوؤں میں اور ملک محمد جائسی مسلمانوں میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جس وقت راجپوتانہ میں رزمیہ شاعری کا اول اول رواج ہوا تو اس میں ملک کی عام اور غیر مرتب زبان کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے تھے، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا زبان صاف و شائستہ ہونے لگی یہاں تک کہ سنہ ۱۵۵۰ء سے ہندوستان کے ملکی لٹریچر کا عہد زریں شروع ہو گیا۔ یہ زمانہ شاہان مغلیہ کی حکومت کا تھا جو علوم و فنون کی قدر شناسی میں حد درجہ فیاضی و سیر چشمی سے کام لیتے تھے، پھر چونکہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا عہد مسلمانوں کی حکومت کا خاص زمانہ شمار کیا جاتا ہے، اس لئے ہندی لٹریچر نے بھی اس دور میں بہت ترقی کی اور سب سے پہلے اُسی وقت ہندی شاعری پر فن کے لحاظ سے توجہ کی گئی۔ یہی زمانہ تھا جب ہندی شاعری کے نجوم تابندہ تلسی داس سور داس، اور بہاری لال رونما ہوئے اور یہی عہد تھا جب سکھ گرنتھ کی ترتیب عمل میں آئی۔

جب انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو تہذیب مغرب سے مل کر ہندی لٹریچر میں ایک اور انقلاب پیدا ہوا اور للو لال جی نے موجودہ ہندی نثر نگاری اور لٹریری زبان کو رواج دیا۔

یہاں تک جس قدر بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک ہندی لٹریچر پر تین دور گزر چکے ہیں۔

(۱) سنہ ۱۴۰۰ء کے قریب جب وشنو تحریکات نے ہندی زبان پر اپنا اثر ڈالا۔

(۲) سنہ ۱۵۵۰ء کے قریب جب آرٹ اور فن کی حیثیت سے اس کو ترقی حاصل ہوئی۔

(۳) سنہ ۱۸۰۰ء کے قریب جب مغربی اثرات سے مل کر اس نے موجودہ صورت اختیار کر لی۔

آیندہ صفحات میں ہم انھیں تینوں زمانوں پر ذرا تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے۔

قدیم رزمیہ شاعری سنہ ۱۱۵۰—۱۴۰۰

جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور راجپوتوں نے ابقاء نفس سلطنت کے لئے اپنی تمام قوت مدافعت استعمال کرنی شروع کی، تو منجملہ دیگر ذرائع کے ایک ذریعہ شاعری کا بھی تھا اور اسی عہد کی ہندی شاعری قدیم ترین خیال کیجاتی ہے۔

اس وقت ہندوستان کا کوئی راجہ ایسا نہ تھا جس کے دربار میں رجز گو یا "رزم خواں" شاعر موجود نہ ہو اور وہ اپنے مالک یا راجہ کے افسانہائے شجاعت و جانبازی کے بیان سے لوگوں میں جرأت و دلیری کی نئی روح نہ پھونکتا ہو۔

ان فوجی مطربوں یا رجز خواں شعراء کا تعلق مختلف قبائل سے تھا، اور اسی بناء پر اُن کے مختلف نام تھے۔ جن میں سے چارن، بھاٹ، سیوگ، اور نجوگی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس عہد سے قبل بھی (مابین سنہ ۱۱۵۰ء) ان قومی شعراء کا وجود پایا جاتا تھا، جن میں کپشیا، گدر، بنیاد ا

قطب علی اور اکرم فیض کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے، لیکن چونکہ اُن کا کلام اب بالکل نایاب و معدوم ہے، اسلئے نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی زبان کیا تھی، تاہم یہ یقینی ہے کہ اُن کی شاعری اُسی عہد کی پراکرت (عوام کی زبان) میں رہی ہوگی اور اسی نے رفتہ رفتہ ترقی کرکے موجودہ مہذب صورت اختیار کی۔

بعض کا خیال ہے کہ بارہویں صدی سے بہت قبل ہندی زبان نے موجودہ صورت اختیار کرلی تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، نصف بارھویں صدی میں (۱۱۵۹ء) جب کمار پال گجرات کے راجہ نے ہیم چندر جینی کے اثر سے، جین مذہب اختیار کیا تو ہیم چندر نے اُس عہد کے پراکرت میں ایک مثنوی "کمار پال چرتر" تصنیف کی، اسی طرح ایک نظم "بیسل دیو راسو" اس وقت تحریر کی گئی جب محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور بیسل دیو اجمیر کا راجہ تھا، لیکن ان سب کے دیکھنے سے اس کا ثبوت کوئی نہیں ملتا کہ یہ واقعی اسی وقت لکھی گئی تھیں، یا بعد کو، بہرحال اس وقت یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بارھویں صدی سے قبل کس زبان میں شاعری کی جاتی تھی، اور اُس عہد کی پراکرت کیا تھی۔ البتہ نصف بارھویں صدی کے بعد سے جو شاعری کی گئی ہے اس کے متعلق ضرور کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کو مختصراً ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

چند بردائی پرتھی راج جو تاریخ ہندوستان میں کافی شہرت رکھتا ہے ۱۱۵۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۱۹۲ء میں قتل کیا گیا۔ یہ اجمیر و دہلی کا فرمانروا تھا اور لٹریچر کا بڑا سرپرست خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے دربار میں علاوہ بھنیا داس کے جس کا ذکر ابھی کیا گیا، چند بردائی بھی پایا جاتا تھا جو اپنی رزمیہ شاعری کے لحاظ سے اُس عہد کا بے مثل شاعر سمجھا جاتا ہے، یہ خاندانی شاعر تھا اور بعض کا خیال ہے کہ سورداس بھی اسی کی اولاد میں سے تھا، چونکہ پرتھی راج علم و ادب کا بڑا قدرشناس تھا، اس لئے اس نے چند کو نہ صرف ملک الشعراء بنایا، بلکہ وزارت کی خدمت بھی اس کے سپرد کردی، اس کا مجموعہ کلام میواڑ کے ایک شخص امر سنگھ نے تیرھویں صدی عیسوی میں مرتب کیا اور کہیں کہیں حذف و اضافہ کرکے اس کی قدیم زبان کو بھی بدل دیا۔ اس کی خاص تصنیف پرتھی راج راسو تھی۔ اس میں تقریباً ایک لاکھ شعر یا مصرعے ہیں اور پرتھی راج کی سوانحعمری کے علاوہ اُس عہد کی تاریخ بھی تحریر کی ہے، ہرچند غیر ضروری مبالغہ سے خالی نہیں، تاریخی نقطۂ نظر سے اس میں چند غلطیاں بھی ہیں، مثلاً پرتھی راج اور محمد غوری کی باہمی جنگ کو دو بار سے زائد ظاہر کیا ہے اور جس عہد میں مغلوں کا ذکر کیا گیا ہے، حقیقتاً اس کے تیس سال بعد تاریخ ہندوستان میں اُن کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اس لئے یہ امر مشتبہ ہے کہ پرتھی راج راسو کا جو نسخہ دستیاب ہوتا ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو اصل مصنف کے دماغ کا نتیجہ ہے، تاہم اس کی زبان اور اسکے محاورات و انداز بیان سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اصل تصنیف چند بردائی کی تھی، گو بعد کو اس میں کم و بیش تحریف ضرور کی گئی۔

ہر چند اس کی زبان بہت مشکل ہے اور ماہرین ہندی بھی اس کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تاہم محققین نے جس قدر پڑھ لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لٹریری نقطۂ نظر سے اس میں بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

چند بردائی اپنے مالک پرتھی رائے کے ساتھ سنہ ۱۱۹۲ء میں مارا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس کا بیٹا جلہن بھی شاعر تھا، اور غالباً راسو کے بعض حصے اسی کے دماغ کا نتیجہ ہیں۔

جگ نائک

یہ چند بردائی کا ہمعصر اور مہوبا کے راجہ پرمال کا (جو پرتھی راج کا رقیب تھا) درباری شاعر تھا۔ اس کا کلام ناپید ہے لیکن بعض کا خیال ہے کہ مہوبا کھنڈ میں ایک حصہ اسی کا لکھا ہوا ہے یہ نظم زبانی روایات سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہے اور بعض پیشہ ور گانیوالے اب بھی اس کو گاتے ہیں لیکن شاعر کی اصلی نظم یا اصل الفاظ کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا، کیونکہ ہر راوی اور ہر گانے والے نے اپنے مذاق اور زمانہ کے لحاظ سے اسمیں بہت کچھ تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ یہ نظم آلہا اودل کے نام سے مشہور ہے اور انگریزی زبان میں بھی اسکا ترجمہ ہو چکا ہے۔

سارنگ دھر

یہ چودھویں صدی کے وسط میں پایا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ چند بردائی کی اولاد میں سے تھا اس کی دو نظمیں ہمیر راسا اور ہمیر کاوی بہت مشہور ہیں جن میں رنتھنبور کے شاہی خاندان کے حالات درج ہیں، ہمیر اور علاءالدین کی جنگ جس میں اول الذکر مارا گیا بہت مشہور واقعہ تاریخ کا ہے اور سارنگ دھر نے اس واقعہ کو بھی نظم کیا ہے۔

اس نے سنسکرت کے عاشقانہ اشعار کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا جو سارنگ دھر پدھتی کے نام سے مشہور ہے اور جو سنہ ۱۳۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔

اس عہد کے دیگر شعرا

اس عہد میں علاوہ مذکورہ بالا شعراء کے چند اور نفوس بھی تھے جو ہندی شاعری کی دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ مثلاً بھوپتی جو تیرھویں صدی کے آخر میں تھا، اور نلا سنگھ جو غالباً اسی کا ہمعصر تھا، مسلمانوں میں ملا داؤد اور امیر خسرو چودھویں عیسوی کے قریب گزرے ہیں۔

علاوہ ان کے ایک شخص گورک ناتھ تھا، جو یوگیوں کی جماعت کا مورث اعلےٰ تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں تصانیف مرتب کیں۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فرضی ہستی ہے لیکن یہ صحیح نہیں اور سنہ ۱۲۰۰ء کے قریب اس کا پایا جانا ثابت ہے، البتہ اس وقت جو تصانیف اس کی پائی جاتی ہیں اور جن میں ایک نثر کی کتاب بھی ہے یقیناً اس کی نہیں ہیں بلکہ اس کے متبعین کی ہیں۔

قدیم بھگت شعراء (سنہ ۱۴۰۰-۱۵۵۰)

جب شمالی ہند میں وشنوی تحریک عام ہوئی، تو ہندی لٹریچر پر بھی اس کا بڑا اثر پڑا، اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے حملے نے ہندوؤں

کے جذبات مذہبی کو صدمہ پہونچایا، لیکن انھیں بالکل فنا نہیں کر دیا، چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شمالی ہند میں وشنوی مسالک نے ہندو معتقدات پر اثر ڈالنے میں کافی کامیابی حاصل کر لی۔ وشنوی مسلک تین گروہوں میں منقسم تھا، ایک کرشن جی کو خدا کا اوتار قرار دیتا تھا، دوسرا رام چندر جی کو اور تیسرا کسی کو اوتار نہ سمجھتا تھا، یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کرشن جی کو اوتار ماننے کا خیال عرصہ سے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھا، کہ راما نند کا ظہور ہوا اور اس نے رام چندر جی کو اوتار قرار دے کر اپنی ایک جماعت الگ کر لی، اور شمالی ہند میں رفتہ رفتہ یہ مسلک عام ہو گیا۔

راما نند سے قبل بھی بھگت شعراء کا وجود پایا جاتا تھا، چنانچہ سکھوں کے آدی گرنتھ میں جسے گرو ارجن نے سنہ ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا تھا، ان بھگت شعراء کا نمونہ کلام پایا جاتا تھا جو راما نند سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اور گرنتھ میں اب بھی بعض اجزاء نظر آتے ہیں۔

گرنتھ میں جے دیو کی تصنیف گیتا گوبند کا بھی ایک حصہ موجود ہے (جے دیو بارھویں صدی کے آخر میں پایا جاتا تھا) سدنا قصائی کے بھی چند اشعار گرنتھ میں محفوظ ہیں، یہ سندھ کا رہنے والا تھا، اور پندرھویں صدی کی ابتداء میں اس نے شہرت حاصل کی تھی یہ اپنے پیشہ کو چھوڑ کر بھگت ہو گیا تھا۔

اسی عہد میں ایک شخص نامدیو سرزمین مہاراشٹر سے پیدا ہوا اور چودھویں صدی کے اول ربع حصہ میں اس نے شہرت حاصل کی یہ درزی تھا اور عالم شباب میں ڈاکوؤں کی معیت میں رہتا تھا، لیکن بعد کو تائب ہو کر بھگت ہو گیا اور مرہٹی زبان میں اس نے بہت سی بھجنیں تصنیف کیں، شمالی ہند میں بھی یہ مذہبی رہنما تسلیم کیا گیا اور ہندی زبان میں کثرت سے اشعار کہے۔ گرنتھ میں اس کا کلام بھی پایا جاتا ہے۔

راما نند

اس کا زمانہ سنہ ۱۴۰۰ء اور سنہ ۱۴۷۰ء کے درمیان ہوا ہے، اس نے سنہ ۱۴۲۰ء میں تبلیغ شروع کی کہ خدا کی پرستش رام کے وجود میں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ صرف رام ہی وہ ذریعہ ہے جو مصائب تناسخ کو دور کر سکتا ہے۔

چونکہ اس نوع کی تحریک قبل سے رائج تھی اور کرشن جی کے وجود کو اس لحاظ سے مکمل خیال کر کے ایک گروہ ان کی پرستش کر رہا تھا، اس لئے راما نند کی تحریک کو بہت کامیابی حاصل ہوئی، اور اس نے بنارس میں قیام کر کے اسے تحریک کا مرکز قرار دیا، اس میں شک نہیں کہ راما نند مذہبی نقطۂ نظر سے بہت بڑا شخص تھا، کیونکہ اس کے مقلدین اب بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

بہ حیثیت مصنف یا شاعر ہونے کے اسے کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، ہندی زبان میں ایک آدھ نظم اس کی آدی گرنتھ میں پائی جاتی ہے جس میں وہ ظاہر کرتا ہے کہ "وشنو کی پرستش کے لئے کسی مندر میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ خدا ہر جگہ ہے اور اسے میں نے اپنے زوال میں پا لیا ہے" لیکن اس سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا

کہ اُس نے بت پرستی کی بھی مخالفت کر دی تھی۔ ہر چند اس نے صرف ایک خدا یعنی رام کی ہستی کو قابل پرستش قرار دیا لیکن اُس نے بت پرستی کی بھی مخالفت نہیں کی۔ اسی کے ساتھ اس نے قومی تقسیم کی پابندیوں کو بھی بالکل نظرانداز نہیں کیا۔

ہر چند بھگت رہنماؤں کی طرح اس نے اسکا دعویٰ کیا کہ بھگت ہونے کے بعد ہر مذہب قوم ہر ملت و مسلک کا آدمی نجات پاسکتا ہے، خواہ وہ شدر ہو یا برہمن، مسلمان ہو یا ہندو، لیکن عملی طور سے اس نے سوسائٹی کی قدیم پابندیوں کو دُور نہیں کیا، اس کے متبعین نے تقریباً سنسکرت کا استعمال ترک کر دیا، اور صرف اُس وقت کی پراکرت میں تبلیغ شروع کی، جس کا اثر ہندی لٹریچر پر بہت پڑا۔

مقلدین رامانند

رامانند کے بارہ شاگرد تھے جن میں سے بعض کا ہندی کلام اب تک محفوظ ہے۔ پیپا، گگرون گڑھ کا راجا جو ۱۴۲۵ء میں پیدا ہوا تھا، رامانند کا مرید ہو کر تارک السلطنت ہو گیا اور سادھو بن گیا دوسرا شاگرد دھنا جاٹ تھا، جو ۱۴۱۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ تیسرا سین تھا جو راجہ ریواں کے دربار کا نائی تھا ان تینوں کا کچھ کلام آدی گرنتھ میں محفوظ ہے۔

رامانند کے شاگردوں میں بھاونند مشہور شخص گذرا ہے جس نے ہندی زبان میں امرت دھار لکھ کر ویدانت فلسفہ کی صراحت کی ہے، رامانند کا ایک مرید رائے داس چمار بھی تھا، جو بہت بڑا بھگت گذرا ہے، اور اس کی کچھ نظمیں آدی گرنتھ میں پائی جاتی ہیں، جذبات کے لحاظ سے اسکی شاعری کا خاص درجہ ہے چنانچہ وہ اپنی ایک مناجات میں لکھتا ہے کہ:

"اے خدا اگر تو پہاڑی ہے تو میں تیرا طاؤس ہوں، اگر تو چاند ہے تو میں تیرا چکور ہوں، تو ہی مجھے قطع کردے تو کردے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا، میں تجھ سے کٹ کر کس سے ملوں گا، اگر تو شمع ہے تو میں اس کی بتی ہوں، اگر تو کوئی زیارت گاہ ہے تو میں تیرا زائر ہوں۔

اے خدا میں سچی محبت کے ساتھ تجھ سے ملا ہوں اور تجھ سے مل کر میں سب سے جدا ہو گیا ہوں، جہاں کہیں میں جاتا ہوں تیری ہی پوجا کرتا ہوں، تیری طرح اے خدا کوئی مالک نہیں۔ کیونکہ تیری پرستش سے موت کا پھندا کٹ جاتا ہے"۔

کبیر

رامانند کے شاگردوں میں جو مرتبہ کبیر کو حاصل ہوا وہ اُس کی شہرت سے ظاہر ہے، یہ باعتبار مذہب کے مسلمان اور بلحاظ پیشہ کے جلاہا تھا، اس کا زمانہ ۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۸ء تک ہوا ہے۔

بعض کا بیان ہے کہ وہ حقیقتاً ایک بیوہ برہمنی کے بطن سے ہوا تھا، جس نے اس کو اپنی شرم رکھنے کے لئے بنارس کے قریب تالاب میں ڈال دیا تھا، یہاں نیرو ایک مسلمان جلاہے نے اس کو پاکر اُٹھا لیا، اور بچوں کی طرح پرورش کی، بعض نے اس کی پیدائش ایک معجزہ کی صورت میں ظاہر کی ہے جو بالکل غلط ہے۔

طفلی ہی کے زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں کو اس سے تکلیف پہونچتی تھی، کیونکہ وہ باوجود مسلمان ہونے کے جنیو پہن

تھا اور خدا کو ہندو ناموں سے پکارتا تھا۔

چونکہ یہ کسی کا مرید نہ تھا اس لئے لوگ اُسے بے پیرا کہتے تھے، اور یہ الزام رفع کرنے کے لئے وہ رامانند کا مُرید ہونا چاہتا تھا، مگر اس خیال سے کہ رامانند اسے منظور نہ کرے گا، اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ گھاٹ کے زینہ پر جہاں رامانند آتا جاتا تھا رات کو لیٹ گیا۔ جب رامانند کا پاؤں اس پر پڑا، تو دفعتًا اس کے منھ سے رام، رام نکل گیا، یہ سنتے ہی کبیر کھڑا ہو گیا، اور کہا کہ رسم کے مطابق میں آپ کا مُرید ہو گیا ہوں، چنانچہ رامانند نے اس کی ارادت کو تسلیم کر لیا، اور کبیر اس کے پاس آنے جانے لگا۔ کبیر مسلمان رہا ہو یا ہندو، اس میں کلام نہیں کہ اسکے خیالات پر اسلامی تعلیمات کا اثر نمایاں ہے، اس نے سب سے پہلے خالص توحید کی تبلیغ کی اور کسی کو خدا کا اوتار تسلیم نہیں کیا۔ اسنے خدا کو رام، ہری، گوبند، اللہ اور دیگر مختلف ناموں سے پکارا، اور باوجود ویدانتی خیالات رکھنے کے اس نے بُت پرستی وغیرہ کی سخت مخالفت کی۔

اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج بھی نہ صرف کبیر پنتھی جماعت پائی جاتی ہے بلکہ اور بھی بہت سی جماعتیں ایسی ہیں جن کے معتقدات کا ماخذ اسی کا مسلک تھا، کبیر کی زندگی کے متعلق مختلف افسانے بیان کئے جاتے ہیں، لیکن ان پر وثوق نہیں ہو سکتا تاہم یہ یقینی ہے کہ اول اول اپنے پیشہ کی طرف متوجہ نہ ہونے سے گھر والے اسکے مخالف ہو گئے اور پھر بعد کو اُسکی تعلیمات نے ہندو مسلمان دونوں کو اس کی طرف سے برہم کر دیا، بعض کتب تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سکندر لودی نے اس کو بنارس سے نکل جانے کا حکم دیدیا تھا، چنانچہ یہ گھرا (جو ضلع گورکھپور کا ایک مقام ہے) چلا گیا، اور وہیں اپنی زندگی ختم کر دی۔

کبیر نے کثرت سے نظمیں تصنیف کیں، اور ہر چند اس نے خود انھیں ایک جگہ جمع نہیں کیا، لیکن اس کے مریدین و مقلدین نے انھیں اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا۔

اس وقت کثرت سے اس کا کلام لوگوں کو یاد ہے اور کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ اسمیں سے اکثر اُس کا نہیں ہے بلکہ بعد کو لوگوں نے خود اضافہ کر دیا۔

اس کے کلام کا ایک مجموعہ آدی گرنتھ میں ہے (جو ۱۶۰۴ء میں مرتب ہوا) اور دوسرا بیجک میں ہے، کہا جاتا ہے کہ بیجک کو بھاگو داس نے ۱۵۷۰ء میں مرتب کیا تھا جو کبیر کا خاص شاگرد تھا، اس مجموعہ میں مختلف بحروں کے اشعار ہیں لیکن آدی گرنتھ اور بیجک دونوں میں تمام اشعار ایسے نہیں ہیں جنھیں کبیر کے دماغ کا نتیجہ کہا جا سکے۔

علاوہ ان کے کبیر کی بہت سی ساکھیاں (یعنے چھوٹے دوہے) جن میں سے پانچ ہزار اس وقت تک جمع ہو چکی ہیں، ہندوستان کے تمام حصوں میں مشہور ہیں۔

کبیر چورا میں جو بنارس میں کبیر پنتھیوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے ایک مجموعہ کبیر کے کلام کا بیس حصوں میں موجود ہے جسے خاص گرنتھ کہتے ہیں، لیکن اس میں بھی کبیر کا کلام بہت کم ہے۔

بیجک کے مجموعہ میں جو اشعار پائے جاتے ہیں وہ اودھ کی ہندی زبان میں ہیں، کبیر کی شاعری بہ لحاظ شاعری کے زیادہ قابل لحاظ نہیں ہے کیونکہ ترکیب، صحت الفاظ کے سقم کے علاوہ قواعد کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں اور انداز بیان بھی معمولی ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کی شہرت و مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص اس سے لطف اٹھاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں حد درجہ صداقت پائی جاتی ہے اور وہ نہایت آزادی و بیباکی سے اپنے عہد کے فضول و لغو مراسم مذہبی پر اعتراض کرتا ہے، اسی کے ساتھ اس کے انداز بیان میں ایک خاص قسم کا طنز ملا ہوا ہوتا ہے جو شعر کو بہت پُر لطف بنا دیتا ہے اور وہ روانی و سلاست جو جذبات کی شاعری میں قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے اس کے کلام میں بہت پائی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندی کی مذہبی شاعری کو جس قدر فروغ اس کی ذات سے حاصل ہوا اس سے قبل اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

اس کے بہت سے دوہوں کا ترجمہ رابندر ناتھ ٹیگور نے انگریزی میں کیا ہے، لیکن حقیقی لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اصل زبان میں ان کا مطالعہ کیا جائے۔

کبیر اپنے مذہب و مسلک کے لحاظ سے بالکل موحد تھا، اور وہ تفریق مذاہب کا قائل نہ تھا، وہ تمام اشیاء کو ذات باری کا مظہر و آثار خیال کرتا تھا، اور صرف اخلاقی نقطۂ نظر سے وہ نجات و ابتلا پر حکم لگاتا تھا، جس طرح وہ مسجد و مندر کی قید سے آزاد تھا، اسی طرح وہ ذات و قومیت کی تخصیص کو بھی لغو قرار دیتا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ اگر ایک شخص خود معرفت نفس حاصل کرے تو مقصود تک پہونچ سکتا ہے۔

کبیر کا ایک بیٹا کمال تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بھی شاعر تھا لیکن اپنے باپ کے معتقدات سے منحرف اور اس کے خیالات کا مخالف، اس لئے یہ مثل مشہور ہے کہ "بڑا بنس کبیر کا اپنے پوت کمال"۔ یعنے کبیر کا خاندان تباہ ہو گیا، کیونکہ اس میں کمال پیدا ہوا۔

نانک

کبیر کی تعلیمات نے ہندوستان میں بہت سی جدید مذہبی تحریکیں پیدا کر دی تھیں، لیکن ان سب میں اہم ترین سکھوں کا مسلک تھا جسے گرو نانک نے پنجاب میں قائم کیا۔

نانک کا زمانہ ۱۴۶۹ء سے ۱۵۳۸ء تک ہوا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ جب نانک کی عمر ۲۷ سال کی تھی تو کبیر سے اس کی ملاقات ہوئی، اور اس کا جو اثر نانک پر پڑا وہ نہ صرف اس سے ظاہر ہے کہ سکھ گرنتھ میں کبیر کا کلام کثرت سے پایا جاتا ہے۔ بلکہ خود نانک کی تعلیمات اس کی شاہد ہیں۔

اس ملاقات کے بعد گرو نانک نے سیاحت شروع کی اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں ہو کر مطالعہ فطرت کیا، دوران سیاحت میں اس کا شاگرد مردانا بھی ہمراہ رہتا تھا، جو گرو نانک کے بھجنوں کے ساتھ رباب بجایا کرتا تھا، گرو نانک کی بھجنیں اور قریب قریب تمام منظومات ہندی اور پنجابی ملی ہوئی زبان میں تھیں۔

ہر چند بہ حیثیت شاعر ہونے کے گرو نانک کا درجہ کبیر سے کم ہے تاہم اس کا کلام صاف اور موثر ہے۔

نانک نے بہت جلد اپنے مقلدین کثیر تعداد میں پیدا کرلئے اور اس کا بہترین مجموعۂ نظم جپجی ہے جس میں روزانہ پرستش اور دعا کے وقت کی بھجنیں درج ہیں۔

علاوہ جپجی کے سکر گرنتھ میں اور بھی بہت سی نظمیں گرونانک سے پائی جاتی ہیں۔

کرشن پرست طبقہ

راما نند، کبیر اور گرو نانک کے مقلدین اکثر خدا کو رام ہی کے نام سے پکارتے تھے اور کبھی کبھی دوسرے ناموں سے بھی، لیکن ان تینوں میں فرق یہ تھا کہ راما نندی طبقہ رام کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا اور بت پرستی کا عادی تھا، کبیر اور نانک نے ان دونوں باتوں کی اجازت نہیں دی۔ نہ وہ رام کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے اور نہ بت پرستی کے طرفدار تھے۔

انھیں فرقوں کے ساتھ ایک فرقہ وشنویوں کا ایسا بھی تھا جو کرشن جی کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا۔ ہر چند رام پرست طبقہ کی طرح کرشن پرست گروہ بھی بہت پہلے سے پایا جاتا تھا، لیکن اس زمانہ میں اس کی تحریک بہت قوی ہوگئی جس کا سبب صرف وہ مذہبی لٹریچر تھا جو اس عہد میں کرشن پرستی کے عقائد کو رواج دے رہا تھا کرشن پرست طبقہ میں بعض لوگ ایسے تھے جنھوں نے کرشن جی کے عالم طفولیت کو اپنی پرستش کا مقصود قرار دیا تھا۔ لیکن اکثر کرشن جی کی اس زندگی کو اپنے والہانہ جذبات کا ماخذ قرار دیتے تھے جس کا تعلق رادھا اور دوسری گوپیوں کے اختلاط سے تھا۔

رادھا کرشن کے متعلق نظموں کی ابتدا بارھویں صدی سے ہوئی جب سنسکرت میں گیتا گوبند سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر جے دیو نے مرتب کی، اس کے بعد چودھویں صدی میں بنگالی زبان نے اس نوع کی منظومات میں سبقت کی، سنہ ۱۴۱۵ء اور سنہ ۱۴۸۰ء کے درمیان ایک گجراتی شاعر نرسنگھ مہتا پیدا ہوا جس نے اپنے ملک کی زبان میں رادھا اور کرشن کی عاشقانہ زندگی کو نظم کیا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندی زبان میں بھی اسی موضوع پر چند نظمیں لکھی تھیں۔

ودیا پتی ٹھاکر جو ضلع دربھنگہ کے ایک گاؤں بسپی کا رہنے والا تھا، پندرھویں صدی کے وسط میں مشرقی ہندستان کا بڑا مشہور وشنوئی شاعر ہوا ہے، اس نے ایک خاص قسم کی بھجن گانے والے بھی پیدا کئے جو تمام بنگال میں پھیل گئے اس کی زندگی کا حال بہت کم معلوم ہے، اس نے سنسکرت میں کئی کتابیں تصنیف کیں، لیکن اس کی شہرت کا خاص باعث وہ عاشقانہ نظمیں ہیں جو بہاری زبان میں تصنیف کی گئیں۔ ان نظموں میں انسان روح اور خدا کے باہمی تعلق کو رادھا اور کرشن جی کے تعلقات سے تشبیہ دیکر بیان کیا ہے، اس کی بہت سی نظمیں بعد کو بنگالی زبان میں منتقل ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام میں خاص کیفیت ہے اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس کی شاعری ایک مخصوص امتیاز رکھتی ہے اس کا ہمعصر ایک اور شخص روما پت تھا، اس نے بھی بہاری اور بنگالی زبان میں شاعری کی اور کرشن جی کی زندگی کو اپنا موضوع شعر قرار دیا۔

میرابائی

وہ دیاپت کے زمانہ میں یا اس کے کچھ عرصہ کے بعد مغربی ہندوستان میں ایک اور ہستی ایسی پیدا ہوئی جس نے پرستش کرشن کو بہت زیادہ مقبول بنا دیا۔ اس کا نام میرابائی تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کا مرتبہ ہندی شاعری میں بہت بلند ہے۔

اس کی زندگی کے حالات اکثر غیر معلوم ہیں لیکن یہ امر محقق ہے کہ یہ راجپوتانہ کی ایک رانی تھی جو مہارانا میواڑ کے ولی عہد بھوج راج سے منسوب ہوئی تھی۔ اس کا شوہر قبل تخت نشین ہونے کے مرگیا اور راجہ کمبھا کو اس کے دوسرے بیٹے اودے کرن نے ۱۴۶۹ء میں تخت سے اُتار دیا۔

میرابائی جو شروع سے کرشن پرست تھی یوں بھی اپنے شوہر کی زندگی میں زیادہ عزیز نہ تھی، کیونکہ وہ اس طریقۂ پرستش و اعتقادت سے منحرف تھے جو میواڑ کے خاندان میں رائج تھا، لیکن جب اس کا دیور تخت نشین ہوا تو اُسنے اس کو بہت زیادہ تکلیف پہونچائی یہاں تک کہ وہ چتوڑ سے بھاگ کر رامانند کے شاگرد رائے داس (چمار) کی مُرید ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ :-

"وہ خصوصیت کے ساتھ کرشن جی کی اس مورت کی پرستار تھی۔ جسے رنچھوڑ کہتے ہیں، چنانچہ ایک دن وہ بدرجہ خشوع و خضوع کے ساتھ پوجا کر رہی تھی کہ مورتی شق ہوئی اور وہ اس میں سماگئی۔"

رائے داس رام پرست تھا اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ میرابائی جو کرشن پرست تھی کیوں اس کی مُرید ہوئی، ممکن ہے کہ رائے داس کی محبت میں اس کے معتقدات بدل ہوگئے ہوں، لیکن میرابائی کے کلام سے اس کا ثبوت صرف اس قدر ملتا ہے کہ کہیں کہیں اُس نے خدا کو رام سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا کلام برج بھاشا میں ہے اور نہایت پاکیزہ ہے، بعض نظمیں گجراتی زبان کی بھی اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔ میرابائی کی شاعری بالکل جذبات کی شاعری ہے وہ ایک جگہ لکھتی ہے :-

"اے ماں۔ کرشن نے اپنے صفات سے جن کا گیت میں گایا کرتی ہوں میری روح کو بالکل لپیٹ لیا ہے،
اس کی محبت کا تیز تیر، اے ماں، میرے جسم کے اندر پیوست ہوتا جا رہا ہے،
اول اول جب وہ میرے جسم میں چُبھا تو مجھے خبر بھی نہ ہوئی، لیکن اب تو وہ ناقابل برداشت ہوگیا ہے،
میں دوا، دعا، سحر و افسوں سبھی کچھ کر چکی، لیکن وہ درد کسی طرح دُور نہیں ہوتا،
اے ماں ہے کوئی ایسا جو میرے اس درد کی دوا کرے۔"

اے خدا، تو نزدیک ہے، دُور نہیں، اس لئے آ، اور مجھ سے مل جا۔

میرا کہتی ہے کہ پرماتما نے جو بے انتہا رحیم ہے میرے جسم کی آگ کو بجھا دیا ہے۔
اُس کنول کی سی آنکھیں رکھنے والے نے اپنی صفات سے میری روح کو بالکل لپیٹ لیا ہے۔

بلبھ چاریا

کرشن پرستی کا عام رواج جس کی ذات سے ہوا وہ بلبھ چاریا تھا - یہ جنوبی ہند کے ایک برہمن کا لڑکا تھا اور ۱۴۷۹ء میں بمقام بنارس پیدا ہوا تھا - اس نے برج میں بمقام گوبردھن کرشن کی ایک مورت قائم کی اور یہیں سے اس نے اپنی تعلیمات کی اشاعت شروع کی، ہرچند اس کی تمام تصانیف سنسکرت میں ہیں لیکن اس کے معتقدین میں کثرت سے ہندی زبان کے شاعر پیدا ہوئے - ۱۵۳۱ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا بٹھل ناتھ اس کا جانشین ہوا -

بٹھل ناتھ اپنے باپ کے بعد نہ صرف کرشن پرست طبقہ کا سردار تسلیم کیا گیا، بلکہ اس نے ہندی زبان میں شاعری بھی کی، کہا جاتا ہے کہ علاوہ نظموں کے جن کی صحت اسوقت ثابت نہیں ہو سکتی، اس نے ایک نثر کی بھی کتاب برج بھاشا میں لکھی جس کا نام منڈن تھا، اس کتاب میں اس نے رادھا اور کرشن جی کے معاشقانہ زندگی سے بحث کی ہے -

بعد کو بلبھ چاریا کے چار شاگردوں نے بٹھل ناتھ کے چار شاگردوں کے ساتھ مل کر اشٹ چھاپ (آٹھ مہریں) کے نام سے بہت شہرت حاصل کی جن کا ذکر بعد کو آئے گا -

بھگتی تحریک کی تقسیم

۱۴۰۰ء اور ۱۵۵۰ء کے درمیان بھگتی تحریک تین شعبوں میں تقسیم ہو گئی ،

(۱) جس نے رام کی پرستش ان کو خدا کا اوتار سمجھ کر کی اور بت پرستی اپنا شعار قرار دیا، (۲) جس نے خدا کی پرستش رام کا نام لے کر کی، لیکن انھیں اوتار نہیں سمجھا اور نہ بت پرستی کی (۳) جس نے کرشن جی کی پرستش کو اپنا مطمح نظر قرار دیا -

ان تینوں طبقوں میں ہندی لٹریچر کا عام رواج تھا اور اسی نے معتقدات مذہبی کی اشاعت میں کافی مدد پہونچائی -

ملک محمد جائسی

ملک محمد جائسی کی شہرت کا زمانہ ۱۵۴۰ء تھا - یہ اپنے عہد کے درویش اور ہندوؤں کی مذہبی روایات سے بہت واقف تھے، کہا جاتا ہے کہ تعلیمات کبیر سے یہ بہت متاثر ہوئے تھے، راجہ امیٹھی آپ کا بہت قدر شناس تھا، اس کے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی لیکن بعد کو آپ کی دعا سے ایک بیٹا پیدا ہوا - ان کا مزار امیٹھی میں اب بھی مرجع خلائق ہے -

پدماوت ان کی نہایت مشہور مثنوی ہے، اس میں ایک قصہ نظم کیا گیا ہے کہ رتن سین ایک طوطی کی زبانی پدماوت یا پدمنی کے حسن کا ذکر سن کر اس پر عاشق ہو گیا اور فقیر بن کر لنکا پہونچا، جب وہ اس کو بیاہ کر چتوڑ لایا تو علاء الدین خلجی نے پدمنی پر قبضہ کرنے کے لئے چتوڑ پر حملہ کر دیا - وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا - لیکن رتن سین کو مقید کر لیا، اس کے بعد یہ دو آدمیوں کی بہادری سے آزاد ہوا اور اس نے دیوپال پر حملہ کیا جس نے پدمنی سے اس کی غیبت میں اظہار تعشق کیا تھا - دیوپال کو قتل کر کے رتن سین بے انتہا زخمی ہو کر چتوڑ واپس آیا اور مر گیا - پدمنی اپنے شوہر کے

ساتھ ستی ہونے کے لئے چتا میں بیٹھی تھی کہ علاؤالدین چتوڑ کے دروازہ پر پہونچ گیا۔ اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ لیکن پدمنی اس وقت تک خاک ہو چکی تھی۔

ملک محمد جائسی نے مثنوی کے آخر میں ظاہر کیا ہے کہ یہ قصہ صرف ایک استعارہ ہے ورنہ حقیقتاً چتوڑ سے جسم انسانی، رتن سین سے روح، پدمنی سے فراست، علاؤالدین سے واہمہ اور طوطی سے گرو یا رہبر مقصود ہے۔

ملک محمد نے اس نظم میں چتوڑ کے اس محاصرہ کو پیش نظر رکھا ہے جو ۱۳۰۳ء میں علاؤالدین نے کیا تھا پدماوت کی زبان اس وقت کی ہندی ہے۔ لیکن اس میں فارسی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ یہ مثنوی باعتبار شاعری کے بے مثل خیال کی جاتی ہے اور ہندی لٹریچر میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

اس عہد کے دوسرے شعراء

اس زمانہ کے شعراء میں ایک شخص نرو تم داس تھا جس نے ۱۵۳۰ء میں شہرت حاصل کی۔ اس کی تصنیف سُدا ما چرتر بہت مشہور ہے۔ دوسرا اکر پارام تھا جو ۱۵۴۰ء میں مقبول ہوا اس نے برج بھاشا میں ایک ہت ترنگنی تصنیف کی اور غالباً فنِ شعر پر ہندی زبان میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔

شاہانِ مغلیہ کے عہد میں ہندی لٹریچر کی ترقی

ہندوستان میں اگرچہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی لیکن دربار و دفاتر میں عام طور سے فارسی کا رواج تھا۔ اسی لئے بہت سے ہندو جن کا تعلق دربار سے تھا وہ فارسی سے نا آشنا نہ رہے تھے، اور یہی اثر تھا جو بعد کو ہندی لٹریچر میں زیادہ ترقی کا باعث ہوا۔

عہد مغلیہ سے قبل بھی ہندوستان کے مسلمان فرمانروا ترقی زبان کے معاون و مددگار تھے، لیکن حقیقی معنی میں جس شخص نے سب سے پہلے اس ... کی طرف عملی قدم بڑھایا وہ شہنشاہ اکبر تھا اور اس کا عہد حکومت (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) خصوصیت کے ساتھ ہندی لٹریچر کا عالم شباب نظر آتا ہے، چونکہ اکبر عام طور سے علم و فضل اور فنون لطیفہ کا بہت بڑا حامی تھا، اس لئے مصوری، موسیقی، خطاطی وغیرہ کے ساتھ اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ مختلف زبانوں کی کتابوں کا قائم کیا اور حکم دیا کہ سنسکرت سے بھی فارسی اور اس وقت کی عام مروجہ زبان میں ترجمہ کیا جائے اسی کے ساتھ شعراء کی قدر شناسی بھی اس نے بدرجۂ کمال کی۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی اور دیگر علوم و فنون کے ساتھ ہندی لٹریچر نے بھی ایک اور نیا قدم ترقی کی طرف اٹھایا۔

ہر چہار طرف سے علما و شعراء اس کے دربار میں کھنچ کھنچ کر آ رہے تھے اور چونکہ وہ اپنی بے تعصبی کی وجہ سے حد درجہ ہر دلعزیز تھا اس لئے اس کا دربار ہندو شعراء و دیگر اصحاب کمال کا بھی مرکز بن گیا۔

عہد اکبری کے ہندی شعراء

اس سلسلہ میں سب سے پہلے خود اکبر کا نام لینا چاہئے جس کے بعض متفرق اشعار ہندی کے بہت مشہور ہیں، ان میں اس نے اپنا تخلص اکبر رائے رکھا ہے۔

اس کے بعض وزراء بھی صاحب تصنیف اور بڑے قدر شناس علم و فضل تھے، راجہ ٹوڈر مل (۱۵۲۳-۱۵۸۹ء) نے نہ صرف بھگوت پران کا ترجمہ فارسی میں کیا بلکہ ہندی میں شاعری بھی کی۔ چنانچہ اسکے بہترین اشعار وہ ہیں جن میں اس نے اخلاق سے بحث کی ہے۔

راجہ بیربل (۱۵۲۸-۱۵۸۳ء) قنوج کا ایک برہمن تھا، اور فرمانروائے جے پور کے دربار میں بزمرۂ شعراء ملازم تھا، راجہ جے پور نے اس کو دربار اکبری میں پیش کیا جہاں اس نے بہت ترقی کی۔ وہ نہ صرف معاملات سلطنت طے کرنے میں مشاق تھا بلکہ موسیقی و شاعری کا بھی خاص ذوق رکھتا تھا، چنانچہ اکبر نے اسے کوی رائے (ملک الشعراء) کا خطاب دے کر بہت جلد تمام مدارج ترقی طے کرا دئیے۔ اس کی چھوٹی بحر کے مذاقیہ دوہے بہت مقبول ہوئے، ہر چند ان کا مجموعہ اس وقت نایاب ہے لیکن بہت سے دوہے اب بھی مشہور ہیں جب راجہ بیربل بڑے درجہ پر پہونچ گیا تو خود اس نے بھی دوسرے شعراء کی سرپرستی کی۔

راجہ منوہر داس (جس کا زمانۂ ترقی ۱۵۷۷ء ہے) بھی اکبر کے امرائے دربار میں سے تھا اور اچھا شاعر تھا۔

اسی طرح مہاراجہ مان سنگھ (۱۵۳۵-۱۶۱۸ء) جو اکبر کا مشہور فوجی سردار تھا آدمیوں کا بڑا قدردان تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک بار ایک شعر کے انعام میں ایک لاکھ روپیہ دیدیا۔ اور فیضی سے کون واقف نہیں کہ وہ فارسی شاعری کے علاوہ ہندی زبان کا بھی ماہر تھا، لیکن ان سب میں بہت زیادہ مشہور عبدالرحیم خانخاناں تھا (۱۵۵۳-۱۶۲۷ء) یہ اکبر کے اتالیق بیرم خاں کا بیٹا اور عربی و فارسی، سنسکرت و ہندی کا بڑا زبردست عالم تھا، یہ شعراء کا ایسا قدرشناس تھا کہ اس کی نظیر بادشاہوں میں بھی نہیں ملتی، چہ جائیکہ امراء کی صف میں عزمی، نظیری، فارسی شعراء میں اور گنگ کوی ہندی شعراء میں اس کو نہایت محبوب تھے، اور اسکی فیاضیوں سے مالا مال رہتے تھے۔

عبدالرحیم خود بھی فارسی و ہندی کا بڑا زبردست شاعر تھا، اور اس کے دوہے جذبات عالیہ سے لبریز نظر آتے ہیں اس وقت اس کی ہندی تصانیف میں سے صرف رحیم ست سئی نظر آتی ہے، جس کے مطالعہ سے اس کا مرتبہ

شاعری ظاہر ہو سکتا ہے۔

تان سین (سنہ ۱۵۵۶-۱۶۱۰ء) گوالیار کا رہنے والا تھا اور مذہب اسلام اس نے اختیار کر لیا تھا، یہ اپنے عہد کا بےمثل موسیقی داں تھا۔ جب سنہ ۱۵۶۳ء میں اول اول یہ دربار اکبری میں پہونچا، تو بادشاہ نے اسے دو لاکھ روپئے انعام میں دیئے۔ مغنی ہونے کے ساتھ وہ شاعر بھی تھا، اس کی تصانیف میں سنگت سار اور راگ مالا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

رام داس (سورداس کا باپ) بھی دربار اکبری کے مغنیوں میں سے تھا، اور تان سین کے بعد اس کا ہم رتبہ فن موسیقی میں کوئی نہ تھا۔

علاوہ ان کے کرن اور نرہری سہائے دو بھائی اور بھی دربار اکبری کے ہندی شعراء میں سے تھے۔ نرہری سہائے کے متعلق اکبر کہا کرتا تھا کہ اور گانے والے تو "گن کے پاتر" ہیں لیکن یہ مہا پاتر ہے۔

گنگا پرشاد بھی دربار اکبری کا مشہور شاعر تھا یہ زیادہ تر کنگ کوئی کے نام سے مشہور ہے اور اس کا زمانہ سنہ ۱۵۳۳ء اور سنہ ۱۶۱۷ء کے درمیان ہوا ہے اس کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور اس وقت صرف ۳۰، ۳۵، اشعار اس کی یادگار باقی رہ گئے ہیں۔ عبدالرحیم خانخاناں اس کا بڑا سرپرست تھا، چنانچہ ایک بار خانخاناں نے صرف ایک شعر پر اس کو ۳۶ لاکھ روپئے عنایت کئے، رزمیہ اور مزاحی شاعری میں بھی اس کا بڑا رتبہ تھا۔

علاوہ ان کثیر التعداد شعراء کے جن کا تعلق دربار اکبری سے تھا اور بھی بہت سے شاعر موجود تھے، جن میں تلسی داس اور سورداس کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

فن شاعری

عہد اکبری سے قبل ہندی شاعری فن کے لحاظ سے بالکل غیر منظم حالت میں تھی اور عروض وغیرہ سے بالکل بے نیاز، لیکن جب اکبر کے زمانہ میں تمام علوم و فنون نئے نئے ملبوس میں نظر آرہے تھے، اسی وقت ہندی شاعری نے بہ لحاظ فن کے ترقی کی اور چند نفوس ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اس طرف توجہ کر کے اس نقص کو بھی دور کر دیا۔

کیسو داس

ہر چند اس سے قبل ایک شخص کرپارام اس کی تحریک کر چکا تھا لیکن سب سے پہلے جس نے فن شعر پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی، وہ کیسو داس (ساکن اورچھا) تھا۔ اس نے اول اول وگیان گیتا لکھی اور راجہ مدھوکر شاہ فرمانروائے اورچھا کے نام منسوب کی، اس کے بعد اس نے کوی پریا تصنیف کی، اور اس میں صراحت کے ساتھ محاسن شعری سے بحث کر کے اپنے تئیں مسلم الثبوت استاد تسلیم کرا لیا۔ یہ کتاب پروین رائے پاتری کے نام منسوب کی گئی جو خود بھی مشہور شاعر تھا، علاوہ ان کے تیسری کتاب رام چندرکا اس نے

مدھوکرشاہ کے بیٹے اندرجیت سنگھ کے نام سے منسوب کی، ایک بار اکبر نے اندرجیت سنگھ سے ناراض ہوکر اس پر کثیر رقم جرمانہ کی، لیکن بعد کو محض کیسوداس کی وجہ سے جو بیربل کے ذریعہ سے دربار اکبری میں پہونچ گیا تھا۔ یہ جرمانہ معاف ہوگیا اور اندرجیت نے کیسوداس کی بڑی عزت کی۔

اس نے ایک کتاب رسک پریا فن ساہت یا ترکیب اشعار پر اور دوسری رام النکرت منجری فن عروض پر تصنیف کی، ان کتابوں میں اس نے صرف اُصول ہی سے بحث نہیں کی۔ بلکہ مثالیں بھی پیش کی ہیں جس سے ہر تصنیف اک نہایت دلچسپ مجموعہ اشعار کا بھی ہوگئی ہے۔ کیسوداس کا مرتبہ شاعری کے لحاظ سے بہت بلند ہے اور جو کوششیں اس نے ہندی شاعری کو ترقی دینے کے لئے کیں وہ یقیناً غیر فانی ہیں۔ اس کا کلام چونکہ مشکل ہے اس لئے متعدد شرحیں اس کی کتابوں کی لکھی گئیں اور بعض شعراء نے اس کے انداز بیان کا تتبع بھی کیا۔

کیسوداس کے معاصرین

کیسوداس کا بھائی بلبھدر سنادھیا مصر بھی اسی عہد کا مشہور مصنف تھا، اس نے بھگوت پران کی شرح کئی جلدوں میں لکھی، اس کی بہترین نظم نک سکھ (سراپا) ہے جس میں محبوب کے تمام اعضا کی (سر سے لے کر پاؤں تک) مختلف تشبیہات کے ساتھ تعریف کی گئی ہے۔ علاوہ بلبھدر کے بال کرشن ترپاٹھی بھی تھا جس نے سنہ ۱۶۰۰ء میں فن عروض پر ایک کتاب رس چندر کا تصنیف کی، اس عہد میں کاشی ناتھ بھی ایک اچھا شاعر تھا۔

عہد شاہجہاں و جہانگیر

عہد اکبری میں جو صورت ہندی لٹریچر کی ترقی کی قائم ہوگئی تھی وہ اکبر کے بعد بھی قائم رہی کیونکہ جہانگیر (سنہ ۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) اور شاہجہاں (سنہ ۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) نے قدردانی شعراء میں اسی قدر حصہ لیا جتنا عہد اکبری میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ داراشکوہ، شاہجہاں کا بیٹا تو اس قدر مائل تھا کہ بعض لوگوں نے اُسے نصف ہندو کہہ دیا۔ عہد اورنگ زیب میں (سنہ ۱۶۵۸-۱۷۰۷) بھی باوجود اس کے کہ عام طور سے وہ تعصب کا دور کہا جاتا ہے مستحق ہندی شعراء کو کوی رائے کے خطاب دیے جانے کا دستور تھا۔

سنہ ۱۶۳۱ میں کوی رائے کا خطاب ایک شخص سندر کو دیا گیا جو ذات کا برہمن تھا، اس کی ایک کتاب فن شعر پر سندر سنگار اور دوسری سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ برج بھاشا زبان میں خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

سیناپت سنہ ۱۵۸۹ میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۶۴۹ تک زندہ رہا، یہ قنوجی برہمن تھا، اور پرتاپ کرشن میں سے تھا سنہ ۱۶۴۹ میں اس نے ایک کتاب کوت رتناکر کے متعلق تصنیف کی۔ مناظر فطرت کے بیان میں اس کو خاص ملکہ حاصل تھا، چنانچہ اس نے جہاں موسموں کا بیان کیا ہے وہ حصہ ہندی لٹریچر کی جان کہا جاسکتا ہے۔

رتناکر ترپاٹھی ایک قنوجی برہمن تھا اور ٹکوامپور (ضلع کانپور) میں رہا کرتا تھا اس کے چار بیٹے تھے اور چاروں مشہور شاعر ہوئے۔ انھوں نے عہد شاہجہاں و اورنگ زیب میں ترقی حاصل کی اور کیشوداس کے مذاق تصانیف کو زیادہ مقبول بنایا۔ ان میں سے بڑے بھائی کا نام چنتامنی تھا، اور شاہجہاں تک بھی اس کی رسائی تھی، اس کی متعدد تصانیف ہیں جن میں چھند بچار فن عروض پر خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ سب سے چھوٹے بھائی کا نام نیل کنٹھ تھا اور یہ بھی نہایت مشہور شاعر تھا۔ باقی دو بھائی بھوشن اور متی رام تھے، جو شاعری میں چنتامنی اور نیل کنٹھ سے زیادہ بلند مرتبہ رکھتے تھے، بھوشن مختلف ہندو راجاؤں کے درباروں میں رہا لیکن بندیلکھنڈ کے راجہ چھترسال اور سیواجی (مرہٹہ) نے خصوصیت کے ساتھ اس کی بہت قدر کی، ان دونوں کی تعریف میں اس نے بہت سے قصائد کہے، چنانچہ سیورام بھوشن اس کی بہت مشہور کتاب ہے جس میں اس نے سیواجی کے کارنامے بیان کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رزمیہ مناظر کے بیان کرنے میں اس کو خاص ملکہ تھا۔

متی رام کا تعلق پہلے راجہ راؤ بھاؤ سنگھ (بوندی) سے رہا اور پھر راجہ شمبھوناتھ سلطانی سے۔ راجہ بوندی کے سامنے پیش کرنے کے لئے اس نے علم معانی پر ایک کتاب لالت للام تحریر کی اس میں جو مثالیں پیش کی ہیں وہ خود اسی کی مصنفہ ہیں اور اکثر میں راجہ بوندی کی تعریف کی ہے، علم بدائع و معانی پر اس کی یہ تصنیف خاص عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کی دوسری تصنیف عروض پر چھند سار سنگل ہے جو راجہ شمبھوناتھ کی خاطر سے لکھی گئی تھی، اس کی تیسری تصنیف رس راج جو خالص عاشقانہ شاعری ہے، بہترین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے، اس کی ست سئی متی رام بھی بہت مشہور ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا کلام بہاری لال کے کلام سے (جس کا ذکر آگے آئے گا) ٹکر کھاتا ہے۔

عہد شاہجہاں کے شعراء

شمبھوناتھ ستارہ کا راجہ (سنہ ۱۶۵۰) شعراء کا قدرشناس صرف اس لئے تھا کہ وہ بھی اچھا کہنے والا تھا، چنانچہ اس کی تصانیف نایکہ بھید اور نکھ سکھ بہت مشہور ہیں۔

سرستی (سنہ ۱۶۵۰) بنارس کا برہمن تھا اور سنسکرت کا فاضل، شاہجہاں کے اشارہ سے اس نے ہندی زبان میں شاعری شروع کی۔ چنانچہ کوندراکلپ اس کی مشہور کتاب ہے جس میں شاہجہاں اور داراشکوہ کی تعریف میں بہت سی نظمیں پائی جاتی ہیں۔

تلسی (سنہ ۱۶۵۵) ایک معمولی شاعر تھا لیکن اس نے ایک کوی مالا مرتب کرکے اپنے تئیں غیر فانی بنا دیا۔ اس کتاب میں اس نے سنہ ۱۴۹۳ سے سنہ ۱۶۴۳ تک کے خاص خاص ۵، شعراء کا منتخب کلام درج کرکے وہ کام کیا جو اس سے قبل کسی کے ذہن میں نہ آیا تھا اور غالباً ہندی زبان میں تذکرۃ الشعراء کے سلسلہ کی یہ پہلی

کتاب تھی۔

عہد مغلیہ کے باقی شعراء

عہد مغلیہ کے تمام شعراء کی اگر فہرست مرتب کی جائے اور یہ سوال ہو کہ سب سے پہلے کس کا نام درج کرنا چاہیئے تو یقیناً فن شعر کے لحاظ سے بہاری لال ہی کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ جس کا کلام آج بھی ویسا ہی شگفتہ و پر مغز نظر آتا ہے جیسا اب سے تین صدی قبل۔
یہ ذات کا برہمن تھا، گوالیار میں پیدا ہوا۔ اور لڑکپن بندیلکھنڈ میں صرف کیا، بعد کو متھرا میں اس کی شادی ہوئی اور برج بھاشا کی اس حقیقی مسکن میں اس نے اقامت اختیار کرلی۔ اس کا سرپرست جے سنگھ راجہ جے پور تھا جو ہر شعر کے عوض اُسے ایک اشرفی دیا کرتا تھا۔

بہاری لال کی موجودہ شہرت اس کی ست سئی پر ہے جس میں تقریباً سات سو دوہے اور سورٹھا پائے جاتے ہیں۔ ان دوہوں میں رادھا اور کرشن کے تعشق کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ ہر دوہا اک مکمل مضمون پیش کرتا ہے اس لئے مختلف نسخے مختلف ترتیب کے ساتھ منضبط ہوئے، لیکن ان سب میں مشہور وہ نسخہ ہے جو اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے اعظم شاہ کے لئے لکھا گیا تھا۔ اور اسی لئے اُسے اعظم شاہی نسخہ کہتے ہیں۔
اس کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے چند مختلف دوہے درج کئے گئے ہیں، اس کے بعد نایک کی چاروں قسموں کا بیان ہے اور پھر دو سو شعر نایکہ کی اقسام سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد مختلف کیفیات کے متعلق الگ الگ مجموعۂ اشعار مرتب کیا گیا ہے، ایک سو ستر دوہے صرف فراق کے بیان میں ہیں۔ تیسرے حصہ میں نک سکھ (سراپا) ہے جو ۶ موسموں کے بیان پر ختم ہوتا ہے اور چوتھے حصہ میں دیگر مختلف جذبات سے بحث کی گئی ہے۔

ہرچند بہاری لال اس انداز بیان اور ترتیب کا موجد نہ تھا (اس سے قبل سنسکرت میں سپت ستکا موجود تھی اور تلسی داس بھی ایک ست سئی لکھ چکے تھے) لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ست سئی بہت زیادہ مقبول ہوئی اور کم از کم تیس شرحیں اس کی لکھی گئیں۔ بنارس کے ایک شخص ہری پرشاد نے اس کو سنسکرت میں بھی منتقل کیا۔

جسونت سنگھ

مارواڑ (جودھپور) کا راجہ (جو تاریخ میں اورنگ زیب کے مخالفین کی فہرست میں دکھایا جاتا ہے) ۱۶۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۸۱ء تک زندہ رہا۔ ۱۶۳۴ء میں جبکہ وہ بہت کمسن تھا تخت نشین ہوا۔ لٹریچر میں اس کی خاص شہرت کا باعث بھاشا بھوشن ہے۔ اس کی اور کتابیں بھی فلسفہ ویدانت پر ہیں۔

دیوکوی

اس کا اصلی نام دیودت اور ذات کے لحاظ سے سناڈھیا برہمن تھا۔ یہ ۱۶۷۳ء میں بمقام

اٹاوہ پیدا ہوا اس کی عمر سولہ سال کی تھی کہ اس نے شاہزادہ اعظم شاہ کے سامنے اپنی سب سے پہلی نظم پڑھی اس نے سرپرست کی تلاش میں ہندوستان کا بہت سفر کیا، اور اکثر رؤسا نے اس کی قدر بھی کی لیکن وہ کبھی مطمئن نہ ہوا، راجہ بھوگی لال اس کا ایک مشہور سرپرست تھا چونکہ اس نے سیاحت بہت کی تھی اس لئے وہ ہندوستان کے مختلف طبقوں کے حالات سے پورا وقوف رکھتا تھا، اور ان کے بیان کرنے میں اس کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ۷۲ کتابیں لکھیں جن میں سے اب صرف تیس باقی ہیں۔ اس کی بہت مشہور کتابیں حیات بلاس اور پریم چندرکا ہیں۔ انداز بیان اور زبان کے لحاظ سے اس کا شمار ہندی کے مخصوص طبقۂ شعراء میں کیا جاتا ہے۔

شاہجہاں کے بعد

باوجود اس کے کہ اورنگ زیب کو متعصب کہا جاتا ہے لیکن بہت سے ہندی زبان کے شعراء اس کے دربار سے متعلق تھے اور ہندی شاعری کی سرپرستی قائم تھی جو اس کے پہلے بادشاہ کے عہد میں بھی جاری رہی ہم یہاں ایک فہرست پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شاہجہاں کے بعد ڈیڑھ صدی کے اندر کتنے مشہور شاعر پیدا ہوئے۔

(۱) چنتامنی مصر، آگرہ کا باشندہ اور بہاری لال کا بھتیجہ یا بھانجہ تھا۔ سنہ ۱۶۱۰ء اس کا سنہ پیدائش ہے جے پور کا راجہ رام سنگھ اس کا سرپرست تھا۔ اس نے سنہ ۱۶۷۰ء میں ایک کتاب رس راج لکھی جو بہت مشہور ہے۔

(۲) رام جی، سنہ ۱۶۴۶ء میں پیدا ہوا، اس نے متعدد تصانیف لکھیں، جن میں نائکہ بھید خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

(۳) منڈن، سنہ ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوا۔ یہ بندیلکھنڈ میں پیدا ہوا اور متعدد تصانیف چھوڑ گیا۔

(۴) سکھ دیو مصر۔ یہ کمپلا کا رہنے والا تھا اور متعدد درباروں سے وابستہ رہا۔ راجہ گور نے اسے کوی راج کا خطاب دیا۔ اس نے فن عروض وغیرہ پر متعدد تصانیف لکھیں سنہ ۱۶۸۰ء اس کا زمانۂ ترقی رہا۔

(۵) نواج ذات کا برہمن اور چھتر سال راجہ پنا کے دربار سے متعلق تھا۔ شکنتلا ناٹک اس کی مشہور کتاب ہے سنہ ۱۷۰۰ء میں اس نے ترقی حاصل کی۔

(۶) کالی داس ترویدی۔ نواج کا ہمعصر اور بنا پورہ کا رہنے والا تھا۔ عرصہ تک دربار اورنگ زیب سے وابستہ رہا۔ پھر راجہ جمبو نے اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ بڑا خوش گو شاعر تھا، اس کی تصنیف کالی داس ہزارہ، جس میں دو سو شعراء کے ایک ہزار منتخب اشعار درج ہیں، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

(۷) عالم (سنہ ۱۷۰۳ء) ایک برہمن تھا جو ایک سلمان رنگریزن پر جو خود بھی شاعرہ تھی عاشق ہو کر مسلمان ہو گیا

اور اس سے شادی کرلی۔ شاہزادہ معظم شاہ کا ملازم تھا اس کا کلام نہایت دلکش ہے۔

(۸) سُری پت (۱۷۲۰ء) فن شاعری کے لحاظ سے اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی بہت مشہور کتاب کاویہ سروج ہے۔

(۹) سورتی مصر (۱۷۲۹ء) آگرہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے بہاری لال کی ست سئی اور کیشوداس کی رسک پریا کی شرح لکھی اور خود بھی متعدد تصانیف لکھیں جن میں نک سکھ بھی شامل ہے۔

(۱۰) گنجن (۱۷۲۹ء) بنارس کا برہمن اور قمر الدین خاں وزیر محمد خاں کا ملازم تھا، قمر الدین خاں اسے اکثر انعامات سے سرفراز کرتا تھا۔ اس نے اس کی فرمائش سے ایک کتاب فنِ شعر پر لکھی اور اپنے سرپرست کی بہت تعریف کی۔

(۱۱) گردت سنگھ (۱۷۳۴ء) امیٹھی کا راجہ تھا اور بھوپت اس کا تخلص تھا، اس نے بہاری لال کی تتبع میں خود بخود ایک ست سئی لکھی ہے۔

(۱۲) توش ندھ (۱۷۳۴ء) سنگرور ضلع الہ آباد کا رہنے والا تھا اس کی تصانیف میں سدھاندھ اور نک سکھ زیادہ مشہور ہیں۔

(۱۳) دلپت رائے اور بنسی دھر (۱۷۳۵ء) یہ دونوں احمد آباد کے رہنے والے تھے، انھوں نے باہم مل کر ایک کتاب النکار رتناکر تصنیف کی اور اودے پور کے راجہ جگت سنگھ کے نام منسوب کی۔ اس کو راجہ جسونت سنگھ کی مشہور تصنیف بھاشا بھوشن کی شرح سمجھنا چاہیئے۔

(۱۴) سومناتھ (۱۷۳۷ء) یہ برہمن زادہ تھا اور راجہ بھرت پور کا ایک لڑکا اس کا سرپرست تھا۔ اسکی متعدد تصانیف میں پیوش ندھ فن شاعری کی نہایت عمدہ کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

(۱۵) رس لین (۱۷۴۰ء) اس کا نام سید غلام نبی اور بلگرام اس کا وطن تھا۔ اس کے متعدد تصانیف ہیں جن میں رنگ درپن خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

(۱۶) اودے ناتھ ترویدی (۱۷۴۰ء) یہ کالی داس ترویدی کا بیٹا اور بن پورہ کا رہنے والا تھا۔ یہ راجہ امیٹھی کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ فنِ شاعری پر یہ اک اچھی تصنیف کا مالک ہے۔ اس کا بیٹا دولہ ترویدی بھی اسی موضوع کا شاعر تھا۔

(۱۷) بیری سال (۱۷۶۶ء) نے علم بدائع و معانی پر ایک کتاب بھاشا برن لکھی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت عمدہ تصنیف خیال کی جاتی ہے۔

(۱۸) کشور (۱۷۶۰ء) یہ بھی اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا، اس کا منتشر کلام اب ایک جگہ جمع ہو کر

کشور سنگرہ کے نام سے مشہور ہے۔

(۱۹) دیو دت (سنہ ۱۶۷۰ء) اس کی تصنیف للت لتا بہت مشہور ہے جو متی رام کے للت للام سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔

(۲۰) چندن رائے (سنہ ۱۶۷۳ء) راجہ گور کے دربار کا شاعر تھا۔ اس نے فنِ شعر پر متعدد کتابیں لکھیں۔ اس کے بارہ شاگرد تھے جو بعد کو سب کے سب مشہور شاعر ہوئے۔

(۲۱) رتن کوی (سنہ ۱۶۴۱ء) میں پیدا ہوا۔ فن شاعری پر اسکی تصانیف فتح شاہ پرکاش اور فتح بھوشن بہت مشہور ہیں۔ فتح شاہ بندیلہ اس کا سرپرست تھا۔

(۲۲) منی رام مصر (سنہ ۱۶۷۲ء) اس نے اپنی تصنیف چھند چھپنی میں نہایت مختصر طریقہ پر فنِ شاعری سے بحث کی ہے۔

(۲۳) بودھا فیروز آبادی (سنہ ۱۶۷۳-۱۸۰۳ء) اس کا تعلق دربار پنا سے تھا اور عاشقانہ شاعری میں مخصوص رنگ کا مالک تھا۔ اس کا عشق نامہ بہت مشہور کتاب ہے اس کا موضوع سخن ایک بازاری عورت تھی جس کا نام سبحان تھا۔

(۲۴) جن گوپال (سنہ ۱۶۷۶ء) اس کی کتاب سمر سار مشہور ہے۔

(۲۵) دیوکی نندن (سنہ ۱۶۸۴-۱۸۰۰ء) نائک نایکہ بھید میں اس کی کتاب سرنگار چرتر بہت مقبول ہوئی۔

(۲۶) تھان رام (سنہ ۱۶۹۱ء) یہ بھاٹ تھا اور دلیل پرکاس اس کی معروف کتاب ہے۔

(۲۷) بینی (سنہ ۱۶۹۲-۱۸۱۱ء) اس نے بھی فنِ شعر پر متعدد کتابیں لکھیں۔ لیکن اس کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہے جس کا تعلق طنزیات سے ہے۔

(۲۸) بھون (سنہ ۱۶۹۴ء) یہ بھی بھاٹ تھا اور فنِ شعر سے اچھی طرح واقف تھا۔

(۲۹) بھکاری داس (سنہ ۱۷۳۴-۱۷۵۰ء) پرتاب گڈھ (بندیلکھنڈ) کا ایک کایستھ تھا۔ یہ زیادہ تر صرف داس کے نام سے معروف ہے۔ راجہ پرتھوی پت کا بھائی ہندوپت اس کا مربی تھا۔ اس نے علاوہ اور تصانیف کے وشنو پران کا ترجمہ بھی ہندی زبان میں کیا ہے۔

(۳۰) گمان مصر (سنہ ۱۷۴۴ء) اکبر علی خاں کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے سری ہرش کی کتاب نیشدھ کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا اور علاوہ اس کے اور کتابیں بھی فن کے متعلق لکھیں۔

(۳۱) رگھوناتھ (سنہ ۱۷۴۵ء) بنارس کا رہنے والا تھا۔ اس کے بیٹے گوکل ناتھ نے بعد کو مہابھارت کا ترجمہ ہندی میں کر کے کافی شہرت حاصل کی۔

رگھوناتھ نے بہاری لال کی ست سئی کی شرح لکھی جس کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

(۳۲) کمار منی بھٹ (۱۷۴۶ء) بڑا اچھا شاعر تھا۔ اس کی تصنیف رسک رسال فن شعر پر کافی شہرت رکھتی ہے۔

(۳۳) سمبھوناتھ مصر (۱۷۴۹ء) راجہ آسوتھر (ضلع فتحپور) بھگونت رائے کے دربار کا شاعر تھا اور خوب کہتا تھا۔

(۳۴) سیوا آرسلا (۱۷۵۰ء) نے بھی فن عروض پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ یہ سمبھوناتھ مصر کا شاگرد تھا۔

(۳۵) جگت سنگھ (۱۸۰۰ء) یہ سیوا آرسلا کا شاگرد اور راجہ گونڈا و بھنگا کے خاندان سے تھا، اس نے بھی فن عروض پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔

(۳۶) ٹھاکر (۱۸۰۰ء) ٹھاکر ستک اور ست سئی (بہاری لال) کی شرح اس کی مشہور تصانیف ہیں۔

(۳۷) ہری چرن داس (۱۸۰۰ء) کرشن گڈھ (مارواڑ) کا برہمن تھا۔ اس نے کوی پریا، رسک پریا (مصنفہ کیسوداس) اور ست سئی (مصنفہ بہاری لال) کی شرحیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

تلسی داس اور رام پرست طبقہ

ہندی شاعری کی دنیا میں جس قدر شہرت تلسی داس کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی، پھر یہی نہیں کہ صرف ہندوستان ہی تک ان کی شہرت محدود رہی ہو بلکہ تمام عالم نے ایسے مرتبۂ شاعری کو عزت کی نگاہ سے دیکھا اور جب تک رامائن کا نام لینے والا بھی کوئی روئے زمین پر زندہ ہے اُس وقت تک تلسی داس کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ان کے حالات زندگی و سوانح قابل وثوق ذرائع سے بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۵۳۲ء میں پیدا ہوئے آپ کے باپ کا نام آتما رام اور ماں کا نام ہلسی تھا، پہلے اُن کا نام رام بولا تھا لیکن درویشی اختیار کرنے کے بعد تلسی داس رکھ لیا۔ ان کی جائے پیدائش کے متعلق بھی اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ وہ ہستنا پور میں پیدا ہوئے بعض ان کا مولد راجی پور کو بتاتے ہیں جو چترکوٹ کے قریب ہے لیکن عام طور سے یہی خیال ہے (اور غالباً صحیح ہے) کہ ان کی جائے ولادت راجپور تھی جو ضلع باندہ کا ایک گاؤں ہے۔ یہ قنوجی برہمن تھے اور ان کا گرو نرہری داس تھا جس کا سلسلۂ طریقت چھ واسطوں سے رامانند تک پہونچتا تھا۔

رامائن کے دیباچہ میں تلسی داس نے لکھا ہے کہ سوکر کھیت یا سوروں میں ان کی تعلیم ہوئی، وہ ابھی نوجوان ہی تھے کہ اُن کی شادی ہو گئی اور اپنی بیوی سے انھیں سخت محبت ہو گئی۔ ایک دن اُن کی بیوی اپنے میکہ گئی تو یہ بہت بیقرار ہو گئے اور رات ہی کو تاریکی میں بھرا ہوا دریا عبور کر کے اس کے گھر تک پہنچ گئے۔ اس کی بیوی نے

جب ان کو دیکھا تو بولی کہ اگر تمہیں رام سے اتنی ہی محبت ہوتی جتنی مجھ سے ہے تو زمین سونا ہو جاتی۔

اس فقرہ کا تلسی داس پر بہت اثر ہوا اور صبح ہوتے ہی بنارس چلے گئے۔ ہر چند یہاں انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ صرف کیا لیکن کبھی کبھی سوروں، ایودھیا، چترکوٹ، الہ آباد، اور بندرابن بھی گئے، ان کی زندگی کے متعلق بہت سے عجیب و غریب افسانے مشہور ہیں لیکن پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔

نابھا داس (بھگت مالا کا مصنف) ان کا دوست تھا اور کبھی کبھی یہ اس سے ملنے بھی گئے۔ ہر چند تلسی داس کا تعلق دربار شاہی سے نہیں ہوا، لیکن راجہ مان سنگھ اور خانخانان انہیں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ۱۶۲۴ء میں بمقام بنارس ان کا انتقال ہو گیا۔

تلسی داس کے افکار دماغ کا بہترین نتیجہ راماین ہے جس کی تصنیف انھوں نے ۱۵۷۰ء میں شروع کی تھی۔ ہر چند نفس راماین کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ والمیکی سنسکرت کا مشہور شاعر ۳۰۰ سال قبل مسیح رامچندر جی کے اس افسانہ کو منظوم کر چکا تھا، لیکن تلسی داس و راماین حقیقتاً ایک دوسری چیز تھی، قصہ کا خاکہ تو وہی ہے مگر پھر بھی دونوں میں بہت فرق نظر آتا ہے۔

تلسی داس اور والمیکی کی راماین میں بہت بڑا فرق ایک تو یہ ہے کہ والمیکی نے رام چندر جی کو صرف ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے، پہلے اور چھٹے حصہ میں ایک جگہ رام کو وشنو کا اوتار ظاہر کیا ہے، لیکن تحقیق سے ثابت ہے کہ سوائے ایک جگہ کے یہ بعد کا اضافہ ہے اور والمیکی کا خیال نہیں ہے، برخلاف اس کے تلسی داس نے رام کو ہر جگہ خدا کا اوتار ظاہر کیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تلسی داس نے یہ خیال ادھیاتما راماین سے وام لیا تھا، جو سنسکرت زبان میں غالباً چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں کسی غیر معلوم شاعر نے لکھی تھی، علاوہ اس خیال کے اور بھی بعض باتیں ان دونوں میں مشترک نظر آتی ہیں، لیکن اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شاعرانہ حیثیت سے تلسی داس کی راماین بہت بلند ہے۔

تلسی داس حقیقتاً اسی تحریک کے حامی تھے، جس نے رام کی پرستش کو شمالی ہندوستان میں عام کر دیا تھا، اور وہ سمجھتے تھے کہ سنسکرت داں پنڈت ضرور معترض ہونگے چنانچہ وہ راماین کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہر چند میں معمولی آدمی ہوں لیکن میرا مقصد غیر معمولی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھے لوگ میری اس تصنیف سے خوش ہوں گے اور بے وقوف ہنسیں گے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں کیونکہ نادان لوگ نہ شاعری کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ رام کے مرتبہ کو۔"

اس میں کلام نہیں کہ تلسی داس کا انداز بیان نہایت پاکیزہ، بلند اور اخلاق آموز ہے، زبان جو راماین میں استعمال کی گئی ہے۔ بیسواڑی یا اودھی کی ہے جو اس وقت دوآبہ اور مشرقی میں عام طور سے رائج تھی۔ کہیں

کہیں برج بھاشا کے الفاظ بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

تلسی داس نے ضرورت شعری کے لئے الفاظ کا تلفظ بدلدینے سے بھی احتراز نہیں کیا اور ہندی کے دیگر شعراء کی طرح انھوں نے بھی دور از کار تشبیہات اور مفروضات عوام سے کام لیا ہے۔ مثلاً سانپ کا من، یا ہنس کا دودھ اور پانی کو علیحدہ کردینا۔ لیکن اسی کے ساتھ جہاں کہیں وہ مناظر فطرت کا بیان شروع کر دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ غائر نگاہ مشکل ہی سے کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

قصہ سات حصوں یا کھنڈوں میں منقسم ہے اور دوسرا حصہ جس میں اجودھیا کے مناظر کا بیان ہے بہترین خیال کیا جاتا ہے، دسرتھ کا ملال، رام کا بلند شریفانہ کیرکٹر، سیتا کی محبت، لکشمن کا جوش، بھارت کا ایثار ان سب کا بیان تلسی داس نے اس قدر خوبی سے کیا ہے کہ بے اختیار شاعر کے زور قلم کی داد دینی پڑتی ہے۔

تلسی داس کا مقصود اس نظم سے صرف اپنی شاعری کی نمائش یا ایک عجیب و غریب قصہ کا اظہار نہ تھا بلکہ مدعا یہ تھا کہ لوگوں میں رام کی پرستش رواج پائے، ہر چند تلسی داس ویدانت کی تعلیم وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ رام کو مجسم خدا بھی مانتے تھے، اور ان کی ساری نظم کا مدعا اسی خیال کی تبلیغ تھی، اس لئے مذہبی نقطۂ نظر سے راماین خواہ کیسی ہی ہو لیکن شاعرانہ حیثیت سے یقیناً اس کا مرتبہ دنیا کی بہترین تصانیف میں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ راماین میں لٹریچر کی غلطیاں ہیں۔ بعض بعض مقامات پر عروض کے لحاظ سے زیادہ بلند ہے، لیکن پھر بھی راماین، تلسی داس کی وہ تصنیف ہے جو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور دنیا اس کی قدر کرنے پر مجبور ہوگی۔

ہر چند تلسی داس نے کسی نئے مسلک کی بنیاد نہیں ڈالی لیکن حقیقت سے انکار ہوگا اگر کہا جائے کہ راماین نے وشنوی تحریک کو شمالی ہند میں زیادہ کامیاب نہیں بنایا۔

علاوہ راماین کے تلسی داس کی اور تصانیف بھی ہیں۔ مثلاً رام گیتاولی جس میں رام کا قصہ مخصوص گانے کی بحر میں نظم کیا ہے یا دوہاولی جن میں مختلف دوہے اُن کے پائے جاتے ہیں۔ کوتاولی میں بھی انھوں نے رام کا قصہ دوسری بحر میں لکھا ہے، علاوہ ان کے ایک کتاب ست ستسئی اور اس میں بھی رام ہی کو موضوع شعر قرار دیا ہے، یہ ۱۵۸۵ء میں تصنیف کی گئی اور بھی بعض تصانیف تلسی داس سے منسوب کی جاتی ہیں لیکن یہ نسبت قابل اعتبار نہیں ہے۔

بھگت مالا تلسی داس کے وجود نے رامانندیوں اور دوسری رام پرست جماعتوں کو بہت زیادہ

مقبول بنادیا اور کثرت سے ایسا لٹریچر نظر آنے لگا جو اس اعتقاد کا معاون تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں بھگت مالا بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے اس کا مصنف نابھاداس (سنہ ۱۶۰۰ء) تھا جو نرائن داس کے نام سے مشہور ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اگرداس کا شاگرد تھا جو کرشن پرست تھا اور بعض اُسے راما نند کا شاگرد بتاتے ہیں یہ قوم کا ڈوم تھا اور جب یہ پیدا ہوا تو اس کے والدین نے قحط کی وجہ سے جنگل میں ڈال دیا۔ اتفاق سے اگرداس نے اسکو پالیا اور پرورش کی جب یہ جوان ہوا تو اپنے مربی اور استاد کے اشارہ سے اس نے بھگت مالا لکھی، یہ تصنیف (سنہ ۱۵۸۵ء) اور سنہ ۱۶۲۳ء کے درمیان عمل میں آئی۔ بھگت مالا قدیم مغربی ہندی زبان ہے۔ اس میں وشنوی اُصول سے بحث کی گئی ہے اور خصوصیت کے ساتھ پرستاران رام کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہایت دقیق ہے اور ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں اسے خاص امتیاز حاصل ہے۔ پریاداس نے سنہ ۱۷۱۲ء میں اس کی ایک شرح لکھی جو اب اصل کتاب کا ایک جزو ہو کر رہ گئی ہے۔

ملوک داس یہ عہد اورنگ زیب میں تھا اور اس نے راما نندی طبقہ سے ملتا جلتا ایک اور گروہ اپنا پیدا کیا۔ اس گروہ نے نہ صرف رام کو خدا کا اوتار سمجھا بلکہ مورتی پوجن کو بھی اختیار کیا، راما نندیوں اور ملوک داسیوں میں یہ فرق تھا کہ وہ سنیاسی تھے اور یہ تارک دنیا نہ تھے، ملوک داس کڑہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوا، عمر بھر تجارت کی اور جگناتھ میں مرگیا۔

ملوک داس اور اس کے مقلدین کے مندر کڑہ اور دیگر مقامات میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی خاص خاص تصانیف دس رتن اور بھگت وتسل ہیں۔ اس کے دوہے اور بھی مختلف طور سے بہت مشہور ہیں۔

رام پرستی کے متعلق اور لٹریچر تلسی داس کا ایک شاگرد بینی مادھوداس تھا (سنہ ۱۶۰۰ء) اسنے تلسی داس کے حالات یکجا کرکے اس کا نام گوسائیں چرتر رکھا۔ اسکی دوسری تصنیف نک سکھ بھی مشہور ہے۔ ایک اور شخص مان داس برج کا رہنے والا تھا۔ اس نے والمیکی کی رامائن اور ہنومان ناٹک کی مدد سے ایک ہندی نظم رام چرتر تصنیف کی۔

ایشری پرشاد نے سنہ ۱۶۷۳ء میں والمیکی کی نظم کا ترجمہ کیا اور اس کا نام رام بلاس رامائن رکھا۔

ایک شخص بالی الی نے سنہ ۱۶۹۲ء میں رام اور سیتا کی تعریف میں نیہہ پرکاش اور سیتا رام دھیان منجری دو کتابیں تصنیف کیں۔

جانک رسکی سرن (سنہ ۱۷۰۳ء) نے رام کی تعریف میں اودھ ساگر مرتب کی اور بھگونت رائے، اسوتھر (ضلع فتحپور) کے راجہ نے ایک رامائن خود تصنیف کی۔

سنہ ۱۷۵۰ء میں شمبھوناتھ نے رام بلاس تصنیف کی، اسی زمانہ میں ایک شخص تلسی صاحب (سنہ ۱۷۶۳ء-۱۸۴۳ء)

نے جو راجہ پرنا کا بڑا بیٹا تھا لیکن تخت سے دستبردار ہو چکا تھا، گھٹ راماین تصنیف کی۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ وہ پہلے جنم میں تلسی داس تھا۔

مادھو سودن داس (سنہ ۱۷۸۲ء) بھی اس عہد کا مشہور شاعر تھا اور اس کا رنگ کلام بہت کچھ تلسی داس سے ملتا ہے۔

منیار سنگھ (سنہ ۱۷۸۵) جسے یار بھی کہتے ہیں ایک اور مشہور شاعر تھا، یہ بنارس کا باشندہ اور رام کے پرستاروں میں سے تھا۔ اس کی سندر یہ دھری، سندر کانڈ اور ہنومان چھبیسی مشہور کتابیں ہیں جن میں رام اور ہنومان کا حال بیان کیا گیا ہے۔

گنیش (سنہ ۱۸۰۰) راجہ بنارس کے دربار کا شاعر تھا، اس نے بھی بہت سی تصانیف کیں اور والمیکی کی راماین کا بھی ترجمہ کیا۔

جانشینانِ کبیر

کبیر پنتھی

تعلیماتِ کبیر کی وسعتِ اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد بہت سے طبقے ہندوستان میں ایسے رونما ہوئے جو مسلکِ کبیر ہی کے متبع تھے، کبیر پنتھ جس کا تعلق براہِ راست کبیر سے ہے دو حصوں میں منقسم ہے ایک کا مرکز کبیر چورا (بنارس میں) ہے اور دوسرے کا چھتیس گڑھ (صوبہ متوسط میں) ہے۔ بنارس میں جو اس طبقہ کے مہنت رہتے ہیں ان کا مورثِ اعلیٰ سورت گوپال تھا، اور چھتیس گڑھ کے مہنتوں کا دھرم داس۔ کہا جاتا ہے کہ سورت گوپال اور دھرم داس کبیر کے دیکھنے والے اور اس کے شاگرد تھے، لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً کبیر کے بعد یہ پیدا ہوئے اور پھر کبیر کا مسلک اختیار کیا۔ اگرچہ کبیر پنتھ اصولاً بت پرستی کا مخالف ہے لیکن بعد کو بت پرست ہندوؤں کے اثر سے اسمیں بہت سے حشو و زوائد پیدا ہو گئے ہیں۔ کبیر خدا کے حلول کرنے کا مخالف تھا اور اس کا اعتقاد یہ نہ تھا کہ کوئی انسان خدا کا اوتار ہو سکتا ہے، لیکن اب کبیر پنتھ کے بعض لوگ خود کبیر کو خدا کا اوتار سمجھنے لگے ہیں، تسبیح و مالا بھی کبیر کا شعار نہ تھا لیکن اب اس کا بھی رواج ہو گیا ہے۔

سوائے اس کلام کے جس کا مصنف خود کبیر تھا، اور لٹریچر جس کا تعلق اس کے متبعین سے ہے کوئی اور شخص نہیں دیکھ سکتا۔

بیجک جس کا ذکر پہلے آچکا ہے کبیر کے تقریباً ۵۰ سال بعد مرتب ہوئی۔ علاوہ بیجک کے دو کتابیں اور اس طبقہ کی ہیں۔ ایک کا نام سکھ ندہان ہے؟ غالباً اٹھارویں صدی کے وسط میں مرتب ہوئی اور دوسری امر مول ہے، جو ۱۸۰۰ء کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، ایک اور شخص پلٹو صاحب بھی اِس طبقہ کا ۱۸۰۰ء میں ہوا ہے جس نے بعض موثر نظمیں کنڈلیہ بحر میں تصنیف کی ہیں۔

سکھ

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سکھ مذہب کا بانی نانک تعلیمات کبیر سے بہت متاثر ہوا تھا، نانک کے بعد سکھ مذہب میں نو گرو اور ہوئے ہیں جو سب کے سب شاعر تھے، سکھوں کی مذہبی کتاب کو گرنتھ صاحب کہتے ہیں اس کو چھٹے گرو ارجن نے (جس کا زمانہ ۱۵۶۳ء سے ۱۶۰۶ء تک ہوا ہے) ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا تھا۔ اس میں گرو نانک، گرو امر داس، گرو رام داس، گرو ارجن اور گرو نانک (نواں گرو) کا کلام پایا جاتا ہے، دسویں گرو گوبند سنگھ کا بھی ایک آدھ دوہا اس میں موجود ہے، گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند سنگھ کے کلام کا اس میں بعد کو اضافہ کیا گیا ہے۔ گرنتھ میں اس کے کلام کے علاوہ اور کلام بھی گرؤں کی تعریف میں دوسرے لوگوں کے شامل ہیں اور بعض بھجنیں کبیر، کام دیو اور دوسرے بھگت لوگوں کی بھی اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں۔ مصنفین کے لحاظ سے نہیں بلکہ راگوں اور راگنیوں کے لحاظ سے کلام کی ترتیب کی گئی ہے سوائے آخری گرو کے تمام گرؤں نے اپنا لقب نانک رکھا ہے۔ اس گرنتھ میں سب سے پہلے گرو نانک کی جپجی ہے اور پھر سودرد، سو پرکھو، سوہلا، دعائیہ نظمیں ہیں۔ راگوں کے بعد کتاب کے آخر میں بھوگ ہے جسمیں اشلوک ہیں۔ اس کی زبان قدیم ہندی ہے اور کہیں کہیں پنجابی بھی شامل ہے۔ سکھ ہندوستان کی محارب قوم ہے اور یہ روح اُن میں دسویں گرو گوبند سنگھ کے زمانہ سے پیدا ہوئی۔ اس کا عہد مابین ۱۶۰۵ء اور ۱۷۰۸ء ہوا ہے، اسی نے اپنی قوم میں ایک فوجی نظام پیدا کر کے اس کا نام خالصہ رکھا، اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے طیار کیا۔ اس کے عہد میں بہت سے ہندو خیالات سکھ مذہب میں رائج ہو گئے۔

گرو گوبند سنگھ نے متعدد نظمیں لکھیں جن میں سے اکثر برج بھاشا میں ہیں اور کمتر فارسی و پنجابی میں ۱۷۳۴ء میں اس کے کلام کا مجموعہ ایک شخص بھائی منی سنگھ نے مرتب کیا جسے "دسویں گرو گرنتھ" کہتے ہیں اس سے صرف جذباتِ شجاعت پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے اور ادی گرنتھ سے اس کا درجہ کمتر ہے، اس گرنتھ میں علاوہ جپجی اور رحمد کی بھجنوں کے وچتر نانک بھی شامل ہے جس میں گوبند سنگھ کی سوانح زندگی بیان کئے گئے ہیں۔

دادو پنتھ

اس طبقہ کا مورثِ اعلےٰ ایک شخص دادو تھا (۱۵۴۴ء - ۱۶۰۳ء) یہ احمد آباد میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ راجپوتانہ میں صرف کیا، عام طور سے یہی مشہور ہے کہ وہ قوم کا نداف تھا، لیکن اس کے معتقدین کا بیان ہے کہ وہ برہمن تھا، دادو اس قدر فیاض اور رحیم الطبع تھا کہ لوگ

اسے دادو دیال کہنے لگے، اس کی تعلیمات کبیر سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اسلامی خیالات اس قدر نہیں ہیں دادو تعلیم ویدانت، بت پرستی، اور تفریق قومی کے خلاف تھا، لیکن اب اس کے متبعین میں ویدانت کا رواج ہے اور خود پنتھ کے بانی کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کی تعلیمات کو اس کے چیلوں نے بہت پھیلایا جن کی تعداد ۵۲ تھی، اس کے معتقدات بانی میں درج ہیں جو پانچہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ۲۷ باب ہیں اور ہر باب میں ایک جداگانہ بحث ہے، نفس، سچائی، دعا، ایمان، نیکی، فراق وغیرہ مختلف عنوانا پر ہر باب میں دوہے درج کئے گئے ہیں۔

دادو کا کلام بہت دلکش ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی موسیقی پائی جاتی ہے، اس کے دو بیٹے بھی شاعر تھے اور اس کے چیلے بھی قریب قریب سب خوش گو اور خوش فکر لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دادو پنتھ کا لٹریچر ہندی میں کثیر اور اچھا ہے، اس کے شاگردوں میں بہترین شاعر سندر داس تھا۔ جسے بوسر بھی کہتے ہیں۔ اس کا زمانہ ترقی مابین ۱۶۲۰ء و ۱۶۵۰ء ہوا ہے، دادو پنتھی لوگ اس کو بہترین شاعر ہندی لٹریچر کا خیال کرتے ہیں۔ یہ بڑا پُر گو تھا۔ اس کی بہترین تصانیف سندر باس اور گیان سمندر ہیں۔ اس طبقہ میں جس نے سب سے پہلے ویدانتی خیالات پیدا کئے، وہ اس جماعت کا ایک شاعر نچل داس تھا۔

لال داسی

ایک شخص لال داس نے (جس کا انتقال ۱۶۰۴ء میں ہوا) لال داسی طبقہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ الور کا رہنے والا اور میو قوم کا تھا، دوسرے مذہبی معلمین کی طرح جن کے اصول تعلیم معتقدات کبیر کے زیر اثر قائم ہوئے، لال داس نے بھی رام کا نام لینے پر زیادہ زور دیا۔ اس کی تعلیمات اور بھجنیں ایک کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں جسے بانی کہتے ہیں۔

سادھ

بیر بھان نے اس طبقہ کی بنیاد ۱۶۵۸ء میں قائم کی۔ خصوصیت کے ساتھ یہ دوآبہ کے بالائی حصہ میں زیادہ مقبول ہوا۔ بیر بھان مدعی تھا کہ ایک غیر انسانی قوت شبد اور ساکھی کی صورت میں اس کے اصول الہام کرتی ہے۔ اس کا مجموعہ آدی اپدیسا کہلاتا ہے۔

دھرنی داسی

دھرنی داس بمقام مانجی ضلع چھپرہ ۱۶۵۶ء میں پیدا ہوا۔ یہ قوم کا کائستھ تھا، اس نے بھی ایک مسلک قائم کیا جو اب تک موجود ہے، اس کی دو کتابیں ہندی میں ستیا پرکاش اور پریم پرکاش بہت مشہور ہیں۔

بعض صوفی شعراء

ہندوؤں کے علاوہ بعض مسلمان بھی ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے ہندی میں تصوفانہ شاعری کی۔ مثلاً یاری صاحب (۱۶۶۸-۱۷۲۳ء) یہ ایک صوفی منش شخص تھا اور دہلی میں رہا کرتا تھا۔ اس کے بعض شاگرد بھی ہندی میں شعر کہتے تھے۔ جن میں کیسو داس اور بُلّا داس خاص طور سے

قابل ذکر ہیں ان کا زمانۂ شہرت سنہ ۱۷۳۰ء تھا، بُلّا داس کا ایک شاگرد گلال صاحب تھا اور اس کا بھیکا صاحب۔ گلال اور بھیکا نے اٹھارویں صدی کے آخر میں کافی شہرت حاصل کی اور ان کا ہندی کلام خوب ہے۔

ان کے علاوہ دو شاعر اور بھی اسی خیال کے مقلد تھے۔ دونوں کا نام دریا صاحب تھا لیکن ایک بہار کا رہنے والا تھا اور دوسرا مارواڑ کا۔ یہ بھی دونوں مسلمان تھے، ان کا زمانۂ ترقی بھی آخر اٹھارویں صدی سمجھنا چاہیئے۔ ابتدائی اٹھارویں صدی میں بھی ایک اور مسلمان صوفی عقائد کا یکلے صاحب تھا۔ اس کا ہندی کلام بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔

چرن داسی

چرن داس (سنہ ۱۷۰۳-۱۷۸۲ء) قوم کا بنیا تھا اس نے سنہ ۱۷۳۰ء میں دہلی کے اندر اپنا ایک طبقہ الگ قائم کیا جو اب بھی پایا جاتا ہے اس کے بہت سے شاگرد تھے جو اس کی تعلیمات کی اشاعت کرتے تھے اس نے عورتوں کو بھی اپنا چیلا بنایا۔ اس کی تعلیمات بہت کچھ کبیر کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ اس نے بھی بھگتی اور خدا کا نام جپنے کی تاکید کی ہے۔ اس نے بھی بُت پرستی کو ممنوع قرار دیا تھا لیکن بعد کو اس کے طبقہ میں بھی وہ عود کر آئی، اس طبقہ کے لوگ اپنے گرو کی بہت عزت کرتے ہیں۔

دوسرے طبقوں کی طرح اس کا لٹریچر بھی ہندی میں بہت ہے۔ بھگوت پران اور بھگوت گیتا کا ترجمہ ہندی میں اس جماعت کے پاس موجود ہے جس کا ایک حصہ غالباً خود چرن داس کا کیا ہوا ہے۔

چرن داس کا ہندی کلام اس کے طبقہ میں بہت مقبول ہے اس کے مریدوں میں دو عورتیں شاعرہ بھی تھیں ان کا نام ساہوجی بائی اور دیا بائی تھا، یہ چرن داس کی ہم قوم تھیں۔ ان عورتوں کا کلام بے انتہا موثر ہے۔ دیا بائی کے کلام کا مجموعہ سنہ ۱۷۵۱ء میں مرتب ہوا تھا جس کا نام دیا بودھ ہے۔

شیونرائن

شیونرائن قوم کا راجپوت اور غازی پور کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا سنہ ۱۷۳۴ء میں اس نے اپنا مسلک الگ قائم کیا جو بالکل موحدانہ انداز کا تھا، بُت پرستی کی اس نے بھی سخت مخالفت کی۔ اس کے مقلدین خیال کرتے ہیں کہ شیونرائن اپنے زمانہ کا اوتار تھا غیر ہندو لوگ بھی اس جماعت کے ممبر ہو سکتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ (سنہ ۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) اس جماعت کا ممبر تھا، شیونرائن بڑا لکھنے والا تھا، اس نے سولہ کتابیں ہندی نظم میں لکھیں۔

غریب داسی

کہا جاتا ہے کہ غریب داس (سنہ ۱۷۱۷-۱۷۸۲ء) کا گرو کبیر داس تھا، ہرچند یہ غلط ہے کیونکہ دونوں کے زمانہ میں بہت فرق تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ کبیر پنتھ کی ایک شاخ تھا، اس کے مقلدین اب بھی پائے جاتے ہیں اور قریب قریب سب سادھو ہیں۔ غریب داس کا مجموعۂ نظم گرو گرنتھ صاحب کے نام سے مشہور ہے اور اس میں ۲۴۰۰۰ ساکھیاں اور چوپائیاں ہیں۔ ان میں سے

... ، ساکھیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کبیر کی ہیں۔ غریب داس موضع جھورانی (ضلع رہتک) کا رہنے والا تھا۔

رام سینہی

اس کا مورث اعلے رام چرن تھا، یہ ۱۷۱۸ء میں پیدا ہوا اور راجپوتانہ میں زندگی بسر کردی۔ یہ پہلے بُت پرست تھا لیکن بعد کو بُت پرستی ترک کرکے رام سینہی (یعنے عاشقانِ رام) گروہ کی بنیاد قائم کی۔ اس جماعت کی یادگار اب صرف سادھوؤں کا ایک طبقہ رہ گیا ہے۔ رام چرن کا مجموعۂ نظم (بانی) بھی مرتب ہے، اس طبقہ کا تیسرا رہنما دولھا رام تھا جو ۱۷۷۶ء میں رام سینہی ہوا۔ اس نے دس ہزار شبد اور چار ہزار ساکھیاں تصنیف کیں ۱۸۲۴ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

ست نامی طبقہ اور جگ جیون داس

ست نامی طبقہ کی بنیاد سترھویں صدی کے وسط ہی میں قائم ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے حالات نامعلوم ہیں ۱۷۵۰ء میں پھر جگ جیون داس نے اس طبقہ کو زندہ کیا، یہ شخص لکھنؤ اور اجودھیا کے درمیان ایک موضع کوٹوا کا رہنے والا تھا، یہ طبقہ اپنے معتقدات کے لحاظ سے تو بالکل موحد ہے لیکن اوتاروں کا بھی قائل ہے۔ یہ قوم کا چھتری تھا، اس کی تصانیف میں پرتھم گرنتھ، مہا پرلے اور گیان پرکاش بہت مشہور ہیں۔ یہ سب ہندی نظم میں ہیں۔

اس کا ایک شاگرد دولن داس ضلع رائے بریلی کا رہنے والا اور اچھا شاعر تھا، جگ جیون کے جانشینوں میں دو شخص جلال داس اور دیوی داس اور بھی ہوئے ہیں جو اچھے شاعر تھے۔

۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان صوبۂ متوسط میں ایک شخص غازی داس پیدا ہوا اور اس نے اس جوار میں ست نامی جماعت کو چھتیس گڑھ میں پھر ترقی دی۔

پران ناتھی

پران ناتھ اٹھارھویں صدی کی ابتداء میں بمقام پنا (بندیلکھنڈ) پیدا ہوا اور راجہ چھترسال اس کا سرپرست تھا اس نے بھی ایک مسلک قائم کیا جس میں ہندو عقائد کے علاوہ اسلامی اور عیسوی عقائد سے بھی بعض باتیں مستعار لی گئیں۔ پران ناتھ چھتری تھا، اور ہندو مسلمان دونوں کے معتقدات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے کوشش کی کہ یہ دونوں مذہب مل کر ایک ہوجائیں۔ اس طبقہ کا دوسرا نام دھامی بھی ہے (دھام خدا کا ایک نام ہے) پران ناتھ کی ۱۴ تصانیف ہیں جو سب کی سب نظم میں ہیں۔ ہرچند قواعد کے لحاظ سے وہ سب ہندی زبان کی شمار کی جاتی ہیں، لیکن عربی اور فارسی الفاظ اس میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

عام تبصرہ

اس باب میں جن جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کے سب شانت رس کے لکھنے والے تھے ان کی نظمیں صاف سلجھی ہوئی ہیں اور فنِ شاعری کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اس قدر زائد

نہیں اس عہد کی تمام تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصود صرف مذہبی معتقدات کی اشاعت تھی نہ کہ لٹریچر میں کوئی ترقی پیدا کرنا، اور یہی وجہ ہے کہ کبیر کے بعد جو شعراء ہوئے ہیں اگرچہ ان کا کلام کبیر کے کلام سے زیادہ صاف ہے تو اس اعتبار سے جوش و اثر، دلکشی و جاذبیت مفقود ہے۔ ان سب میں صرف ایک ہی قسم کی تعلیم نظر آتی ہے، یعنے گرو کی ضرورت عظمت، خدا کا نام بار بار لینے کی اہمیت، بھگتی کا مرتبہ، مایا کا دھوکہ، سچائی و دیانت کی عظمت وغیرہ وغیرہ۔ اور اس میں کلام نہیں کہ بعض بعض کتابوں میں کہیں کہیں نہایت حسن و اہتمام کے ساتھ ان امور کی تعلیم دی گئی ہے۔

اس زمانہ کا اقتضاء یہی تھا کیونکہ شمالی ہندوستان ایک سخت سیاسی انقلاب سے گزر رہا تھا، اورنگ زیب (سنہ ۱۶۵۸-۱۷۰۷) کا سارا زمانہ منتشر قوتوں کے یکجا کرنے میں صرف ہو گیا اور اس کے بعد سیاسی بدنظمی بہت زیادہ پھیل گئی۔ پھر نادر شاہ کے حملہ (سنہ ۱۷۳۹) اور احمد شاہ کی تاخت (سنہ ۱۷۵۶) نے عام تباہی پھیلا دی۔ علاوہ اس کے مرہٹہ جماعتیں مغل سلطنت پر حملہ کر رہی تھیں اور ہر طرف سے بے اطمینانی، امن شکنی اور اضطراب پیدا تھا۔ چنانچہ امن و سکون کی تلاش کے لئے بہت سے مسالک و مذاہب پیدا ہوئے اور لوگوں نے بے قرار دلوں میں اپنی تعلیمات سے اطمینان پیدا کرنا چاہا۔

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور پھر بیان کرتے ہیں کہ کبیر کے بعد جتنے اور پنتھ یا مسلک پیدا ہوئے ان سب کا ماخذ کبیر کی تعلیم تھی اور اصول کے لحاظ سے کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو اپنے تئیں کبیر کی اصولی تعلیم سے بالکل علیحدہ ثابت کر سکے۔

کرشن پرست جماعتیں

(سنہ ۱۵۵۰-۱۸۰۰)

اشٹ چھاپ بلبھ چاریہ اور اس کا بیٹا بٹل ناتھ بلبھ چاری پر طبقہ کو مورث اعلیٰ تھے جن کا اجمالی ذکر پہلے آچکا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے چار چار چیلے تھے اور یہ آٹھوں شاعر تھے، انھیں کو اشٹ چھاپ (آٹھ مہریں) کہتے ہیں کیونکہ ان کی نظمیں مغربی ہندی زبان کا بہترین نمونہ خیال کی جاتی ہیں گویا انھوں نے زبان پر مہر لگا دی اور اس طرح ٹکسالی ہندی ان سے بہتر کسی نے نہیں لکھی۔

انھوں نے برج بھاشا زبان میں شاعری کی ہے یعنے وہ زبان جو متھرا، بندرابن اور قرب و جوار کے مقامات

میں اس وقت رائج تھی۔

اسی وقت سے تقریباً تمام وہ ہندی شاعری جس کا تعلق کرشن پرستی سے ہے برج بھاشا زبان میں کی جارہی ہے، اور ہندی شاعری کی زبان ہی برج بھاشا قرار دیدی گئی ہے؛ اگرچہ تلسی داس اور اکثر رام پرست جماعتوں نے صرف مشرقی ہندی کو اختیار کیا

بلبھ چاریہ کے چار چیلوں کے نام یہ تھے: سور داس، کرشن داس، پرمانند داس، بکھان داس، اور بٹھل ناتھ کے چیلے یہ تھے:۔ چتربھج داس، چھیت سوامی، نند داس، گوبند داس، یہی آٹھوں اشٹ چھاپ کہلاتے ہیں اور ان کا زمانہ سولھویں صدی کا وسط اور آخری حصہ سمجھنا چاہیئے۔

کرشن داس، سور داس کا رقیب تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سور داس کی شاعری سے اُسے کوئی نسبت نہ تھی۔ کرشن داس کی بہترین تصنیف پریم ستو نی روپ ہے۔ اس کے کئی شاگرد اچھے تھے، ان میں سے ایک بہت مشہور اگر داس (۱۵۷۵ء) تھا جو نابھا داس مصنف بھگت مالا کا اُستاد تھا۔

اشٹ چھاپ میں سور داس کے بعد نند داس کا درجہ ہے، یہ برہمن تھا اور بعض کا خیال ہے کہ مشہور تلسی داس جی کا بھائی تھا۔ اس کے متعلق ایک مثل مشہور ہے کہ "اور سب گھڑیا، نند داس جڑیا" یعنے سارے شاعر تو صرف گھڑنے والے ہیں لیکن نند داس الفاظ کو نگ کی طرح جڑ دیتا ہے۔

اس کا متفرق کلام بہت ہے اور تصانیف بھی متعدد ہیں جن میں پنچادھیائی (جو گیتا گوبند کے نمونہ پر لکھی گئی ہیں) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

سورداس　اشٹ چھاپ میں سب سے زیادہ مشہور سور داس تھا، اس کے حالات زندگی بہت کم ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ برہمن تھا، اس کا باپ بابا رام داس دربار اکبری کا مغنی تھا، سورداس کی عمر ۸ سال کی تھی کہ وہ متھرا گیا اور وہیں کسی سادھو کا چیلا ہوگیا، اس کے بعد وہ گوگھاٹ (مابین آگرہ و متھرا) گیا اور یہاں بلبھ چاریہ کا مُرید ہوگیا۔

اپنے بعض مشکل دوہوں کی تصریح کرتے ہوئے خود سور داس کا بیان ہے کہ وہ مشہور چند بردائی کے خاندان سے تھا۔ اس کے باپ کا نام رام چندر اور دادا کا ہری چندر تھا جو آگرہ کے رہنے والے تھے، لیکن بعض کا خیال ہے کہ وہ برہمن ہی تھا، اور اپنے نسب کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں ہے اس کا باپ گوپ چل میں رہا کرتا تھا اور اس کے سات بیٹے تھے جن میں سے چھ مسلمانوں کے مقابلہ میں مارے گئے، اور سور داس جو نابینا تھا بچ رہا، اس کے نابینا ہونے کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ حقیقتاً نابینا تھا، اور بعض کا خیال ہے کہ اس کو صرف استعارتاً نابینا کہتے ہیں، کیونکہ ایک بار کرشن جی کا درشن اسے خواب میں حاصل ہوا تھا، اور پھر اس کے

ساری دنیا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں، اس کے بعد یہ برج میں رہنے چلا گیا اور وہیں بلبھ چاریہ کا چیلا بن گیا۔ سنہ ۱۴۸۳ء اس کا سنہ ولادت اور سنہ ۱۵۶۳ء سنہ وفات ہے (لیکن یقینی نہیں)

سورداس کا مرتبۂ شاعری بہت بلند ہے، اور اس کا کلام اک خاص کیفیت کا حامل ہے، اس نے بھگوت پران کے بہت سے افسانے اور ٹکڑے نہایت خوبی کے ساتھ ہندی میں نظم کئے ہیں، اور کرشن و رادھا کی حیاتِ معاشقہ کو نئے نئے اسلوب سے اس نے بیان کیا ہے، اس عاشقانہ کلام کا مجموعہ ایک سورساگر ہے، اور دوسرا سورادلی۔ اس کا دقیق و پیچیدہ کلام ساہتیا لہری میں پایا جاتا ہے جس کی شرح خود اسی نے لکھی ہے۔ اس نے نل دمن کا افسانہ بھی ہندی میں لکھا ہے۔

اس کا تمام کلام ۵۰۰۰، دوہوں پر مشتمل ہے، سورداس، انداز بیان، سوز و گداز، تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے اور ہر چند بعض لوگ تلسی داس کو سورداس پر ترجیح دیتے ہیں لیکن غالباً حقیقت یہ نہیں ہے۔ ایک مثل مشہور ہے کہ سورداس آفتاب ہے اور تلسی داس ماہتاب اور کیشوداس ستاروں کا مجموعہ۔ ربار اکبری کے کسی شاعر نے لکھا ہے کہ:-

"گنگ عاشقانہ شاعری کا مالک ہے اور بیربل کبت کا اور کیشو بلاغت کا لیکن سورداس ان سب کا بادشاہ ہے"

سورداس ایک جگہ گوپال کے فراق میں لکھتا ہے کہ:-

"گوپال نہیں ہے تو یہ کنج کیسے سنسان نظر آتے ہیں۔ جب وہ یہاں تھا تو درختوں کی بیلیں کیسی خنک نظر آتی تھیں لیکن اب آگ کا شعلہ معلوم ہوتی ہیں کوئی پوچھے کہ اب جمنا کیوں بہہ رہی ہے، چڑیاں کیوں چہچہا رہی ہیں، نیلوفر کیوں پھول رہے ہیں۔ بھونرے کس کے لئے بھنبھنا رہے ہیں"

سورداس کہتا ہے کہ:-

"مالک کے انتظار میں میری آنکھیں گھونگچی کی طرح سرخ ہو گئی ہیں"

چوراسی ورت

اس عہد کی ایک خاص تصنیف چوراسی ورت بھی ہے (یعنے چوراسی افسانے) مشہور ہے کہ ان کا مصنف گوکل ناتھ، بٹھل ناتھ کا بیٹا تھا جس کا زمانہ ترقی سنہ ۱۵۶۸ء ہے۔

یہ تصنیف بھگت مالا سے پہلے کی ہے اور اس میں مقلدین بلبھ چاریہ کے بہت سے افسانے پائے جاتے ہیں، لٹریری نقطۂ نظر سے یہ کتاب اس لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، کہ ہندی نثر کی اگر سب سے نہیں تو کم از کم بہت قدیم کتاب ہے۔

اس کی زبان نہایت صاف و سہل ہے اور ہر چند اب سے ۳۵۰ برس قبل لکھی گئی تھی لیکن موجودہ زبان

سے زیادہ فرق نہیں ہے۔

دوسرے بلبھ چاری شعرا

بھگوان ہت (۱۵۷۴ء) کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بٹھل ناتھ کا شاگرد تھا، اس نے کرشن کی عاشقانہ زندگی کا حال خوب لکھا ہے۔ ایک مسلمان رس خاں بھی قابل ذکر ہے اس کا زمانۂ ترقی ۱۶۱۴ء تھا، اس کا نام پہلے سید ابراہیم تھا، لیکن بعد کو یہ کرشن پرست ہو گیا، اور اس نے نہایت موثر انداز میں کرشن کی مدح وثنا بیان کی، رس خاں کا ایک شاگرد قادر بخش بھی تھا اس نے بھی ہندی میں اچھی شاعری کی ہے۔

رادھا بلبھی

۱۵۸۵ء میں ایک اور نئی جماعت بندرابن میں پیدا ہوئی، جسے رادھا بلبھی کہتے ہیں۔ یہ طبقہ کرشن جی سے زیادہ رادھا کا پرستار ہے، اس کا بانی ہری ونس تھا جسے ہت ہری بنس اور ہت جی بھی کہتے ہیں۔ اس کے باپ کا نام دیاسا تھا، جو قوم کا گور برہمن تھا، اور دربار شاہی کا ملازم تھا، ہری بنس نے ایک کتاب سنسکرت میں رادھا سدھا ندھی ۱۰۰ اشعار کی لکھی ہے اور ہندی میں خاص کتاب چوراسی پد یا پریم لتا ہے۔

بہ حیثیت شاعری و اظہار جذبات کے ہری بنس کا درجہ بہت بلند ہے، اس جماعت میں اور بھی متعدد شاعر ہوئے ہیں جنہیں سے ناگری داس (جو سولھویں صدی کے آخر میں مشہور ہوا) دھرو داس (جس کا زمانۂ ترقی ۱۶۶۲ء ہے) اور برندابن داس جی (جس کا زمانۂ ترقی ۱۷۴۳ء ہے) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ہری داس

بندرابن میں ایک اور جماعت پیدا ہوئی جسے ہری داسی کہتے تھے، اس کا بانی سوامی ہری داس تھا، یہ آخر سولھویں صدی میں پیدا ہوا اور شروع سترھویں صدی میں مر گیا۔ ہری داس کے ہندی کلام میں سدھارن سدھانت بھی خوب کتاب ہے، ہندی شعراء کی صف میں ہری داس بھی بہت ممتاز نظر آتا ہے۔

ہری داس کے بعد اس جماعت کا سردار بٹھل بپل ہوا اور پھر بہارنی داس، یہ دونوں شاعر تھے، موخرالذکر کا کلام بہت ہے، اس کے بعد ۱۷۲۳ء میں ستیل اس جماعت کا سردار ہوا، یہ بھی اچھا شاعر تھا ایک اور شاعر سہچری سرن (۱۷۶۳ء) بھی اس جماعت سے متعلق تھا، اس کی تصانیف میں للت پرکاش بہت مشہور ہے جس میں ہری داس بانی اول کے مقولے درج ہیں۔

اور شعراء

گدادھر بھٹ (۱۶۶۵ء) بھی کرشن پرست شاعر تھا اور چیتنیا جماعت سے متعلق تھا، اس نے بھی کرشن کی تعریف میں اچھے اچھے دوہے لکھے ہیں۔

بہاری لال چوبے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ بھی پرستاران کرشن میں سے تھا، علاوہ ان کے اور شعراء

بھی اسی اعتقاد کے ہوئے ہیں جن میں سے خاص یہ ہیں -

تاج جس کا زمانہ سترھویں صدی کے آغاز میں ہوا ہے، ایک مسلمان عورت تھی، جو بعد کو کرشن کے پرستاروں میں داخل ہوگئی، اس کا کلام سوز و گداز کا بہترین نمونہ ہے۔

بھیشم (۱۶۵۰ء) اس نے بھگوت پران کے دسویں باب کا ترجمہ ہندی نظم میں کیا اور اس کا نام بالمکند لیلا رکھا۔

بخشی ہنس راج (۱۷۳۲ء) یہ پنا کا کایستھ تھا اور اچھا شعر کہتا تھا، اس نے رادھا اور کرشن کے حالات زندگی لکھے ہیں، سنیہ ساگر اس کی مشہور کتاب ہے۔

آن، بیسواڑہ کا برہمن تھا، اس نے ۱۷۶۱ء میں کرشن کھانڈا کا ترجمہ ہندی میں کیا، اور اس کا نام کرشن کلول رکھا۔

رزمیہ شاعری

(۱۵۵۰ء - ۱۸۰۰ء)

میواڑ نہ صرف راجپوتانہ بلکہ ہندوستان کے تمام حصص میں رزم گو شعراء کا وجود بہت حال کے زمانہ تک پایا جاتا تھا، اور میواڑ خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کا سرپرست تھا، رانا جگت سنگھ فرمانروائے میواڑ کے حالات جس نے ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۴ء تک حکومت کی کسی رزم گو شاعر ہی نے جمع کئے تھے اور اس کا نام جگت بلاس رکھا تھا، جگت سنگھ کے بعد رانا راج سنگھ فرمانروا ہوا اس کا زمانہ ۱۶۵۴ء سے ۱۶۸۱ء تک ہوا۔ یہ اورنگ زیب کا مشہور دشمن اور اس نوع کے شعراء کا بڑا سرپرست تھا۔ اس کے زمانہ کے حالات بھی کسی غیر معلوم بھاٹ ہی نے مرتب کئے تھے جس کا نام راج پرکاش ہے، رانا راج سنگھ کے دربار میں ایک بھاٹ ملک الشعراء کی خدمت پر مامور تھا جس کا نام مان تھا، اس نے راج سنگھ اور اورنگ زیب کے باہمی جنگ کے حالات راج بلاس میں یکجا کردئے تھے؛ اس کے دربار میں ایک اور شاعر سداسیو (۱۶۶۰ء) بھی تھا جس نے راج سنگھ کی سوانح زندگی راج رتناکر کے نام سے مرتب کئے۔

راج سنگھ کے بعد اس کا بیٹا جے سنگھ فرمانروا ہوا (۱۶۸۱ء—۱۷۰۰ء) یہ بھی شعراء کا سرپرست تھا اس نے اپنے دربار کے شعراء سے ایک کتاب جے دیو بلاس تصنیف کرائی جس میں تمام ان بادشاہوں کا حال ہے،

جن سے بجے سنگھ نے مقابلہ کیا تھا۔

میواڑ کا ایک اور مشہور بھاٹ رن چھوڑ تھا، جس نے وقائع میواڑ کو یکجا کر کے اس مجموعہ کا نام راج تپنار کھا۔

مارواڑ مارواڑ راج بھی بھاٹوں کا بڑا سرپرست تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ مہاراج سور سنگھ نے ایک بار چھ لاکھ روپیہ چھ شاعروں کو ایک دن میں تقسیم کر دئے۔ اس کا بیٹا گج سنگھ اور پوتا امر سنگھ تھا یہ بھی شعراء کی سرپرستی میں سور سنگھ کے نقش قدم پر چلے۔

یہ امر سنگھ وہی ہے جو اپنے باپ سے لڑ کر شاہجہاں کے دربار میں چلا گیا تھا اور وہاں کسی بات پر ناخوش ہو کر خود شاہجہاں کے قتل کرنے کی فکر میں تھا، چنانچہ بعد کو یہ بادشاہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

امر سنگھ نے جن شعراء کی سرپرستی کی ان میں ایک بنواری لال بھی تھا جس نے اپنے آقا کی تعریف میں بہت سی نظمیں لکھیں اور دوسرا رگھوناتھ رائے تھا۔

برج باسی داس۔ یہ بھی کرشن پرست طبقہ اور ولبھ چاری جماعت کا مشہور شاعر تھا، ۱۷۶۰ء میں اس نے ایک کتاب برج بلاس لکھی جس میں کرشن جی کے حالات دوران قیام بندرابن کے درج ہیں۔

سندری کنوری بائی (۱۷۹۰-۱۷۶۰ء) یہ راج سنگھ، مہاراج روپ نگر وکرشن گڑھ کی بیٹی تھی، اس کی شادی بلبھدر سنگھ مہاراجہ راگھوگڈھ سے ہوئی تھی، اس کے خاندان میں بہت سے لوگ شاعر ہوئے ہیں۔ تعریف کرشن میں اس نے بہت سی نظمیں لکھیں۔

منچیت دوج (۱۷۷۹ء) یہ بندیلکھنڈ کا باشندہ تھا، اس نے اپنی کتاب سربھی دان لیلا میں کرشن جی کے حالات ایام طفولیت کے اور کرشنا میں بھی شباب اور آخر عمر کی نہایت خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔

بی بی رتن کنوز، بنارس کی رہنے والی تھی اور ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئی تھی، یہ راجہ شیو پرشاد کی دادی تھی اور انیسویں صدی میں ہندی لٹریچر کی ترقی بہت کچھ اس کی مساعی سے ہوئی! اس کی ایک کتاب پریم رتن ہے جس میں پرستاران کرشن کے حالات درج ہیں علاوہ اس کے اور کتابیں بھی اس نے تصنیف کیں۔

عام تبصرہ کرشن جی کے متعلق جس قدر بھی شاعری پائی جاتی ہے اس میں زیادہ تر اس محبت سے بحث کی گئی ہے جو کرشن جی کو برج کی گوپیوں اور خصوصیت کے ساتھ رادھا سے تھی۔ تحریک بھگتی کے بڑے بڑے معلمین نے کرشن جی کے ان افسانوں کی بہت سی عارفانہ اور صوفیانہ تاویلیں کی ہیں، انھوں نے کرشن کو خدا سمجھ کر رادھا اور گوپیوں کو ارواح انسانی سے تعبیر کیا ہے۔

اس طبقہ کے جس قدر شعراء گزرے ہیں وہ تقریباً سب نہایت اچھا کہنے والے تھے، اور فنِ شاعری کے لحاظ سے بھی وہ قابلِ تعریف ہیں، چونکہ متھرا مغلوں کے دارالحکومت آگرہ سے بہت قریب تھا اور آگرہ علوم و فنون کی ترقی کا مرکز بنا ہوا تھا اس لئے متھرا کے شعراء پر اس کا اثر ہونا چاہئیے تھا اور یہی وجہ ہے کہ کرشن پرست طبقہ کے شعراء نے فن کے لحاظ سے بھی کافی ترقی کی جس کا امتیاز مسلمانوں کی رواداری کو حاصل ہے۔

جودھپور کے راجہ اجیت سنگھ (۱۶۸۱-۱۷۲۴ء) نے بھی ایک کتاب تصنیف کرائی، جس میں سورج بنسی خاندان کے حالات شروع سے اپنے عہد تک درج کردئے، اجیت سنگھ کے بیٹے، مہاراجہ ابھے سنگھ کے عہد میں (۱۷۲۴-۱۷۵۰ء) کرن بہت مشہور بھاٹ ہوا ہے اس نے ایک نظم سوریا پرکاش ۷،۵۰۰ اشعار کی لکھی جس میں ۱۶۲۰ء سے لے کر ۱۷۳۱ء کے حالات درج کئے۔

مہاراجہ بجے سنگھ (۱۷۵۳-۱۷۸۴ء) خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کا بڑا قدرداں تھا، اس کے زمانہ میں ایک کتاب بجے بلاس لکھی گئی جس میں ایک لاکھ اشعار ہیں۔ اس تصنیف میں صرف اس لڑائی کا حال درج ہے جو بجے سنگھ اور اس کے برادر عم زاد رام سنگھ کے درمیان ہوئی تھی۔

دوسرے درباروں کے بھاٹ

علاوہ میواڑ اور مارواڑ کے اور درباروں میں بھی جاٹوں کی قدر کی جاتی تھی، جب جگت سنگھ راجہ مئو نے شاہجہاں کے خلاف بغاوت کی تو اس کا حال ایک بھاٹ بگھیر رائے نے ۱۶۵۰ء میں لکھا، راؤ رتن کے عہد میں (۱۶۵۰ء) جو راجہ اُدے سنگھ کا پوتا تھا کسی بھاٹ نے ایک تاریخ راؤ رتن ساآسیا نظم میں لکھی۔

جے سنگھ سوائی مہاراجہ جے پور (۱۶۹۹-۱۷۴۳ء) نہ صرف شعراء کا سرپرست تھا بلکہ خود بھی شاعر تھا اس نے خود اپنی لائف جے سنگھ کلپ درم کے نام سے نظم کی ہے، اسی جے سنگھ کا برادر نسبتی بدھ راؤ، راجہ بوندی بھی اچھا شاعر تھا۔

جودھ راج ایک برہمن زادہ نے مہاراجہ نمرانا کے حکم سے ایک کتاب ہمیر کاوی لکھی، اس میں انھیں واقعات کو نظم کیا گیا ہے جنھیں سارنگ دھر چودھویں صدی میں لکھ چکا تھا۔

گھنشیام شکل راجہ بدلیاں کے دربار کا بھاٹ تھا، اور کچھ عرصہ تک راجہ بنارس کے دربار میں بھی رہ چکا تھا، اس کا شمار بہترین بھاٹوں میں ہے۔

ہری کشن (۱۷۳۱ء) راجہ چھتر سال فرمانروائے پنا کے دربار سے متعلق تھا اور اس کی رزمیہ شاعری بہت مشہور ہے۔

سدن برہمن (۱۷۵۰ء) بھی رزم گو شاعر تھا اور مہاراجہ بھرت پور کا بیٹا سورج مل اس کا سرپرست

تھا، اس کی کتاب سُجان چرتر مشہور ہے جس میں سورج مل کی جنگ کا حال درج کیا گیا ہے، سدن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جنگ کے حالات لکھنے میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔

ایک بھاٹ لال جھا (سنہ ۱۷۵۰ء) بہاری زبان میں شاعری کیا کرتا تھا اس کی ایک نظم کنڑپی گھاٹ لڑائی مشہور ہے، جس میں مہاراج نرندر سنگھ فرمانروائے دربھنگہ کے رزمیہ وقائع درج ہیں۔

لال کوِی

راجہ چھتر سال (سنہ ۱۶۴۹-۱۷۳۱ء) فرمانروائے پنا بڑا علم دوست رئیس تھا، اس نے شعراء اور دیگر اہلِ کمال کی بہت قدر کی، اس کے عہد کا نہایت مشہور شاعر یا بھاٹ گورے لال پروہت تھا جسے عام طور سے لال یا لال کوِی کہتے ہیں۔ اس کی تصنیف چھتر پرکاش بہت مشہور کتاب ہے، اس میں بندیلکھنڈ کے تمام راجاؤں کے حالات لکھے ہیں اور چھتر سال اور اس کے باپ کے واقعات زیادہ تفصیل سے درج ہیں۔ لال کوِی رزمیہ شاعری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا اور جنگ کے واقعات اس طرح بیان کرتا ہے کہ ساری تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے۔

اس عہد کا اور لٹریچر

علاوہ شعر و شاعری کے اس عہد میں اور قسم کی کتابیں بھی فلسفہ ویدانت جین مذہب اخلاق، زراعت، نجوم، سالوتری، لغت وغیرہ کے متعلق مرتب ہوئیں۔ خاص خاص مصنفین کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

(۱) ناتھ کوی (پیدائش سنہ ۱۵۸۴ء) برج کا باشندہ تھا، اس نے موسموں اور دیگر مباحث پر متعدد نظمیں لکھیں۔

(۲) مبارک علی (پیدائش سنہ ۱۵۸۳ء) بلگرام ضلع ہردوئی کا رہنے والا تھا۔ اس کے دوہے چھوٹی بحر میں بہت مشہور ہیں۔

(۳) ناظر (پیدائش سنہ ۱۶۰۰ء) آگرہ اس کا وطن تھا، یہ اپنے زمانہ کا بڑا مشہور اور ذی کمال شاعر تھا۔

(۴) بنارسی داس (پیدائش سنہ ۱۵۸۶ء) جین مذہب کا مقلد تھا اور جونپور اس کا مسکن تھا، اس کی شاعری تمام تر مذہبی تعلیمات سے لبریز ہے۔

(۵) سری دھر (پیدائش سنہ ۱۶۲۳ء) راجپوتانہ کا باشندہ تھا اس کی کتاب بھوانی چند مشہور ہے۔

(۶) گھاسی رام۔ (زمانۂ ترقی سنہ ۱۶۲۳ء) اپنے عہد کا بڑا زبردست شاعر تھا، محبت و اخلاق وغیرہ پر اس کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔

(۷) بھِکر (زمانۂ ترقی سنہ ۱۶۳۴ء) یہ کایستھ تھا۔ اس کا تعلق جہانگیر کے دربار سے تھا، جہانگیر نے ایک بار اسے کسی خطا پر قید کر دیا، چنانچہ اس نے قید ہی کی حالت میں رس رتن تصنیف کی، جب جہانگیر کے سامنے وہ پیش ہوئی تو اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔

(۸) دمودر داس (زمانۂ ترقی ۱۶۶۰ء) یہ دادو پنتھی جماعت سے تعلق رکھتا تھا اس نے مارکنڈے پران کا ترجمہ راجستھانی زبان میں کیا، یہ ترجمہ نثر میں ہے۔

(۹) چھپتر۔ (زمانۂ ترقی ۱۷۰۰ء) یہ کایستھ تھا اور موضع انتر (گوالیار) کا رہنے والا تھا، اس نے مہابھارت کو ہندی نظم میں مختصر کرکے لکھا اور اس کا نام بجے مکتاولی رکھا۔

(۱۰) سبل سنگھ (پیدائش ۱۶۷۰ء) یہ کسی راجہ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس نے بھی مہابھارت کے ۲۴۰۰۰ اشعار کا ترجمہ ہندی نظم میں کیا تھا۔

(۱۱) بیتال (پیدائش ۱۶۷۰ء) بکرم شاہی دربار سے اس کا تعلق تھا یہ زیادہ تر اخلاقی نظمیں لکھتا تھا۔

(۱۲) دیبی داس (زمانۂ ترقی ۱۶۰۵ء) بندیلکھنڈ کا رہنے والا تھا۔ اور راجہ رتن پال سنگھ رئیس قرولی اس کا سرپرست تھا۔ اس نے اخلاق پر ایک نہایت عمدہ کتاب پریم رتناکر لکھی۔

(۱۳) ہوتی رام (زمانۂ ترقی ۱۶۸۳ء) اس نے افسانہ مادھونل کا ترجمہ برج بھاشا زبان میں کیا جو بعد کو للو لال جی کی کوشش سے اردو زبان میں بھی منتقل ہوا۔

(۱۴) بھودہرداس (زمانۂ ترقی ۱۷۲۴ء) جینی مذہب کا پیرو تھا، اور اس کی تصانیف زیادہ تر مذہبی ہیں، بہ حیثیت شاعر ہونے کے یہ ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

(۱۵) گھاگھ (زمانۂ ترقی ۱۶۹۶ء) قنوج کا باشندہ تھا۔ اس نے فنِ زراعت پر ایک کتاب لکھی، اس کے بہت سے مقولے شمالی ہند میں اب بھی زبان زد ہیں۔

(۱۶) گنگاپت (زمانۂ ترقی ۱۷۱۹ء) ہندوؤں کے اصول فلسفہ کے متعلق اس نے ایک نظم لکھی ہے جو مکالمہ کی صورت میں ہے۔ اس کا نام اس نے وگیان بلاس رکھا تھا۔

(۱۷) کرپارام (زمانۂ ترقی ۱۷۲۰ء) راجہ جے سنگھ فرمانروائے جے پور کے دربار کا نجومی تھا اس نے علم نجوم پر ایک کتاب ہندی زبان میں اچھی لکھی ہے۔

(۱۸) گرِدھر (پیدائش ۱۷۱۳ء) دوآبہ کا باشندہ اور اخلاق کے متعلق خوب کہتا تھا۔ کنڈلیا جس کا یہ بڑا استاد مانا جاتا تھا، اس کے بہت سے اشعار نے ضرب الامثال کی صورت اختیار کرلی ہے۔

(۱۹) سری ناگری داس (زمانۂ ترقی ۱۷۲۳ء) کرشن گڈھ کا راجہ تھا اس کا اصلی نام سورت سنگھ اور شاعرانہ تخلص ناگری داس کرتا تھا، بلحاظ شاعری یہ بھی اک خاص رنگ کا مالک تھا۔

(۲۰) نور محمد (زمانۂ ترقی ۱۷۲۳ء) اس کی تصنیف اندراوتی بہت مشہور کتاب ہے، یہ اک افسانہ ہے جسے

ملک محمد جائسی کے پدماوتی کی طرح اس نے منظوم کیا ہے۔

(۲۱) من بودھ جھا (زمانۂ ترقی سنہ ۱۷۵۰ء) اس کو بھولن جھا بھی کہتے ہیں یہ ضلع دربھنگہ کا باشندہ تھا اور بہاری زبان کا اچھا شاعر تھا۔

(۲۲) ندھان (زمانۂ ترقی سنہ ۱۷۵۱ء) فن ساوتر پر ایک کتاب کا مصنف ہے، دیاندھ بھی اس زمانہ کا مصنف تھا اور اس نے بھی اسی فن پر ایک کتاب لکھی ہے۔

(۲۳) رام چندر۔ قوم کا برہمن تھا اس نے اٹھارویں صدی کے آخر میں شہرت حاصل کی، اس نے پاربتی کے پاؤں کی تعریف میں ایک کتاب پانچ جلدوں میں لکھی جس کا نام چرن چندر کا ہے۔ یہ کتاب شاعری کے لحاظ سے بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔

ہندی لٹریچر

(سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد)

اٹھارویں صدی ہندی لٹریچر کی ترقی کے لئے نامبارک ثابت ہوئی، البتہ انیسویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوگئی اور انتظام سلطنت کے لئے انگریزوں کو ضرورت ہوئی کہ وہ یہاں کی زبانوں سے واقفیت حاصل کریں، اور اپنی زبان یہاں کے باشندوں کو سکھلائیں، اس وقت پھر یہ تحریک زندہ ہوئی اور مغربی خیالات کی آمیزش، مطابع کے رواج اور حکام کی ناگزیر توجہ سے ہندی اور اردو لٹریچر کا ایک جدید دور شروع ہوا۔

للو لال جی

انیسویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کا منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گلکرسٹ (DR JOHN GILHERST) چنانچہ اس نے کالج کے دیگر اراکین (کپتان ابراہیم لاکٹ پروفیسر ٹیلر، ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ) کی مدد سے ہندوستان کے لٹریچر پر صرف اس لئے توجہ کی کہ یورپین لوگوں کیلئے ایک سلسلۂ نصاب ایسا مرتب کیا جائے جس سے وہ یہاں کے مروجہ زبانوں کو آسانی سے سمجھنے لگیں۔

اس نے اس وقت کے ماہرین زبان کو جمع کیا اور ان سے متعدد کتابیں لکھوائیں، جو زیادہ تر اردو کی تھیں، ہندی زبان کے لئے للو لال جی اور سدل مصر کا انتخاب کیا گیا، ہندی لٹریچر کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ نثر میں باقاعدہ کوئی کتاب اچھے پیمانہ پر مرتب کی جاتی۔

للولال جی قوم کا برہمن اور گجرات کا رہنے والا تھا مگر اک عرصہ سے شمالی ہند میں بود و باش رکھتا تھا، یہ ایک ذہین اور قابل شخص تھا، چنانچہ اس نے سدل مصر کی مدد سے موجودہ ہندی لٹریچر کی بنیاد قائم کی۔ اُسوقت شمالی ہند میں بہت سی بولیاں رائج تھیں لیکن سب سے زیادہ فصیح و سلیس صرف اُردو تھی، جو شرفاء اور پڑھے لکھے طبقہ کی زبان سمجھی جاتی تھی، للولال جی نے کوشش اس امر کی کی کہ اُردو میں جو الفاظ فارسی و عربی کی کثرت سے پائے جاتے ہیں اُن کو علیحدہ کرکے ہندی الفاظ اُن کی جگہ رکھدئے۔ چنانچہ سب سے پہلے اُس نے ایک کتاب پریم ساگر مرتب کی جو بھگوت پران کے دسویں باب کا ترجمہ ہے، یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۱۰ء میں تمام ہوگئی، اس کے بعد ۱۸۰۹ء میں راج نیت کی تصنیف شروع کی گئی جو برج بھاشا زبان میں تھی پھر سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی لکھی گئیں جن کی زبان اردو ہندی ملی ہوئی تھی، للولال جی نے اسی سلسلہ میں بہاری لال کی ست سئی کی شرح لکھی اور اس کا نام لال چندرکا رکھا۔

سیرام پور

اسی سلسلہ میں سیرام پور کی اُس عیسوی جماعت کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے ۱۸۱۰ء میں انجیل کا ترجمہ ہندی میں شائع کیا، علاوہ اس کے اور کتابیں بھی تصنیف کرائیں جن میں سے ایک ترجمہ راماین کا بھی تھا، ۱۸۱۸ء میں مسٹر کیرے نے جو اس مسیحی جماعت کا سردار تھا ایک اخبار بنگالی زبان میں جاری کیا اور غالباً یہ سب سے پہلا اخبار تھا جو کسی ہندوستانی زبان میں شائع ہوا۔

راجہ شیو پرشاد

للولال جی نے جس زبان میں کتابیں لکھی تھیں وہ اس اعتبار سے بہت مشکل تھیں کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے موجود تھے، اس کی طرف سب سے پہلے راجہ شیو پرشاد (۱۸۲۳-۱۸۹۵ء) نے توجہ کی اور غالباً یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے موجودہ ترقی یافتہ ہندی زبان کی بنیاد قائم کی، اس نے تمام مشکل الفاظ سنسکرت کے اس سے خارج کردئے اور وہ بولنے لکھنے کے لئے زیادہ آسان ہوگئی، شیو پرشاد، بی بی رتن کنور مشہور شاعرہ کا (جس کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں) پوتا تھا پہلے یہ مہاراجہ بھرت پور کا وکیل تھا، بعد کو انگریزی ملازمت اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ میر منشی کے عہدہ سے ترقی کرکے انسپکٹر مدارس ہوگیا، راجہ کا موروثی خطاب بھی گورنمنٹ نے بحال رکھا، اس نے متعدد کتابوں کے ترجمے کئے اور مدارس کے نصاب کے لئے ہندی کی کتابیں بھی لکھیں۔

مطابع کا قیام

اس عہد کی ہندی ترقی کا نمایاں امتیاز یہ تھا کہ نثر کی کتابیں زیادہ لکھی گئیں، جس کی اشاعت بھی مطابع کی وجہ سے کافی طور پر ہوسکی، سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج میں ہی کتابیں طبع ہوئیں لیکن چونکہ مصارف زیادہ ہوتے تھے، اور ٹائپ بھی بھدا ہونے کی وجہ سے مقبول نہ تھا اس لئے کالج نے

اس کام کو روک دیا، اس کے بعد سنہ ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ایک لیتھو پریس قائم ہوا اور اس کے بعد سے ہندی لٹریچر کی اشاعت پورے طور پر ہونے لگی۔

ہریش چندر

اسی سلسلہ میں بابو ہریش چندر (سنہ ۱۸۵۰-۱۸۸۵ء) کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ بنارس کا رہنے والا تھا اور بھارت رندو (یعنی ہندوستان کا چاند) کے لقب سے مشہور تھا، کوئنس کالج بنارس میں اسکی تعلیم ہوئی اور سولہ سال کی عمر سے اس نے شاعری شروع کی۔ اس نے ۱۲۵ کتابیں تصنیف کیں جس میں اٹھارہ ڈرامے اور ناٹک کی کتابیں ہیں علاوہ ادب لطیف کے تاریخ و مذہب وغیرہ کے متعلق بھی اس کی تصانیف پائی جاتی ہیں۔ تاریخ میں کشمیر کسُم اور چرتاولی اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ ڈرامے کے بعد اس کا عاشقانہ کلام زیادہ مقبول ہوا۔

اس نے ایک رسالہ بھی ہریشچندر کا کے نام سے جاری کیا اور تذکرۃ الشعراء کے طرز پر ایک کتاب سُندری تلک شائع کی۔

ہندی اور بہاری ڈرامہ

ہندی ڈرامہ بہت حال کی چیز ہے، اس سے قبل بعض شعراء نے ناٹک کی کتابیں ضرور لکھی تھیں لیکن ڈرامہ سب سے پہلے سنہ ۱۸۵۷ء میں گوپال چند نے لکھا، اس کا نام نہش ناٹک تھا، اس کے بعد سنہ ۱۸۶۲ء میں راجہ لکشمن سنگھ نے ایک مشہور ڈرامہ لکھا جو شکنتلا کے نام سے اب بھی مقبول و معروف ہے، اس کے بعد ہریش چندر اس کی طرف متوجہ ہوا اور سب سے پہلے ودیا سندر لکھا اس کے بعد سترہ ڈرامے اور تصنیف کئے، علاوہ ہریش چندر کے توتا رام، گوپال رام کاشی ناتھ، ستیا رام وغیرہ نے بھی ڈرامے لکھے اور سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۸ء میں ڈرامہ اسٹیج پر لایا گیا۔

بہار میں ڈرامہ زیادہ قدیم چیز ہے، ودیاپت ٹھاکر جو پندرھویں صدی کا مصنف ہے سب سے پہلے اس نے بہاری زبان میں ڈرامہ لکھا، اس کے بعد لال جھا نے سنہ ۱۷۸۰ء میں اپر بھاتی ہرن کے نام سے ایک ڈرامہ تصنیف کیا۔

یہ بہاری ڈرامہ ہندی ڈرامہ سے کچھ مختلف ہے، گفتگو سنسکرت اور پراکرت زبان میں دکھائی ہے صرف گانے بہاری زبان کے ہیں۔

شعراء کے تذکرے

اس عہد میں ہندی شعراء کے تذکرے بھی شائع ہوئے، علاوہ اُن تذکروں کے جو للو لال جی اور ہریش چندر نے لکھے ذیل کی تصانیف بھی قابل ذکر ہیں:-

راگ کلپدرم۔ اس میں تقریباً دو سو شعراء کا منتخب کلام ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اس کا مصنف ایک برہمن کرشنانند ویاس دیو تھا، یہ کتاب سنہ ۱۸۴۳ء میں مرتب ہوئی۔

رس چندر ودے۔ اس میں ۲۴۲ شعرا کے کلام کا انتخاب ہے، ٹھاکر پرشاد اس کا مصنف اور ۱۸۶۳ء تاریخ ترتیب ہے۔

دگ بجے بھوشن۔ اس میں ۱۹۲ شعرا کا کلام انتخاب کیا گیا ہے، اس کا مصنف بلرام پور کا ایک کالستھ گوکل پرشاد تھا، یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں مرتب کی گئی۔

شیو سنگھ سروج۔ اس کا مصنف شیو سنگھ ہے، یہ کتاب اور تذکروں سے ماخوذ ہے لیکن بہت مفید اور عمدہ انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔

گوکل ناتھ

اس عہد کی ایک مشہور تصنیف ترجمۂ مہابھارت بھی ہے، اس کام کو گوکل ناتھ نے ۱۸۲۰ء میں راجہ اودت نرائن (بنارس) کی فرمائش پر شروع کی، اس کی اور تصانیف بھی ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور اور کارآمد مہابھارت کا ہندی ترجمہ ہے۔

رؤسائے ہند کی سرپرستی

ہر چند اس زمانہ میں مطابع وغیرہ کے قیام سے ہندی لٹریچر کی اشاعت زیادہ ہوگئی، پھر بھی بہت سے مقامات پر وہی قدیم طریقہ باقی تھا، اور شعرا ریاستوں کی قدردانی پر پڑے ہوئے تھے، چنانچہ پنا، چرکھاری، ریواں، ناگپور، بنارس وغیرہ کے درباروں میں شعرا اور بھاٹ اب بھی پائے جاتے تھے، اور بعض فرمانروا خود بھی شاعر تھے، مثلاً مہاراجہ مان سنگھ (جودھپور) جس نے خود متعدد تصانیف کیں۔

مہاراجہ ہندوپت رئیس پنا کے دربار میں موہن بھٹ، روپ ساہی، اور کرن مشہور شاعر تھے، موہن نے فن شعر پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا بیٹا پدماکر بھی بہت مشہور شاعر ہوا ہے۔

چرکھاری کے تین راجہ کھمان سنگھ، وکرم ساہی اور رتن سنگھ نہ صرف شاعروں کے قدردان بلکہ خود بھی شاعر تھے، وکرم ساہی (۱۷۸۵-۱۸۲۸ء) نے بھی ایک ست سئی، بہاری لال کی تتبع میں لکھی ہے، اس کے دربار میں بتیال، مان اور بال دیو خاص شاعر تھے،

راجہ رتن سنگھ کے دربار میں بہاری لال، راؤ رنا، گوپال، رام دین اچھا کہنے والے تھے، ان سب کا زمانہ ترقی ۱۸۴۰ء سمجھنا چاہیئے۔ اس سنہ میں ایک شاعر سوہر یا ملا۔ راجہ بوندی کے دربار میں تھا جس کی کتاب ہنس بھسکر مشہور ہے۔

ریواں میں بھی مہاراجہ جے سنگھ (۱۷۶۴-۱۸۳۴ء) اور اس کے بیٹے وشوناتھ سنگھ (۱۷۸۹-۱۸۵۴ء) نے شعرا کی اچھی قدردانی کی، یہ دونوں خود بھی شاعر تھے، وشوناتھ سنسکرت کا بھی مصنف تھا، اس نے کبیر کی بیجک اور تلسی داس کے ونے پترکا کی شرحیں بھی لکھی ہیں، وشوناتھ کا جانشین راجہ رگھوراج سنگھ (۱۸۲۳-۱۸۷۹ء)

بھی جو ۱۸۵۰ء میں تخت نشین ہوا اچھا ذوق شاعری کا رکھتا تھا، اس نے بھگوت پران کا ترجمہ کیا اور ہنومان کی تاریخ سندر ستک کے نام سے مرتب کی۔

مہاراجہ مان سنگھ (۱۸۵۰ء) اجودھیا کا رئیس بھی شاعر اور شاعر پسند تھا۔

فن شعر

اس عہد میں بعض شعراء ایسے بھی تھے، جنھوں نے فن شعر کے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ گوردین پانڈے (۱۸۰۳ء) اور بینی پربین باجپئی (۱۸۱۷ء)، نے جو لکھنؤ کا ایک برہمن اور خوشگو شاعر تھا، کئی کتابیں فن شعر کے متعلق لکھیں۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور پدماکر بھٹ ہوا ہے (۱۸۳۳-۱۷۵۳ء) یہ باندہ کا رہنے والا تھا، اور مختلف درباروں میں رہ کر اپنی قدر کرا چکا تھا، اس نے سات کتابیں تصنیف کیں جو تقریباً سب کی سب فن شعر سے متعلق ہیں اور آج بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، اس کی بہترین تصنیف جگت ونود ہے جو ۱۸۱۰ء میں مرتب کی گئی۔ آخر عمر میں اس نے اپنی زندگی گنگا کی پرستش کے لئے وقف کر دی تھی، اسی بناء پر اس کی آخری تصنیف گنگا لہری ہے، اس کا پوتا گدادھر بھٹ (۱۸۶۰ء) بھی اچھا شاعر تھا، پدماکر کا ایک ہمعصر رقیب اور بھی تھا اس کا نام گوال اور متھرا کا باشندہ تھا، اس کی ایک کتاب جمونا لہری بہت مشہور ہے۔

اسی زمانہ میں ایک شخص بنارس میں رام سہائے داس (۱۸۲۰ء) اور دوسرا بنیا میں ——— بچنس (۱۸۴۳ء) اچھا کہنے والا تھا ۱۸۲۸ء میں ایک شخص اور پرتاب سہائے بھی خوش فکر شاعر گذرا ہے، ۱۸۴۲ء میں نبین نے شہرت حاصل کی جو اس زمانہ کے بہترین شعراء میں سے تھا۔

گنیش پرشاد فرخ آبادی (۱۸۷۷-۱۸۴۷ء) بھی اچھا کہنے والا تھا اس کی نک سکھ مشہور ہے، گردھر داس (۱۸۴۳ء) ہریش چندر کا باپ بھی بڑا پرگو شاعر ہوا ہے، اس کی تصانیف چالیس کے قریب ہیں۔

ایک شاعر اور سردار (۱۸۸۳-۱۸۴۵ء) بنارس کا رہنے والا تھا اس نے بہاری لال اور سورداس کے کلام کی شرح لکھی، اور فن شعر پر سرنگار سنگرہ اچھی کتاب تصنیف کی۔ اس کا ایک شاگرد نرائن رائے تھا، اور وہ بھی اچھا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہندی شاعری کی بعض خصوصیات

بیان ماسبق سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہندی شاعری کی ابتداء مذہب سے ہوئی، اور صرف مذہبی خیالات کا اظہار شاعری کا حقیقی مقصود تھا، یہی وجہ ہے کہ نصف سے زائد ہندی لٹریچر بھگتی تحریک سے پیدا ہوا، اور اسی تحریک کے اصول پر اس نے ترقی کی، علاوہ مذہبی لٹریچر کے فن شعر کے متعلق بھی کچھ لٹریچر پیدا ہوا۔ رزمیہ شاعری نے

بھی رواج پایا۔ لیکن یہ بھی کسی نہ کسی واسطے سے مذہب ہی پر جا کر منتہی ہوئی۔

اُنیسویں صدی سے قبل تقریباً تمام ہندی لٹریچر نظم کے سوا اور کچھ نہ تھا، وہ تصانیف جن کو گورکھ ناتھ سے منسوب کیا جاتا ہے (جو یقیناً اس کی نہیں ہیں) اگر علیحدہ کر دئے جائیں تو پھر کوئی اہم ستثنےٰ ابھی باقی نہیں رہتا۔ نظم نے نثر کی جگہ اس قدر وسعت کے ساتھ گھیر لی تھی کہ شرحیں بھی نظم ہی میں لکھی جاتی تھیں۔ حتےٰ کہ نجوم، لغت، تشریح وغیرہ کی کتابیں بھی منظوم ہی ہوا کرتی تھیں۔

نصف سولھویں صدی سے ہندی لٹریچر نے ہوش سنبھالا اور کیشو داس کے زمانہ سے جو فن شعر پر توجہ ہوئی تو اس طرف لوگوں کا میلان بڑھتا ہی گیا، حتیٰ کہ عروض وغیرہ کی کثیر کتابیں مرتب ہو گئیں، لیکن اسی کے ساتھ ایک خرابی بھی شامل تھی، اور وہ یہ کہ جذبات اور مفہوم شعر سے زیادہ الفاظ پر زیادہ نگاہ کی جاتی تھی اور صناعت لفظی کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔

تشبیہات واستعارات کے لحاظ سے بھی ہندی نے کوئی ترقی نہیں کی، وہی نیلوفر، چکوا، چکور وغیرہ جو نہایت قدیم زمانہ میں ذریعہ تشبیہ واستعارہ تھے، اب بھی باقی ہیں اور سوائے چند شعراء کے کسی نے مناظر فطرت سے استعارہ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔

چونکہ ہندی شاعری کا ماخذ بالکل مذہبی روایات ہیں، اس لئے اس میں کوئی تنوع پیدا نہ ہو سکا اور سوائے فضول افسانوں اور واقعات کے اور کوئی میدان عاشقانہ شاعری کے لئے تلاش نہیں کیا گیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اخفاء حقیقت ہوگا اگر اس کے بعض محاسن کو ظاہر نہ کیا جائے۔ شاعری کی حقیقی روح صرف جذبات کی سادگی ہے اور غالباً مشکل سے کوئی اور زبان اس مسئلہ میں ہندی شاعری کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

خلوص وفداکاری کی وہ آلہانہ کیفیت جو ہندوستانی عورت کی خصوصیات میں سے ہے جس خوبی کے ساتھ ہندی زبان میں ادا ہو جاتی ہے، وہ کسی اور زبان کو نصیب نہیں، اور چونکہ اسکی عاشقانہ شاعری میں اظہار جذبات بالعموم عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے اس لئے اس کے اثرات اور زیادہ بے پناہ ہو جاتے ہیں۔ انداز بیان کے لحاظ سے بھی ہندی شاعری خصوصیت کے ساتھ قابل تعریف ہے اور اگر آج کوئی اس کی مثالیں یکجا کرنا چاہے تو مشکل سے اسکی عمر اس کام کے لئے کافی ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ ایک مختصر حقیقت تھی ہندی شاعری کی، لیکن چونکہ لٹریچر ہمیشہ نثر سے بنا کرتا ہے اور ہندی نثر حقیقتاً بہت پیچھے ہے اس لئے ہم ہندی لٹریچر کو فی الجملہ کامیاب نہیں کہہ سکتے، موجودہ دور میں جبکہ ملکی زبان کا مسئلہ بہت اہم ہو گیا ہے، میں ہندی زبان کی کمزوریوں اور بعض نقائص کو بیان کرنا مناسب سمجھتا کہ مبادا میں موضوع سے علیحدہ ہو جاؤں اور اصل مقصد سے انحراف کرنے والا کہلایا جاؤں۔

ہندی کی بعض نادر تشبیہات

۱۔ بینی پیٹھ سہت یوں سندر بام جیوں پکھراج سلا پے سانپن سیام

اُس پیٹھ پر چوٹی ایسی معلوم ہو رہی ہے جیسے پکھراج (ایک پیلے رنگ کا پتھر) کی سِل پر کالی ناگن بیٹھی ہو۔

۲۔ دیکھ مُرت جب سیاما پیٹھ دکھائے منو ہوں ناگن ڈسکے اُلٹت جبائے

دو نکیح رنگ، نوجوان لڑکی جب کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی گزر جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناگن کاٹ کر لوٹی جا رہی ہے۔

۳۔ چند نہیں یہ کیسے ہوں مومت مانھ پری اکاس ادھی میں تی مکھ چھانھ

یہ آسمان میں چاند نہیں ہے بلکہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے سمندر میں کسی کے چہرہ کا عکس پڑ رہا ہے۔

۴۔ کھلے بار بیچ مکھ یوں سوہ سناؤ مانہوں گو در ہنیاں منہ مہتاؤ

کھلے ہوئے بالوں میں، چہرہ اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آغوشِ شب میں چاند ہو۔

۵۔ نہیں ناگر گر منہیاں ہیرا ہار کرت پر وچھن سیسی کو نکھت کتار

یہ کون کہتا ہے کہ اس کے گلے میں ہیرے کا ہار ہے یہ ستارے ہیں جو چاند کا طواف کر رہے ہیں۔

۶۔ سویت جھین انگیا میں کچھ دُدتی ونت جُھ کندیل ابرکھ میں دیپ دپنت

باریک سفید انگیا میں اس کا سینہ اس طرح چمک رہا ہے جیسے فانوس کے اندر شمع روشن ہو۔

۷۔ منی گن نیل بسن میں یوں درسا ہیں دیپ مالکا چھایا جمنا ما ہیں

اس نیلگوں لباس پر زیور ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جمنا کے کنارے چراغاں ہو رہا ہے۔

۸۔ ہری کنچکی کس مسی مسکی رس کے ہیمہ جیسے نکست کلی گلاب کی نکست للت لکیمہ

"سبز محرم (جو اس کے سینہ پر تنگ و چست دبی تھا) جوشِ جوانی سے مسک گیا ہے": اس کے لئے کیا پیاری تشبیہ تلاش کی ہے، کہتا ہے کہ:۔ "بس یہ معلوم ہوتا ہے، جیسے گلاب کی (برگ پوش) کلی شگفتہ

ہو رہی ہو اور (اُس کے پتوں کے درمیان سے) سُرخ لکیر نظر آتی ہو۔" اگر آپ نے کبھی گلاب کی کلی کو شگفتہ ہوتے دیکھا ہے، اور اسِ سُرخ دھاری کو دیکھا ہے، جو پتیوں کے جُدا ہوتے وقت پہلے نظر آتی ہے، تو شاعر کی تلاش کی داد دیجئے۔

۹۔ رَحمن انگیا نیل کی رَت میں پھٹی اتیک منو کسوٹی ہیم پر، دَئی ہیم کی لیک

"نیلگوں سینہ بند (جو) باتھا پائی میں (کہیں) خفیف سا مسک گیا ہے (تو ایسا معلوم ہوتا ہے) جیسے سونے کی کسوٹی پر، سُونے کی لکیر ہو۔"

کسوٹی نیلگوں رنگ کی ہوتی ہے۔ اور ذراسی لکیر کھینچ کے اُس پر سُونے کا رنگ دیکھتے ہیں۔

۱۰۔ للت سَیام لیلا للن بڑھی چبُک چھبُ دُن مدھ چاکھو مدھ کر پیو گلاب پہ سُون

چبُک۔ ٹھوڑی، پہ سُون۔ پھول۔

"یہ دلفریب سیاہ گودنے کا نشان اور بھی ٹھوڑی کے حُسن کو دو بالا کر رہا ہے (یہ معلوم ہوتا ہے گویا) گلاب کے پھول سے بھونرا چمٹ کر (نہایت بدمستی سے) رَس چُوس رہا ہے۔"

۱۱۔ چھپیو چھبیلی مکھ لسے سیلے آنچل چیر منو کلا ندھ جھلملے کالندی کے نیر

کلا ندھ، چاند۔ کالندی، جمنا۔

"نیلی ساری کے آنچل کی اوٹ میں، اس کا منھ ایسا نظر آتا ہے، جیسے جمنا کے پانی میں چاند جھلملاتا ہو۔"

اس میں صرف جھلملانا ایک ایسا لفظ ہے، جس سے شاعر کی قادر الکلامی اور رسائی ذہن اچھی طرح ثابت ہوتی ہے، جس طرح گھونگھٹ کی اُوٹ میں چہرہ صاف نظر نہیں آتا، بلکہ کپڑے کی بناوٹ سے کہیں کہیں اسکی ضَو دکھلائی پڑتی ہے، اسی طرح جمنا میں بھی لہروں کی وجہ سے جو چاند کا عکس پڑتا ہے، ایک جگہ قائم نظر نہیں آتا۔

۱۲۔ اُٹھ ٹھک ٹھک ایتو کہا پاوس کے ابھسار جان پریگی دیکھبو دامن گھن اندھیار

برسات کا زمانہ ہے، اندھیری راتیں ہیں، نہایت کوشش وسعی سے اس کی سکھی نے ایک موقع نکالا ہے کہ وہ اپنے پی سے مل لے، اور اب وہ اس کو بلانے آئی ہے کہ چل۔ وہ یہ سن کر سامان چلنے کا کرنے لگی اور اس قسم کا ملبوس زیب بدن کرنے لگی جس سے کوئی پہچان نہ لے، اس پر دیر ہوتے دیکھ کر سکھی کہتی ہے کہ بس چلو اُٹھو بھی برسات کے موسم میں اس قدر کھٹراگ اور احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی اتفاق سے کہیں دیکھ بھی لے گا تو اس بارش میں یہی سمجھے گا کہ بجلی چمک گئی (تمہارے ہونے کا کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا)

ہندی شاعری میں قومی جذبات

علم و ادب کسی مخصوص انسان کی جائداد نہیں ہے۔ بلکہ وہ جماعتوں کے خیالات کا عکس ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ جو باتیں پبلک کو متاثر کرتی ہیں وہی ادب کی تشکیل میں بھی مدد دیتی ہیں۔ حکومت کے ماحول میں رہنے والی پبلک کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کسی مذہب و ملت کی طرف قدم بڑھانے والی قوم کی ادبی تخلیق زیادہ تر سیاسی ماحول کے ماتحت ہوتی ہے۔ دنیا کے ادب کی تاریخ دیکھنے سے یہ بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ملک کا سیاسی ماحول ہی ادب کو زیادہ تر متاثر کرتا ہے اور یہی جذبہ ادب میں قومی رنگ بھرتا ہے۔ ایسے ادب کو ہم مفاد قومی کے جذبہ سے متعلق سمجھتے ہیں۔ اور اُس کو ادبیات قومی کہتے ہیں۔ ہندی شاعری کس حد تک سیاسی جذبہ نے قومی رنگ پیدا کیا ہے، یہی اس مضمون کا مقصد ہے۔

قومی جذبات کے نقطۂ نظر سے تمام ہندی ادب چار مختلف ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلا دور:۔ سنہ ۱۱۰۰ء سے سنہ ۱۶۵۰ء تک

۲۔ دوسرا دور:۔ سنہ ۱۶۵۰ء سے سنہ ۱۸۰۵ء تک

۳۔ تیسرا دور:۔ سنہ ۱۸۷۵ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک

۴۔ موجودہ دور:۔ سنہ ۱۹۱۰ء سے اسوقت تک

ان میں سے ہر ایک پر تبصرہ اس طرح ہوگا۔

(۱) ابتدائی دور:۔

یہ دور دورِ رزم گوئی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ اس زمانہ کو دورِ چارن کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ اسوقت کا ادب زیادہ تر چارنوں کا ممنون احسان ہے۔ چارن درباروں میں رہا کرتے تھے اور مخصوص تقریبوں میں اپنے راناؤں کی تعریف میں قصائد گایا کرتے تھے۔ ان کی کتابیں 'کھیات' کے نام سے مشہور ہیں۔ اُسوقت سیاست

لہ راجپوتانہ کی زبان میں کھیات کے معنی تاریخ ہے۔

کے ساتھ علم و ادب کا مرکز بھی راجستھان تھا، اس لیے کھیاتوں کی زبان زیادہ تر مارواڑی ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:-

دھوم کنور ماریاں راؤ ناہڑ ریساڑ
گو آسل کھینڈھلا سانگ سوں دُوہ کہاڑ

یعنی دھوم نے کنور کو مار ڈالا جس سے اس کا والد ناہڑ ناراض ہوا، اس لیے دھوم کی آسل ذات سینڈھلا میں آباد ہوگئی اور اسی وقت سے دونوں میں جھگڑا پیدا ہوگیا،

یہ دور ۱۰۰۰ء سے شروع ہوکر ۱۶۷۵ء میں ختم ہوتا ہے، کیونکہ ہر چند ۱۴۰۰ء کے بعد کبیر کی موحدانہ شاعری اور ۱۵۵۰ء کے بعد تلسی داس اور سور داس کی بھگتی تحریک شروع ہوئی تھی مگر راجستھان میں چارنوں کی رزم گوئی ہنوز باقی تھی، اس زمانہ کے شروع میں ہم کو بگڑی ہوئی ہندی سے نکلی ہوئی ہندی کی ایک اور نئی شکل دکھائی پڑتی ہے، جسمیں کھماں، راسو اور بیسل راسو کی تصنیف ہوئی، اگرکاشی پرشاد جیسوال کے بیان کے مطابق ہندی ۷۰۰ء کے قریب مقامات کے قرب و جوار میں دندھیا، زبان کی شکل میں رائج تھی اور اسکی ادبی شکل ۸۰۰ء کے قریب پیدا ہوئی، انکی رائے کے مطابق ہندی کے ابتدائی مصنف کا نام سرہا[1] تھا، مگر اس بات کی ابھی تک تصدیق نہیں ہوسکی، بہر حال زمانہ پر نظر ڈالنے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسمیں رزمیہ جذبات کافی موجود تھے اور ہندی ادب کا ابتدائی زمانہ قومی جذبات پر مشتمل تھا،

اس رزمیہ شاعری کی دو قسمیں ہیں، پہلی غنائی شاعری (Ballads) اور دوسری فنی شاعری، پہلی شکل کی مثال بیسل دیو راسو ہے جسمیں مالوہ کے راجہ بھوج پرمار کی لڑکی راج متی اور سانبھر کے راجہ بیسل دیو کی محبت کا قصہ درج ہے، فنی شاعری کی مثال پرتھوی راج راسو ہے جو ہندی کی سب سے پہلی مثنوی تصور کیجاتی ہے، اسکے مصنف کا نام چند بردائی کہا جاتا ہے، اسمیں ۶۹ ابواب ہیں اور اسمیں پرتھوی راج چوہان کی بہادری اور محمد غوری سے جنگ کا بیان ہے، اس کتاب کو مورخین ادب نے ہندی کی سب سے پہلی مثنوی تصور کیا ہے لیکن اوجھا کی تحقیق یہ ہے کہ سنسکرت مثنوی "پرتھوی راج وجے" کو دیکھکر اس کتاب کی اولیت میں شک کیا جاسکتا ہے، انکے شک کے اسباب یہ ہیں:-

(۱) تاریخوں میں اختلاف۔
(۲) تاریخی سنیوں اور واقعات میں بھول۔
(۳) زبان و بیان کا انداز۔

---

[1] ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کا خطبۂ صدارت۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء

Bengal Asiatic Society journal R III ot

اس بحث طلب مسئلہ کا حل ابھی تک نہیں ہو سکا اس لیے اس کتاب کے متعلق قطعی رائے دینا خطرہ سے خالی نہیں ہے، اسوقت کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے دیکھنے سے اور نیز ڈاکٹر ایس۔ پی تیسٹری کی کتاب (...ic & Historical Survey of India) کے دیکھنے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی ماحول کی اسوقت کی شاعری پر سب سے زیادہ حکومت تھی لیکن چونکہ قومی جذبات محدود تھے۔ اور مخصوص کسی نہ کسی راجہ سے متعلق ہوتے تھے اس لیے اُس زمانہ کی شاعری کو بطل پرستی (Hero worship) کے نام سے پکارتے ہیں:۔

دوسرا دور:۔

اب ہم دوسرے دور کی طرف قدم بڑھاتے ہیں یہ زمانہ ۱۶۵۰ء سے ۱۸۷۵ء تک رہا ہے۔ اس دور میں صرف راجستھان میں ہی نہیں بلکہ شمالی وجنوبی ہند میں بھی شعراء کو راجاؤں کی امداد حاصل ہوئی اور انھوں نے اپنے محافظوں کی تعریف میں قصائد کہنا شروع کیے، ایسے شعراء میں سب سے زیادہ تفوق بھوشن کو حاصل ہوا، جب انھوں نے شیواجی کی تعریف میں "شیوراج بھوشن" تصنیف کی، اسمیں اُسکی بہادری کا بیان کرتے ہوے اُسے ہندو مذہب اور ہندو قوم کا محافظ کہا گیا ہے۔

بھوشن کی شاعری گو دور اول کی رزمیہ شاعری سے کچھ آگے ضرور بڑھی مگر مذہبیت سے باہر نہیں نکلی اور اسی لیے اسنے مسلمان بادشاہوں کی دل کھول کر ہجو کی ہے۔

اس زمانہ میں اگرچہ عشقیہ شاعری بام عروج پر تھی مگر رزم گو شعراء کی بھی کمی نہ تھی، بھوشن کے علاوہ چھتر پرکاش کے مصنف گورے لال، جنگ نامہ کے مصنف مرلی دھر، ہمیر راسو کے مصنف جودھ راج، سوجان چرت کے مصنف سودن خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، اگرچہ ان شعراء کی تصانیف میں تاریخ کا مواد ضرور ملتا ہے۔ مگر اسمیں نہ کوئی ادبی خصوصیت پائی جاتی ہے اور نہ قومی جذبات کا مناسب ارتقاء۔ بھوشن کی گورے لال بھی اپنے چھتر پرکاش میں چھتر سال کی تعریف کرتے ہوئے اس مذہبیت کی تنگ نظری میں مبتلا نظر آتے ہیں،

تیسرا دور:۔

ہمارے سامنے اب تیسرا دور آتا ہے جو ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۰ء تک رہا ہے، اس زمانہ میں بہت سے سیاسی انقلاب رونما ہوئے اور حکومت وتہذیب کا نقطۂ نظر بھی بدل گیا، انگریزی تعلیم کا اثر ملک میں بہت زیادہ پڑا اور لوگوں کی نظر ملک کی اجتماعی صورت کی طرف گئی، اسوقت کے مشہور ہندی مصنف بابو بھارتیندو ہرسچندر تھے۔ انھوں نے ہندی ادب کی ضروریات کو بڑی کامیابی کے ساتھ پورا کیا، اور ادب میں نیا جوبن بھر دیا۔ ہندی ادب میں اسوقت سے پہلے ناٹک نہیں تھے، انھوں نے اس ضرورت کو مدنظر رکھ کر ۱۹ ناٹک تصنیف کیے،

انمیں سے بعض سنسکرت اور انگریزی کا ترجمہ ہیں، علاوہ فنی خصوصیت کے قومیت کے لحاظ سے بھی بابو ہریش چندر مشہور ہیں
انھوں نے اپنے ناٹکوں میں جو وطن پرستی اور قومیت کا تعارف کرایا ہے اس سے انکی شخصیت بہت بلند معلوم ہوتی
ہے ایسے ناٹک۔ بھارت جننی۔ بھارت درودشا اور نیل دیوی وغیرہ ہیں۔ اگرچہ نیل دیوی میں انکا نقطۂ نظر بھی محدود
ہوگیا ہے مگر اور دو ناٹکوں میں یہ عیب نہیں ہے بہرحال ہریش چندر ناٹک میں انکے قومی جذبات بہت وسیع ہوگئے ہیں
اپنے ناٹکوں میں بھارتیندو نے یورپی تہذیب کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر انھوں نے بتلایا ہے کہ ہندوستان کیلئے
ہندوستانی تہذیب ہی مناسب ہے۔

الغرض ہم بھارتیندو کے دل و دماغ میں متحدہ ہندوستان کی شکل منقوش پاتے ہیں۔ اور انکا تصورِ قومیت
پچھلے دو دور سے بہت زیادہ عظیم الشان ہے۔ بھارتیندو کے معاصر پرتاب نارائن مصر اور بال کرشن بھٹ انھیں کے
قدم بہ قدم چلے ہیں۔

موجودہ دور۔

اس کے بعد موجودہ دور کے تصور قومیت کو ملاحظہ کیجئے۔ یہ زمانہ ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اسے ہم ہندی
شعری میں قومی زمانہ کہہ سکتے ہیں، اس زمانہ میں قومی ترقی بہت کافی ہوئی ہے۔ اور بھارتیندو کے بنائے ہوئے رستہ
پر چل کر شعرا نے کافی کامیابی حاصل کی ہے ۱۹۱۲ء میں میتھلی سرن گپت نے اپنی مشہور کتاب بھارت بھارتی لکھکر
کافی تحریک قومی جذبات میں پیدا کی۔

بھارت بھارتی میں ہم بھارتیندو کی تصانیف کی طرح آزادی کا درس دیا گیا ہے اور ۱۹۱۹ء کے بعد نان
کواپریشن کی وجہ سے یہ جذبات زیادہ روشن ہوگئے ہیں،

قیدی اور کوئل کے عنوان سے ایک نظم میں حسب ذیل جذبات کا اظہار کیا ہے:۔

تجھے ملی ہریالی ڈالی
مجھے نصیب کوٹھری کالی
تیرا نبھ بھر میں سنچار
میرا دس فٹ کا سنسار
تیرے گیتوں اٹھتی واہ
رونا بھی ہے مجھے گناہ
دیکھ لِسمتا تیری میری
بجا رہی تس پر رن بھیری

اس سنکرت پر اپنی کرت سے اور کہو کیا کر دوں
کوکل بولو تو
موہن کے برت پر پرانوں کا آنسو کس میں بھر دل
کوکل بولو تو

یعنی اے کوئل تجھ کو ہری ڈالی ملی اور مجھ کو کالی کوٹھری نصیب ہوئی، تو آزاد ہو کر آسمان میں اُڑ سکتی ہے اور میری دُنیا صرف دس فٹ کی ہے۔ تو جب گاتی ہے تو واہ واہ کا شور ہوتا ہے اور میرا رونا بھی گناہ ہے۔

اسمیں کوئل کی آزادی اور اپنی غلامی کا فرق بتلاتے ہوئے آزادی کے لیے کتنی پُر درد پکار ہے ہری سو بھدرا کماری چوہان "بیروں کا کیسا ہو بسنت" عنوان دیکر لکھتی ہیں:-

کہہ دے اتیت اب مون تیاگ
لنکے تجھ میں کیوں لگی آگ
اے کرو چھیتر اب جاگ جاگ
بتلا اپنے انو بھو اننت
بیروں کا کیسا ہو بسنت
بھوشن اتھوا کوی چند نہیں
بجلی بھر دیں وہ چھند نہیں
ہے قلم بندھی سوچھند نہیں
پھر ہمیں بتا دے کون ہنت
بیروں کا کیسا ہو بسنت

اے ماضی اب اپنی خاموشی ترک کر دے۔ اے لنکا تجھ میں کیوں آگ لگی اے کروکشیتر (ہندوؤں کے مشہور مذہبی میدان جنگ کا نام) اب بیدار ہو جا۔ اپنے لاتعداد تجربے بتلا کہ بہادروں کا بسنت کیسا ہو۔ بھوشن اور چند کوی (یہ دونوں رزم گو ہندی شاعر ہیں) ہمیں نہیں ہوں، جنکی نظم سننے والے کے دل میں بجلی بھر دے، قلم جکڑا ہوا ہے آزاد نہیں ہے، پھر ہم کو کون بتا دے کہ بہادروں کا بسنت کیسا ہونا چاہیے۔ اس طرح کی نظموں میں کہ جہاں ملک کی طرف سے محبت کا جذبہ نظر آتا ہے وہاں کہیں کہیں اخوت انسانی کے خیالات بھی ملتے ہیں، جذبات قومی موجودہ ہندی شاعری میں بلندی تک ضرور پہونچ گئے ہیں، مگر انمیں سنجیدگی اور اصول کی کمی ہے ملک کی ترقی کیلئے جو کچھ لکھیں آیا اسکا کہہ ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح کی شاعری میں احساس اور سنجیدگی کی ضرورت ہے۔

براہم کمار ونرما

رامائن و مہابھارت

رامائن و مہابھارت کے متعلق ایک خیال عام طور پر یہ غلط قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ دونوں رزمیہ شاعری کی کتابیں ہیں۔ مہابھارت تو یقیناً رزمیہ داستان ہے اور اپنی تمام خصوصیات کے لحاظ سے دُنیا کی بہترین رزمیہ شاعری کے مقابلہ پر پیش کی جا سکتی ہے لیکن رامائن کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کوئی داستان رزم ہے یا اس حیثیت سے مہابھارت کے ساتھ اسکا ذکر کیا جا سکتا ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

رامائن انسانی زندگی کے جس مقصد کو پیش کرتی ہے وہ مہابھارت کے مطمح نظر سے بالکل علٰحدہ ہے اور مہابھارت جن خیالات کے ماتحت مرتب ہوئی ہے وہ رامائن سے جدا ہیں اسکے سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ یہ دونوں کتابیں کیونکر وجود میں آئیں۔

ممکن ہے لوگوں کا اُنکی ترتیب کے متعلق یہ خیال ہو کہ جس طرح دُنیا کی تمام کتابیں مرتب کی جاتی ہیں اُنکو بھی کسی شاعر نے (فردوسی کی طرح) چند سال سے یا زیادہ زیادہ اپنی ساری عمر میں مرتب کیا ہو لیکن غالباً یہ خیال صحیح نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ نظم کی حیثیت سے انکی ترتیب اسی طرح ہوئی ہو جس طرح اور کتابوں کی ہوتی ہے۔ لیکن ان کا مواد فراہم ہوا ہے یقیناً صدیوں میں اور ان کے خیالات نتیجہ ہیں خدا جانے کتنی نسلوں کے جذبات کے اور عطر ہیں کتنی روایات قدیمہ کے،

فرض کر لیجیے کہ ظہور مسیح سے ایکہزار سال قبل یا اس سے بھی پیشتر اودھ اور شمالی بھارت میں دو سلطنتیں ہیں اور یہاں کے حکمران اپنی فیاضی، اسیر چشمی، رعایا پروری، انصاف پسندی، علم نوازی، اور اُن تمام انسانی صفات سے متصف ہیں جنھیں بہترین اصول اخلاق متعین کر سکتے ہیں، رعایا خوشحال ہے ہر جگہ امن و سکون کی حکومت ہے، بغض و حسد، کینہ و عداوت مفقود ہے، رافت و اُلفت سے ایک ایک دل بریز ہے، علوم و فنون کی ترقی ہو رہی ہے اور روحانیت کا جلوہ ہر جگہ نظر آ رہا ہے۔ لیکن آپ اسوقت موجود نہیں ہیں بلکہ آپ اسکے کئی صدی بعد پیدا ہوئے ہیں اور جب ہوش سنبھالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ گھر کی بڑی بوڑھیاں، خاندان کے معمرین اور جوان افراد مختلف صحبتوں میں اس زمانہ کا ذکر کیا کرتے ہیں، مائیں بچوں کو لوریاں سناتی ہیں اور ان میں رام اور سیتا کا ذکر ہوتا ہے، چھوٹوں کو نصیحت کرتی ہیں تو انھیں کی مثالیں پیش کرتی ہیں، ڈراتی ہیں تو راون کی بھیانک تصویر کھینچتی ہیں، الغرض

بچپن سے آپ کے کان اس ذکر سے آشنا ہوتے رہتے ہیں اور جب آپ بڑے ہوتے ہیں تو اپنے چھوٹوں سے یہ روایات بیان کرتے ہیں لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ راماین کے منظوم ہونے وقت (جو یقیناً صدیوں بعد کا واقعہ ہے) تمام روایات بجنسہٖ منتقل ہوئی ہونگی اور ان میں کوئی مبالغہ، کوئی حشو و زوائد کوئی حاشیہ کوئی خیال آرائی شامل نہوئی ہوگی، یقیناً ایسا ہوا اور ہونا ناگزیر تھا، اس عہد کی یہ روایات سینہ بسینہ نثر ہی میں منتقل نہیں چلی آرہی تھیں بلکہ مختلف زمانوں کے مختلف شعراء نے انکو اپنے اپنے خیال و ذہن کے مطابق نظم بھی کرلیا تھا اور احباب کے مجمع میں انکو سنایا کرتے تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ جو روایات صدیوں تک شاعری کے ذریعہ سے نسلاً بعد نسل منتقل ہوئی ہونگی انمیں آہستہ آہستہ امتداد زمانہ کے ساتھ ہر عہد کے خیالات و جذبات کیا کچھ شامل نہ ہوئے ہونگے بیشک شامل ہوئے اور اس حد تک کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ راماین کے افسانے میں حقیقت کتنی ہے اور رنگ آمیزی کس قدر۔ میں یہ نہیں کہتا کہ راماین کے جتنے کیرکٹرس (اشخاص) ہیں وہ سب فرضی ہیں لیکن یہ ضروری کہونگا کہ راماین کی حقیقی عزت کا راز اشخاص سے وابستہ نہیں ہے بلکہ صرف اس امر سے وابستہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی تصویر یہ ہمارے سامنے پیش ہوجاتی ہے اور انسانی زندگی کی جن مختلف حالتوں اور انسانی معاشرت کی جن مختلف کیفیات کو وہ ظاہر کرتی ہے، اسکا تتبع اگر آج بھی کیا جائے تو نوع انسانی کو اس دنیا میں نجات اخروی کا لطف حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر ہمارے ملوک و امراء دسرتھ کے سے اوصاف حاصل کرلیں، اگر ہمارے شاہزادے رام کا سا عزم، رام کی حق پرستی، رام کا سا پاس عہد اور رام کی سی شجاعت کے حامل ہوں، اگر ہماری عورتوں میں سیتا کی سی وفاداری اور مصائب کے مقابلہ میں سیتا کا سا عزم و ثبات پیدا ہوجائے تو یقیناً ہماری حالت بدل جائے اور ہم پھر اپنی کھوئی ہوئی عزت کو حاصل کرلیں۔

راماین میں انسانی سیرت کو جس قدر بلند دکھایا گیا ہے، وہ اگر افسانہ کے لحاظ سے واقعہ نہ ہو تو بھی ہمارے لیے ایک آئیڈیل ضرور ہے اور اگر کبھی کسی ملک پر ایسا زمانہ گزرا ہے تو یقیناً وہ اس کا عہد زریں تھا اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

مہابھارت میں جس جنگ کا ذکر کیا گیا ہے اسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ قبل مسیح تیرھویں یا چودھویں صدی میں ہوئی تھی، لیکن اسکی روایات بھی واقعات راماین کی طرح منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں، یہاں تک کہ صدیاں اسی طرح گزر گئیں اور قبل مسیح تیسری یا چوتھی صدی میں یہ مختلف روایات ایک شیرازہ سے منسلک کرکے رزمیہ داستان کی صورت سے نظم کی گئیں، لیکن اس کے بعد اسمیں اضافہ ہوتا رہا، واقعات بڑھائے جاتے رہے مختلف عہد کے شعراء نے اپنی رنگین بیانیوں سے اسکو ضخیم بنایا ہر جدید مصلح نے اپنے خیال و اعتقاد کے مطابق اسمیں مختلف قواعد و قوانین کا اضافہ کیا اور ہر راوی نے اپنی ذاتی رائیں شامل کرکے مہابھارت کو اسقدر

حشو و زوائد سے بھر دیا کہ اس کے اشعار کی تعداد ۹۰ ہزار تک پہونچ گئی۔ اس لیے اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مہابھارت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ سب اُسی عہد کا واقعہ ہے جب کوروں اور پانڈوں میں جنگ ہوئی تھی تو میں اس کے ماننے کے لیے طیار نہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ جنگ وقوع میں آئی اور جنگ کے متعلق اس کتاب میں جتنے بیانات ہیں وہ واقعیت کے لحاظ سے جو مرتبہ بھی رکھتے ہوں، مگر رزمیہ شاعری کی حیثیت سے عجیب و غریب چیزیں ہیں اور جس قوت و جوش کے ساتھ انھیں بیان کیا گیا ہے وہ یقیناً قدیم ہندوستان کی تاریخ ادب کا ایسا ترکہ ہے جو تمام آریہ ورت کے باشندوں کے لیے وجہ ناز ہو سکتا ہے۔

دُنیا کی تمام اُن کتابوں میں جنھیں ہم "زائیدہ خیال" کہتے ہیں۔ مہابھارت کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے بعض کا خیال ہے کہ ہومر کی الیڈ و اڈیسی مہابھارت اور رامائن سے بڑھی ہوئی ہیں، لیکن غالباً یہ صحیح نہیں اگر نظم و خیال کی تمام ممکن خوبیاں الیڈ و اڈیسی میں پائی جائیں، تو بھی وہ روح مذہبیت جو ہر آرٹ کی جان ہے انمیں کہاں سے آسکے گی، ان کتابوں کا مقصد وحید صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ یونان قدیم میں زندگی کا نصب العین لطف و مسرت، عیش و احساس حسن اور فنا دگی عشق کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن رامائن و مہابھارت کا مقصد اس سے نہیں زیادہ بلند ہے کیونکہ انکے نقش و نگار کی بیک گراونڈ (Back ground) مذہب و روحانیت ہے۔ کہاں ہومر کی ہلن جو صرف نسوانی حسن و جمال اور معشوقانہ دلکشی و دلربائی کا ایک اچھا نمونہ ہے اور کہاں سیتا جو علوئی فطرت، عصمت و حیا، عزم و ثبات ایثار و قربانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

جب رامچندر جی بن باس ہوتے ہیں تو سیتا جی کہتی ہیں کہ :-

> میرے ماں باپ نے ہمیشہ یہ تعلیم دی تھی کہ شادی ہو جانے کے بعد لڑکی کا گھر صرف شوہر کا پہلو ہوا کرتا ہے اور اُسے ہر حال میں اپنے خاوند کا اسی طرح شریک رہنا چاہیے جیسے جسم کے لیے سایہ، اس لیے مجھے بھی اپنے شوہر کے ساتھ جنگلوں میں بھٹکنے دو، یہ جنگل مجھے گھر کے محلوں سے زیادہ محبوب ہیں

آپ ہومر کی تصانیف میں بڑی بڑی نادر تشبیہیں پائیں گے انداز بیان کے نہایت اچھے اچھے نمونے دیکھیں گے لیکن نہ وہاں کوئی سیتا نظر آئے گی اور نہ کوئی رام، نہ کوئی دسرتھ وہاں تلاش کرنے سے آپکو مل سکے گا اور نہ کوئی کرشن ممکن ہے کہ ڈانٹے (Dante) کی (Divine Comedy) کو رامائن کے مقابلہ میں پیش کیا جائے لیکن اگر یوروپ کا عہد وسطیٰ جسکی تصویر ڈانٹے نے کھینچی ہے، ہندوستان قدیم کی اخلاقی تہذیب کا مقابلہ کر سکتی ہے تو ڈوائن کمیڈی کا ذکر رامائن کے مقابلہ میں کیا جا سکتا ہے ورنہ ان دونوں میں کوئی نسبت نہیں وہ انسان اعلیٰ جو رامچندر اور سیتا جی کے لباس میں دکھایا گیا ہے اور وہ پاکیزہ و مقدس جسکی تصویر رامائن میں کھینچی گئی ہے انسانیت کا وہ بلند و اعلیٰ نصب العین جو کرشن جی کی صورت میں بتایا گیا ہے یقیناً نہ ہومر کے خیال میں آسکتا تھا نہ ڈانٹے کی پرواز خیال وہاں تک

پہونچ سکتی تھی۔

میں نے تمہید میں ظاہر کیا تھا کہ راماین کو رزمیہ شاعری نہیں کہا جا سکتا، اور یہ اس لئے کہ ساری کتاب میں رزم کا حصہ صرف وہ ہے جہاں رامچندر جی نے راون سے جنگ کی ہے اور یہ بھی مہابھارت کے انداز بیان کے مقابلہ میں بہت پھیکا ہے۔ مثلاً راماین میں سیتاجی کے سوئمبر کو لے لیجئے اور اس کے مقابلہ میں مہابھارت کی دروپدی کے واقعۂ شادی کو دیکھئے، زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ وہاں بزم کی لطافتیں ضرور ہیں، لیکن رزمیہ جوش مفقود ہے برخلاف اس کے دروپدی کے واقعۂ نکاح کی شاعر نے تصویر کھینچی ہے کہ جب متعدد بہادر و جنگ آزما چاہنے والے کسی عورت کے لئے نمائش قوت کریں گے تو میدان مقابلہ کا کیا عالم ہوگا۔ اسی طرح رامچندر جی و راون کے درمیان یا لکشمی اور اندرجیت کے مابین جو جذبات درتابت راماین میں بیان کئے گئے ہیں، اُن میں وہ سختی و اشتداد نہیں ہے جو مہابھارت کے ارجن و کرن، بھیم، و دریودھن کے جذبات میں نظر آتی ہے۔ مقابلہ کرکے دیکھئے کا تو چنگاری اور شعلہ کا فرق نظر آئے گا۔

جب سیتاجی کو راون لیجانے لگا ہے تو انھوں نے مزاحمت کی اور نہایت سختی سے اُسے جواب دیا، مگر الفاظ میں جوش اور قوت نہیں ہے برخلاف اس کے جب دروپدی کی توہین دربار میں ہوئی ہے اور اس نے جس طرح اپنے جذبات نفرت و حقارت کو ظاہر کیا ہے وہ ناگن کی پھنکار معلوم ہوتی ہے۔ راون بھی مشورۂ جنگ کے لئے ارکین دربار کو طلب کرتا ہے اور یودھشٹر بھی لیکن وہاں فسردگی و اضمحلال ہے یہاں جوش و اشتعال۔ بھبھیشن راون سے آشتی کی گفتگو کرتا ہے اور راون اس کو رد کر دیتا ہے لیکن ضعیف الفاظ میں کرشن جی کوروں کے راجہ سے احتراز جنگ کی التجا کرتے ہیں تو دریودھن کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ:—

"تم قصبہ اور گاؤں کا کیا ذکر کرتے ہو، اگر تم صرف سوئی کی نوک سے ڈھک جانے والا حصۂ زمین بھی چاہو گے تو تمھاری خواہش رد کر دی جائے گی۔"

راماین میں رامچندر جی اور راون کے درمیان جو مناظر جنگ دکھائے گئے ہیں وہ ارجن و کرن، بھیم و دریودھن کی جنگ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مہابھارت میں جتنے کیرکٹر ہیں وہ اسی دنیا کے انسان ہیں جن میں کمزوریاں بھی ہیں اور بھلائیاں بھی، برخلاف اس کے راماین کے اشخاص کسی مخصوص عالم کی ہستیاں نظر آتی ہیں۔ مہابھارت میں ہندوستان کی ایک قدیم جنگ کا حال بہترین صنعت شعری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور راماین میں اسی عہد کے وہ واقعات اخلاق و معاشرت دکھائے گئے ہیں جن کی بنا پر ہم اُسے ہندوستان کا عہد زریں کہتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بہت فرق ہوگا۔ اور یہ فرق اتنا بیّن ہوگا کہ جب تک ہم دونوں کتابوں کا علحدہ علحدہ مطالعہ نہ کریں اس وقت تک ہمارا علم ہندوستان قدیم کے متعلق مکمل نہیں ہو سکتا۔

ہندی کی عشقیہ شاعری

عام قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر ذی روح کا نر سراپا پرستش و نیاز ہوتا ہے اور مادہ سرتاسر عشوہ و پذیرائی۔[1] چنانچہ یہی اُصولِ فطرت انسانوں میں بھی جاری ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ کا مرد عورت کے سامنے زانو ٹیک کر اُس سے نازو حسن کی بھیک مانگتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مرد نے عورت پر کتنے ہی مظالم کیوں نہ کئے ہوں، اور پادریوں، ملاؤں اور زاہدوں نے اپنی النفس پرستی دخیرہ سری کی بنا پر عورت کی پوزیشن کو کتنا ہی غارت کیوں نہ کیا ہو لیکن جب کبھی اسی سرزمین کے کسی دل باختہ شاعر نے اپنے قلب میں جذباتِ لطیف کی تڑپ اُٹھتی دیکھی ہے اور ملاءِ اعلیٰ سے اُس پر افکارِ عالیہ کا فیضان ہونا شروع ہوا ہے تو وہ ہمیشہ عورت کی ہر جنبشِ ابرو کا پرستار نظر آیا ہے آپ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کی، عرب میں بعثت سے پہلے کی یا کسی اور سرزمین کے دورِ وحشت و جہالت کی شاعری کو اُٹھا کر دیکھئے آپ کو یہ حقیقت صاف طور پر نظر آئے گی۔

لیکن اس کے باوجود آپ کو یہ سُن کر سخت حیرت ہو گی کہ دنیا میں ایک گوشہ ایسا بھی ہے جہاں کی شاعری اس کلیہ کے بالکل خلاف ہے اور وہ گوشہ خود آپ کا وطن ہندوستان ہے۔ یعنی یہاں جذبات مرد کی جانب سے نہیں بلکہ عورت کی زبان سے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہاں مرد اپنی متاعِ صبر و ہوش کو خیرباد نہیں کہتا بلکہ عورت اپنے دل کی دنیا اُجاڑتی ہے۔ یہاں مرد کسی کی چشم و ابرو کا گھائل نہیں ہوتا بلکہ عورت کسی کے ناز و کرشمہ کا شکار بنی مرغِ بسمل کی طرح تڑپتی رہتی ہے۔ چنانچہ رامائن میں پہلے پہل سیتا ہی کے دل میں رام کی محبت کا تیر پیوست ہوا ہے بھاگوت میں پہلے رُکمنی ہی نے سری کرشن کے پاس اپنا پیامِ محبت بھیجا ہے۔ مہابھارت میں دمینتی ہی نے نل کے سامنے اپنے جذباتِ عشق کو پیش کیا ہے۔ اور اسی طرح ابتدا ءً سنجوگتا ہی نے پرتھوی راج کی حسین چتون پر اپنے دل کی بھینٹ چڑھائی ہے۔

مثال کے طور پر ہندی کے مستند شعراء کے کلام سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو "بک آف نالج" جلد ۸ صفحہ ۵۲۴۸ - [2] میں نے ہندی نظموں کا آزاد ترجمہ پیش کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ حتی الوسع شعر کی اصل اسپرٹ کو باقی رکھا جائے جس کی وجہ سے بعض جگہ ترتیبِ الفاظ میں تغیر و تبدل بھی کرنا پڑا ہے۔

۱۔ گردھر کوی رائے کا ایک سویّا (قطعہ) ہے جس میں ایک لڑکی اپنی نوجوان سہیلی کو مخاطب کر کے کہتی ہے :-

سوّیا :- رادھا پیاری! فضول باتیں نہ بناؤ
میں تمہارے راز کو خوب جانتی ہوں
تم کرشن کی سندرتیون کے آگے اپنا دل ہار چکی ہو ۔۔۔ اور
باغ میں اُسے "محبت کا نذرانہ" بھی پیش کر چکی ہو
آخر تم نے شرما کر اپنے منھ پر آنچل کیوں ڈال لیا ہے؟
تم آدھے راستے سے چھپ کر کیوں بھاگتی ہو؟
سکھی! کیا شرم سے محبت چھپ سکتی ہے؟
کیا جال میں پانی رک سکتا ہے؟

۲۔ بہاری لال کہتا ہے :-

دوہا :- میں دن بھر آئینہ لئے بیٹھی رہتی ہوں
اپنے لبوں کو کھولتی ہوں، چھوتی ہوں اور پھر چھپا لیتی ہوں ۔۔۔ کیونکہ
میرے سوامی نے رات بھر ان کو کاٹا ہے

۳۔ "شب وصل" ایک ایسا موضوع ہے جس پر دنیا کا ہر شاعر اپنی ذاتی کیفیاتِ طرب کو پیش کرتا ہے لیکن ایک ہندی شاعر ان سب سے الگ اس کو یوں ایک عورت کی زبان سے ادا کرتا ہے :-

سوّیا :- سوامی! اتنے مست ہو کر میرے کپڑوں کو مت کھینچو
ٹھہرو، ذرا دئے کو مدھم کر دوں،
دوڑ کر دروازہ لگا آؤں
دیکھ آؤں کوئی ہے تو نہیں ۔۔۔ اور
ان ہنسوں اور ہرن کے بچوں کو باہر نکال دوں ۔۔۔ پھر
میں آپ کی ہوں ۔۔۔ پیارے سوامی!

(کیشو داس)

۴۔ دردِ ہجر :-
سویا :- "ناتھ! تم کب آؤ گے؟"

وہ یہ کہتی ہے اور اپنے حسین رخساروں اور کنول جیسی آنکھوں کو اوپر کئے مغموم بیٹھی رہتی ہے۔
کبھی کووں کو اُڑاتی ہے
کبھی شگون لیتی ہے۔
کبھی اُس کی واپسی کے دنوں کو گننے لگتی ہے
کبھی پڑھے ہوئے خط کو پھر پڑھتی ہے ——— اور
کبھی گھنٹوں بیٹھی اُس کی تصویر کو تکتی رہتی ہے

(سیناپتی)

سہیلیو! زیادہ باتیں نہ بناؤ ——— جاؤ
مجھے اُس کے بغیر یہ اٹاری سونی معلوم ہوتی ہے

(عبدالرحیم خان خاناں)

حسن پھول! [illegible] ؟
[illegible] دیکھ کر میرا [illegible]

(عبدالرحیم خان خاناں)

سکھی! میری بپتا سُن کر مجھ پر ترس کھاؤ
برہ [illegible] سے سینچا کروں گی
تمہارے ہرے ہرے پتوں کو [illegible] کروں گی ——— مگر
مجھ دکھیا کو میرے پیتم سے ملا دو

(گوبند داس جیتپوری)

اس کے مقابلہ میں عرب کے اُس ہجر زدہ شاعر کا تصور کیجئے جس کو محبوبہ کا دیدار صرف خواب ہی میں نصیب ہوسکتا ہے

أَنَّى سَرَبْتِ وَكُنْتِ غَيْرَ سَرُوبٍ   وَتُقَرِّبُ الْأَحْلَامُ غَيْرَ قَرِيبٍ

تو آج رات کیسے آگئی۔ حالانکہ تو تو کبھی نہ آتی تھی ؟ گرہاں، خواب سے دور کی چیزیں قریب ہو جاتی ہیں۔

مَا تَمْنَعِي يَقْظَى فَقَدْ تُؤْتِينَهُ   فِي النَّوْمِ غَيْرَ مُصَرَّدٍ مَحْسُوبِ

تو نے بیداری میں ہمیشہ میرے سامنے آنے سے اعتراض کیا، لیکن خواب میں کس بے باکی سے آگئی۔

كَانَ الْمُنَى بِلِقَائِهَا فَلَقِيتُهَا   فَلَهَوْتُ مِنْ لَهْوِ امْرِئٍ مَكْذُوبِ[1]

میں تجھے دیکھنے کو ترستا تھا، سو آج دیکھ لیا ——— خواب کی ملاقات ہی سے دل بہلا لیا۔

[1] قیس ابن الخطیم، زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر

لیکن اس کے برخلاف ہندوستان کی سرزمین میں جو آواز کانوں میں پڑتی ہے وہ یہ ہے :-

اوکوّے ! کھالے، تو میرے سارے جسم کو کھالے
میرے گوشت کی ایک ایک بوٹی کو نوچ ——————— لیکن
میری دونوں آنکھوں کو باقی رہنے دے
شاید یہ کبھی پیا کو دیکھ سکیں

نوجوان شکنتلا اپنے محبوب راجہ دُشانیتا کے عشق سے بے قرار ہو کر کہتی ہے :-

تم تو چین سے سو رہے ہوگے
لیکن ظالم محبت مجھے یہاں کھائے جارہی ہے
میرے دل کی گہرائیوں سے ایک چیخ نکل رہی ہے
ہائے ! میں سب کچھ تم پر لٹا چکی !!

اس کے مقابلہ میں براؤننگ کی اُس مشہور نظم کو پڑھیے جس میں وہ اپنی سنگدل محبوبہ کے سامنے زانو ٹیک کر صرف ایک مرتبہ اُس کے ساتھ سیر کے لئے چلنے کی بھیک مانگتا ہے۔ اور اسی کو اپنی روح کے لئے ایک غیر فانی بہجت و سرور تصور کرتا ہے[1]

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

[illegible] کا پہلا تیر :-

سویّا :-
سکھی ! ایک دن میں سب سہیلیوں کے ساتھ جارہی تھی -
یکایک میری نظر موہن پر پڑی ——————— اور
آہ ! میں لُٹ گئی !!
میری سکھیاں میرے دل کی حالت کو تاڑ گئیں
میں نے ایک مرتبہ پھر اُس کی طرف دیکھا
ہائے ! وہ اپنے سندر تیر کمان سے میرا دل زخمی کرگیا !!
(عبدالرحیم خان خانان)

---

[1] The last Ride together

سویّا:- میں شام کو آنکھ مچولی کھیلنے گئی تھی
وہاں ایک بڑی انوکھی بات ہوئی
ایک جگہ چھیل اور میں تنہا چھپے تھے
چھیل نے مجھے پکڑ کر چمٹا لیا
اف! میرا بدن پسینہ سے شرابور ہوگیا
میں کانپنے لگی
میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے
میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں

(متی رام)

سویّا:- میں اکیلی اپنے گاؤں جا رہی تھی
یکایک اُس سناٹے میں اُس نے مجھے آلیا
میں نے کہا ——— ارے سانولے، ارے پاگل مجھے مت چھو
مگر ——— ہائے! میں کیا کہوں!!
اُس نے مجھے خوب چمٹایا
میں کچھ نہ بول سکی
یہ نگاہ بھر آئی
اور چپ چاپ کھڑی رہی۔

(پدماکر)

سویّا:- سہاگن کی بات تم سب اپنے کانوں سے خوب سنو!
[illegible] ——— اور
اُسے پیار اچھا ہوا ——— مگر
میں نے ناحق ست دیوار پر ایک تصویر بنائی ——— کیا؟
ایک شیرنی اور ہاتھی پاس پاس بیٹھے ہیں
شیرنی بچہ دے رہی ہے ——— بچہ
وہ بچہ اُس کے "جسم" سے علٰحدہ ہو اور جھپٹ کر ہاتھی کی مستک پر بیٹھ گیا۔ (کالیداس ترویدی)

دوہا:- اُس رات جب وہ آیا تو میں نے اپنے دونوں زانوؤں سے اپنا "سینہ" چھپا لیا
اس ڈر سے کہ کہیں وہ میرا "جوبن" نہ چھو لے

(عبدالرحیم خان خاناں)

بڑی عیاری سے وہ شوخ میرے پاس آیا اور
بچّہ کو میری گود سے لینے کا بہانہ کر کے میرے "سینہ" کو مس کر گیا

(...)

یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ امراءالقیس کو فحش گو شاعر کہا جاتا ہے۔ اور اس کے جن اشعار کی بنا پر اس کے باپ نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا وہ یہ ہیں [۲]۔

وَیَومَ دَخَلتُ الخِدرَ خِدرَ عُنَیزَۃٍ فَقَالَت لَکَ الوَیلَاتُ اِنَّکَ مُرجِلِی

ایک دن میں عنیزہ کے ہودج میں دفعتہً گھس گیا، اُس نے چلا کے کہا "ارے تیرا ناس ہو کیا تو مجھے پیدل چلا ئیگا"

تَقُولُ وَقَد مَالَ الغَبِیطُ بِنَا مَعًا عَقَرتَ بَعِیرِی یَا امرَءَ القَیسِ فَانزِلِ

وہ کہنے لگی "ارے دیکھ! ہمارے وزن سے ہودج جھکا جا رہا ہے۔ او امراءالقیس! اُتر، تیری وجہ سے اونٹ کی پیٹھ زخمی ہوئی جا رہی ہے"

فَقُلتُ لَهَا سِیرِی وَاَرخِی زِمَامَهُ وَلَا تُبعِدِینِی مِن جَنَاکِ المُعَلَّلِ

میں نے اُس سے کہا تو اپنا کام کئے جا اور ذرا اونٹ کی نکیل ڈھیلی چھوڑ دے۔ گر خدا کے لئے مجھے اپنے اس گدرائے ہوئے جوبن سے دور نہ ہٹا۔

فَمِثلِکِ حُبلَی قَد طَرَقتُ وَمُرضِعٍ فَاَلهَیتُهَا عَن ذِی تَمَائِمَ مُحوِلِ

میں تجھ جیسی بہت سی حاملہ اور بچہ والی عورتوں کے پاس راتوں کو جا چکا ہوں۔ جو اپنے سال سال بھر کے کھیلتے کودتے بچوں کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئی ہیں۔

اِذَا مَا بَکَی مِن خَلفِهَا انصَرَفَت لَهُ بِشِقٍّ وَتَحتِی شِقُّهَا لَم یُحَوَّلِ

اور جب اُن کے کان میں پیچھے سے بچہ کے رونے کی آواز آئی تو انھوں نے ایک چھاتی تو اُسکے منھ میں دیدی اور دوسری کو اسی طرح میرے پنچے دبا رہنے دیا۔

---

[۱] یہ تمام اقتباسات ہندی کے مستند شعراء کے کلام سے نقل کئے گئے ہیں جن کو "کلاسیکل پوئٹ" کہا جا سکتا ہے۔ دیہات کے گیت (Folk Songs) میں سے کوئی اقتباس اس میں شامل نہیں ہے۔ اور اس لئے ان کی صحت و قدامت میں شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ [۲] ملاحظہ ہو:- ترجمہ امرئ القیس فی کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ"

اسی طرح کیٹس (Keats) کو بھی کارلائل نے "شیطانی گروہ کا شاعر"[1] کہا ہے حالانکہ اُس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اُس کی شاعری برملا طور پر مادی اور حسّی ہے۔

لیکن ہندی شاعری کے مندرجہ دوہوں اور سوتوں میں سے آخری پانچ کو پڑھیے اور دیکھیے کہ سوسائٹی کے اختلافات اور ماحول کے تفاوت کی بنا پر ایک ملک میں مرد کی جانب سے جن جذبات کا اظہار قابل ملامت و نفرت قرار دیا جاتا ہے دوسری سرزمین میں اُس سے زیادہ عریاں طرز ادا عورت کی طرف سے اختیار کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی سوسائٹی اُس کو نگاہِ گرم سے نہیں دیکھتی۔

کیا ہندی شاعری اُصولِ فطرت کے منافی ہے

ہندی کی عشقیہ شاعری پر اس مختصر سی بحث کے بعد ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ آیا یہ انداز شاعری اُصولِ فطرت کے موافق ہے یا مخالف۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کی یہ شاعری اُصولِ فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اور اسی وجہ سے ہندی ادب کے تاریخ نویسوں کی آرا اس مسئلہ میں مختلف ہیں بعض نے اس کو قانونِ فطرت کے خلاف کہہ کر اس کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے۔ لیکن زیادہ تر مورخین نے اس کو سراہا ہے۔ اور اس کو منشائے قدرت کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ عشق و محبت کے جذبات عورت کی جانب سے پیش ہوں اس لئے کہ اُن کے خیال میں عشق کی پہلی تڑپ ابتداءً عورت ہی کے ننھے سے دل میں پیدا ہوتی ہے پہلے وہی مرد کی سحر طراز آنکھوں کے آگے سرِ نیاز جھکاتی ہے۔ پہلے وہی مرد کی تیغ ابرو کا شکار ہوتی ہے اور پہلے وہی ہجر و فراق کے درد سے کراہتی ہے۔

لیکن یہ رائے روزمرہ کے بدیہی مشاہدات و تجربات کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے اور اس لئے اس کی تائید میں اس درجہ مطلق العنانی کے ساتھ رطب اللسان ہونا اُن حضرات کی یک طرفہ رائے کا پتہ دیتا ہے جو ہندی شاعری کو ہر حیثیت سے بے داغ ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں — عام اس سے کہ دلائل و براہین سے بھی اُس کی تائید ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

پھر اس گروہ کی رائے اس لئے اور بھی قابل پذیرائی نہیں رہتی کہ ہندی شاعری کی تاریخ میں شروع سے لے کر اسوقت تک میرا بائی، سہجو بائی اور دیا بائی جیسی بیسیوں قابل تعریف شاعر خواتین پیدا ہوئی ہیں لیکن اُن میں سے کسی کا ایک دوہا بھی اس کی تائید نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف اس قسم کی جتنی شاعری ہے وہ سب مردوں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جس کو اُنھوں نے عورت کی جانب سے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حقیقتاً عورتیں اتنی وارفتہ جذبات ہوتیں تو ہندی کی کسی نہ کسی شاعرہ کی زبان سے اس کا اظہار ضرور ہوتا۔

---

[1] A poet of Satanic School of thought.

لیکن اس کے باوجود بھی میری رائے یہ ہے کہ ہندی شاعری اگر پوری پوری طرح منشائے فطرت کے مطابق نہیں ہے تو منشائے فطرت کے منافی بھی نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل ذرا طولانی ہے۔ تاہم اس کو مختصراً پیش کیا جاتا ہے:۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں دُنیا کے تمام دیگر ممالک کے خلاف امن وسکون کی زندگی زیادہ بسر کی گئی ہے۔ یہاں کے لوگوں کو آرین نسل کے جارحانہ اقدام کے بعد سے محمود غزنوی کے حملہ تک عام قتل وغارت گری اور جلاوطنی وکشت وخون سے بہت کم سابقہ پڑا۔ عرب کی سرزمین کی طرح گنگا جمنا کا بیچ خانہ بدوشوں کے خون سے لالہ زار نہیں رہتا تھا۔ نہ یورپ کے براعظم کی طرح اس کی ریاستیں ہمیشہ ایک دوسرے کے خون سے کھیلا کرتی تھیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کے دماغوں نے جس فلسفہ کی بنیاد ڈالی اُس میں قتل انسان تو خیر بڑی بات ہے قتل حیوان تک کی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی ہے۔ اہمسا کے نظریہ کو یہاں تک کھینچا گیا کہ مچھر و مکھی کا مارنا بھی معصیت قرار پاگیا۔ ظاہر ہے کہ جس سرزمین میں انسانی زندگی اس طرح سکون و اطمینان کے گہوارہ میں جھول رہی ہو وہاں کے باشندوں کے دماغ کی ساری توجہ گھروں کی چہار دیواری اور عورتوں کی سوسائٹی کی طرف مبذول ہونا چاہئے۔

اکبر کا مشہور شعر ہے:۔

کہا دُنیا سے کس طرح چپکوں عورت نے کہا کہ گوندھوں میں

چنانچہ راجپوتوں اور اسی طرح کی دو ایک اور فوجی جماعتوں کے علاوہ ہندوستان کی وسیع سرزمین کی ان گنت آبادی دن بھر نیلے آسمان کے نیچے عورتوں کے رسیلے نغموں کی گونج میں کاشتکاری کرتی تھی اور رات کو امن وآسایش کے ساتھ "کنیاؤں" کی رس بھری لوریوں سے مصروف راحت ہوجاتی تھی۔

اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ منزلی زندگی میں غیر معمولی استحکام و پختگی پیدا ہوگئی۔ نیز چونکہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں معمولی جنگ وجدل یا اسی قسم کی دیگر جان لیوا مہموں (Expedition) سے بھی الگ رہتی تھیں اور شاذ و نادر ہی قتل وغارت گری کا شکار ہوتی تھیں اس لئے دیگر ممالک کے بالکل خلاف اُن کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ آج بھی ہندوستان کے اُن صوبوں میں جہاں ہنوز ہندومت کی قدیم تہذیب کسی حد تک باقی ہے عورتوں کا تناسب مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے جیسا کہ صوبۂ متوسط، مدراس، بہار و اڑیسہ کی ریاستوں اور کوچین وغیرہ کی مردم شماری کی رپورٹ کو دیکھنے سے بخوبی پتہ چل سکتا ہے۔

عورتوں کی اس فراوانی کی وجہ سے ہر مرد کے لئے عورت کی معیت حاصل کرنا بہت آسان ہوگیا اور عورت روزمرہ زندگی کی ایک معمولی چیز ہوکر رہ گئی جس کے حصول میں جد وجہد کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا اور اس لئے قدرتی

طور پر عورت کی شخصیت غیر وقیع ہوتی گئی اور اُس کی کوئی خاص قدر و قیمت باقی نہ رہی۔

لیکن دیگر ممالک میں حالات ہمیشہ اس سے مختلف رہے ہیں۔ چنانچہ عرب میں ہر قبیلے کے مرد اپنی لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے اس لئے کہ ان کو ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ دوسرے قبیلے کے لوگ اُن کی لڑکیوں کو چھین کر لیجائیں گے اور یہ ایسی ذلت تھی جس کو وہ نہ زندگی میں برداشت کرسکتے تھے اور نہ موت کے بعد۔ چنانچہ جب اسلام کے بعد دختر کشی کی رسم ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تو فتنۂ خوارج کے زمانہ میں بہت سے لوگ محض اس بنا پر جنگ سے کنارہ کش رہتے تھے کہ چونکہ اب وہ اپنی لڑکیوں کو قتل نہ کرسکتے تھے اس لئے اُن کی موجودگی میں اپنے خون سے کھیلنا اُن کے امکان سے خارج تھا۔[1]

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عرب میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ جس کی وجہ سے قدرتاً اُن کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا اور اُن کا حصول اور اُن کی معیت ایک ایسی تمنا ہو کر رہ گئی جس کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن ہندوستان میں ایسا نہ تھا۔ یہاں عورتیں بکثرت تھیں اور ایک عورت کو ہمیشہ کے لئے "بندۂ وفا" بنا لینے سے زیادہ اور کوئی کام آسان نہ تھا۔ اس لئے قدرتاً عورتوں کی عظمت و اہمیت کے جذبات ایک ایک کرکے قلوب سے فنا ہوتے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ مرد نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ وہ عورت کی قربان گاہ پر اپنے جذباتِ نیاز و طلب کو پیش کرے، بلکہ اس کے علی الرغم ان جذبات کا قاصد بھی عورت ہی کو قرار دیا گیا چنانچہ کوک شاستر (جس کی اولیت کا فخر ہندوستان ہی کو حاصل ہے) سے یہ ثابت کیا گیا کہ ایک عورت میں مرد کی نسبت سے دس گنے زیادہ جذباتِ جنسی پائے جاتے ہیں اور اس لئے اگر مرد ایک مرتبہ عورت کی طرف کشش محسوس کرتا ہے تو عورت دس مرتبہ مرد میں جاذبیت پاتی ہے۔

لیکن میرا مطلب اس گزارش سے یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے علاوہ باقی تمام ممالک میں عورتوں کی عزت و حرمت کی جاتی تھی۔ یقیناً وہاں بھی عورت کی ذلت و خواری بہت حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ لیکن ہندوستان کے مقابلہ میں اُس کی شکل مختلف تھی۔ ہندوستان میں امن چین کی زندگی تھی اور اہمسا کا ہمہ گیر قانون تمام ملک پر چھایا ہوا تھا۔ لیکن دوسرے ممالک میں اس کے برخلاف آئے دن کی خونریزیوں کی وجہ سے لوگوں کی منزلی زندگی نیم مردہ رہتی تھی۔ اور کچھ تو رسوائی و ذلت کے خوف سے اور کچھ مذہبی بے رحمی و سفاکی کے ہاتھوں عورتوں کو بے دریغ قتل کردیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عورتوں کی تعداد میں ہمیشہ معتد بہ کمی رہی اور وہ ایک ایسی نادر چیز ہو کر رہ گئیں جن کو گو سماجی، مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے کتنا ہی نفرت انگیز کیوں نہ کہا جائے لیکن جب قلوب سے ان بندشوں

---

[1] ملاحظہ ہوں اشعار ابوخالد۔ کتاب الکامل للمبرد۔ جلد سوم صفحہ ۹۲ و ۹۳

کے تمام پردے اُٹھ جاتے تھے اور انسانی دل محبت کے الہامی ترانوں سے بھرپور ہوتا تھا تو پھر اُس کے دل کی گہرائیوں سے یہی صدا بلند ہوتی تھی :-

اِنّی لَاَهوَاکِ غَیرَ ذِی کَذِبٍ — قَد شَفَّ مِنّی الاَحشَاءُ وَ الشَّغَفُ

خدا جانتا ہے میں تجھ سے جھوٹی محبت نہیں کرتا — تیرے عشق نے میرے دل و جگر کو کباب کر دیا ہے

لیکن ہندوستان میں ایسا نہ تھا۔ یہاں عورت کے حصول میں کسی جد و جہد یا جنگ و جدل کی ضرورت تھی عورت سے ساتھ ارتباط پیدا کرنا آسان ترین کام تھا۔ معمولی سی کوشش کے بعد ایک مرد کا عورتوں کے بیچ میں کرشن بن کر ہولی کھیلنا کوئی اہم بات نہ تھی۔ دشانیتا کی طرح کئی بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی شکنتلا جیسے فتنۂ نوخیز کو اپنی طرف مائل کر لینا روزمرہ کی زندگی میں داخل تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس قسم کے ماحول میں قدرتی طور پر عورت کے دل میں وہ تمام جذبات پیدا ہونا چاہئیں جو دوسرے ممالک میں مرد کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اس قسم کے گرد و پیش میں بالکل فطری طریقہ پر مرد کی حیثیت ایک محبوب کی ہونا چاہیے اور رشک و رقابت اور طلب و سجود کا جذبہ عورت میں پرورش پانا چاہیئے۔ ہر عورت کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنی دوسری "سوکنوں" کے مقابلہ میں "پیا" کی نظروں میں زیادہ عزیز ہو۔ اس لئے کہ "سہاگن وہی پیا کی ہے جسکو پیا چاہے"۔

یہی وجہ ہے کہ معشوقہ اور محبوبہ کے بجائے ہندوستان میں [illegible] جیسے الفاظ مرد سے متعلق ہو کر عشقیہ شاعری کا مرکز بن گئے۔ شوہر کو دیوتا سمجھا گیا۔ اور ہر بیوی کا اولین فرض قرار پایا کہ وہ روز صبح اپنے سوامی کے قدم چومے۔ اُس کے ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ لگائے اور ایک بت کی طرح اس کے سامنے سجدے کرے۔ شوہر کے مرنے کے بعد یا تو اُس پر ستی ہو جائے اور یا عمر بھر اُسی کے نام کی مالا جپتی رہے اور اس لئے اگر ہندی کا شاعر عشق و محبت کے تمام جذبات عورت کی زبانی پیش کرتا ہے تو اسے عین فطرت کہا جائے یا نہ کہا جائے لیکن منشائے فطرت کے منافی بھی کسی طرح [illegible]

پھر اُردو اور فارسی کی اُس شرمناک شاعری سے تو ہندی ہزار درجہ بہتر ہے جہاں "ترک بچوں" اور "برہمن زادوں" کی جناب میں داستان عشق دہرائی جاتی ہے۔ [illegible] "[illegible] خط" کی یاد میں ہجر کی راتیں کاٹی جاتی ہیں اور جہاں شاعری کا مدار ان جذبات پر ہے:-

ہونے دیتے ہی نہیں [illegible] بل سے
غصہ آتا ہے مجھے صاحب کے باوا جان پر

سید ابو سعید بزمی ایم۔ اے۔

ہندی کا مشہور حسن نواز شاعر

(بہاری)

مہاکوی (ملک الشعراء) بہاری لال 'بہاری' قوم کے چوبے برہمن تھے ان کے والد کا نام کیشو رائے تھا۔ بہاری سمبت ۱۶۶۰ میں بمقام گوبند پور ضلع گوالیار پیدا ہوئے اور سمبت ۱۷۲۰ میں انتقال کر گئے۔

شادی کے بعد بہاری اپنی سسرال متھرا میں رہنے لگے تھے وہاں سے مہاراجہ جے سنگھ (مرزا راجہ جے شاہ) نے بہاری کو جے پور بلا کر اپنے ہاں کے شعرائے خاص میں داخل کر لیا۔ مہاراجہ جے سنگھ نے بہاری کی بہت قدردانی کی چنانچہ جب بہاری کی "ست سئی" تکمیل کو پہونچی تو مہاراجہ نے ان کو سات سو اشرفیاں انعام میں دیں۔ بہاری کا عاشقانہ کلام ہندی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتا ان کے کلام میں کہیں کہیں فارسی اور عربی کے بھی الفاظ آ گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عربی اور فارسی سے بھی واقف تھے اور یہ کہ اس زمانہ میں فارسی اور عربی کا استعمال ہندی میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بہاری کا کلام اردو دنیا میں زیادہ مقبول ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کے کلام میں کچھ کچھ اردو کے نازک خیال شعرا کی جھلک پائی جاتی ہے۔

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اگر غیر ملکی زبانوں کے ساتھ ہی ملکی زبانوں خصوصاً بھاشا کے جذبات اور ہندی ادب سے بھی اردو دنیا کو روشناس کرایا جائے تو اس سے ہماری ادبیات میں قابل قدر اضافہ ہوگا اور اسی خیال کو مدنظر رکھ کر بہی خواہان اردو ہمیں وقتاً فوقتاً ہندی ادب سے روشناس کراتے رہتے ہیں ہمارے اُن برادران وطن کی یہ روش نہایت شرمناک اور قابل ملامت ہے جو ہندی کی ترویج و اشاعت کے جوش میں غریب اردو کو فنا کرنے پر تُلے ہوئے ہیں دنیا جانتی ہے کہ ہندی اور اردو آپس میں بہنیں ہیں دونوں زبانوں میں بہت کچھ مماثلت ہے میل جول اور تبادلۂ خیالات ہی سے دونوں زبانوں کا فایدہ ہوگا۔ آج میں "بہاری ست سئی" کے چند دوہے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ بہاری کی نازک خیالیاں اور اسلوب بیان کے متعلق کچھ لکھنا لاحاصل ہے کیونکہ اس کا اندازہ کلام پڑھکر بصیرت افروز نگاہیں خود کریں گی۔ ہندی شعرا نے نظم کو نو صورتوں میں پیش کیا ہے جس کو وہ 'نو اس' کہتے ہیں

جس طرح 'شانت رس' میں فطرت نگار تلسی اور 'ویر رس' میں "بھوشن" کا نمبر اول مانا جاتا ہے اسی طرح 'سنگار رس' (جس میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہو یا وہ کیفیتیں مرقوم ہوں جو حسن پرستوں کے قلب کی آئینہ دار ہوں) میں بہاری کا مرتبہ ہندی شاعری میں اعلیٰ مانا گیا ہے اور اس نسبت سے 'بہاری' عاشق مزاج کے لقب سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ اس قادر الکلام۔ عاشق مزاج شاعر نے بھاشا کے چمن میں کیسی کیسی گلفشانیاں کی ہیں میں نے معمولی ترجمہ کر دیا ہے نکات شاعری کو ناظرین کے ذوق پر چھوڑتا ہوں۔

भूषन -भार संभारि है क्यों इहिं तन सुकुमार

सूधे पाइ न धर परैं सोभा हीं के भार

بھوشن بھار سنبھار ہے کیوں یہ تن سکمار

سودھے پائے نہ دھر پریں سوبھا ہین کے بھار

دھر = زمین

اے لاڈلی تو اپنے نازک جسم پر زیوروں کا بار کیسے سنبھالے گی تیرے پاؤں تو شباب کے بوجھ ہی سے زمین پر سیدھے نہیں پڑتے۔

जरी - कोर गोरे वदन बढ़ी खरी छब, देख

लसति प्यानो बिजुरी किय सारद - ससि - परिवेष

جری کور ۔ زری کا کنارہ ۔ زریں آنچل ۔ سارد سسی ۔ سردی کا چاند

پرویش ۔ چاند کا ہالہ جو برسات میں کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے

مطلب۔ اس سندری کے گورے چہرہ پر ساری میں لگی ہوئی زری کی کناری کو تو دیکھو کتنی خوشنما معلوم ہوتی ہے گویا چاند کے چاروں طرف بجلی نے ہالہ بنایا ہے۔

कन देबो सोप्यों ससुर, बहु थुरहथी जानि,

रुप रहंचटें लागि मागन, सबु जग आनि,

کن۔ بھیک ۔ تھرہتھی ۔ چھوٹے ہاتھوں والی ۔ رہنچٹ ۔ لالچ

کن دیبو سونپو سسر ۔ بہو تھرہتھی جان

اب رہنچٹیں لگ لگ ۔ مانگن سب جگ آن

مطلب ۔ بہو کو چھوٹے ہاتھوں والی سمجھ کر (کنجوس) سسر نے اسے بھیک دینے کا کام سونپا (کنجوس سسر نے یہ سمجھ کر کہ بہو کے ہاتھ نازک اور چھوٹے ہیں ان میں اناج کم آئے گا جس سے اناج کا خرچ کم ہوگا اس کو خیرات دینے کا

کام سونپا لیکن اس کا نتیجہ اس کے خلاف توقع ہوا کیونکہ بہو کے حسن دلکش کے درشن کرنے کے لالچ میں سارا جہان بھکاری بن گیا اور اس کے دروازہ پر آکر بھیک مانگنے لگا۔

खरी लसति गोरे गरें धंसति पान की पीक
मनौ गुलीबंद-लाल की,लाल,लाल दुति-लीक

کھری لست گورے گرین-دھنست پان کی پیک
منو گلوبند لال کی- لال- لال دُتی لیک

مطلب = گوری کے گورے گلے میں پان کی سُرخ پیک ایسی جھلکتی ہے گویا گلوبند (زیور) کے لعل کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔

बरजें दूनी हठ चढ़ै, ना सकुचै न सकाइ
टूटत कटि दुमची-मचक लचकि लचकि बचि जाइ

برجین دونی ہٹ چڑھے-نہ سکچے نہ سکائی
ٹوٹت کٹ دُمچی مچک- لچک لچک بچ جائی

دُمچی- جھولے پر کھڑی ہو کر کمر لچکا کر پینگ بڑھانے کا عالم- پتلی شاخ

یک مست شباب الہڑ حسینہ پینگ بڑھا بڑھا کر جھولا جھول رہی ہے عاشق مزاج بہاری لال کا مضمون یوں دکھاتے ہیں

مطلب:- (اس مست شباب حسینہ کی لمبے لمبے جھونکے جھولا جھولنے کا شوق بے حد ہے اس کو پینگ بڑھانے میں نہ تو بدن کھُل جانے کی پرواہ ہے اور نہ اس کا ڈر ہے کہ جھٹکے سے کہیں اس کی نازک کمر ٹوٹ جائے سکھیاں اس کو منع کرتی ہیں تو اس سے اس کی ضد اور بھی بڑھ جاتی ہے وہ نڈر ہو کر ضد میں آکر اور بھی خوب زور زور سے ہمک ہمک کر پینگ بڑھاتی ہے) اس سے اس کی شاخ (دگل) کی طرح نازک پتلی کمر ٹوٹتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے لیکن لچک لچک کر رہ جاتی ہے (جس طرح لچکیلی چھڑی موڑنے پر بھی ٹوٹنے سے بچ جاتی ہے) جن اصحاب نے برکھا رت میں "کسی" کو جھولا جھولتے اور پینگ بڑھاتے دیکھا ہوگا وہ اس دوہے کا خاص لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ بہاری نے تو مصوری کا حق ادا کر دیا ہے۔

बाल छबीली तियनु में बैठी आपु छिपाइ ।
अरगट ही पानूस सी प्रगट होति लखाइ ॥

بال چھبیلی تین میں بیٹھی آپ چھپائی
ارگٹ ہی پانوس سی پرگٹ ہوت لکھائی

پانوس - فانوس

مطلب = وہ چھبیلی بہت سی عورتوں کے درمیان اپنے چہرہ کو گھونگھٹ میں چھپا کر بیٹھی (اتنی احتیاط پر بھی گھونگھٹ کے اندر رہی سے اس کا خوبصورت چہرہ) اس طرح نظر آنے لگا جیسے فانوس کے اندر شمع روشن ہو۔

डीठि न परतु समान - दुति कनकु कनक सैं गात ।
भूशन कर करकस लगत परसि पिछाने जात ॥

ڈیٹھ نہ پرت سمان دُت کنک کنک سیں گات
بھوشن کر کرکس لگت پرس پچھانے جات

کنک = سونا ۔ کرکس = کھردرا

مطلب = اس کے جسم پر جس کا رنگ سونے کی طرح ہے، طلائی زیور نظر ہی نہیں آتے کیونکہ دونوں کا رنگ ایک سا ہے۔ چھونے سے جب ہاتھ میں سختی معلوم ہوتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ زیور کہاں ہے۔

लौने मुंह दीठि न लगै, यौं कहि दीनौ ईठि ।
दूनी ह्वै लागन लगी दिये दिठौना दीठि ॥

لونے مکھ ڈیٹھ نہ لگے ۔ یوں کہ دینو ایٹھ
دونی ہو وے لگن لگی دئے ڈیٹھونا ڈیٹھ

ڈیٹھ = نظر ۔ ایٹھ ۔ دوست ۔ سکھی ۔ ڈیٹھونا ۔ کاجل کا کالا ٹیکہ جو پیشانی پر اس وجہ سے لگا دیا جاتا ہے کہ کسی کی نظر نہ لگے ۔ لونے = خوبصورت۔

مطلب = سکھی نے تو یہ سمجھ کر تیری پیشانی پر کالا ٹیکہ لگایا کہ تیری پیاری صورت پر کسی کی نظر نہ لگے۔ لیکن اس سے تو تیرے چہرہ کا حسن ایسا دوبالا ہو گیا کہ (تیرے چند رکھ پر) اس پر لوگوں کی پہلے سے بھی زیادہ نظریں پڑنے لگیں۔

लसोत सेत सारी - ढप्यौ तरल तरयौना कान ।
परयौ मनो सुरसरि सलिल रवि- प्रतिबिंब बिहान ॥

لست سیت ساری ڈھپیو ترل تریونا کان
پریو منو سرسری سل ربی پربت بنب بہان

تریونا ۔ کرن پھول ۔ پربیت بنب ۔ عکس ۔ بہان = صبح

مطلب ۔ اس کے کان میں ہلتا ہوا کرن پھول آب رواں کی سفید ساری میں چھپا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا صبح کو سورج کا عکس گنگا جی کے آب رواں (بہتے ہوئے پانی) پر پڑ رہا ہے۔

जटित नील मनि, जगमगति सींक सुहाई नाक ।
मनौ ग्वली चंपक - कली बसि रस लेतु निसाक ॥

جٹت نیل منی جگمگات سینک سہائی ناک
منو الی چمپک کلی بس رس لیت نشانک

مطلب:- اس کی خوبصورت ناک میں نیلم جڑی لونگ جگمگاتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی ہے گویا چمپا کی کلی پر بھونرا بیٹھا ہوا ہے کھلکے رس پی رہا ہے۔

اس دوہے میں بلاغت یہ ہے کہ بھونرا چمپا کی کلی پر کبھی نہیں بیٹھتا لیکن یہ بہاری کا کمال ہے کہ اس نے معشوق کی لونگ پر (جس پر چمپا کی کلی کا دھوکہ ہوا) بھونرے کو بیٹھا ہی دیا۔ دیکھنے سے یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ناک کی لونگ ہے یا چمپا کی کلی

नैना नैंक न मानहीं, कितो कह्यों समुझाइ ।
तनु मनु हारें हूँ हसैं, तिन सौं कहा बसाइ ॥

نینا نیک نہ مانہی کتو کہو سمجھائی
تن من ہارے ہو ہنسیں تن سوں کہا بسائی

ایک سندری اپنے عاشق کو دیکھ کر مسکرانے لگتی ہے اس کی سہیلی اسے سمجھاتی ہے کہ نادان یہ اچھی بات نہیں ہے اس سے بدنام ہو جائیگی اس پر سندری جواب دیتی ہے۔

مطلب۔ (پیاری سکھی) میں نے ان (چنچل نینوں (آنکھوں) سے کئی مرتبہ سمجھا سمجھا کر کہا ہے مگر یہ مانتے ہی نہیں تن من ہارنے پر بھی یہ ہنستے رہتے ہیں (ان ناسمجھ جواریوں سے) کیا بس چل سکتا ہے۔ (اگر کوئی کچا جواری ہارجاتا ہے تو اس کو سخت صدمہ ہوتا ہے اور وہ سمجھانے سے جوا کھیلنا چھوڑ دیتا ہے لیکن جو پکے جواری ہوتے ہیں وہ ہارنے پر بھی ہنستے رہتے ہیں ایسے پکے جواریوں کو سمجھانا بیکار ہے)۔

बरन बास सुकु मारता सब विधि रही समाय ।
पंखरी लगी गुलाब की गात न जानी जाय ॥

برن باس سکمارتا سب بدھ رہی سمائے
پنکھری لگی گلاب کی گات نہ جانی جائے

مطلب — گلاب کی ایک پنکھڑی حسینہ کے گال میں چپکی ہوئی جان نہیں پڑتی کیونکہ وہ رنگ خوشبو اور نزاکت سے (ان سب کی وجہ سے) گال میں سما گئی ہے (کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ گال پر کوئی گلاب کی پنکھڑی چپکی ہوئی ہے کیونکہ گال کا رنگ۔ خوشبو اور نزاکت پنکھڑی کا سا ہے۔

छिप्यो छबीलो मुँह लसै नीले अंचर-चीर ।
मनौ कलानिधि झलमलै कालिंदी के नीर

چھپو چھبیلی مُنھ لسے نیلے آنچر چیر
منو کلانِدہ جھلملے کالندی کے نیر

آنچر — آنچل - دامن — کالانِدہ = چاند - چندرمان — کالندی = (نیلے - جمنا)

مطلب = اس چھبیلی کا منھ نیلے آنچل کے اوٹ میں چھپا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا چاند نیلے پانی (جمنا) میں جھلملا رہا ہے

छुटी न सिसुता की झलक झलक्यो जोवन अंग।
दीपति देह दुहुन मिलि दीपत ताफ़ता रंग ॥

چھٹی نہ سِسُتا کی جھلک جھلکو جوبن انگ
دیپت دیہہ دُہون مل دیپت تافتہ رنگ

دیپت = چمک - جھلک — دہون = دونوں — تافتہ رنگ = دھوپ چھاں - جس کپڑے میں دو قسم کے رنگوں کا میل ہو اور ان کے میل سے دونوں رنگوں کی جھلک لہراتی ہو۔

مطلب — لڑکپن کی جھلک ابھی نہیں گئی اور جوانی کا اثر ہو چلا ہے۔ ان دونوں کے ملاپ سے اس کا جسم دھوپ چھاؤں کے رنگ کی طرح دو رنگی ہو رہا ہے۔

सहज सेत पचतोरिया पहिरत अति छवि होति ।
जल चादर के दीप लौं जगमगाति तन-जोति ॥

سہج سیت پنچ توریا پہرت ات چھب ہوت
جل چادر کے دیپ لون جگمگات تن جوت

سہج = صاف - سادہ - پنچ توریہ = پانچ تولہ کی - ایک قسم کا بہت مہین کپڑا جو اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ اسکی ایک پوری ساڑی تول میں صرف پانچ تولہ کی ہوتی ہے۔ اُردو میں اسے "آب رواں" کہہ سکتے ہیں۔ جل چادر = پانی کا جھرنا۔ اگر رات کے وقت اس کے پیچھے طاقوں میں چراغ رکھ دئے جائیں تو بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

مطلب - سفید مہین ہلکی آب رواں کی ساڑی پہننے سے اس (سندری) کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے اور آبشار کے پیچھے رکھے ہوئے چراغ کی طرح اس کے جسم کی جوت جگمگا رہی ہے۔

اعظم کُریوی

ہندی شاعری

جب کوئی شخص واردات قلب کو بلا تصنع صنایع و بدایع کی قید سے آزاد ہو کر بیان کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس نے فطرت کی زبان اختیار کی اور چونکہ بات دل سے نکلی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اثر ہونا لازم ہے۔ فطرت کا مہیب ترین دشمن تمدن ہے جس ملک میں تمدن اور اس کا حقیقت تصنع داخل ہوا اس ملک سے بچے بچے سے فطرت اور زبان فطرت کو نکال کے چھوڑا۔ یا دوسروں کے ایک زمانہ تھا کہ جہاں ہوا فطرت کی آغوش شفقت میں محو راحت تھی اسی زمانے میں اس کے ایک پرستار شاہ حاتم نے شوق دیدار کو یوں بیان کیا تھا ؎

زندگی دردِ سر ہوئی حاتمؔ — کب ملے گا مجھے پیا میرا؟

دیکھئے زندگی ہجر کو "دردِ سر" سے تعبیر کر کے حاتم نے کس لطافت سے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا ہے۔ رفتہ رفتہ شاہانِ وقت کی ہوسناکیوں نے اس پردے کی گفتگو کو بازار سے بدتر بنا دیا اور عشق کے فطری جذبہ کو بوالہوسی اور مشکل پسندی نے اس درجہ پر پہونچا دیا جہاں عاشق کو خود اپنے رشک کی وجہ سے دیدار دوست بھی گوارا نہیں ہوتا! کیا کوئی صحیح الدماغ انسان اس جذبہ رشک کی موجودگی ممکن سمجھ سکتا ہے؟ جب علم بدیع معراج کمال پر پہونچ جاتا ہے تو ردعمل شروع ہوتا ہے اور ایک طبقہ زبان فطرت کا علمبردار بنکر کھڑا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح اردو داں حضرات رعایت لفظی اور دیگر صنایع و بدایع سے متنفر ہو چکے ہیں اسی طرح ہندی داں اصحاب بھی تلسی داس اور سور داس کی نزاکت معنی اور مشکل پسندی سے متوحش ہو رہے ہیں۔ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے کوتا کو مودی (कविता कौमुदी) کے قابل مؤلف مسٹر رام نریش تری پاٹھی کی ایک عبارت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مسٹر رام نریش اپنی قابل قدر تالیف میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "آؤ ایک بار چل کر ہم اپنے اس پرانے دیش کو دیکھیں تو ندی جوہڑوں کے کنارے آم کے گھنے باغوں کے بیچ میں بسا ہوا ہے" اردو داں احباب ہندی پر جان دیتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ہندی میں تشبیہ و استعارہ اردو سے زیادہ فطری ہے لیکن ہندی داں اصحاب ہندی کی کلاسک شاعری پر گرام گیت کو ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ گرام گیت ([illegible]) زبان و عروض کی قید سے بے نیاز ہونے کے باوجود

بے انتہا فطری ہوتے ہیں۔ گرام گیت کی بھی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں (۱) اونچی ذات والے دیہاتیوں کے گیت اور (۲) اچھوتوں کے گیت۔ مسلمان فاتحین نے شروع ہی سے درس مساوات کو بھلا دیا تھا اور ذات پات کی قید میں گرفتار ہو گئے تھے یہی وجہ تھی کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کو ان کی سرکار میں درخور حاصل ہوا مگر ہریجن چشم عنایت سے ہمیشہ محروم رہے۔ مسلمانوں کے ارتباط کا گرام گیت (ग्राम गीत) پر بھی کافی اثر پڑا اور اونچی ذات کے ہندو بڑی حد تک اپنی فطری سادگی کھو بیٹھے۔ فارسی اور اردو شعرا ازل سے مرغ سحر کی صدائے بے ہنگام کی شکایت کرتے ہیں اب ایک ہندی چرنٹر (مصرع) بھی ملاحظہ فرما لیجئے جس میں مسلمانوں کے اتباع کی کوشش کی گئی ہے۔ سہاگ رات ہے ایک ہندو عورت فارسی شعراء کا تتبع کر کے سورج کو حکم دیتی ہے کہ طلوع نہ کرے۔ سپیدۂ سحر سے التجا کرتی ہے کہ ظاہر نہ ہو اور پھر مرغ سے کہتی ہے:۔

مور ہردا برس جنی کی ہیو مُرگا متی بولیو

मोर हिरदा बिरस जनि किहेव मुरगा मति बोलेउ ।

یہ مسلمانوں کے ارتباط کا نتیجہ اور صدیوں کی نخوت کا خمار ہے کہ اونچی ذات کی دلہن عناصر فطرت طیور و وحوش سب کو اچھوتوں کی طرح اپنا تابع فرمان سمجھتی ہے لیکن ایک مظلوم ہریجن دلہن جانتی ہے کہ وہ فطرت کی ذلیل ترین مخلوق ہے وہ سمجھتی ہے کہ عناصر قدرت کا کیا ذکر بہت سے انسان اس کا حکم ماننے سے پیشتر اپنی جان دیدیں گے اس لئے وہ اپنی سہاگ کی رات میں سورج چاند یا مرغ کو کوئی حکم نہیں دیتی ہے مگر اسے اپنی بے پناہ محبت پر اعتماد ہے اور اسی کے بھروسے پر وہ اپنے کمامی (خاوند) سے کہتی ہے۔

جانے نہ دیوں بر پکڑی رکھوں گی ۔ میں تیرے دل میں بسوں گی

जाने न देवँ वर पकड़े रखौंगी - मैं तेरे दिल में बसौंगी

مجھے افسوس ہے کہ میں مندرجۂ بالا ہندی چرنٹروں کے ناظم کا پتہ نہیں لگا سکا اور ان پر کیا انحصار مجھے تمام مضمون میں غیر معلوم شعراء کے اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرنا پڑی۔ میں نے جن مہتروں یا چماروں سے گیت سنے ان سے یہ بھی پوچھا کہ یہ گیت کس نے رچے ہیں مگر کسی نے کوئی قابل اطمینان جواب نہیں دیا۔ بعض نے کہا کہ ان کے پرکھوں نے گیت رچے ہیں اور بعض نے ان غیر موزوں گیتوں کے نظم کرنے کا سہرا تلسی داس غریب کے سر باندھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان چھوٹے بڑے بے ردا گیتوں کو تلسی داس کا نتیجۂ فکر نہیں کہا جا سکتا۔ بعض گیتوں (خصوصاً مذہبی گیتوں) کو پہلی دفعہ سنکر بھی یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ کسی ودوان کوی (قابل شاعر) کے رسپے ہوئے ہیں جو ہریجنوں کی چشم عنایت سے رفتہ رفتہ غیر موزوں ہو گئے مثلاً:۔

ایسی نگری میں ہنسا بولتا - آپ ہی مالی آپ ہی پھلواری ہے کلی کلی سب جوڑتا - آپ ہی ڈنڈی آپ ترازو تولتا ایسی نگری میں ہنسا بولتا -

ऐसी नगरी में हंसा बोलता - आपही माली आपही फुलवारी है कली कली सब जोड़ता -
आप ही डंडी आपही तराज़ू तोलता - ऐसी नगरी में हंसा बोलता -

ہنس سے مراد (परम आत्मा) پرم آتما ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ شاعر نے وحدت الوجود کے مسئلہ کا تتبع کیا ہے۔ ان فلسفیانہ گیتوں کو نظر انداز کرنے کے بعد کثرت سے ایسے گیت بھی سننے میں آئینگے جن کی نسبت یہ شک پیدا ہی نہیں ہوسکتا کہ وہ ہریجن دماغ کا نتیجۂ فکر نہیں ہیں مثلاً:-

ہوت بھنسار مینا انگنا بہور لی بڑھنی بھیجا وا گوپی عاسک رے جی۔

بھنوسار - صبح - بڑھنی - جھاڑو - عاسک - عاشق -

होत भिनुसार मैना अंगना बहोरली - बढ़नी भेजावा गोपी आसिक रे जी -

ایک مہتر کے سوا اپنی محبوبہ کو تحفۃً جھاڑو دینے کا خیال کس کے دل میں پیدا ہوسکتا ہے ؟ ایک دوسرے گیت کو بھی صاحبانِ نظر نگاہِ اول میں ہریجن دماغ کا نتیجۂ فکر بتادیں گے۔ ایک عورت کو اس کے پردیسی پیا نے مدت مدید کے بعد کچھ چیزیں بھیجی ہیں اور وہ خوش ہوکر ان چیزوں کے نام گنوا رہی ہے:-

اب سُدھ آئی بلم کو - بھیجے پانچ روپیا سکھی موری - بڑھنی بھیجا وا بھیجا وا چمچی سکھی موری -

अब सुधि आई बालम को - भेजे पांच रुपया सखी मोरी -
बढ़नी भेजावा भेजावा चमची सखी मोरी -

بعض گیت ایسے بھی سُنے جن میں بظاہر ہریجن زندگی کی خصوصیات نظر نہیں آتیں مگر سمجھنے والے ادنیٰ فکر و غور کے بعد سمجھ جاتے ہیں کہ ان گیتوں کی سادگی کسی اونچی ذات کے کوی کا نتیجۂ فکر نہیں ہے۔ مندرجۂ ذیل گیت غور سے پڑھئے اور خود انصاف کیجئے کہ اس بے پناہ سادگی اور قیامت خیز اثر کا کیا جواب ہوسکتا ہے ؟

بابا نبیا کا پیڑ جنی کاٹیو (بابا نیم کا پیڑ نہ کاٹنا) نبیا چریا بسیر (نیم کے درخت پر چڑیاں بسیرا لیتی ہیں) بابا بٹیو جنی کیو دکھ دیو بابا لڑکیوں کو بھی کسی طرح کا دُکھ نہ دینا) بٹیا چریا کی نائیں (لڑکی بھی چڑیوں کی طرح نیم کے درخت پر یعنی میکے میں عارضی طور سے مقیم ہوتی ہے) سب رے چریا اُڑ جہیں رہی جی سیے نبیا اکیلی -
(چڑیاں اُڑجائیں گے اور پھر نیم اکیلا رہجائے گا) سب رے بٹیوا جہیں ساسور رہی جئے میا اکیلی -
(اسی طرح رفتہ رفتہ سب لڑکیاں اپنی سسرال چلی جائیں گی اور ماں اکیلی رہ جائے گی)

बावा निवया का पेड़ जिनी काटेउ - निवया चिरैया बसेर ।
बावा बिटिगउ जिनि केउ दुखदेउ - बिटिया चिरैया की नाईं ॥
सबरे चिरैया उड़ जइहैं - रहजइहै निवया अकेलि ।
सबरे बिटियवा जइहैं सासुर - रहिजइहै [illegible] अकेली

لڑکیوں کے میکے کے قیام کو چڑیوں کے رین بسیرے سے تشبیہ دینا بلاغت کی وہ انتہا ہے جس پر ہندی گویّوں کے علاوہ کسی اور زبان کا کوئی شاعر فائز نہیں ہوا پھر اردو کا کیا ذکر جس کے پرستاروں کو اب تک تقلیدِ عجم اور قیدِ عروض سے آزادی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

ہریجن لڑکی کو اپنے میکے سے والہانہ اُلفت ہوتی ہے لیکن اس کا باپ اس سے کچھ زیادہ مانوس نہیں ہوتا۔ ہریجن باپ اپنے افلاس کی وجہ سے یہ گوارا نہیں کرتا کہ کنیا روز روز میکے کے پھیرے کرے اور اسی لئے حتی الوسع لڑکی کی شادی دور کے دیس میں کرتا ہے لیکن ہریجن ماں کی بے پناہ محبت کو افلاس کی زنجیریں مقید نہیں کر سکتیں وہ یہی چاہتی ہے کہ اس کی لڑکی کی شادی کہیں قریب ہو تاکہ وہ میکے میں آتی جاتی رہے۔ اپنے کھامی کو خوش دیکھ کر ہریجن ماں استدعا کرتی ہے کہ لڑکی کا بیاہ دور نہ ہو اور اپنے بیان کو روزمرہ کی مثال دے کر زوردار بنانا چاہتی ہے۔ کہتی ہے:۔

دُرہن دیس جنی پھریو کریُروا (اسے کریلے بہت دور جاکر نہ پھلنا) کے تو ہین توڑن جائی (تجھ کو کون توڑنے جائے گا)
دُرہن دیس جنی بریہو بٹوا (لڑکی کی شادی دور دیس میں نہ کرنا) کے تو ہین آنن جائی۔ (پھر اس کے لینے کو کون جائے گا؟)

दूर हीं देस जानि फरेउ करेरवा - के तोहैं तोरन जाइ ।
दूरहीं देस जानि विरहु विटियवा - के तोहैं आनन जाइ ॥

ہریجن لڑکی کو بھی اپنے باپ کی تغافل شعاری اور اپنی ماں کی والہانہ الفت کا احساس ہوتا ہے اسے اپنے باپ کے عدم التفات کی زیادہ شکایت نہیں ہوتی لیکن ماں کی چشم توجہ کو پھرا ہوا دیکھ کر تڑپ جاتی ہے — ساون کا مہینہ گزر گیا اور بھادوں بھی قریب الاختتام ہے اونچی ذات کی لڑکیوں کو ان کے بھائی میکے بلا کر لے گئے لیکن اس مظلوم ہریجن لڑکی کو اب تک کسی نے نہیں بلایا ہے اور وہ اپنی سسرال میں بیٹھی ہوئی دل سے باتیں کر رہی ہے:۔

ساون ماں کس کاس جبی بھادوں دو بیاہرے رہی رے
میّا نٹھور ن نیند کیسے آوے بیرن کو نہ پٹھایا رے

सावन मा कुस कास जामि भादों दुबिया हरेरी रे।

मय्या निठूरिन नींद कैसे आवे बीरन कोन पठाया रे॥

یعنی ساون کے مہینے میں کانس جمی بھادوں میں دوب ہری ہو گئی لیکن میری ماں نے ابتک بیرن کو مجھے لے جانے کے لئے نہیں بھیجا میں پوچھتی ہوں کہ میری سنگدل ماں کو میرے بغیر نیند کیسے آتی ہے؟

"میا نٹھورن نیند کیسے آوے؟" کے فقرے پر ہندی شاعری ناز کر سکتی ہے۔ ہریجن شاعری میں جذبات نگاری کی متعدد مثالیں موجود ہیں لیکن میں صرف ایک مثال اور پیش کروں گا۔ ساون کا مہینہ ہے مینھ برس رہا ہے بادل گرج رہا ہے بجلی چمک رہی ہے اور ایک ہریجن عورت اپنے پریتم پردیسی کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے:۔

ساون گھن گرجے (بادل گرج رہا ہے) کیدھر کی گھٹا اونی (ایک طرف سے گھنگھور گھٹا اٹھ رہی ہے) کیدھر برسے گنبھیر (اور دوسری سمت موسلادھار بارش ہو رہی ہے) ہمرا للن پردیسیا بھیجت ہوئیں کون دیس ہائے میرا پردیسی پریتم نہ معلوم کس دیس میں بھیگ رہا ہوگا)

بارش کی کیفیت دیکھ کر ذہن کا پریتم کی طرف منتقل ہو جانا نہایت بلیغ ہے۔

सावन घन गरजे - कीधर की घटा श्रावनी।

कीधर बरिसे गंभीर - हमरा ललन परदेसिया भीजत होइहैं कवन देस॥

ہریجن شاعری میں کبھی تو عربی شاعری کی طرح اظہار عشق مرد کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی ہندی شاعری کی طرح عورت کی طرف سے۔ لیکن بہرحال اظہار عشق میں فارسی شعرا کی طرح زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے جاتے۔ ایک ہریجن عورت عالم خیال میں محبوب کے وصل کا سامان تیار کر رہی ہے لیکن اسے انشا مرحوم کی طرح دو دن کے واسطے عرش کبریائی مانگنے کا خیال بھی نہیں آتا ہے وہ کہتی ہے:۔

खसके बंगला छवौतिउ चौमुख रखतिउ दुवार।

हरी लेके सोतिउ श्रटरिया झोकवन श्रावित बयार॥

کھس کے بنگلہ چھوتیوں چومکھ رکھتیوں دوار ۔۔ ہری لیکے سوتیوں اٹاریا جھونکوں آوتی بیار۔ یعنی اگر میرا محبوب میرے پاس ہوتا تو میں خس کا بنگلہ بنواتی اور اس میں چاروں طرف دروازے رکھتی تاکہ ہوا کے جھونکے خوب آئیں اور پھر میں اپنے محبوب کے ساتھ اٹریا پر مزے سے سوؤں۔

ممکن ہے کہ بعض ناظرین نگار کو اس خس پوش بنگلے میں دوزخ ۔۔۔ اور دوزخ نہ سہی زیادہ سے زیادہ اعراف کا لطف آئے لیکن باور فرمایئے کہ جھونپڑی میں رہنے والوں کی تخیل اس سے زیادہ رفیع نہیں ہو سکتی کیونکہ انکے

نزدیک خس پوش بنگلہ مترادف ہے جنت کا۔

فارسی شاعری کا معشوق بھی نرالا ہوتا ہے۔ اس کا پندار حسن خونِ عاشق سے مطمئن ہوتا ہے لیکن ہریجن معشوق ستم رانی سے مجتنب رہتا ہے۔ ہریجن معشوق کو نقد جان کی ضرورت نہیں ہوتی اس کی فرمائشیں اسی مادی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے نزدیک محبت کا ثبوت جان دینا نہیں بلکہ زر دینا ہے۔ ایک معشوق اپنے عاشق کو خوش دیکھ کر کہتا ہے :۔

बलमा कासे कुसे के पटवा संग झुलीया झोली जाय ।
बलमा हमको पटवा के पलवा डराव ॥

بلما کاسے کوسے کے پٹوا انگ جھلویا جھولی جائے (بلما کاس کوس کی رسی سے ہمارا نازک بدن چھلا جاتا ہے)
بلما ہم کو پٹوا کے تھلوا ڈراؤ (بلما ہمارے لئے ریشم کی رسیاں بنوا دو)

دوسرے معشوق کی فرمائش ذرا زیادہ قیمتی ہے :۔

अतलस का लंहगा मगादेउ बलमा ।
रेशम की चुनरी रंगादेउ बलमा ॥

(اطلس کا لہنگا منگا دیو بلما۔ ریشم کی چنری (چندری) رنگا دیو بلما۔ میں نے اپنے مضمون کے آغاز میں لکھا تھا کہ ہریجن مسلمانوں کی چشم عنایت سے محروم ہونے کی وجہ سے اسلامی اثرات سے محفوظ رہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کی زبان یا ان کی معاشرت اسلامی اثرات سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی ہاں یہ ضرور ہے کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے مقابلہ میں ہریجن کم متاثر ہوئے۔ مسلمانوں کی طویل حکومت کی وجہ سے نہ صرف بعض عربی اور فارسی الفاظ ہریجن زبان میں داخل ہوگئے (مثلاً جامہ۔ اطلس۔ وکیل وغیرہ) بلکہ مسلمانوں کی بعض شرعی اصطلاحات بھی ان کی زبان کا جزو بن گئیں۔ مجھے حیرت ہوئی جب میں نے ایک سالخوردہ ہندو مہترانی سے ایک سہرا سُنا اور اس میں نکاح کا لفظ موجود پایا۔ ناظرینِ نگار کے تفننِ طبع کے لئے وہ سہرا نقل کرتا ہوں سہرا لکھنے میں میں نے الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھا ہے بلکہ اس سالخوردہ مہترانی کے تلفظ کو مدنظر رکھا ہے اب رہی چرنٹروں کی غیر موزونیت تو وہ ہریجن شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

جب میرا رسیا بنّا سہرا مانگے میں جاؤں گی مالی کے بہانے سے جب میرا رسیا بنّا جامہ مانگے گا میں جاؤں گی درجی کے بہانے سے جب میرا بنّا نکاح پڑھوائے میں جاؤں گی کاجی کے بہانے سے۔

जब मेरा रसिया बन्ना सेहरा माँगा मैं जाऊँगी माली के बहाने से ।
जब मेरा रसिया बन्ना जामा माँगेगा मैं जाऊँगी दर्ज़ी के बहाने से ॥

अब मेरा [illegible] निका पढ़वाए मैं जाऊँगी काशी के बहाने से !

ہریجن شاعری پر تبصرہ کرنا اور رسیا کو نظر انداز کر جانا ایک ناقابل عفو جرم ہے مگر کروں تو کیا کروں ایک طرف قانون اپنی مہیب آواز سے منع کرتا ہے اور دوسری طرف سوسائٹی زبان بے زبانی سے تاکید کرتی ہے کہ رسیا کو نظر انداز کر جاؤ۔ ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتا ہوں اور قدم قدم پر دعا مانگتا جاتا ہوں کہ کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے قانون یا سوسائٹی کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ ہماری تہذیب میں یہ جائز ہے کہ عورت یا مرد مہذب الفاظ میں فراق کی شکایت کرے وصل کی تمنا کرے مگر یہ حرام ہے کہ انھیں کیفیات کو کھلے الفاظ میں قلم بند کرے۔ ہمارے افسانہ نویس حضرات مرد کے جذبات کی تحقیر عورت کی تقدیس لابدی سمجھتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ گنہیوں کے وجود کا باعث مرد کی ذات نہیں ہے کاش کہ ان بھولے بھالے حضرات کو معلوم ہوتا کہ مرد کو عیاش بنانے والی ہستی عورت ہے اسرائیلیات کے ہاروت و ماروت کے زہد و ورع کو برباد کرنے والی ذات ایک عورت ہی کی تھی پھر بھلا کس شخص میں اتنی طاقت ہے کہ عورت کے بے پناہ جذبات کا مقابلہ کر سکے؟ رسیا میں عورتوں کے جذبات کو کھلم کھلا بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خوب بیان کیا جاتا ہے۔ میں ایک رسیا کے بعض حصص نقل کرتے پر مجبور ہوں جس میں ایک بارہ برس کی دوشیزہ لڑکی کے جذبات بیان کئے گئے ہیں:۔

ہمری نگریا کبھی آجانا رسیا ہمری عمریا بارہ برس کی ترہین برس کبھی آجانا رسیا ات گنگا ات جمنا کی دھارا ندیا کنارے کبھی آجانا رسیا

हमारी नगरिया कभी आजाना रसिया ।

हमरी उमरिया बारह बरस की कभी आजाना रसिया

इत गंगा उत जमना की धारा , नदिया कनारे कभी आजाना रसिया ॥

کیا ان بے پناہ جذبات کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ ۔ رسیا میں کیفیات وصل کو جس عریانی کے ساتھ دکھایا گیا ہے اس کا تصور بھی محال ہے۔ لارڈ بائرن کی مشہور نظم (Confession of a bride) ہو یا مثنوی طلسم الفت ہریجن رسیا کے مقابلے میں کوئی نظم بھی فحش نہیں کہی جا سکتی۔ میں ایک مشہور رسیا کے دو چار مصرعے نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ان دو چار مصرعوں سے ناظرین نگار کو رسیا کا صحیح اندازہ ضرور ہو جائے گا:۔

میری ناف کے نیچے درد اٹھا رے رسیا اٹھا رے رسیا میں مری رے رسیا۔

मेरी ढोंढी नीचे दरद उठा रे रसिया उठा रे रसिया मैं मरा रे रसिया ॥

طالب ...دی

مُغلیہ حکومت اور ہندی شاعری

مغلیہ عہدِ حکومت ہندوستان کی تاریخ کا ایک رنگین ورق ہے جس کے نقش و نگار میں تاج محل جیسی حسین عمارت ہے، آئینِ اکبری جیسا طریقۂ جہانبانی ہے، فیضی جیسا عالی دماغ انسان ہے، ___ پتھر اسی دور میں اتنا نرم ہوا کہ تاج کا گنبد اپنی تمام رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ پیکرِ لطافت اختیار کر گیا۔ کوہ پیکر قلعے اور فلک فرسا مساجد اسی زمانہ کے فنِ تعمیر کی یادگار ہیں۔ مصوری نے اکبر اور جہانگیر سا قدر دان پایا اور رنگ کی آمیزشوں نے زندگی پیدا کرنا اسی عہد میں سیکھا، آواز میں لوچ اور موسیقی میں گداز کب نہیں پایا جاتا تھا لیکن جو کیفیت تان سین نے پیدا کی اُس کا ذکر تاریخ کی زبان دُہرا رہی ہے۔ علم و عمل کا چرچا ہمیشہ ہوتا تھا مگر یہ چند صدیاں تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گئیں۔ مختصر یہ کہ مغلوں کے ایام سلطنت میں اور تمام باتوں کے ساتھ ہی ساتھ فنونِ لطیفہ کی حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ شاعری کا شمار کئی حیثیتوں سے فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔ فارسی شاعری نے فیضی، عرفی اور صائب پیدا کئے تو ہندوستان کی ملکی زبان نے بھی عبدالرحیم خان خاناں، بہاری، کیشوداس اور سندر کے نام پیش کئے اس طرح ہندی ادب کی ترقی اور افزائش میں مسلمان حکمرانوں کے اور شاعروں کا زبردست ہاتھ ہے۔

جس طرح دنیا کی ہر زبان کی ابتدا، اور مخرج کے متعلق مختلف نظرئے پیش کئے جاتے ہیں اسی طرح اُردو اور ہندی بھی اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کسی یقینی نتیجہ کے رہینِ منت نہیں ہیں۔ اس لئے ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو عام طور پر شمالی ہندوستان میں ایک مخصوص طبقے کی مادری زبان کہی جاتی ہے۔ مغلیہ عہدِ حکومت اس کی ترقی کا زمانہ تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر ذرا سی تفریق کے ساتھ قریب قریب برج بھاشا اور اسی کی مختلف پراکرتیں بولی جاتی تھیں۔ تیز نگاہ وہ تفریق آج بھی تلاش کر سکتی ہے لیکن اس مضمون میں ہندی سے مراد وہ زبان ہوگی جو شمالی ہندوستان میں رائج ہے۔ ماگدھی، سورسینی پراکرت، سندھی، برج بھاشا وغیرہ کے میل سے ایک مشترک صورت ایسی پیدا ہوئی جو ہندی زبان کہے جانے کی مستحق ہے۔ چونکہ بحث طویل ہے اور میرے مبحث سے الگ اس لئے اس گتھی کو دوسروں کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔

ہندی شاعری کی ابتدا مغلیہ عہدِ حکومت سے پہلے ہو چکی تھی لیکن اس کا شباب دیکھنا مغلوں ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ ہندی شاعری بھی دوسری چیزوں کے دوش بدوش ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی اگرچہ بظاہر

ہندی کو مسلمان حکمرانوں سے کوئی ربط نہیں نظر آتا لیکن ہم ابھی دیکھیں گے کہ حقیقتاً ہندی شاعری کی ترقی میں اُس زمانہ کی حکومت اور مغلیہ سرپرستی کا بہت زبردست ہاتھ تھا۔ یہ ایک قدیم فقرہ ہے کہ ماحول ادب کی نشو و نما میں ایک ضروری چیز ہے لیکن یہ جملہ ناگزیر بھی ہے۔ ہندی شاعری نے بغیر کسی خاص وجہ کے یہ ترقی نہیں کر لی بلکہ اسکا دامن حکومت کے عروج و زوال سے بندھا ہوا نظر آتا ہے اس لئے دوربین نگاہ اُن اسباب کی تلاش میں لگ جاتی ہے جس میں دونوں کا اتحاد تھا۔

سب سے پہلے تو یہی نظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں بہ نسبت دوسرے ادوار کے زیادہ امن و امان تھا اور یہی وقت فنونِ لطیفہ کی ترقی کے لئے موزوں بھی ہے اس کے علاوہ بابر کی قائم کی ہوئی حکومت میں ترکی زبان کے آثار بہت عرصے تک قائم نہ رہ سکے۔ ہمایوں نے اپنی توجہ فارسی کی جانب رکھی اور اکبر نے ترکی کا خیال ہی ترک کر دیا۔ گویا ترکی کے زوال نے فارسی کو اہمیت دی اور فارسی کی جگہ جو خالی ہوئی اُسے بھرنے کے لئے ایک ایسی عام فہم زبان کی ضرورت تھی جو عام طور پر سمجھی جا سکے۔ سکندر لودی کے زمانہ کی تاریخ میں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوں نے عام طور پر فارسی پڑھنی شروع کر دی تھی تاکہ اُن کو عمال میں جگہ مل سکے لیکن فارسی اتنی عام نہیں ہو سکتی تھی ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ تحریری زبان بن جائے اور حقیقتاً بنی رہی لیکن روزمرہ کے کاموں کے لئے کسی دوسری زبان کی ضرورت بنی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ تاریخی اور تمدنی سبب ہندی کی ترقی کا ذریعہ بن گیا۔

یہی وہ دن تھے کہ جب ہندو معاشرت اور مذہب میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ بھگتی تحریک کی بنیاد پڑ چکی تھی اور یہ نیا حربہ برہمن خاندان کے خلاف ایک ایسا موثر اسلحہ تھا جس نے قدیم نظام پر کاری ضرب لگا دی۔ برہمن فلسفہ میں قدیم روایات کی بنا پر رسم و رواج کی پابندی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ زندگی کے آثار کہیں نہیں تھے۔ اُس کی خشکی اور مسلسل یکرنگی نے طبیعتوں میں ایک بے کیفی پیدا کر دی تھی اور لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ برہمن نظام کی بنیاد کمزور فلسفہ پر ہے اسی لئے اس کی ترقی میں ہم کو ذات پات کی کمزوری اور فلسفۂ حیات پر بہت سے رہنما آواز بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیال ہے کہ رامانند نے اس کی بنیاد ڈالی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ ننھا پودا اس دور میں بڑھ کر تن آور درخت بن گیا۔ چنانچہ اب ذات کی وہ پابندی کمزور ہو چلی اور ہندی شعراء کی فہرست میں پیپا (راجپوت)، دھانا (جاٹ)، سین (حجام) اور ریداس (چمار) کے نام نظر آتے ہیں یہ سب بھگتی تحریک کے حامی بن کر اپنے انداز میں خدا سے لو لگانے کی ترکیبیں بتاتے ہیں۔

اس مذہبی تحریک نے ایک طرح اور شاعری کی ترقی میں مدد دی۔ نئے نئے رہنما اپنی آواز عام لوگوں

پہونچانا چاہتے تھے اس لئے ایسی زبان کو وسیلہ بناتے تھے جو آسانی سے سمجھی جائے اور پھر یہ کہ وشنو تحریک کے حامیوں میں سے ایک گروہ کرشن کو خدا کا اوتار مانتا تھا۔ اُن کی رومانی زندگی، رادھا اور گوپیوں کے ساتھ اُن کی نئے نوازی کی لطیف داستان، اُن کا فلسفۂ حیات اور اُن کی تعلیمات یہ سب شاعری کا موضوع بن گئے اُس وقت سے ادب کا زیادہ حصہ اسی افسانہ کی رنگینی سے کیف آور بن گیا ہے۔ ادب کی ترقی کے لئے تھوڑے سے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری کو ذراسی ٹھوکر درکار ہے اور یہ مواد تو ایسا تھا کہ دنیا کا ہر ادب ایسی داستانوں سے ترقی کر سکتا تھا۔

ہندی شاعری کی ترقی کوئی اتفاقیہ بات نہ تھی بلکہ اُسوقت ماحول نے ذہنی تشکیل اس صورت پر کی تھی۔ اکبر ایک آزاد خیال بادشاہ تھا اُس کی وسیع النظری تمام مذاہب کو ایک خاص مساوات کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اُسوقت کی ہندی شاعری کا زیادہ حصہ مذہبی تھا اور حکومت کی جانب سے روک ٹوک ہونے کے بدلے قدر دانی ہوتی تھی پھر اگر ایسی حالت میں شاعری ترقی نہ کرتی تو کیا کوئی دوسرا دور آتا۔ اکبر کی صوفیانہ زندگی میں کبھی اس "ادبی تعصب" نے جڑ پکڑنے کا موقعہ نہ پایا، جہانگیر کی رگوں میں ہندو لہو تھا، شاہجہاں حسنِ نظر سے ہر چیز کو پرکھتا تھا اور ہر جگہ سے حسن تلاش کر لیتا تھا، اورنگ زیب اگرچہ ایک حد تک متعصب تھا لیکن ادب نواز تھا۔ ہندی شاعری کے لئے اس سے بہتر ترقی کا موقعہ ل ہی نہیں سکتا تھا۔ اسوقت زبان کے معاملہ میں ہندو اور مسلمان کا سوال نہیں پیدا ہوا تھا اور مسلمان شعراء کی کافی تعداد ایسی ملتی ہے (جس میں عبدالرحیم خان خانان کا نام سرفہرست پر ہے) جو ہندی شاعری کے دلدادہ تھے۔ سرپرستی کا اثر علم و فن کی ترقی پر بہت جلد پڑتا ہے چنانچہ ہندی شاعری کی سرپرستی جب خود بادشاہِ وقت کرے تو اس کا کیا کہنا۔ جب حاکم وقت خود کسی چیز سے دلچسپی لے تو پھر کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے اُمرا اُس کی عزت کریں گے۔ ارکان دولت اُسے سر پر بٹھائیں گے اور عوام اُسے پسندیدگی کی نظرت دیکھیں گے۔ بیرم خاں، عبدالرحیم خان خانان، حکیم ہمام، بیربل، مان سنگھ وغیرہ شعراء کی قدر دانی میں بادشاہ وقت سے ہمسری کرتے تھے اور اکثر شعراء جو دربار میں آسودہ حال نہ تھے ان کی آستاں بوسی کو اپنا شرف تصور کرتے تھے۔ بندیلا کے فتح شاہ کے یہاں رتن کوی مشہور شاعر دربار داری میں مصروف رہتا تھا۔ اس مختصر تبصرہ سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہندی شاعری کی قدر ہو رہی تھی اور اُس کی ترقی میں زمانہ ساتھ دینے کو تیار تھا سہ

ہوئے تم دوست جس کے اُس کا دشمن آسماں کیوں ہو؟

اسی کے ساتھ ہی ساتھ قومیت کا احساس بھی شروع ہو چلا تھا۔ موضوع سے خارج ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ کس طرح اکبر کے وقت میں ہندوستان میں قومیت کا صحیح جذبہ پیدا ہوا۔ اکبر کی ترقی کا ایک بڑا راز یہی تھا، اُس کی زندگی کا مقصد یہی نظر آتا ہے کہ وہ ایک مسلمان بادشاہ کی طرح نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی

طرح حکومت کرے۔ اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہا۔ اُس کی عظمت کے تاج میں یہی سب سے زیادہ چمکدار پتھر ہے، اُس کے نام کے ساتھ یہی چیز سب سے زیادہ محبت کے ساتھ وابستہ کی جاسکتی ہے۔ اس کا اثر زبان پر پڑنا لازمی تھا کیونکہ قومیت کے لئے زبان کا ایک ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

اب تک تو ان اسباب وعلل کا تذکرہ تھا جو مغلیہ دور میں ہندی شاعری کی ترقی کا ذریعہ بن گئے۔ اب ہمیں اُس ترقی کی رفتار بھی دیکھنی چاہئے جو ان اسباب وعلل کا منطقی اور ضروری نتیجہ ہے۔

بابر اور ہمایوں کے عہدِ حکومت میں کوئی ایسا نمایاں کارنامہ نظر نہیں آتا جسے ثبوت میں پیش کیا جاسکے اور سچ تو یوں ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں مغلیہ حکومت کی بنیاد بھی متزلزل تھی۔ اکبر کے وقت سے اس زریں دور کا شمار ہوتا ہے۔ اکبر کی ملکی توسیعات، آئینِ حکومت اور نظم ونسق کے بعد ہماری نظر اُس تمدنی اور معاشرتی ترقی پر پڑتی ہے جس نے مغل حکومت کا نام روشن کیا ہے۔ عیش وطرب کے راستے بند نہ تھے۔ تخیل کو جولانی کا پورا موقعہ تھا چنانچہ خود اکبر کے ہندی اشعار کا پتہ ملتا ہے (نواب نصیر حسین خیال مرحوم اور پروفیسر عبدالغنی) جب بادشاہ کی زبان سے ہندی میں شعر نکل سکتے ہیں تو ہم کو اُس کی ہر دلعزیزی میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ برج بھاشا خود نرم ونازک زبان تھی، فارسی سے مل کر نزاکت کا مجسمہ بن گئی، مان سنگھ کی سخن سنجی، بیربل کی ذکاوت اور ذہانت، ٹوڈرمل کا اخلاق، ان سب میں ہندی اور فارسی کی آمیزش تھی۔ فیضی فارسی کا ادیب تھا لیکن اُس کا دماغ ہندی کیلئے بھی بند نہ تھا۔ سرتاج شعرا، عبدالرحیم خانخانان عالم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تلوار کا دھنی بھی تھا۔ اُسکی رحیم ست سئی اُسے ہندی شعراء کی پہلی صف میں جگہ دلاتی ہے۔ تان سین نے اکبر اور جہانگیر دونوں کے یہاں اپنے نغموں کے جادو جگائے لیکن شاعری میں بھی ہندی کو اپنا منت کش بنا گیا اُس کے اشعار سنگیت سار اور راگ مالا میں ملتے ہیں۔ تلسی داس کا نام اگرچہ اس حیثیت سے ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ ان کو براہ راست مغل دربار سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ مان سنگھ اور عبدالرحیم خانخانان سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور بہت سے امرا، اور رؤسا اُن کی خوشنودی کو اپنی عزت تصور کرتے تھے۔ لیکن اُسوقت کی عام ترقی کا اثر اُن پر بھی تھا۔ فارسی کے عام رواج کی وجہ سے فارسی الفاظ ان کی زبان پر بھی تھے چنانچہ آزاد مرحوم نے آبحیات میں کئی شعر نقل کئے ہیں جن میں فارسی کی آمیزش ہے یا فارسی الفاظ نے ہندوستانی جامہ پہن لیا ہے لیکن دور رس نگاہیں من انداز قدت را می شناسم کہکر اُنھیں پہچان لیتی ہیں۔

شاعرانہ کمالات، تخیل کی نزاکت اور بیان کی ندرت نے ہندی شاعری کو معراج کمال پر پہونچا دیا اور اسی دور میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس سرمایہ کا جائزہ لیکر شاعری کے اُصول مرتب کئے اور ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ جب ذخیرہ اچھی طرح مجتمع ہو چکا تو اس کی ترتیب کا خیال بھی پیدا ہوا۔ کیسوداس (۱۵۵۵ء سے ۱۶۱۷ء تک

غالبًا پہلا شاعر ہے جس نے ہندی شاعری کے محاسن اور صنایع بدایع کو ناقدانہ طور پر دیکھا اُسنے شاعری کے اُصولوں پر بحث کی اور ہر چیز کی مثال اشعار سے دی۔ مثال کے شعر زیادہ تر اُسی کے ہیں اس سے اُسکی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے کہ اُس نے ہر رنگ میں شعر لکھے۔ فنِ تنقید کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ سینا پتی، ترپاٹھی برادران نے متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب کے تعلقات درباروں سے تھے۔

شاعروں کی سوانح عمریاں نہیں لکھنا ہیں ورنہ طول ہوجائے گا ہمیں صرف اُن کے نام پیش کرنے ہیں اور یہ دیکھنا ہے کہ اُن کو مغل عہد کی عام ترقی سے کتنا لگاؤ تھا اور اُس کا اثر اُن کی شاعری پر کس طرح پڑ رہا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر کوئی وجہ نہیں نظر آتی لیکن نامعلوم طور پر اُسوقت کا تمدن واقعات کی ترتیب دیتا رہتا ہے اسی طرح بہت سے شعرا جن کا تعلق دربار سے نہ تھا غیر محسوس طور پر اثرات قبول کر رہے تھے جس کا جلوہ اُن کے کلام میں نظر آجاتا ہے۔

اکبر کی دلچسپی کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ اُس نے خود ہندی شعر لکھے اور پھر اپنے لڑکوں کو ہندی شاعری کی ترغیب دیکر اپنی سرپرستی اور محبت کا ثبوت دیا۔ اُس کے بعد جہانگیر اور شاہجہاں بھی ہندی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ شاہجہاں کے دربار کا ہندی ملک الشعرا یا کوی رے (कवि राये) سندر تھا، جس کی غیر فانی تصنیف سنگھاسن بتیسی سے اُردو داں طبقہ بھی واقف ہے کیونکہ اُس کا اُردو ترجمہ للوجی لال نے اُنیسویں صدی کے ابتدا میں کردیا تھا۔ یہ شاہجہاں ہی تھا کہ سرسوتی کو سنسکرت شاعری سے ہٹا کر ہندی کی طرف لایا اور پھر سرسوتی نے ہندی ادب میں اضافہ کیا۔ سرسوتی بنارس کا رہنے والا تھا اور پہلے سنسکرت میں شاعری کرتا تھا شاہجہاں کے اشارے پر ہندی کی جانب مائل ہوا۔ اُس نے اپنی مشہور کتاب "کاوندر اکلپ لتا" میں شاہجہاں اور دارا شکوہ کی بہت تعریفیں کی ہیں۔ دارا شکوہ میں اکبر اعظم کی بہت سی خصوصیات نمایاں طور پر موجود تھیں۔ وہ ہندوؤں سے بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اُن کا ادب، اُن کی معاشرت وغیرہ کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُس نے بہت سی سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کرائے اور خود اُنھیں پڑھا کرتا تھا۔ اس طرح عہد بہ عہد ہندی شاعری ترقی کرتی چلی گئی۔ مغل حکومت کے زیر سایہ اُسے بڑھنے اور عروج پانے کا اچھا موقعہ ملا۔ یہ بادشاہوں کے منھ لگی اور امرا کے ساتھ کھیلی۔ ہندو رانیوں اور شہزادیوں نے اسے مغل محلوں کے اندر اپنی گودیوں میں کھلایا اس لئے اس نے دیکھتے دیکھتے اپنے زریں عہد میں قدم رکھدیا۔

یوں تو شعرا کی تعداد کا شمار بھی مشکل ہے لیکن چند نام ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کا مختصر تذکرہ کئے بغیر گزر جانا سارے افسانہ کو بے رنگ بنا دیتا ہے۔ بہاری لال چوبے (۱۶۰۳ء–۱۶۶۳ء) جے پور کے راجہ جے سنگھ کے دربار میں تھا۔ اُس کی شہرت کا مدار اُس کے دوہوں پر ہے تقریبًا سات سو دوں کا مجموعہ ست سئی کے نام سے

۱۶۶۲ء میں لوگوں کے سامنے پیش ہوا کرشن اور رادھا کی داستان کا تذکرہ ہے لیکن ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہے ۔۔۔۔۔ ایف ۔ ای ۔ کے F. E. KEAY لکھتا ہے کہ اس میں تسلسل کا خیال نہیں ہے اور مختلف مقامات پر مختلف لوگ مخاطب ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور وہ حصہ ہے جس میں اعظم شاہ کا ذکر ہے۔ اس کی شاعری کا تعلق بھی کسی نہ کسی طرح دلی دربار سے رہا۔ اس کی قدردانی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اس کے سرپرست نے بعض اوقات اسے ہر دوہے پر ایک اشرفی دی۔ بہاری کے دوہے اس سے بہت زیادہ قیمتی ہیں ان کی قیمت یہی ہے جو زمانہ اسے حیاتِ جاوید دیکر ادا کر رہا ہے۔ بہاری کے کلام پر تبصرہ مقصود نہیں مگر اتنا ضرور کہا جاسکے گا کہ اس نے محبت کے نازک ترین جذبات کی ترجمانی نہایت اچھوتے انداز میں کی ہے۔ شام، سحر کے جلووں میں، رات کی تاریکی اور دوپہر کی گرمی میں اس کے لئے موادِ شاعری تھا۔ وہ قلب انسانی کی ہر ضرب کا صحیح اندازہ لگاتا تھا اور صنف نازک کے جذبات کی ترجمانی میں کمال کا درجہ رکھتا تھا۔ مناظرِ حسین صوری اس کے دو لفظوں میں ہوجاتی تھی۔ اس کے قلم سے وہ نغمے نکلتے تھے جن میں اثر اور کیف کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اس کی شاعری تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا میں پہونچا دیتی ہے جہاں کوئل کی کوک اور پپیہے کی کہاں سنائی دیتی ہے۔

اسی طرح دیودت یا دیو کوی (۱۶۷۳ء-۱۷۴۵ء) فطرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لیکر آیا تھا سولہ برس کی عمر میں اس نے پہلی نظم شہزادہ اعظم شاہ کے سامنے پڑھی اور شہزادے نے اسے بہت پسند کیا بہت سے شعراء مغلوں کی سرپرستی ہی کی وجہ سے شاعری کی طرف رجوع ہوگئے

ہم نے دیکھا کہ جس قدر مغلیہ سلطنت کی ترقی ہوتی جاتی تھی اسیقدر ہندی شاعری کو بھی عروج نصیب ہو رہا تھا دونوں کے چاند شباب پر نہایت تیزی سے آئے۔ تھے اور بدر بن کر گھٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ حکومت جس کی بنیاد بابر نے رکھی تھی، جسے اکبر نے بڑھایا تھا اب ہر کمالے را زوال کا مصداق بننے والی تھی۔ اب نہ تو تاج محل کی سی عمارت بنتی نظر آتی ہے اور نہ آئینِ اکبری کی سی گرانبہا تصنیف ملتی ہے، عرفی، اور فیضی آسودۂ خواب تھے، تان سین کے نغمے فضائیں گونج کر فنا ہوچکے تھے۔ مختصر یہ کہ مغل تہذیب و تمدن کا زوال شروع ہوچکا تھا اس لئے ضروری تھا کہ جتنی چیزیں اس عروج و زوال کے اسباب و علل سے وابستہ تھیں اُن پر بھی اس کا اثر پڑے۔ عالمگیر کا زمانہ ترقی کا آخری اور انحطاط کا پہلا زینہ تھا۔ کچھ تو قدیم روایات کی بنا پر اور کچھ عالمگیر کی ذاتی قابلیت اور جانفشانی کی وجہ سے اچانک تبدیلی نہ ہوسکی اور اورنگ زیب نے اپنے دن برے بھلے کاٹ دئے۔ اورنگ زیب نے موسیقی کا جنازہ دیکھ کر نہایت گہرائی میں دفن کرنے کی تاکید کی لیکن اس کے دربار میں ہندی شاعری کا ملک الشعراء موجود تھا۔ اعظم شاہ جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے اسی کا فرزند تھا اگرچہ اورنگ زیب پر فنونِ لطیفہ کی تباہی کا الزام ہے لیکن اس کا دامن ہندی شاعری پر سایہ افگن رہا۔

ہندی شاعری میں بھی زوال شروع ہو گیا اگرچہ شعرا کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ درحقیقت شاعری مائل بہ انحطاط تھی لیکن اس سے شاعری کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ اُن ستاروں کی طرح تھے جو تھوڑی دیر تک اندھیری رات میں اپنی چمک دکھاتے ہیں۔ ان کا نام بھی تاریخوں میں اس لئے محفوظ رہ گیا ہے کہ اُسوقت وہی سب کچھ تھے لیکن شاعرانہ عظمت کھوئی گئی تھی۔ وہ تقلید کی گتھیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اُن کے یہاں جدت و ندرت کا نام ہی بیگانہ نظر آتا ہے، اُن کے کلام میں کوئی انفرادیت نہیں۔ تعداد سے کچھ نہیں ہوتا اُن کے یہاں صداقت اور جذبات کی سچی ترجمانی مفقود تھی۔ بہادر شاہ کے زمانے میں بھی ہندو شعرا کا اچھا خاصا گروہ موجود تھا جن کا تعلق دلّی دربار سے تھا بہادر شاہ نے اُس خیال کو دور کرنے کے لئے جو ہندوؤں کو اورنگ زیب کی جانب سے پیدا ہو گیا تھا، ہندوؤں سے تعاون کی بہت کوشش کی تھی سکھوں کو لڑانے کے لئے اُن کے قیدی رہا کر دئے تھے اور متعدد طبقوں سے صلح کے نامہ و پیام ہو رہے تھے اس لئے اُس نے ہندی شاعری کی جانب سے بھی اپنی توجہ نہیں ہٹائی لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے شاعری میں جان ہی باقی نہ تھی۔ کلپتی مصر، نام جی، سکھدیو، تواج اور عالم وغیرہ کے نام ہمارے پیش نظر ہیں مگر ادب کی ترقی میں انکا کوئی خاص حصہ نہیں۔

مغل حکومت ختم ہونے کے قریب تھی ایک بیمار کی طرح اپنی آخری سانسیں گن رہی تھی۔ اُس کا وجود تو تھا لیکن قوائے عمل مضمحل تھے۔ بالکل اسی طرح ہندی شاعری موجود تھی لیکن دوبارہ کے ابھارنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ جس طرح مغل حکومت بابر، اکبر اور شاہجہاں پھر نہ پیدا کرسکی اسی طرح ہندی شاعری سے بھی عبدالرحیم، کیسوداس اور بہاری نہ پیدا کئے۔

یہ مختصر مقالہ جسے ہر طرح مختصر بنانے کی کوشش کی گئی ہے صرف اس مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھا گیا ہے کہ مغل حکومت کس طرح ہندی کی ترقی میں کوشاں رہی اور کس طرح بہت سے مسلمان شعرا نے اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُسوقت کی ہندی اپنی نزاکت اور لوچ کی وجہ سے دلوں کو خود اپنی جانب کھینچتی تھی۔ اب ہمارے اہل وطن نے ہندی اُردو کا مسئلہ کھڑا کرکے ہندی کو سنسکرت کا اتنا مشابہ بنا دیا ہے کہ اُس کی لطافت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ ادبی عصبیت اور ضد قومی ادبیات کے لئے زہر سے زیادہ مہلک ہے۔

احتشام رضوی ناہلی بی۔اے

فطرت نگار تلسی کا ناصحانہ کلام

ہندی شاعری ایک نہایت وسیع موضوع ہے اس کی تعریف کرنے کی نہ تو اس مختصر مضمون میں گنجایش ہی اور نہ تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت مختصر طور سے آپ یہ سمجھ لیجئے کہ بھاشا کی شاعری چند لفظوں میں لطیف جذبات اور مرصع خیالات کی شاعری ہے۔ وکٹر کزن لکھتا ہے:۔

"جب ہم مشرقی خصوصاً ہندی شاعری اور فلسفہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس پاک اور اعلیٰ تخیل کے مقابلہ میں یورپین فلسفہ کی بلند ترین پرواز (جہاں بسا اوقات صرف ہماری اعلیٰ ترین ہستیاں پہونچ چکی ہیں) اس قدر پست و ذلیل معلوم ہوتی ہیں کہ ہم ان اُستادان مشرق کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ گہوارۂ تمدن درحقیقت اعلیٰ ترین فلسفۂ عالم کا سرچشمہ ہے۔

"دوہاولی" گو مقبولیت میں تلسی کرت رامائن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاہم بھی اس کا مرتبہ ہندی ادب میں بہت بلند ہی اس میں معرفت، تصوف، اخلاق اور ناصحانہ انداز بیان کی نہایت پاکیزہ تصویریں ہیں۔ اپنے خیال کو واضح کرنے کے لئے میں "دوہاولی" سے چند دوہے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں میں نے معمولی ترجمہ کر دیا ہے نکات ناظرین کے ذوق پر چھوڑتا ہوں۔ دوہاولی پوربی بھاکا میں ہے اس کی زبان مشکل، دوہے پیچیدہ، لیکن دلچسپ اور نصیحت آموز ہیں۔

دئے بیٹھ پاچھے لگے سنمکھ ہوت پرائے
تلسی سپنت چھانہہ جیوں لکھ دن بیٹھ گنوائے

مطلب۔ لکشمی (دولت کی دیوی) کی خصلت سایہ سے ملتی ہے (جس طرح صبح کے وقت کوئی شخص پورب سے پچھم کی جانب چلے تو سایہ اس کے آگے آگے رہتا ہے لیکن وہ آدمی اگر واپس ہو کر پورب کی طرف چلنے لگے تو سایہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگتا ہے اور اس کو کوئی پکڑ نہیں سکتا) بالکل یہی حال لکشمی کا ہے، اس سے دور ہو تو وہ قریب آنے کی کوشش کرتی ہے اور اگر اُسے پکڑنا چاہو تو وہ بھاگ جاتی ہے۔ بھگت کبیر کا بھی یہ دوہا اسی سے ملتا جلتا ہے:۔ "مایا چھایا ایک سی برلا جانے کوئے بھگتا کے پاچھے لگے سنمکھ بھاگے لوئے

سوئی سینور تئی سوا سیوت سرالبنت
تلسی مہاموہ کے سنت سداہت سنت

مطلب - تلسی داس جی کہتے ہیں کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سیمل کا درخت اپنے پھل اور پھول سے چڑیوں کو فائدہ نہیں پہونچا سکتا، طوطا موسم بسنت میں اس پر بیٹھ کر اس کی سیوا کرتا رہتا ہے کہ شاید کچھ فائدہ حاصل ہو جائے۔ یہی کیفیت دنیادی سادھوؤں کی بھی ہوتی ہے وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا کی موہ مایا میں پھنسکر کبھی اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا وہ اسی میں ہمیشہ پھنسے رہتے ہیں۔

دیپ سکھا سم جوتی تن ، من جن ہوس پتنگ
بھجیے رام ، تج کام حد کرئے سدا ست سنگ

مطلب - خوش جمالوں کا خوبصورت نازک بدن شمع کی طرح نظر فریب ہے، اس لئے اے دل تو اس میں پروانہ کی طرح جل کر خاک نہ ہو۔ غصہ، لالچ اور خواہشات نفسانی کو ترک کر کے رام نام کا وظیفہ پڑھ (خدا کی عبادت کر)

بوی۔ پاہن۔ دامن گرج جھر جھکور کھری کھینچ
روش نہ پریتم دوش لکھ تلسی راگ ہی ریجھ

مطلب - جس طرح چاتک (پپیہا) پتھروں کی چوٹ بجلی کی کڑک، بادل کی گرج اور ہوا کے جھوکوں کی مصیبت سہتے ہوئے بھی دن رات "پی کہاں" "پی کہاں" کی رٹ لگائے رہتا ہے اسی طرح سے خدا کے برگزیدہ بندے بھی دنیاوی مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خدا کی یاد میں مگن رہتے ہیں۔

بدھیو۔ بدھک۔ پریو پنیہ جل الٹ اٹھائی چونچ
تلسی چاتک پریم پٹ مرتہو لگی نہ کھونچ

مطلب - پپیہا شکاری کے تیر سے زخمی ہو کر گنگا جل میں گر پڑا لیکن اس حالت میں بھی اس نے محبت کی خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا (پانی میں گرتے ہی) اس نے اپنی چونچ فوراً اوپر اٹھالی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیہوشی کے عالم میں گنگا جل اس کے پیٹ میں چلا جائے (اور مفت کا احسان ہو) تلسی داس فرماتے ہیں کہ پپیہا کی محبت میں مرتے دم تک فرق نہ آیا اور وہ اپنی محبت میں ثابت قدم رہا۔

جرت تہن لکھ نجبن روی دسے بیٹھ پراؤ
ادسے بکس اتھوت پکھ سنے نہ سہج سبھاؤ

مطلب - کنول کو پالے سے جلتا ہوا دیکھ کر اس کا بیوفا محبوب آفتاب پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے کیا آفتاب کی اس بیوفائی سے کنول اپنی محبت (کھلنا) چھوڑ دیتا ہے؟ کبھی نہیں سچا عاشق ہمیشہ اپنی محبت میں ثابت قدم رہیگا

کہے کٹھن کرت کومل ہو ہت ہٹھ ہوئی سہائی
پلک پانی پرادرات سمجھ کو گھائی سگھائی

مطلب - جب خراب وقت آتا ہے تو بہت سے نرم دوست بھی سخت دل بن جاتے ہیں لیکن جو سچا دوست ہے وہ محبت سے کبھی منھ نہیں موڑتا جس طرح آنکھ کی پلک پر چاہے کیسی ہی چوٹ کیوں نہ لگنے والی ہو، اس کا سچا دوست ہاتھ اپنی ہتھیلی سے فوراً اوپر آنے والی مصیبت کو سہہ کر اس کی (پلک کی) حفاظت کرتا ہے۔

ہت ہنت سب سوارتھ ہی ارسدہ بن چانڑ

نج مکھ مانک سم دسن بھوم پرتے بارڑ

مطلب - جس طرح صرف اس وجہ سے کہ دانتوں سے منھ کی زینت ہوتی ہے انھیں موتیوں سے تشبیہ دیجاتی ہے، لیکن وہی دانت جب ٹوٹ کر زمین پر گر پڑتے ہیں تو ہڈی کی طرح چھونے میں بھی ناپاک سمجھے جاتے ہیں اسی طرح جب تک اپنا مطلب رہتا ہے اس وقت تک لوگ محبت آمیز باتیں کرتے ہیں لیکن مطلب نکل جانے کے بعد وہی دشمن طرح تکلیف دہ ہوجاتے ہیں۔

ہرش بسو ہرشت کرت ہرت تاپ اگھ پیاس

تلسی درش نہ جلد کو جو جل جرے جواس

مطلب - تلسی داس جی کہتے ہیں کہ بادل کا تو کام پانی برسا کر دنیا کو سرسبز کرنا ہے اگر بارش سے "جواس" (ایک قسم کی گھاس جو بارش سے جل جاتی ہے) جل کر سوکھ جائے تو اس میں بادل کا کوئی قصور نہیں۔

نیچ نرادر ہی سکھو — آدر سکھو بال

گدلی بدلی ہٹپ گت پکھونپس دسال

مطلب - کمینے کو اگر سر پر نہ چڑھایا جائے تو اس سے آرام ملتا ہے۔ شریف کی قدر کی جائے تو آرام دہ ثابت ہوتے ہیں۔ دیکھو: اچھی ذات کے درخت کٹھل اور آم سینچنے۔ گوڑنے اور کھاد ڈالنے سے عمدہ پھل دیتے ہیں اس کے برخلاف نیچی حیثیت والے بیر اور کیلے کے درخت جب تک قلم نہ کئے جائیں پھل نہیں دیتے۔

تلسی بھلو سو سنگ تین پوچ کو سنگت ہوئی

ناؤ کنری تیر اسی لوہ بوک ہو لوئی

مطلب - تلسی داس جی فرماتے ہیں کہ ست سنگ (بزرگوں کی صحبت) سے کھوٹا بھی کھرا ہوجاتا ہے اور بری صحبت سے اچھا بھی برا ہوجاتا ہے جس طرح لوہا ناؤ اور ستار میں لگنے سے لوگوں کو پار لگاتا اور اچھا نغمہ سناتا ہے لیکن وہ لوہا تیر اور تلوار کی شکل اختیار کرکے خون بہاتا ہے۔

بھلو کہے بن جان ہو — بن جانے اپواد

ستے نرداد۔ جان جے کرے نر ہرش وشواد

مطلب۔ کمینوں کی بھلی یا بری باتوں پر کوئی رنج نہ کرو جس طرح برسات میں مینڈک ٹرٹراتے ہیں اور برسات ختم ہوتے ہی خود بخود خاموش ہو جاتے ہیں اسی طرح سے کمینے بھی خاموش ہو جائیں گے۔

پر سکھ سینت دیکھو سن جرہیں جسے جڑ بن آگ
تلسی ستنکے بھاگ سنے سچلے بھلائی بھاگ

مطلب۔ تلسی داس جی کہتے ہیں کہ جو کمینے دوسروں کی خوشی یا خوشحالی کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جل کر خاک ہو جاتے ہیں اُن کے بھاگ (قسمت) سے بھلائی خود بھاگ کر اپنا پیچھا چھڑاتی ہے

جوک سدہ من کُٹل گت کھل بپ رت بچپار
ان ہت سونت سوش سو۔ سوہت سوشن یار

مطلب۔ اگرچہ جونک کی چال ٹیڑھی ہوتی ہے لیکن اس کا دل صاف ہوتا ہے اسی سے وہ جسم کا خراب خون چوس لیتی ہے۔ اس کے برخلاف کمینوں کی چال ڈھال بظاہر بڑی سیدھی ہوتی ہے لیکن جب وہ جونک کی طرح جسم سے لپٹ جاتے ہیں تو خراب خون کے بجائے اچھا خون چوس کر تباہ کر دیتے ہیں

نیچ گڈی جیون جانیو سن نکھ تلسی داس
ڈھیل دئے گر پڑت مہ کھینچت چڑھت اکاس

مطلب۔ کمینوں کی تشبیہ پتنگ سے دی جا سکتی ہے جس طرح سے پتنگ کھینچنے سے یعنی اگر خاطر و مدارات سے پاس بلاؤ تو اکڑ کر غرور کے مارے آسمان پر چڑھی چلی جاتی ہے اور جب ڈھیل دو یعنی دور بھگاؤ تو زمین بوس ہو کر خاک میں مل جاتی ہے۔ بعینہ یہی حال کمینوں کا ہوتا ہے

بیرت کولھو میل تل تلی سینھی جان
دیکھ پریت کی ریت یہ اب دیکھ بسے رسان

مطلب۔ تیلی تل کو کولھو میں ڈال کر اسواسطے پیلتا ہے کہ وہ تل کو "تل سینھی" (تیل دینے والا سمجھتا ہے) تلسی داس جی کہتے ہیں کہ تل اور تیلی کی محبت کا نمونہ تو دیکھ لیا (یعنی محبت میں کولھو میں پلوایا گیا) اب اس کی ناخوشی کا نمونہ بھی دیکھنا ضروری ہے۔

روش نہ رسنا کھولئے بر کھائے تروار
سنت مدھر بر نام ہت بولے بچن بچار

مطلب۔ اپنی زبان سے کبھی کوئی بات ایسی نہ نکالنی چاہئے جس سے کسی کے دل میں وہ تیر کی طرح لگے۔ گالی سے بہتر تلوار کی مار ہے کیونکہ تلوار سے وہ فوراً مر جائے گا بات ختم ہو جائے گی لیکن بُری بات یا گالی ہمیشہ تکلیف

پہونچاتی رہے گی۔ اسی لئے ہمیشہ سوچ سمجھ کر ایسی بات کرنی چاہئے جس سے کسی کی دل شکنی نہ ہو اور وہ خوش ہو جائے

مدھر بچن کٹ بالبا۔ بن سدم بھاگ ابھاگ
کوڑ کو ؤ کل کنٹھ رو۔ کاگا کدرت کاگ

مطلب۔ میٹھی بولی سے کوئی کسی کو کچھ دے نہیں دیتا مگر اپنی اس میٹھی بولی ہی سے کوئل سب کے دلوں کو موہ لیتی ہے اس کے برعکس کرخت آواز سے باتیں کرنے والا کوا کسی سے کچھ چھین نہیں سکتا پھر بھی اپنی کاؤں، کاؤں سے دنیا میں بدبخت کہلاتا ہے اور کوئی اُسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

دھائے لگے لوہا للک کھو نچ لئی نئی نیچ
سمرتھ پاپی سون بیر جان نبا ہی بیچ

مطلب۔ جو لوگ بغیر سوچے سمجھے ان لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن کا دل فولاد کی طرح سخت ہوتا ہے اور جو لوگ کمینوں کی بدمعاشیوں سے دب کر اُن کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں وہ گویا خود اپنی موت کو بلاتے ہیں۔ یہی حال مچھلی کا بھی ہوتا ہے وہ لوہے کی کنٹیا (کانٹا) میں لگی ہوئی خوراک کے لالچ میں پڑ کر لوہے سے لپٹ جاتی ہے اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

بن آنکھن کی پانہی پہچانت لکھ پائے
چار نین کے نار نر سوجھت بیج نہ مائے

مطلب۔ مردہ کھال کے جوتے بھی جن کی آنکھیں نہیں ہوتیں لیکن پاؤں ہی سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ ہمارے مالک کا پاؤں ہے لیکن (کتنے افسوس کی بات ہے) عورت اور مرد جن کے چار آنکھیں ہوتی ہیں (دو ظاہری اور دو باطنی) وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتے۔

لوپ کھنت مندر جرت آئے دھار بہور
بوہین تو بن کاج سر کتی سرو ملنی کور

مطلب۔ جن لوگوں کو گھر میں آگ لگنے کے بعد کنواں کھودنے کی سوجھتی ہے۔ جب قلعہ کو غنیم گھیر لیتا ہے اسوقت حفاظت کے لئے چاروں طرف ببول لگوانے کی فکر پڑتی ہے جو اپنا سر اسوقت غنیم کے سامنے جھکاتا ہے اور پناہ مانگتا ہے جب اس پر اچانک مصیبت آتی ہے اس قسم کے لوگ ناسمجھ اور بیوقوف ہوتے ہیں۔

لوگن بھلو منا ؤ جو بھلو ہون کی آس
کرت گگن کو گینڈوا سو سٹھ تلسی داس

مطلب۔ تلسی داس جی کہتے ہیں کہ جو شخص دنیا میں اوروں کے بھلا منانے سے اپنے بھلے ہونے کی امید رکھتا ہے

اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو آسمان (جھوٹ موٹ خیال) کی گنڈلی بنا کر اپنے سر کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

تلسی تورت تبر ترو ۔ بکہت ہنس بڑار
بگٹ نکن الی ملن جل سر سر بہو بڑھیار

مطلب۔ تلسی، آدمیوں کا کیا ذکر یہاں تو متبرک گنگا جی کا بھی یہ حال ہے کہ جب برسات میں زیادہ پانی پا جاتی ہیں تو آپے سے باہر ہو کر کنارے کے تمام درختوں کو اُکھاڑ کر پھینک دیتی ہیں کنول برباد ہو یا بھونرا تباہ اس کی انھیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی اگر گنگا جی کے سیلاب سے کسی کا فائدہ بھی ہو تو یہ فایدہ ہنس کو مار کر بگلے کی پرورش کرنا ہوگا۔

کنٹک کری کری پرت گری ساکھا سہن کھجور
مرہن کونرپ کری کری کے سون کچالی بھور بھور

مطلب۔ (تلسی داس جی اس دوہے میں لامذہب اور انصاف نہ کرنے والے راجہ کی مثال کھجور سے دیکر کہتے ہیں کہ) جس طرح سے کھجور کا تنہ ایسا کھردرا ہوتا ہے کہ اس کے سہارے سے نہ تو کوئی کھڑا ہی ہو سکتا ہے اور نہ بیٹھ سکتا ہے اس میں سایہ بھی نہیں ہوتا جس سے انسان یا حیوان کو دھوپ سے پناہ ملے اور وہ آرام پائے۔ اس کی خاردار جھاڑیاں بھی زمین پر گر کر آس پاس کی زمین کو خاردار بنا دیتی ہیں جس سے اس کے قریب جانے کی بھی کسی کو ہمت نہیں پڑتی اس کی تاڑی پی کر لوگ بدمست ہو کر گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اسی طرح سے انصاف نہ کرنے والے مذہب سے لاپرواہ راجہ بھی اپنی بری عادتوں سے اس زمین کو خراب کر کے چل بستے ہیں ان سے کسی کو فیض حاصل نہیں ہوتا۔

آنن چھوڑ دساتھ جب تادن ہتو نہ کوئے
تلسی انبج انب بن ترنی تا سورپ ہوئے

مطلب۔ تلسی داس جی کہتے ہیں کہ جس دن یہ جسم منھ کے ذریعہ سے کھانا پینا چھوڑ دے گا تو اُسی دن سے اس دنیا میں اپنا کوئی پیارا دوست نہ دکھائی دے گا (سب جیتے جی کے ساتھی ہیں) جس طرح سے کہ اگر کنول بغیر پانی کے ہو جائے تو اس کو خوش کرنے والا سورج بھی اس کے لئے تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

چرن چونچ رنگ لوچن ۔ چلو مرالی چال
چھیر نیر دیورن سمے بک اُگھرت تہی کال

مطلب۔ جس طرح سے بگلا اپنی چال ۔ چونچ اور آنکھوں کی سرخی سے ہنس کی چال چلکر راج ہنس نہیں ہوسکتا

کیونکہ جس وقت دودھ اور پانی علٰحدہ ہوتا ہے اس وقت بگلے کی ساری قلعی کھل جاتی ہے اسی طرح سے اوپری بناؤ سنگار کرنے والے بگلا بھگت کی بھی امتحان کے وقت ساری حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اور اس کو آخر میں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔

ملے جو سرل ہی سرل ہے کٹل نہ کیہہ بہائی
سو کیہت جیوں بکر گت بیال نہ بل کہائی

مطلب۔ ٹیڑھی چال چلنے والا سانپ بل میں گھستے ہی سیدھی چال چلنے لگتا ہے (کیونکہ بغیر سیدھی چال چلے وہ بل میں گھس ہی نہیں سکتا) اسی طرح سے بد باطن لوگ چاہے اپنے ملنے والوں سے کتنی ہی شرافت سے کیوں نہیں پیش آئیں (کیونکہ ظاہر داری کے بغیر سوسائٹی میں ان کا نباہ نہیں ہو سکتا) مگر غیبت میں وہ برائی کرنے سے باز نہیں آسکتے کیونکہ وہ اپنی خصلت سے مجبور ہیں۔

کرس دھن سکھ ہی نہ دیب سکھ مینہہ نہ مانگت نیچ
تلسی سجن کی ریال پاوک پانی بیچ

مطلب۔ غریب دوست سے روپیہ مانگ کر تکلیف دینا اچھی بات نہیں ہے اسی طرح کنجوس کمینے دولتمند سے بھی کچھ طلب کرنا اچھا نہیں اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے مرجانا بہتر ہے۔ شریفوں کے لئے یہ دونوں حالتیں آگ اور پانی کی طرح تباہ کن ہیں۔ غریب دوست سے مانگنا چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا ہے اور کنجوس ذلیل دولتمند سے مانگنا آگ میں جل کر مرجانے کے برابر ہے۔

نیچ نچپائی نہ تجے سجن ہو کے سنگ
تلسی چندن بٹپ بسن بن بشن بھئے نہ بھوانگ

مطلب۔ جس طرح سے چندن ایسے پاکیزہ اور خوشبودار درخت میں لپٹے رہنے سے سانپ اپنے زہریلے اثر کو دور نہیں کر سکتا اسی طرح کمینہ شخص بزرگوں کے پاس رہ کر بھی اپنی کمینہ خصلت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

پیہن سمن رس الی بٹپ کاٹ کول پھل کھات
تلسی ترو جیون جگل سمت کمئت کی بات

مطلب۔ تلسی داس جی کہتے ہیں کہ اگرچہ کوئل اور بھونرا دونوں ہی کی زندگی کا سہارا درخت ہوتے ہیں لیکن ان کے خیالات اور مقاصد میں بین فرق ہے۔ بھونرا تو درخت کے پھل پھول پر عاشق ہو کر اپنا گانا سنا کر خوشبو سونگھتا ہے اور رس چوستا ہے لیکن کوئل پھلوں کو کتر کاٹ کر درخت کو تکلیف پہونچا کر ہی خوش ہوتی ہے۔ حقیقت میں دونوں کی زندگی کا انحصار درخت پر ہے لیکن حسب منشا اور خصلت کے مطابق کام کرتے ہیں۔

تلسی مٹے نہ مرمٹھو سانچوں سہج سنیہہ
مور سکھا بن مرہو پل ہت گرجت مینھہ

مطلب۔ گوسائیں جی کہتے ہیں کہ سچی محبت مرنے کے بعد بھی نہیں جاسکتی جس طرح "مورسکھا" بوٹی ۸ مہینے تک جلی بھنی بغیر جڑ پتی کے بھی صرف بادل کی گرج ہی سُن سُن کر جیتی رہتی ہے (یہاں تک کہ برسات کا موسم آجاتا ہے اور وہ ہری بھری ہو جاتی ہے)

اوسر کوڑی جو چکے بہری دے گا لاکھ
دوج نہ چندا دیکھئے ادو کھا بھر پاکھ

مطلب۔ اگر موقع ملنے پر کسی نے اپنی غلطی کی تلافی نہ کی تو بعد میں چاہے وہ لاکھ کوشش کرے پھر وہ بات نہیں ٹل سکتی۔ جس طرح اگر کسی نے اچھی ساعت میں دوج کے چاند کو نہ دیکھا تو چاہے وہ مہینہ بھر چاند دیکھا کرے تو کیا ہوتا ہے۔

اتم مدھیم نیچ گت پاہن سکتا پان
پریت پریکھیا تہن کی بیر بہت کرم جان

مطلب۔ شریفوں کی دوستی پتھر کی لکیر کی طرح دائمی ہوتی ہے۔ معمولی آدمیوں کی دوستی ریت کی دیوار کی طرح تھوڑے دن تک رہتی ہے اور کمینوں کی دوستی پانی کی لکیر کی طرح فوراً مٹ جانے والی ہوتی ہے اسی اصول سے تینوں کی دشمنی کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے (یعنی شریفوں کی دشمنی پانی کی لکیر کی طرح جلد مٹ جاتی ہے معمولی آدمیوں کی دشمنی ریت کی دیوار کی طرح کچھ عرصہ تک رہتی ہے لیکن کمینوں کی دشمنی پتھر کی لکیر کی طرح کبھی نہیں جاسکتی)۔

آپ آپ سب بھلو اپنے کیوں کوی کوی
تلسی سب کون جو بھکو سجن سراہے سوی

مطلب۔ اپنے آپ کے لئے تو سب اچھے ہیں لیکن غیروں کے ساتھ بھلائی کرنے والے شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔ گوسائیں جی کہتے ہیں کہ جو سب کے لئے بھلا ہے بزرگ منش انھیں کی تعریف کرتے ہیں۔

تلسی ترن جل کول کو نردھن نپٹ نکاج
کے راکھے کے سنگ چلے بانہہ گہے کی لاج

مطلب۔ جو تنکا پانی کی لہروں کی چوٹ سے بہ کر کنارے آلگا ہو اس تنکے سے بڑھکر بدنصیب اور حقیر کون ہوسکتا ہے کیونکہ وہ تو ہر حالت میں بےکس ہے چاہے پانی کی لہریں اُسے ساحل پر پڑا رہنے دیں چاہے ہاتھ پکڑنے کی لاج سے اپنے ساتھ بہالے جائیں۔

سنے سدھا دیکھنے گرل سب کرتوت کرال
جہاں تہاں کاگ اُتو بک مانس سکرت مرال

مطلب - آبحیات کا نام بہت سُنا لیکن گولر کے پھول کی طرح کبھی دکھائی نہیں دیا - یہ سب خدا کی شان ہے جس طرح سے ہنس تو مانسرور جھیل ہی میں دیکھے جاسکتے ہیں لیکن بگلا - کوا اور اُلو بافراط ہر مقام پر نظر آتے ہیں -

اعظم کُریوی

ہندی شاعری کے تین خاص دور

ہندی شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی اس کی کوئی صحیح تاریخ متعین نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ بکرمی نویں اور گیارھویں صدی کے درمیان ہندی شاعری کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں راجپوتوں کی حکومت تھی اور تمام ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا یہ سب راتدن آپس میں لڑا کرتے تھے اور اپنی تعریف کرنے والے بھاٹوں کو انعامات دیا کرتے تھے بس یہیں سے ہندی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔

یہ بھاٹ لڑائیوں میں بھی راجاؤں کے ساتھ رہتے تھے اور سپاہیوں کو بہادرانہ گیت سُنا سُنا کر متاثر کیا کرتے تھے، یہ اپنے لڑکوں کو بھی اپنے بنائے ہوئے گیت یاد کرادیا کرتے تھے اور اس طرح سے وہ گیت محفوظ رہ گئے۔ اس جنگ و جدل کے بعد جب راجپوت قوم کا زوال شروع ہوا اور ملک میں مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی تو اسوقت ان گیتوں کو تحریر میں لایا گیا۔ گو یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا تھا۔

ہندی شاعری کا ابتدائی زمانہ

سب سے پہلی رزمیہ تصنیف جس کا پتہ لگا ہے۔ "کھمان راسو" ہے۔ یہ تصنیف کھمان اول سے متعلق ہے۔ سمبت ۸۱۰ سے ۱۰۰۰ کے درمیان اس نام کے تین شخص ہوئے ہیں۔ مگر بعض کا خیال ہے کہ کھمان ایک ہی ہوا ہے۔ اس کتاب میں خلیفہ المامون کے ساتھ کھمان کی جنگ کا بیان ہے۔ کہتے ہیں کہ کھمان راسو کا مصنف دل پتی بجے بھاٹ تھا۔ مگر اس کتاب کا جو نسخہ ملا ہے اس میں مہارانا پرتاپ سنگھ کا بھی بیان ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے شعراء نے بھی اس میں اپنے گیت شامل کردئے ہیں۔ "شیو سنگھ سروج" نام کی مشہور کتاب میں کھمان راسو کا مصنف "اگیات نام بھاٹ" لکھا ہے جس کے معنی ہیں نامعلوم بھاٹ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھمان راسو کے مصنف کے نام کے متعلق اختلاف ہے۔ مگر یہ طے شدہ ہے کہ اس کی تصنیف نویں یا دسویں صدی کے درمیان ہوئی ہے اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندی شاعری کا آغاز بکرمی نویں اور گیارھویں صدی کے درمیان ہوا ہے اور سب سے پہلی تصنیف "کھمان راسو" ہے۔

ہندی شاعری کے اس ہزار سالہ وقت کو کئی حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے لیکن ہم دو عہدوں میں منقسم کریں گے ایک وہ زمانہ جسے ہم رزمیہ شاعری کا عہد کہیں گے اور دوسرا وہ جو ۱۸۵۶ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

ہندی شاعری کے رزمیہ عہد کی تصانیف اور ان کے نام جو اس وقت تک معلوم ہو سکے ہیں یہ ہیں:-

	نام کتاب	مصنف	زمانہ
۱	کھمان راسو	دل پتی سیجے	نویں بکرمی سمبت
۲	بسیل دیو راسو	نرپتی نلھ	سمبت ۱۲۱۲ بکرمی
۳	پرتھوی راج راسو	چند بردائی	۱۲۲۵ - ۱۲۴۹ بکرمی
۴	آلہا	جگ نک	۱۲۳۰ بکرمی
۵	ہمیر راسو	سارنگ دھر	۱۳۵۷ بکرمی
۶	بیجے پال راسو	نلہ سنگھ بھٹ	۱۳۵۵ بکرمی

مذہبی دور سمبت ۱۲۵۰ سے ۱۶۵۰ تک

بکرمی چودھویں صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی جڑ مضبوط ہو چکی تھی۔ اور ہندو راجہ لڑتے لڑتے تھک گئے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ رزمیہ شاعری کا کوئی محل نہ تھا اور مسلمانوں کی حکومت کے خلاف زبان کھولنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے شعراء کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا۔ اس سے پہلے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں سنسکرت میں تھیں اور ان کا رواج اُٹھتا جاتا تھا عوام مذہبی روایات سے بالکل بے بہرہ ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں رامانج اور رامانند وغیرہ نے لوگوں کو بھگتی مارگ کی طرف متوجہ کیا۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے سوامی رامانند بھگتی تحریک کے بڑے زبردست محرک تھے اور انھوں نے ذات پات اور اونچ نیچ کی پرواہ کئے بغیر سب کو اپنا چیلہ بنایا یہی وجہ ہے کہ ہم سوامی رامانند کے شاگردوں میں برخلاف اور دوں کے کبیرداس جیسے جولاہے اور رائے داس جیسے چمار بھی دیکھتے ہیں۔

بھگتی تحریک کی وجہ سے لوگ رام اور کرشن کی مورتوں کو دیوالیوں میں رکھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی شاعری بام عروج پر پہونچ چکی تھی۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب تلسی داس سورداس وغیرہ مشہور شاعر پیدا ہوئے۔ اور کرشن جی کے متعلق اتنی شاعری کی گئی کہ مشکل ہی سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔

صوفی شعراء

اس میں شک نہیں کہ صوفی شعراء نے ہندی شاعری میں بڑا اضافہ کیا۔ ان میں سب سے پہلے جس شخص کا نام لیا جا سکتا ہے وہ رامانند کے چیلے کبیر ہیں ان کا زمانہ ۱۴۵۶ - ۱۵۷۵ بکرمی تک ہے۔ کبیر میں بہ نسبت اور دل کے تصوف بہت زیادہ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ تصوف انھیں سے اور لوگوں میں بھی پہونچا ہے۔

کبیر کے شاگردوں میں بھی بہت سے ایسے صوفی ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے فرقے الگ قائم کئے ان میں سب سے پہلے ہم گرونانک کو لیتے ہیں۔ گرونانک کے خیالات بھی قریب قریب کبیر کے جیسے ہی تھے۔ ان کے علاوہ بعض اور شعرا حسب ذیل ہیں :۔

دھرم داس ۔ یہ کبیر کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور انھوں نے بھی کچھ پد اور دوہے کہے ہیں۔

دادو دیال ۔ (بکرمی ۱۶۰۱) انھوں نے دادو پنتھ کے نام سے اپنا ایک فرقہ الگ قائم کیا۔ ان کے بہت سے پد، رابندرناتھ ٹیگور کے کلام سے ملتے جلتے ہیں۔

سندر داس ۔ یہ بھی صوفی شعرا میں سے ہیں اور دادو دیال کے شاگرد تھے۔ انھوں نے برج بھاشا میں شاعری کی ہے یہ سنسکرت کے بھی اچھے عالم تھے۔ ان کی مشہور کتاب کا نام سندر بلاس ہے۔

بعض کے نام یہ ہیں :۔

پلٹو، بھیکھا، ملوک داس، رائے داس، دولم داس، تلسی صاحب، چرن داس، لال داس، سہجو بائی، پران ناتھ، سیو نارائن، غریب داس، رام چرن، جگ جیون داس۔

وشنوی شعراء

(الف) رام بھگتی۔ اسے ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ رامانج اور رامانند نے بھگتی تحریک کا آغاز کیا تھا اور لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے لیکن جو مرتبہ تلسی داس کو حاصل ہوا وہ کسی کو نہیں ملا۔ ان کی خاص تصانیف رام چرت مانس، ونے پترکا، دوہاولی اور گیتاولی وغیرہ ہیں۔ لیکن ہندوں میں جتنی زیادہ انکی کتاب رام چرت مانس کی اشاعت ہے اتنی اور کسی کتاب کی نہیں ہے۔ رام چرت مانس کو ہم ایک قسم کی مثنوی کہہ سکتے ہیں۔ دوہا چوپائیوں میں یہ ساری کتاب لکھی گئی ہے۔ ہندی شاعری میں اس نوع کی مثنوی لکھنے کی داغ بیل پہلے پہل مشہور مسلمان ہندی شاعر ملک محمد جائسی نے ڈالی تھی اور شاید یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ تلسی داس ضرور جائسی سے متاثر ہوئے۔

تلسی داس کے علاوہ رام بھگت شعرا میں جن کا نام لیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں :۔

نابھا داس، پران چند چوہان، ہردے رام۔

(ب)۔ کرشن بھگت وشنو شعرا۔

شمالی ہند میں وشنوی مذہب کی اشاعت ہونے کے بعد ولبھ آچاریہ وغیرہ نے ہندوستان کے مختلف مقامات میں ان کی اشاعت شروع کی۔ گھومتے گھومتے آخر میں وہ برج (متھرا وغیرہ) میں رہنے لگے۔ ولبھ آچاریہ کے لڑکے گوسوامی بٹھل ناتھ بھی مختلف مقامات میں گھوم گھوم کر کرشن بھگتی کی اشاعت کرتے رہے ان لوگوں نے اپنے اس کام میں موسیقی سے بھی کچھ مدد لی جس سے بہت سے شعرا اس تحریک کی طرف

مایل ہو گئے۔

کرشن بھگتی کی اشاعت کے لئے انھوں نے چار چار شعرا کو شاگرد بنا کر ان کا نام اشٹ چھاپ رکھدیا جو بذریعہ شاعری اس تحریک کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں :-

۱- سور داس - ۲- کمبھن داس - ۳- پرمانند داس - ۴- کرشن داس - ۵- چھیت سوامی -
۶- گووند سوامی - ۷- چتر بھج داس - ۸- نند داس -

ان کا زمانۂ شاعری بکرمی سولھویں اور سترھویں کے درمیان تھا۔ ان شعرا میں سور داس اور نند داس بہت مشہور ہوئے ہیں۔ سور داس کی مشہور تصنیف سور ساگر ایسی کتاب ہے کہ اس کے مقابلہ میں اپنے موضوع کے لحاظ سے کوئی کتاب ہندی میں پیش نہیں کی جاسکتی یہ کتاب اصول موسیقی سے متعلق ہے اس میں کرشن جی کے بچپن کے حالات اور گوپیوں کا بیان بےمثل ہے۔ سور داس کی دو کتابیں اور بھی ہیں جن کے نام سور سار آولی اور ساہتیہ لہری ہیں ۔

سور داس کے بعد نند داس کو بھی ہندی شاعری میں مخصوص درجہ حاصل ہے۔ ان کی تصانیف میں سے بھنور گیت اور راس پنچا ادھیائی وغیرہ ہیں

اشٹ چھاپ کے شعرا کے علاوہ دو شاعر اور بھی ہیں جو کرشن بھگت شاعروں میں بہت مشہور ہوئے ہیں۔ ان کے نام بدیاپتی اور میرابائی ہیں۔ یہ دونوں شعرا پد یعنے گانے لکھتے تھے۔ سب سے پہلے ہندی شاعری میں سکھی اور نائک اور نائکہ وغیرہ کا استعمال بدیاپتی نے کیا ہے۔ میرابائی زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں تھیں مگر جذبات کے لحاظ سے ان کے پد ہندی شاعری میں بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور اگر جذبات کا اظہار شاعری سمجھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میرابائی بڑی زبردست شاعرہ تھیں۔

ان کے علاوہ بعض کرشن بھگت شعرا کے نام یہ ہیں :-

۱- ہت ہری بنس - ۲- ہری داس - ۳- رس کھان - ۴- گھنانند -

مثنوی لکھنے والے شعرا

بکرمی پندرھویں اور سترھویں صدی کے درمیان کچھ شعرا مثنوی لکھنے والے بھی پیدا ہوئے جن میں سے بعض مسلمان بھی تھے۔

سب سے مشہور اور کامیاب لکھنے والے ملک محمد جائسی تھے جن کی دو تصانیف پدماوت اور اکھراوٹ ہندی شاعری میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بےمثل ہیں۔ اس زمانہ کے کچھ شعرا اور ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

نام شاعر	نام کتاب	زمانۂ تصنیف
۱- کتبن (قطبن)	مرگاوتی	۱۵۵۸ بکرمی

نام شاعر	نام کتاب	زمانۂ تصنیف
۲— منجھن	مدھو مالتی	۱۵۵۰-۱۵۹۵ء کے درمیان
۳— ملک محمد جائسی	۱- پدماوت — ۲- اکھراوٹ	۱۵۹۷ بکرمی
۴— عثمان	چترا ولی	زمانۂ حکومت جہانگیر
۵— نور محمد	اندراوتی	۱۸۰۱ بکرمی

ہندی شاعری اور شاہان اسلام

اکبر کا زمانۂ حکومت ہندی شاعری کے لئے بہت مبارک ثابت ہوا اکبری دربار میں جہاں فارسی شعرا کا دوردورہ تھا وہاں ہندی شعرا کی بھی کافی عزت کی جاتی تھی۔

تلسی اور سور جیسے مشہور شاعر اکبر ہی کے زمانہ میں ہوئے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بھگتی شاعری کے بجائے لوگوں کا خیال سنگار رس کی طرف گیا۔

اس عہد کے خاص شعرا یہ تھے:۔

۱— نواب عبدالرحیم خان خاناں۔ یہ اکبری فوج کے سپہ سالار تھے۔ انھوں نے ہندی میں بہت بلند درجے کی شاعری کی ہے ہندی میں ان کے اخلاقی دوہے بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے نائکہ بھید پر بھی شاعری کی ہے۔

۲— گنگ۔ یہ بھی بہت مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ خان خاناں ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

۳— تان سین۔ یہ گوئیے بھی تھے اور شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔

۴— فیضی۔ انھوں نے ہندی میں بھی دوہے لکھے ہیں۔

۵— سیناپتی۔ یہ ہندی کے مشہور شاعر مانے جاتے ہیں۔ کوت رتناکر اور کاویہ کلپ درم ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

۶— مبارک۔ ان کے بعض دوہے ہندی کے مشہور شاعر بہاری لال سے ملتے جلتے ہیں۔

۷— بلبھدر مصر۔ یہ مشہور شاعر کیشوداس کے بڑے بھائی تھے۔ نکھ سکھ سنگار، گوبردھن ستسئی وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

ان کے علاوہ، قادر، بنارسی داس، کرن، راجہ بیربل، راجہ ٹوڈرمل اور راجہ منوہرداس بھی مشہور شاعر ہوئے ہیں۔

تلسی اور سور جیسے بھگت شعرا کی شاعری کا خاص موضوع بھگتی تھا۔ یہ لوگ سکھی بھاؤ یعنی اپنے کو عورت اور رام کرشن کو اپنا شوہر تسلیم کرکے شاعری کیا کرتے تھے بعض نے اپنے کو خادم اور رام کرشن کو مخدوم تصور کرکے شاعری کی ہے اس کے بعد سنگار رس اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور شعرا نے عورت کی خوبصورتی (نائکہ بھید) کے بیان کو اپنے لئے مخصوص کرلیا۔ سب سے پہلے کرپارام نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا اور اس کے بعد اس کا رواج اتنا عام ہوا کہ ہر شخص اسی رنگ میں رنگ گیا یہاں تک کہ آج بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے۔

ہندی شاعری اور مسلمان

مسلمانوں کی آج کل کی حالت دیکھتے ہوئے مشکل سے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی کسی وقت ہندی شاعری میں حصہ لیا تھا، مگر تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے ہندی ادب کے خزانہ کو مالامال کرنے میں ہندوؤں کے برابر اتنا حصہ لیا کہ اگر ہم مسلمان شعرا کی ہندی تصانیف کو ہندی سے الگ کردیں تو ہندی شاعری میں بڑی کمی پیدا ہوجائے جس طرح ہندو شعرا کی تصانیف رام چرت مانس، سور ساگر اور دیگر تصانیف ہندی ادب کی بے مثل چیزیں ہیں اسی طرح پدماوت بھی ہندی شاعری میں اپنا ایک مخصوص مرتبہ رکھتی ہے۔ اور سیکڑوں مسلمان شعراء کے نام ہندی کی تاریخ ادب میں نظر آتے ہیں اسی کے ساتھ مسلمان امراء و سلاطین نے جتنی قدر افزائی ہندی شعرا کی کی وہ ایک علٰحدہ ثبوت مسلمانوں کی دلچسپی کا ہے۔

نواب عبدالرحیم خان خاناں جو رحیم تخلص رکھتے تھے اور ہندی کے بہت بڑے اخلاقی شاعر مانے جاتے ہیں انھوں نے ایک چھپے (ایک قسم کی شاعری) پر خوش ہوکر مشہور شاعر گنگ کو ۳۶ لاکھ روپیہ انعام دیا۔

کہتے ہیں کہ ایک بار شہنشاہ اکبر نے مہاراجہ مان سنگھ کو کابل فتح کرنے کے لئے روانہ کیا مگر راستہ میں اٹک ندی پڑگئی اس لئے وہ رُک گئے کیونکہ مذہبی لحاظ سے اس ندی کو پار کرنا گناہ تھا۔ اکبر کو جب یہ معلوم ہوا تب اس نے ایک دوہا لکھ بھیجا جسے پڑھکر وہ اٹک ندی پار کر گئے۔ دوہا یہ ہے:-

سبئے بھومی گوپال کی | یا میں اٹک کہا
جا کے من میں اٹک ہے | سو ہی اٹک رہا

اکبر کے زمانہ میں امیر خسرو جو ایک فارسی کے مسلمان شاعر تھے فارسی اور اسوقت کی ہندی (بول چال کی زبان) میں ایک نعت خالق باری کے نام سے تصنیف کی جو آج کل لڑکوں کو پڑھائی جاتی ہے یہی نہیں اورنگزیب جیسا ... مسلمان بھی ہندی شاعری کا دلدادہ تھا اور ہندی شاعروں کی قدر کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ مشہور رزم گو شاعر بھوشن پہلے اورنگ زیب کا بھی درباری شاعر رہا تھا جو بعد کو سیواجی کے یہاں چلا گیا تھا۔

... وقت میں داؤد ایک شاعر ہوئے تھے جنھوں نے ہندی اشعار میں نورک اور چندا کا فسانہ محبت

لکھا ہے مگر آج کل یہ کتاب دیکھنے میں نہیں آتی۔ سمبت ۱۵۶۰ بکرمی میں کتبن شیخ نے جو شیر شاہ سوری کے والی حسین شاہ کے یہاں رہتے تھے مرگاوتی نام کی ایک مثنوی لکھی۔ اسے ہندی میں سب سے پہلی مثنوی [illegible]
اسی طرح ملک محمد جائسی کی مشہور تصنیف پدماوت ہندی ادب اور ہندی شاعری میں ایک مخصوص [illegible]
اکبر بادشاہ خود ہندی کا شاعر تھا۔ اس نے ہندی میں سنگار رس (بزمیہ) شاعری کی ہے۔

نواب عبدالرحیم خان خانان اکبری دربار کے مشہور ہندی شاعر تھے ان کی اخلاقی شاعری بہت مشہور [illegible] انھوں نے۔ ۱۔ رحیم ستسئی۔ ۲۔ بروے نائکا بھید۔ ۳۔ راس پنچادھیائی۔ ۴۔ اور سنگار سورٹھ وغیرہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

अब रहीम मुश्किल परी, गाढ़े दोऊ काम।
सांचे ते तो जग नहीं, झूठे मिलैं न राम॥

اب رحیم مشکل پری گاڑھے دوؤ کام　　سانچے تے تو جگ نہیں جھوٹے ملیں نہ رام

کیسی مشکل ہے سچ کہنے میں دنیا ساتھ نہیں دیتی اور جھوٹ کہنے سے خدا نہیں ملتا۔

अंजन दियो तो किरकिरी, सुरमा दियो न जाय।
जिन आंखिन सों हरि लख्यो रहिमन बलि २ जाय॥

انجن دیو تو کرکری سرما دیو نہ جائے　　جن آنکھن سوں ہری لکھیوں، رحمن بلی بلی جائے

آنکھوں میں انجن لگانے سے کرکراہٹ پیدا ہو جاتا ہے اور سرمہ لگایا نہیں جاتا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جن آنکھوں میں محبوب سما جائے ان میں کسی اور کا گزر مشکل ہے۔

जो सुलगे ते बुझि गये, बुझे ते सुलगे नाहिं।
रहिमन दाहे प्रेम के, बुझि २ के सुलगाहिं॥

جے سلگے تے بجھ گئے بجھے تے سلگے ناہیں　　رحمن داہے پریم کے بجھ بجھ کے سلگاہیں

جو چیز سلگتی ہے وہ بجھ جاتی ہے، جو بجھ جاتی ہے وہ سلگتی نہیں لیکن اہل محبت کا عجیب حال ہے کہ بجھ بجھ کے سلگتے ہیں۔

जेहिं रहीम तनु मन लियो, कियो हिरदय बिच भौन
तासों दुख सुख कहन की रही बात अब कौन॥

جہیں رحیم تن من لیو کیو ہردے بچ بھون　　تاسوں دکھ سکھ کہن کی رہی بات اب کون

اے رحیم جس نے تن من سب لے لیا جس نے دل پر قبضہ کر لیا اس سے اب دکھ سکھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

जो रहीम मन हाथ है, मनसा कहु किन जाहिं।
जल में जो छाया परी काया भाजति नाहिं ।।

جو رحیم من ہاتھ ہے من ساکہوں کن جاہیں　　　جل میں جو چھایا پری کایا بھیجت ناہیں

اگر دل اپنے قبضہ میں ہے تو دل چاہے جہاں جائے ہرج نہیں ہے۔ جیسے پانی میں جسم کا عکس پڑتا ہے مگر جسم نہیں بھیگتا۔

मोरे गई लगाय आगि लेन आई जो तिय

مورے گئی لگائے آگ لین آئی جو تی

وہ آگ لینے آئی تھی لیکن میرے دل کو بھی آگ لگا گئی۔

رحیم ہی کی طرح رسکھان بھی ایک بہت بڑے مسلمان شاعر ہوئے ہیں۔ بہت لوگ ان کا اصلی نام سید ابراہیم پہانی والے بتلاتے ہیں ان کے متعلق اہل زبان کا کہنا ہے کہ انھوں نے خالص برج بھاشا میں شاعری کی ہے برج بھاشا کے متعلق ان کی زبان معیاری چیز سمجھی جاتی ہے۔ آج بھی بہت سے ہندو ان کے بنائے ہوئے کبت اور سویئے صبح کے وقت پوجا کرتے ہوئے گایا کرتے ہیں اور اس مسلمان کے الفاظ ہر مندر اور ٹھاکر دوارے میں گونجا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مختصر نمونہ ملاحظہ فرمایئے:-

मानस हो तो वही रसखान बसौं ब्रज ।,
गोकुल गोप गुवारन जौ पसु हौं तो कहा
बस मेरे चरौं नित नंद की धेनु मझारन ।।
पाहन हौ तो वही गिरि को जु कियो ब्रज राज
पुरंदर कारन । जो खग होउ बसेरो करौ
वही कालंद्री कोल कदंब की डारन ।। ।।

مانس ہوں تو وہی رسکھان بسوں برج گوکل گوپ گوارن — جو پسوں ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند، دھینو مجھارن ... پاہن ہوں تو وہی گری کو جو کیو برج چھتر پورندر کارن — جو کھگ ہوں بسیرو کروں وہی کالندری کول کدمب کی ڈارن ...

اپنی دلی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد میں پھر آدمی ہوں تو خواہش یہ ہے کہ گوکل میں گوپیوں کے یہاں پیدا ہوں اور اگر جانور ہوں تو کرشن کی گایوں کے ساتھ چرا کروں۔ اگر پتھر ہوں تو اس پہاڑ کا جسے کرشن جی نے اٹھایا تھا اور اگر پرند ہوں تو انھیں درختوں میں اپنا آشیانہ بناؤں جو جمنا کے کنارے ہیں۔

اور جہاں کرشن جی گائیں چرایا کرتے تھے۔

سید ابراہیم رسکھان کو کہا جاتا ہے کہ وشنوی مذہب سے متاثر ہو کر وشنوی ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری زیادہ تر کرشن کی عبادت اور محبت سے لبریز ہے۔

سمبت ۱۶۷۷ بکرمی میں شیخ حسن نام کے لڑکے عثمان نے ایک عشقیہ مثنوی تصنیف کی جس کا نام چترا ولی تھا یہ بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

تاج۔ یہ ایک مسلمان خاتون تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ کرشن کی محبت میں سرشار رہتی تھی۔ اس کا وہ کبت بہت مشہور ہے جس میں اس نے ترک اسلام اور کرشن کی محبت کا اظہار کیا ہے۔

عالم۔ یہ بھی اونچے درجے کے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے سنگار رس (عشقیہ) شاعری کی ہے — یہ سمبت ۱۷۴۵ بکرمی میں تھے۔ یہ پہلے قوم کے برہمن تھے مگر بعد میں ایک مسلمان رنگریزن کی محبت میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے ایک لڑکا بھی ہوا تھا۔

عالم عشقیہ شاعر تھے ان کی ایک کتاب عالم کیلی نام کی ہے۔ کہتے ہیں ایک بار رنگریزن کو جس کا نام شیخ بتایا جاتا ہے انھوں نے اپنا صافہ رنگنے کے لئے دیا تھا اتفاق سے اس میں ایک دوہے کا ایک حصہ بندھا رہ گیا، جو یہ تھا:۔

کنک ان سی نار ہے، کت کاہے تے بین

(یعنی وہ ایک سرو زریں ہے لیکن اس کی کمر کیوں اتنی پتلی ہے)

کہتے ہیں کہ جب صافہ دھل کر آیا تو اس میں اس دوہے کا دوسرا مصرع اس طرح لکھا ہوا تھا:۔

کٹ کا کنچن اینچ کے کنچن مانج بھر دین

(کمر کا سونا نکال کے سینہ میں بھر دیا گیا ہے اس لئے کمر اتنی پتلی ہو گئی ہے) اسی وقت سے دونوں میں محبت ہو گئی اور عالم مسلمان ہو گئے۔

شیخ کی ہر چند کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے مگر مختلف مقامات میں جو دوہے ان کے نظر آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ برج بھاشا کی اچھی شاعرہ تھی۔

عبدالرحمٰن شاعر اورنگ زیب کے شاہزادے بہادر شاہ کے منصب دار تھے۔ انکی تصنیف "یمک ستک" نام سے مشہور ہے اس میں ۱۰۷ دوہے ہیں۔

سید غلام نبی رسلین بلگرامی جو اٹھارھویں صدی کے شاعر تھے۔ ان کی انگ درپن اور رس پربودھ اب تک موجود ہیں۔ بعض دوہے تو ان کے اتنے اچھے ہیں کہ لوگ بہاری کے دوہے سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً:۔

امی ہلاہل مدبھرے سویت شیام رتنار　　جیت مرت جھک جھک پرت جہیں چتوت اکبار

نور محمد نے سمبت ۱۸۰۰ بکرمی میں جائسی کی طرح ایک فسانۂ محبت چوپائیوں میں لکھا ہے۔ ان کی اس تصنیف کا نام اندراوتی ہے۔

حاجی ابراہیم سرہندی کا ترجمہ اتھرو وید کا اور نصیب خاں و عبدالقادر بدایونی کی رامائن و مہابھارت، اسی طرح ملا فیضی کی لیلاوتی اور نل دمینتی، شاہ محمد شاہ آبادی کی راج ترنگنی، کمل خاں گجراتی کی تاجک اور مولانا شیری کی ہری بنس۔ وہ تصانیف ہیں جن کا ذکر تاریخ میں موجود ہے۔

علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں ہندی کا ایک مشہور شاعر کیدار تھا اور علاؤ الدین اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ ہمایوں نے تعلیم چندرجین کی اور اکبر نے گنگ، نرہری، کرن، ہول وغیرہ ہندی شعراء کی جتنی عزت افزائیاں کیں وہ بھی ارباب تاریخ سے پوشیدہ نہیں۔ داراشکوہ کے جو تعلقات بابا لال داس گوسائیں سے تھے وہ بھی سب کو معلوم ہیں۔ اسی طرح شاہجہاں کے زمانہ میں کوی چندر و سندر۔ اورنگ زیب کے عہد میں ایشور، معظم شاہ کے دور میں عبدالرحمان اور محمد شاہ کے زمانہ میں گمان اور رنگلے اور بعض ہندی کے وہ مشہور شعراء تھے جن کو ہمیشہ دربار شاہی سے مدد ملا کرتی تھی۔

امرائے عصر میں فاضل علی خاں کا سکھدیو مصر کی سرپرستی کرنا، آصف الدولہ کا گردھر رائے کو انعامات دینا اور قائم خاں کا رام سہائے کی قدر افزائی کرنا، وہ واقعات ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

ذیل کی فہرست سے مسلمان شعراء کی بعض خدمات کا اجمالی علم حاصل ہو سکتا ہے:۔

نام شاعر	زمانۂ شاعری	کیفیت
احمد	سمبت ۱۶۹۶ بکرمی	
کارے بیگ	" ۱۷۰۰ "	
رجب شاہ	" ۱۷۰۰ "	ساکھی گرنتھ
قاضی قوم	" ۱۷۰۶ "	
حسین	" ۱۷[illegible] "	کالیداس ہزارا میں انکے اشعار ملتے ہیں
داراشاہ	" ۱۷۱۰ "	یہ شاہجہاں کے بڑے شاہزادے تھے
میر رستم	" ۱۷۳۵ "	انکے اشعار کالیداس ہزارا میں ہیں
زین الدین محمد	" ۱۷۳۶ "	
دانش خاں	" ۱۷۳۷ "	یہ اورنگ زیب کے یہاں رہتے تھے
آصف خاں	۱۷۲۸ "	

نام شاعر	زمانۂ شاعری	کیفیت
کریم	سمبت ۱۷۰۵ کے قبل	
محمد	〃 ۱۷۶۰ کے قریب	
عبدالجلیل بلگرامی	〃 ۱۷۶۵ بکرمی	یہ اورنگ زیب کے دربار میں رہتے تھے
رحیم	〃 ۱۷۸۰ 〃	یہ نواب خان خانان نہ تھے
عادل	〃 ۱۷۹۵ 〃	
اعظم خاں	〃 ۱۷۹۶ 〃	تصنیف سنگار درپن
طالب شاہ	〃 ۱۸۰۰ 〃	
میر احمد بلگرامی	〃 ۱۸۰۰ 〃	
رسنائک (طالب علی بلگرامی)	〃 ۱۸۰۳ 〃	رسک پریا اور ستسئی پر انھوں نے تبصرہ لکھا ہے۔
یوسف خاں	〃 ۱۸۲۰ 〃	
نواز اللہ بلگرامی	〃 ۱۸۳۰ 〃	سار چندر کا
کشور علی	〃 ۱۸۳۷ 〃	
کاظم علی	〃 ۱۸۵۸ 〃	سنگھاسن بتیسی
مرزا دنانک (بلگرامی)		یہ گویّے اور شاعر تھے
نواب ہمت بہادر	〃 ۱۸۶۰ 〃	
سید پہاڑ	〃 ۱۸۸۴ کے قبل	رس سار
عیسوی	〃 ۱۸۸۹ کے قریب	انھوں نے بہاری ستسئی پر تبصرہ لکھا ہے
اعظم	۱۸۹۰	انھوں نے چھ رتوں اور نکھ سکھ پر شاعری کی ہے۔
قاسم شاہ	۱۸۹۹	ہنس جواہر۔ یہ تصوف کی کتاب ہے
حاجی	۱۹۱۷	پریم نامہ
بختاور خاں	۱۹۲۲	انھوں نے ستی سار اور دھنسو ستے لکھی ہیں
خان	۱۹۲۵ کے قریب	
علی حسن	۱۹۳۳	
لطیف	۱۹۳۴	

نام شاعر	زمانۂ شاعری	کیفیت
گیان علی	سمبت ۱۹۹۶ بکرمی	
میر (سید امیر علی)	موجودہ	
حفیظ اللہ خاں	"	
پیر (پیر محمد)	"	
سید چھیدا شاہ	"	
محمد امیر خاں	"	آگرہ
منشی خیراتی خاں	"	تصنیف دیوری ساگر

ذیل میں ان مسلمان شعراء کی فہرست درج کیجاتی ہے جن میں سے اکثر کا کلام ناپید ہے، لیکن جو اپنے عہد میں کافی مشہور تھے:-

طاہر — دلدار — نور محمد — یتیم — پیُپی — محبوب — مبارک — ملاداؤد — یعقوب خاں — رسکھان — رسلین — شیخ فہیم — شہزادہ دانیال — الہ داد — عارف — عاسیہ پیر — انشا — قاضی اکرم فیض — خان عالم — خان ملتان — خان سلطان — تیغ علی — غلامی — دین درویش — نشاط — نیاز — میاں — میرن — مراد — میرمادھو — رسیا — رحمت اللہ — واجد صاحب — سلطان — شاہ محمد — شاہ صفی — شاہ ہادی — شیخ سلیمن — ہاشم بیجاپوری — ہمت خاں — حسین مارہری -

---

تلسی داس

نام — گو عام طور پر آپ کا نام تلسی داس ہی مشہور ہے۔ مگر تذکروں میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ دراصل یہ نام آپکا خود اختیار کردہ نام ہے۔ والدین نے جو نام رکھا تھا۔ وہ باعتبار قیاس تلارام ہے کیونکہ آتمارام پدر بزرگوار گوشائیں جی کے چار لڑکے تھے۔ گنپت۔ مہیش۔ تلارام اور منگل، منجملہ ان کے تلسی داس ہی تلارام تصور کئے گئے ہیں۔ تلسی داس کے نام سے اپنے آپ کو روشناس کرنا خود تلسی داس جی کا اس بنا پر تھا۔ کہ اپنے گرو ہری داس کے نام سے ایک قسم کی ظاہری نسبت قائم رہے۔ دوسرے اُن کے نیازمندانہ پندار نے بھی عامیانہ بات کو گوارا نہ کیا ہوگا کہ جس "رام" کے وہ داس ہیں اُس کو اپنے نام میں شامل کرکے ایک بے ادبی کے مرتکب ہوں۔ گوشائیں جی کے گرو۔ محبت سے آپ کو "رام بولا" بھی کہا کرتے تھے۔

پیدائش :— آپ کی پیدائش کی صحیح تاریخ کسی تذکرہ میں نہیں پائی جاتی۔ آپ کے چیلوں کی چوتھی پیڑھی میں شب لال جی بنارسی نوریسی نے سمبت ۱۵۸۹ بکرمی بتائی ہے۔ بعض لوگ سمبت ۱۵۸۳ ظاہر کرتے ہیں۔ جناب شیام سندر بی۔ اے نے ایک حوالہ سے سمبت ۱۵۵۴ بکرمی بھی بیان کی ہے۔ سمبت ۱۶۸۰ بکرمی میں اس جہان آب و گل سے کنارہ کشی اختیار کرنا اس دوہے سے متحقق مانا گیا ہے۔

संबत सोलह सो असी असी, गंग के तीर ।

सावन शुकला सप्तमी, तुलसी तज्यो शरीर ।।

سمبت سولہ سو اسی اسی گنگ کے تیر ساون شکلا سپتمیں تلسی تجیو شریر

نہیں کہا جاسکتا کہ ان دئے ہوئے حوالوں میں سے کس کو صحیح مانا جائے۔ سمبت ۱۵۸۹ کی رو سے ۹۱ اور سمبت ۱۵۵۴ کی رو سے ۱۲۶ سال کی عمر پانا ثابت ہوتا ہے۔ اس قدر طویل زندگی پانا بھی اگرچہ خالی از تامل نہیں مگر بھگتوں اور خاصان خدا کی زندگیاں بالعموم ایسی ہی لمبی چوڑی بتائی گئی ہیں۔ جس پر ہماری خوش اعتقادی تھوڑا بہت رنگ اپنی طرف سے چڑھاتی رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ۱۲۶ سال کی نہیں تو ۹۱ سال کی عمر گوشائیں جی نے پائی ہو۔

یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ آپ کی پیدائش "ابھگت" مول میں ہوئی تھی۔ ابھگت مول ایک نچھتر ہے جو ہندو دھرم میں منحوس مانا گیا ہے۔ اس نچھتر میں اولاد کا پیدا ہونا والدین کے لئے قسم قسم کے آلام و مصائب کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے

اور اس قسم کے آنے والے ناقابل برداشت اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ناظرین کو پیدائش کے بعد نئے مولود کو اپنے سے جدا کر دیتے ہیں اور اس کی صورت نہیں دیکھتے چنانچہ اسی مذہبی اعتقاد یا رسم معروفہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے گوسائیں جی کے والدین نے ان کو تیاگ دیا۔ اس واقعہ کو گوسائیں جی ہی کی زبان میں سنئے کہتے ہیں:-

जननी जनक तज्यो जनमि करम बिन बिधिहू सिरजो अवडेरे।

جننی جنک تجیو جنمی کرم۔ بن بدہی ہو سرجو اب ڈیرے

یعنی پیدا ہوتے ہی میرے ماں باپ نے مجھ کو تج دیا۔ بدھاتا نے مجھے شاید بدبخت سمجھ کر ہی پیدا کیا تھا۔

آتما رام کا اپنے معصوم بچہ کو علیحدہ کرتے وقت اس کے مستقبل کے متعلق نہ معلوم کیا کیا خیال ہوگا مگر قدرت چلائے نے کہا اس وقت بھی کہہ رہی تھی کہ دیکھنا یہ نوشگفتہ پھول جب اپنی بہار دل پر آئے گا تو بھارت ورش کے چپہ چپہ کو معطر و مشکبار کر دیگا۔ چنانچہ دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ ایک بے یار و مددگار غریب برہمن زادہ نے اپنی روحانی ترقی سے سارے ہندوستان کو مسخر کر لیا اور ادب و شاعری کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔

پرورش و کسب کمال —— قدرت کی فیاضی دیکھو گوسائیں جی والدین کی پر از شفقت گود سے محروم ہوتے ہیں تو ایک ایسی پر خلوص آغوش میں دیدیے جاتے ہیں جو پیر مرادِ آئندہ کا سرچشمہ اور علم و عمل کا مجسمہ ہے۔ گرو ہی داس یا بابا نرسنگھ داس جی نے گوسائیں جی کو پالا پوسا لکھایا پڑھایا اور دکشٹر لیکے اور جو کچھ اپنی ظاہری و معنوی پونجی تھی وہ اپنے ہونہار چیلے کے سپرد کر دی۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ گوسائیں جی نے ۵ سال کی عمر میں اپنے گرو سے اور ۱۰ سال کی عمر میں سادھو سنتوں سے "رام کتھا" سنی اور اپنے عمر کے اٹھارھویں سال خود (رامائن) "رام چرتر مانس" کی تصنیف شروع کی۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن اس میں کیا فضیلت دہری ہے۔ جس شخص کا اوڑھنا بچھونا ایک پر از حقائق آغوش ہو جس کے گرد و پیش کی فضا میں بھگتی ہی بھگتی چھائی ہوئی ہو وہ خود ایک گنجینہ اسرار الہی ہے اس نے کتھا سنی تو کیا اور نہ سنی تو کیا ہاں ایک بات ضرور قابل اعتبار ہے۔ کہتے ہیں جب گوسائیں جی بڑھ پڑھ کر جوان ہو گئے تو ان کی شادی دین بندھو پاٹھک کی دختر "رتناولی" سے ہوئی (ایک بچہ بھی پیدا ہوا جو اوائل عمر میں فوت ہو گیا) رتناولی سے گوسائیں جی کو بے حد عشق تھا ایک لمحہ بھی جدا رہنا گوارا نہ فرماتے تھے۔ کئی مرتبہ رتناولی کے میکے سے بلاوے آئے مگر گوسائیں جی نے بالکل اجازت نہ دی۔ ایک دن گوسائیں جی کا سالا ان کی عدم موجودگی میں اپنی بہن کو بلا پوچھے گچھے ساتھ لے گیا۔ گوسائیں جی کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو اپنی "تصویر تمنا" کو نہ پا کر بہت دکھی ہوئے۔ ادھر ادھر ڈھونڈا پاس پڑوس والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو اپنے بھائی کے ساتھ میکے گئیں ان کی محبت کا پیمانہ لبریز ہو چلا۔ بیوی کے کچھ دیر بعد سسرال

میں جا موجود ہوئے، شرم کی دیوی رتناولی اس طرح اپنے شوہر کے اضطراب و اضطرار کو دیکھ کر سہم گئی تنہائی میں بلا کر کہا:-

लाजन लागत आप को, दौड़े आयहु साथ ।
धिक धिक ऐसे प्रेम को, कहा कहहु मैं नाथ ।।
अस्थि चर्म मय देह मम, तासों जैसी प्रीति ।
तैसी जो श्री राम में, होत न तो भव भीति ।।

لاج نہ لاگت آپ کو، دوڑے آیہو ساتھ　　دھک دھک ایسے پریم کو، کہا کہوں میں ناتھ
استھی چرم مے دیہہ مم تاسوں جیسی پریت　　تیسو جو شری رام میں ہوت نہ تو بھو بھیت

اب کیا تھا آگ بارود سے پانی کشت زار سے وہ سلوک نہیں کرتا۔ جو اس تقریر نے گوسائیں جی سے کیا۔ نگاہوں پر جو غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے وہ یک لخت اٹھ گئے گرد و پیش کی ہر چیز بارگاہ تقدس کی جلوہ زار بن گئی اور حقیقی معنے میں دنیا جس تلسی داس کو پیش کرنے والی تھی اس نے اب یہ تقدیس ''روپ دھارن'' کیا۔

گوسائیں جی تاریخ کی روشنی میں —— بہت سے واقعات جن کا آپ سے تعلق بتلایا جاتا ہے ایسے ہیں کہ اگر ان کی افسانوی اجزاء کی تحلیل کی جائے تو کچھ باقی ہی نہیں رہتا اس لئے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اسیات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے اکبر و جہانگیر کا زمانہ پایا۔ اب رہا یہ امر کہ اکبر نے آپ کو قید کیا یا جہانگیر نے کاشی کا شاداب علاقہ دینا چاہا تصدیق طلب ہے۔ عام طور پر معمولی ذہنیت کے سوانح نگار آج بھی اسی طرز روش پر چلنے کو سعادت سمجھتے ہیں جو ان کے اگلے لکھ گئے ہیں اور آج سے تین سو سال ادھر کے لکھنے والے یہ کیا جانتے تھے کہ کچھ دور آگے چلکر ایسا زمانہ بھی آرہا ہے جب بال کی کھال کھینچی جائے گی ہر واقعہ کے لئے ایک تاریخی شہادت درکار ہوگی اور وہی قول مقبول ہوگا جس کو عقل سلیم باور کرے۔ اس لئے مُردوں کا زندہ کرنا، مندر کا گوسائیں جی کی عدم شرکت کی وجہ سے از خود بند ہو جانا، بندروں کی فوج کا قید سے رہائی دلانا، ایسے واقعات ہیں جو یا تو کسی کہانی سے متعلق ہونا چاہئیں یا پھر گوسائیں جی ہی کو سرے سے دیوتا تصور کر لیا جائے۔

موجودہ روشن خیال اور تعلیم یافتہ طبقہ جس سے توقع کی جا سکتی تھی کہ اپنے ملت کے اس بزرگ اور برگزیدہ منش کے منور چہرہ پر جو حجابات ہیں اُن کی نقاب کشائی کرے گا۔ اول تو اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوا اور اگر کسی نے کچھ عنایت بھی فرمائی تو معمولی اجزا ادھر ادھر سے فراہم کر کے ایک سادہ خاکہ پیش کر دیا اور بس جو واقعات قابل تنقید تھے یا جنکی تصحیح کی ضرورت تھی اُن کو ''شجر ممنوعہ'' سمجھ کر چھوا ہی نہیں ایسی حالت میں گوسائیں جی کے واقعات زندگی پر تبصرہ کرنا اور تنقیدی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا اس شخص کا کام ہو سکتا ہے جو پوری کوشش و کاوش

سے کام لے۔ اس دور کے ہندی و فارسی لٹریچر کا بغور مطالعہ کرے۔ جن واقعات کی جن ذرائع سے تصدیق ہو سکتی ہے اُن کو حاصل کیا جائے اور فی الجملہ گوسائیں جی سے "گرویدگی تام" رکھتا ہو۔

تبحر علمی اور تصنیفات ـــــ گوسائیں جی اپنے زمانہ کے صاحب علم اور باخبر لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں، آپ کو سنسکرت زبان میں کافی عبور تھا۔ ایک مستقل رسالہ بھی اس زبان میں لکھا ہے جس کا نام "اکت گرنتھ" ہے اور جو علم جوتش سے متعلق ہے۔ علاوہ اس کے آپ کی جملہ تصنیفات میں سنسکرت الفاظ اور جملوں کا بکثرت برمحل استعمال بجائے خود آپ کی قابلیت وجامعیت کی روشن دلیل ہے۔

تصنیفات میں متعدد کتابیں ہیں جن میں سے خاص خاص حسب ذیل ہیں:۔ رام چرتر مانس (رامائن) گیتاولی۔ دوہاولی۔ ونے پتریکا۔ کرشناولی۔ رام لتا۔ پاربتی منگل۔ جانکی منگل۔ ہنومان بہانک وغیرہ۔

گو ہر تصنیف اپنی جگہ ایک خاص پہلو لئے ہوئے ہے لیکن رامائن نے لطف زبان، حسن معانی اور مظاہر و فنی کے اعتبار سے جو شہرت حاصل کی ہے وہ آج تک بھاشا کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہندو آبادی میں شاید ہی کوئی ایسی بستی ہوگی جہاں اس کتاب کی دس پانچ جلدیں نہ پائی جائیں اور حق یہ ہے کہ گوسائیں جی نے بھی اپنی اس تصنیف میں جو زور کلام دکھایا ہے وہ مستغنی عن التعریف ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا موج در موج بہتا ہوا چلا آ رہا ہے یا ایک بادل ہے کہ چاروں طرف آکاش پر چھایا ہوا ہے مثال کے لئے تین شعر ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

सुनि गृहंनबचन भूप हिय शोकू ।।
ससि कर छुअत विकल जिमि कोकू ।।
سن مرد دبچن بھوپ ہئے توکو   سسی کر چہوت بکل جمی کوکو،

गयऊ सहाम नहिं कछु कहि आवा।
जनु सचान बन झपटेउ लावा ।।
گیو سہمی نہن کچھ کہے آوا   جنو سچان تہی جھپین لاوا

बिबरन भयऊ निपट नर पालू ।
दामिनि हनेउ मनहु तरु तालू ।।
برن بھیو نپٹ نر پالو   دامن ہنیو ہنو تر و تالو

یہ تینوں چوپائیاں اُس موقعہ پر لکھی گئی ہیں جبکہ راجہ دشرتھ رام چندر جی مہاراج کو راج تلک کرنے کے تمام سامان کر چکے تھے۔ اجودھیا "گہوارہ رنگ و بو" بنا ہوا تھا۔ ہر جگہ شادی اور شادمانی کی چہل پہل ہے۔

لیکن ایک رانی کیکئی ہیں کہ اس عالم مسرت میں بھی بال کھولے غمزدوں کی سی صورت بنائے تنہائی میں پڑی ہوئی ہیں۔ راجہ کو یہ اطلاع پہونچتی ہے۔ وہ بھاگا ہوا آتا ہے رانی سے وجہ افسردگی معلوم کرتا ہے۔ رانی تمام نسوانی دلربائیوں کو صرف کرتے ہوئے کہتی ہے:—

मांग मांग पे कहो पिय, कबहु देहु न लेहु
देन कहेउ बरदान दो, तेहु पावत संदेहु ॥

مانگ مانگ پے کہو پئے کبہوں دیہو نلہو　　دین کہیہو بروان تیہو پاوت ندیہو۔ وغیرہ

یعنے آپ نے مجھ سے دو قول ہارے ہیں اور ان کے مانگنے کا تقاضہ بھی کرتے رہے ہیں آج میں دیکھتی ہوں کہ آپ اپنے عہد کو کس طرح نباہتے ہیں چونکہ دو باتوں کے مانگنے کا مجھے اختیار دیا گیا ہے اس لئے میری پہلی خواہش تو یہ ہے کہ بھرت کو راج تلک ہونا چاہئے اور دوسری یہ کہ رام چندر جی کو چودہ سال کے لئے بن باس دیا جائے۔

رانی کیکئی کی اس گفتگو کا جو اثر دسرتھ پر ہوتا ہے اُسے دیکھئے:—

سن مردو بچن بھوپ ہئے شوکو　　سسی کر چھوات بکل جمی کوکو

یہ میٹھی باتیں سنکر راجہ کا دل شدت رنج سے تڑپ اُٹھا جس طرح چاند کی کرنوں کو چھوکر چکور بیتاب ہوجاتا ہے۔

—— کیکئی راجہ کی چہیتی رانی ہے اُس کو چاند پرستار راجہ کو چکور، رانی کی باتوں کو چاند کی کرنیں کہنا گوشائیں جی کا خاص انداز ہے۔

گیو سہمی نہن کچھو کہے آدا　　جنو سچان بن جھپٹو لاوا

وہ بیچارہ سہم کر رہ گیا۔ کچھ نہ کہہ سکا جس طرح باز کے جھپٹا مارنے سے لوا بدحواس ہوجاتا ہے۔

ببرن بہیو نپٹ نر پالو　　دامن ہنیو منہو ترو تالو

اور انتہا سے زیادہ افسردہ ہوا کیکئی کی گفتگو گویا ایک بجلی تھی جس نے تاڑ کے درخت کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا ہو۔

—— کلام کی برجستگی، زبان کی دلکشی کے علاوہ رانی کو بجلی اُس کی باتوں کو چاند کی کرنیں اور راجہ کو تاڑ کا درخت کہنا جس کی سربلندی ظاہر و مشہور ہے۔ وہ خصوصیات ہیں جس سے گوشائیں کی قادر الکلامی اور وسعت نظری نمایاں ہوتی ہے۔

عورت کا عورت ہونا ہی کیا کچھ کم مصیبت ہے چہ جائیکہ اُس کو بجلی کہکر تمام لوازمات دلیری بیک وقت اکٹھا

کر دئے جائیں۔ نیز کوکو، لوا، تروتالو، مادی اشیاء ہیں مادیات پر ہجوم بلا انسان کا فطری تخیل ہے پھر نزدل بلا چونکہ ہمیشہ آسمان اور فضائے لبسیط سے متعلق سمجھا گیا ہے۔ اس لئے کسی کر سچان دامنی آسمان اور فضائی چیزوں سے ہی یہاں بھی کام لیا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی بیسیوں مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ گوشائیں جی کا زیادہ کلام اسی قسم کی خوبیوں اور خوش نوائیوں سے لبریز ہے۔

گوشائیں جی کی تصنیفات کے متعلق رائے عامہ یہ ہے کہ وہ تمام تر لٹریری محاسن میں مساوی الوزن ہیں۔ اور یہ اس لئے درست بھی ہے کہ گوشائیں جی چونکہ بھگتی دور کے شاعر ہیں۔ مذہبی معتقدات، تزکیہ نفس، درستئ اخلاق بے ثباتی دنیا کے اسباق سے ایک جملہ بھی اُن کا خالی نہیں۔ اس لئے اس اعتبار سے بیشک تمام کلام ایک ہی حیثیت رکھتا ہے لیکن شاعری جس شئے کا نام ہے اُس کی رو سے صرف رامائن ہی ایک ایسی کتاب ہے جسکو گوشائیں جی کے شاعرانہ تخیل کا گل سرسبد کہا جا سکتا ہے۔ اس میں سے اجودھیا کھانڈ خاص چیز ہے اور غضب کی چیز ہے!

عبادت اور محبت بادی النظر میں دو علیحدہ علیحدہ جذبے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو عبادت تو کرتا ہے مگر بغیر محبت کے۔ آپ دیکھیں گے کہ اُس کی گفتگو اور خطابت سراپا اور حسن وکرامات ہونے کے باوجود بھی "وعظ" کی حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہی حال گوشائیں جی کا اُن کی دیگر تصنیفات میں ہے۔ دوہا دلی۔ گیتا دلی۔ بنے پترکا۔ ہنومان بہایک وغیرہ میں جو کچھ ہے وہ وہی ہے جو ایک بھگت یا (یادش بخیر) ہمارے کسی مولوی صاحب کے بیان کا اقتضا ہونا چاہیئے۔ رامائن میں عبادت کے ساتھ ساتھ وہ اظہار محبت پر بھی اُتر آئے ہیں اس عبادت اور محبت کے امتزاج نے بیان میں جو شعریت پیدا کر دی ہے وہی رامائن کی اصل و روح ہے۔ اسکے ماسوا ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رامائن میں بہت سے مقامات آگئے ہیں جہاں گوشائیں جی کو اپنی شاعرانہ نکتہ رسی کے نمایاں کرنے کا کافی موقعہ مل گیا ہے نیز رامائن کی تصنیف چونکہ گوشائیں جی کا کوئی ذاتی خیال نہیں ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ بالمیک پر تفوق حاصل کرنے کے خیال نے گوشائیں جی کو زیادہ کاوش فکر پر آمادہ کر دیا ہو۔

گوشائیں جی کی رزم نگاری — اس سے پہلے کہ گوشائیں جی کے نوادرات پیش کئے جائیں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ بھگتی دور سے قبل "ویرکوتا" (رزمیہ شاعری) کا دور گزر چکا ہے۔ گوشائیں جی جس زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں اُس میں ویرتائی کی جگہ بھگتی نے لے لی ہے۔ ویرتائی کی خوبیاں اور ندرتیں ایک ایک کر کے چن لی گئی ہیں۔ ایسی حالت میں ویرتائی پر قلم اُٹھانا جس قدر مشکل تھا ظاہر ہے لیکن دیکھئے گوشائیں جی جب رزم لکھنے پر آتے ہیں تو مبارز طلبی میں اپنے پیش رو شعراء سے کچھ آگے ہی بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سیتا جی کے سویمبر کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے راجے مہاراجے سیتا جی کو حاصل

کرنے کے زعم میں ایک وسیع میدان میں بیٹھے ہوئے ہیں ایک جانب دہنش (کمان) رکھا ہوا ہے نقیب کہتا ہے :- جو راجہ اس دہنش کو توڑ دیگا وہی سیتاجی کو پانے کا مستحق ہوگا اس گلبانگ مسرت کو سنکر خواہشمندوں کے مجمع میں ایک پراشتیاق جنبش پیدا ہوتی ہے باری باری سے ہر ایک راجہ اپنی جگہ سے اُٹھکر دہنش کے توڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر توڑنا تو کجا اُٹھا بھی نہیں سکتا اور ناکام واپس آکر ہارے ہوئے جواری کی طرح سر بگریباں اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے تاآنکہ سوائے نوعمر رامچندرجی اور لچھمن کے سب پست ہو جاتے ہیں۔ راجہ جنک (سیتاجی کا باپ) یہ حالت دیکھ کر کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے :-

अब जनि कोऊ माखै भट मानी

वीर विहीन मही मैं जानी ॥

اب جنی کوؤ ماکھے بھٹ مانی	بیر بہین مہی میں جانی

غالباً اب کوئی شخص بہادر کہلانے کا مستحق نہیں ہے میرا خیال ہے کہ زمین پر بہادر پیدا ہونا بند ہوگیا ہے۔

तजो आस निज निज घर जाहू

लिखा न विधि वैदेहि विवाहू ॥

تجو آس نج نج گھر جاؤ	لکھا نہ بدھ بے دے ہی بیاؤ

اب آپ صاحبان اپنی اپنی آرزوؤں سے ہاتھ اُٹھائیں اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھروں کا رستہ لیں۔ ہری نے شاید جانکی کا بیاہا جانا ہی مقدر میں کیا ہے۔

لچھمن جی کا دل جنک کی یہ تقریر سنکر جوش جوانمردی سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ مگر بڑے بھائی کا پاس ادب ملحوظ ہے مجبور ہیں کیا کریں۔

कहन सकत रघुबीर डर, लगे बचन जनु बान ।

नाइ राम पद कमल सीर, बोले गिरा प्रमान ॥

کہہ نہ سکت رگھبیر ڈر بگے بچن جنو بان	نائی رام پد کمل سیر بولے گرا پرمان

رگھبر کے خوف سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اور حالت یہ تھی کہ جنک کی تقریر برچھی کی طرح کلیجہ کو پاش پاش کر گئی تھی۔ تاہم باوجود اس کے نہایت صبر و ضبط کے ساتھ رام چندرجی کو مخاطب کرکے بہت ہی نرم لہجہ میں کہتے ہیں :-

जो राउर अनुशासन पाऊं ।

कंदुक इव ब्रह्मांड उठाऊं ॥

جو راؤر انشاسن پاؤں

کندک ایب برہمانڈ اٹھاؤں

اگر آپ (رامچندرجی) مجھے اجازت عطا فرما دیں تو ابھی (دہنش تو کیا چیز ہے) دنیا کو گیند کی طرح کاٹ ڈالوں یا اچھال کر پھینک دوں۔

کاچے گھٹ جم ڈاروں پھوری —————— काचे घट जिमि डारौं फोरी

سکو میرو مولک یب توری —————— सकौं मेरु मूलक इव तोरी

(دنیا کو) کچے گھڑے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ سمیر پہاڑ کو بھی مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دونگا۔

تب پرتاب مہما بھگوانا —————— तव प्रताप महिमा (عنایت) भगवाना

کا باپرو تیں ک پورانا —————— को बापुरो पिनाक पुराना ।।

بھگوان (رامچندرجی) کی اعانت شامل حال ہے تو فرسودہ دہنش کا توڑ ڈالنا کہاں کی بڑی بات ہے۔

ناتھ جان رسس اے سو ہوئے —————— नाथ जानि अस आयस देहू

کوتک کران ہو سکے سو ہو —————— कौतक करों विलोकहु सोहू

مرے مالک آپ مجھے اجازت تو عطا کریں پھر دیکھیں کر جو کہہ رہا ہوں یہی نہ کر دکھاؤں تو میرا ذمہ!

کنول مان جمی چانپ چڑھا ہوں —————— कमल नाल जिमि चाँप (کمان) चढ़ाऊँ

شت جن پرمان بے دہاؤں —————— शत योजन प्रमान लै धाऊँ

دہنش کو کنول ڈنڈی کی طرح ہاتھ پر رکھ کر چار سو کوس تک دوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔ (ایک یوجن سو کوس کا ہوتا ہے)

तोरौं छत्रक दंड जिमि, तव प्रताप बल नाथ

जौन करौं प्रभु पद शपथ पुनि न धरौं धनु हाथ

توروں چھترک جم تیو پرتاب بل ناتھ　　جو نہ کروں پربھو پرسپت پون نہ دھروں دھن ہاتھ

آپ کی دعا سے چھترک (بارش میں ایک پودا چھتری کی طرح ہوتا ہے جو نرمی اور کمزوری میں ضرب المثل ہے) کی ڈنڈی کی طرح ٹکڑے اڑا دوں گا۔ اگر ایسا نہ کروں تو قسم ہے آپ کے قدموں کی تمام عمر اپنے دہنش پر ہاتھ نہ رکھوں گا۔

لکھن سکوپ بچن جب بولے —————— लखन सकोप (غضبناک) बचन जब बोले

ڈگمگات مہی۔ درگج ڈولے —————— डगमगात महि दिग्गज डोले ।।

لچھمن جی نے جب یہ —————— غضب آلود الفاظ کہے تو زمین ہل (اُٹھی) اُٹھی۔ ہاتھیوں کے بدن جو زمین کو اٹھائے ہوئے ہیں خوف سے کانپنے لگے۔

محاکات ——— گوسائیں جی جب کسی واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شے کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ سامنے کھڑی ہوئی ہے۔

سوئمبر کے میدان میں جنک کی تقریر پر جو جوش لچھمن جی سے ظاہر ہوا اُس سے متاثر ہو کر رامچندر جی خود دھنش توڑنے کیلئے اُٹھتے ہیں، بھری ہوئی محفل میں جہاں بڑے بڑے مہا بیر راجے اپنی قوت کے مظاہرہ میں ناکام رہ چکے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ نو عمر راج کنور (رامچندر) اتنا بڑا عزم کرتے ہوئے کچھ جھجکتا کچھ اہل محفل کے تزک و احتشام سے مرعوب ہوتا لیکن بجائے اس کے

ٹھاڑ بھئے اُٹھ سہج سُبھائے ——— ठाढ़ भये उठि सहज सुभाये

ہٹین ادیا مرگ راج لجائے ——— हट वनि युवा मृगराज लजाये

بے تکلف اُٹھ کھڑے ہوئے (اور دھنش کی جانب جاتے ہوئے) اس پُر شوکت چال سے چلے جسے دیکھ کر شیر بھی شرمندہ ہو جائے جن لوگوں نے جنگل میں شیر کی آہستہ خرامی، آزادانہ لاپرواہی دیکھی ہے۔ وہی کچھ اس چوپائی کا لطف اُٹھا سکتے ہیں، سیتاجی کی تمناؤں کا چونکہ یہ آخری منظر ہے اس لئے اُن کا فوٹو بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

دیکھ دیکھ رگھبیر تن سور مناب دہر دھیر ——— देख देख रघुबीर तन, सुर मनाय धरि धीर

بھرے بلوچن پریم جل پل کاولی شریر ——— भरे विलोचन प्रेम जल पुलका बली शरीर

رگھبیر (رامچندر جی) کے چہرہ پر نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ دل ہی دل میں دیوتاؤں سے دعائیں مانگ رہی ہیں۔ جذبات محبت آنکھوں میں آنسو بن کر اُتر آئے ہیں (خوشی سے) تمام بدن کے روئیں کھڑے ہوئے ہیں۔

راجہ دشرتھ کے غور و فکر کی تصویر:۔

ماتھے ہاتھ ۔ موند دو لوچن ——— माथे हाथ मूंद दोउ लोचन ।

تن دھر سوچ ۔ لگو جن سوچن ——— तनु धरि शोच लाग जनु शोचन

پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دونوں آنکھیں بند کر کے اس طرح سوچ بچار میں پڑا ہوا ہے گویا غور و فکر کا مجسمہ رکھا ہے۔

روانی اور سادگی ——— کیکئی راجہ سے خطاب کرتی ہے:۔

بھرت را در پوت تہوے ——— भरत की राउर पूत न होहीं

انہو مول بساہی کہ موہے ——— आनेहु मोल बेसाहि कि मोहीं

کیا بھرت آپ کا بیٹا نہیں ہے کیا مجھے آپ مول خرید لائے ہیں۔

دیکھ اونر اس کہو کہ ناہین ——— देखु उन्नरि अस कहहु कि नाहीं

ست سندھو تم اگ کل ماہین ——— सत्यसिंधु तुम रघुकुल माहीं ॥

جواب دو۔ ہاں یا نہیں۔ تم سچائی کے سمندر ہو۔ تم سورج نبسی ہو؟

گوسائیں جی ایک باکمال شاعر تھے اُن کے کلام میں اُن تمام خصوصیات کا پایا جانا بھی ضروری ہے جو ایک صاحب فن کے لئے لازمی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ چند مثالیں صنائع لفظی اور بدائع معنوی کی پیش کردی جائیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

تشبیہ:۔ اُرن چرن پنکج نکھ جوتی ——— अरुन चरन पंकज नख जोती

کنول دلانی بیٹھے جنو موتی ——— कमल दलन बैठे जनु मोती ।

نرم و نازک کنول جیسی سرخ انگلیوں پر سفید ناخن ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا کنول پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے جمے ہوئے ہیں۔

منی ملیں تن سندر کیسے ——— मन मलीन तन सुन्दर कैसे

بشی رس بھرا کنک گھڑ جیسے ——— बिष रस भरो कनक घट जैसे

بدن تو خوبصورت ہے مگر پیٹ میں جھریاں پڑی ہوئی ہیں جس طرح سونے کا گھڑا زہر آب سے پُر ہو

استعارہ:۔ جمی کری نکر دل مرگ راجو ——— जिमि करि निकर दले मृगराजू

لئے لپیٹ لوا جمی باجو ——— लेइ लपेट लवा जिमि बाजू ॥

شیر (شیر دل لچھمن) ہاتھیوں کی فوج کو اس طرح روند ڈالا چاہتا ہے۔ جیسے باز لوے کو چیر کر پھینکدے۔

ایہام:۔ کرہین کوٹ نارد ہی سنائی ——— करहिं कूट नारदहिं सुनाई

نیک دین ہری سندر تائی ——— नीक दीन हरि सुन्दर ताई

نارد جی کو دیکھکر لوگ مذاق سے کہتے ہیں کہ آپ کو عجیب بھگوان جیسی شکل جمیل عطا ہوئی ہے — ہری کے معنے بندر اور بھگوان دونوں آتے ہیں۔

طباق و تقابلہ:۔

سودہا۔ سودہا کر سرسری سادہو ——— सुधा सुधाकर सुरसरि साधू

گرل۔ انل۔ کلی مل سری۔ بیادہو ——— गरल अनल कलिमल सरि व्याधू

درویش امرت۔ چاند۔ گنگا کی مانند ہے۔ اور بدطینت لوگ مثل زہر۔ آگ گندہ نالے کے ہیں۔

सचिव वैद्य गुरु तीन जो, प्रिय बोलहि भय आश
राज धर्म तनु तीन कर होय बेगही नाश ॥

سچیو۔بید۔اگرو۔تین جو پریہ بولیں بہے آش راج۔دہرم۔تن۔تین کرہوے بگہیا ناش

وزیر۔طبیب۔اُستاد۔یہ تینوں اگر خوف کی وجہ سے چاپلوسی اختیار کرلیں تو سلطنت، مذہب اور تینوں کا ناس ہوجاتا ہے۔

चंद्र चुवइ बरु अगिन कन सुधा होई बिष तूल
सपनेहुं कबहुंन करहिं कछु भरत राम प्रति कूल

مبالغہ:۔ چندر چویائی برواگن کن سودا ہوے بش تول سپنہو کبہوں نکرین کچہو بہرت رام پرتی کول

چاند سے آگ برسنے کا امکان ہے۔امرت زہر ہوسکتا ہے لیکن بہرت رام چندر جی سے خواب میں بھی مخالفت نہیں کرسکتا۔

جمع۔اجیت۔اکھنڈ۔الکھ ابناسی ——— अजित अखंड अलख अविनाशी

اتل۔امت گہٹ گہٹ کے باسی ——— अतुल अमित घट घट के वासी ॥

وہ جو قائم و دائم۔عرفانی اور غیر مرئی۔بے نظیر اور لا انتہا ہے ہر ایک دل میں موجود ہے۔

تجاہل عارف۔سیتا جی کو محو نظارہ دیکھ کر ایک سہیلی باوجود اصل کیفیت سمجھنے کے کہتی ہے:۔

بہوری گوری کر دہیان کرے ہو ——— बहुरि गौरि क ध्यान करेहू

بہوپ کشور دیکھ کن لے ہو ——— भूप किशोर देखि किन लेहू ।

گوری (دیوی) کا دہیان پھر کرلینا۔ابھی تو راج کمار ول کو دیکھ لو۔

مراعاۃ النظیر۔

تجنیس:۔مورت مدہر منوہر دیکھی ——— मूरति मधुर मनोहर देखी ।

بہیو بدیہہ۔بدیہہ بشیکہی ——— भयऊ विदेह विदेह विशेषी

(رام چندر جی کی) شکل جمیل دیکھ کر جنک (بے قابو) بے اختیار ہوگیا۔

تلمیح:۔

اگرہین انت تہوے نبہاؤ ——— उघरे अंत न होय निवाहू ।

کالی نیم جمی راون۔راہو ——— कालनेमि जिमि रावण राहू ॥

بدطینت لوگ اپنی حالت ظاہر ہوجانے پر رسوا ہوجاتے ہیں۔جس طرح کالی نیم۔راون۔راہو

عام کلام :—

राजत राज समाज में, कोशल राज किशोर।

सुन्दर श्यामल गौर तनु, विश्व बिलोचन चोर

راجت راج سماج میں کوشل راج کشور — سندر شیامل گور تن بشب (دنیا) بلوچن چور

مطلب — راج سماج میں اودھ کے شہزادے بیٹھے ہوئے ہیں جو خوبصورت سانولے گورے اور آنکھوں کو چرا لینے والے ہیں۔ چور کی خوبی آنکھ کا کاجل چرا لینا ہے۔ جو سرے سے دنیا کی آنکھوں ہی کو چرا لے۔ ایسے خوبصورت چور کی دیدہ دلیری خدا کی پناہ!

शोक विकल विवरन महि परेऊ — شوک بکل بیرن مہی پرے او

मानहु कमल मूल परि हरेऊ। — مانہو کمل مول پری ہرے او

مطلب — رنجیدہ اور افسردہ دل راجہ فرش زمین پر اس طرح پڑا ہوا ہے جیسے کسی نے کنول کے پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہو۔

हिय फाटहु फूटहु नयन, जरहु ते तनकेहि काम।

द्रवहि स्रवहि पुलकहि नहीं, तुलसी सुमिरन राम

ہیہ پھاٹہو۔ پھوٹہو نین۔ جرہو تے تن کے کام — درد ہی۔ سرو ہی۔ پلکہی نہیں تلسی سمرت رام

مطلب — وہ دل پھٹ جائے۔ وہ آنکھیں پھوٹ جائیں۔ وہ جسم جل جائے جو رام کی محبت میں نہ تڑپتا ہے نہ جاری ہوتی ہے۔ نہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

राम नाम मनि दीप धरि जीह देहरी द्वार। — رام نام منی دیپ دھر جیہہ دیہری دوار

तुलसी भीतर बाहिरो जो चाहसि उजियार — تلسی بھیتر باہر جو چاہس اوجیار

مطلب — عبادت و ریاضت ایسی ہونا چاہئے جس سے ظاہر و باطن دونوں منور ہوتے رہیں۔ جس طرح دہلیز پر رکھے ہوئے چراغ کی روشنی مکان کے اندر و باہر اُجالا رہتا ہے۔

उपल बरसि गरजत तरज, डारत कुलिश कठोर

चितो कि चातक मेघ तज, कबहुँ दूसरी ओर ॥

اپل برش گرجت ترج ڈارت کولش کٹھور — چترک چاتک میگھ تج کبہو دوسری اور

مطلب — چاہے اولے گریں۔ بادل گرجے اور بجلیاں ٹوٹیں۔ مگر پپیہا "میگھ" کی طرف ہی ٹکٹکی لگائے رہتا ہے اور کسی مصیبت سے تکلیف نہیں ہوتا۔

मुखिया मुख सो चाहिये, खान पान को एक।
पाले पोषे सकल अंग तुलसी सहित विवेक।

کھیا مکھ سو چاہئے۔ کھان پان کی ایک   پالے پوشے سکل انگ تلسی سہت ببیک

مطلب = ایثار نفسی "منہ" کی مانند ہونا چاہئے کہ خود تکلیف اٹھاتا ہے اور نفع دوسرے اعضا کو پہونچاتا ہے۔

साहब ते सेवक बड़ो, जो निज धर्म सुजान
राम बांधि उतरे उदधि लांघि गये हनुमान।

صاحب سے سیوک بڑو۔ جو نج دھرم سجان   رام باندھی اُترے اودھی۔ لانگ گیو ہنومان

مطلب۔ اعتقاد شرط ہے، گرو سے چیلہ بڑھ جاتا ہے۔ جس طرح رام چندر جی تو دریا کا پل پھاند کر اُترے اور ہنومان اُس کو پھاند کر چلے گئے۔

तुलसी पावस के समे, धरी कोकिलन मौन
अब तो दादुर बोलि हैं, हमहिं पूछि है कौन।

تلسی پاوس کے سمئے دھری کوکلن مون   اب تو داور بولی ہن ہمیں پوچھے ہی کون

مطلب۔   ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی   (غالب)

मकर उरग दादुर कमठ, ये सब को जल गेह
तुलसी केवल मीन को है सांचिलो सनेह।

مکر۔ اورگ۔ داور۔ کمٹھ ہے سب کو جل گیہہ   تلسی کیول مین کو ہے سانچلو سنیہہ

مطلب۔ مگر۔ سانپ۔ مینڈک۔ اور کچھوا سب پانی میں رہنے والی اور پانی سے محبت کرنے والی چیزیں ہیں۔ مگر مچھلی کو جو محبت ہے وہی سچی محبت ہے کہ بغیر پانی تڑپ تڑپ کر جان دیدیتی ہے۔

देखन मिस मृग विहंग तरु, फिरति बहोरि बहोरि
निरखि निरखि रघुबीर छवि, बाढ़े प्रीति न थोरि।।

دیکھن مس مرگ بہنگ ترو۔ پھرتی بہوری بہوری   نرکھ نرکھ رگھبر چھب باڑھے پریت نہ تھوری

مطلب۔ سیتا جی کی پر اشتیاق نگاہ پلٹ پلٹ کر اپنے رام پر ہی پڑتی ہے۔ گو بظاہر چرند پرند اور درختوں کے دیکھنے کا بہانہ کر رکھا ہے۔

जीवत न नाई नारि, चातक घन तज दूसरी
सोरठा   सुर सरि हू को वारि, मरत न मांगे अरध जल

جیت نہ نائی نار۔ چاتک گہن تج دوسرہی		سرسری ہوکی بار۔ مرت نہ مانگے ار دہ جل

ا۔ پیہا جس قطرہ آب کا پیاسا ہے اس کے سوا گنگا کے صاف اور پاک پانی کو بھی ہیچ سمجھتا ہے خواہ اُسکی ہی کیوں نہ آبنے۔

ढोल गँवार शूद्र पशु नारी ।।

ये सब ताड़न के अधिकारी ।।

ڈھول۔ گنوور۔ شوودر۔ پشو ناری		یہ سب تاڑن کے ادھ کاری

ب۔ غیر مہذب مخلوق کی اصلاح بغیر اس کی نگہداشت کے نہیں ہوسکتی۔ جس طرح ڈھول کہ ہمیشہ ٹھونکے پیٹے ہی بجتا ہے۔

मोरे प्रौढ़ तनय सम ग्यानी ।।

बालक सुत राम दास अमानी ।।

موری پراوڑھ تنے سم گیانی		بالک سُت سم داس امانی

ب۔ جو لوگ صاحب علم و عقل نہیں۔ اُن سے قدرت بھی بے پرواہ ہے اجاہل بچوں کے مانند ہیں۔ اسلئے فکر دامنگیر رہتی ہے۔

सब साधुन (عبادت) को एक फल, जेहिं जानें सोई जान

त्यों त्यों मन मंदिर बसहि, राम धरें धनु बान ।।

سب سادھن کو ایک پھل جیہے جانے سو جان		تیوں تیوں مندر بسیں رام دھرے دھنوبان

ب۔ تمام عبادتوں کا مقصد ایک ہی ہے جو طریقہ مرغوب ہو اختیار کر۔ رام (خدا) مندر اور مسجد کی قید سے بے نیاز وہ تو دلوں میں بسنے والا ہے۔

तुलसी श्री रघुबीर तजि, करें भरोसो और

सुख (آرام و آسائش) संपति (دولت) की का चली, नरक (دوزخ) हु नाहीं ठौर

تلسی سری رگھبیر تج کرے بھروسہ اور		سکھ سنپتا کی کا چلی۔ نرک ہو ناہیں ٹھور

ب۔ شخص اپنے مالک کو چھوڑ کر دوسرے پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ کہیں کا نہیں رہتا۔

ناطق مالوی

ہندی کا مشہور رزم گو شاعر

بھوشن

ہرچند ہندی شاعری کی ابتدا رزمیہ شاعری سے ہوئی ہے لیکن رزم گو شعرا کی تعداد بہت کم ہے زیادہ سے زیادہ تین شاعر قابل ذکر نظر آتے ہیں ایک چند بردائی دوسرا لال کوی اور تیسرا بھوشن۔ لال کا کلام ناپید ہے چند کا ذکر کسی اور جگہ ہو چکا ہے، بھوشن کا نمونۂ کلام اس جگہ پیش کیا جاتا ہے۔

بھوشن، ضلع کانپور پرگنہ گھاٹم پور کے ایک گاؤں تکوان پور میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ قوم کے برہمن تیواری تھے۔ ان کے والد کا نام رتناکر تھا۔ بیس سال کی عمر تک یہ بالکل بیکار اور جاہل تھے اور اپنے بھائی چنتامنی کے دست نگر تھے ایک دن کھانا کھانے کے وقت نمک مانگنے پر ان کی بھاوج نے کچھ سخت کلامی کی تو یہ کھانا چھوڑ کر فوراً مکان سے نکل گئے اور تحصیل علم میں مصروف ہو گئے ان کا ابتدائی زمانہ چترکوٹ کے رودر رام سولنکی کے یہاں گزرا ہے۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب کے یہاں بھی کافی عرصہ تک رہے ہیں ۱۶۶۶ء کے اخیر میں اور اپنی عمر کے ۵۴ ویں سال میں یہ شیواجی کے پاس پہونچے اور یکایک ایک مندر میں شیواجی سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے پہلے شیواجی کو پہچانا نہیں مگر ان کے کہنے پر اپنا ایک چھند ۱۸ بار پڑھکر سنایا۔ کہتے ہیں کہ اس پر اٹھارہ لاکھ روپیہ اور اٹھارہ گاؤں انعام ملے۔ اور بڑی عزت کے ساتھ درباری شاعر کر دئے گئے۔ کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر بھوشن نے اپنی بھاوج کے پاس ایک لاکھ روپیہ کا نمک روانہ کر دیا تھا۔

ان کی تصانیف کی تعداد چار ہیں ۔ ۱۔ شیوراج بھوشن۔ ۲۔ شیوا باونی۔ ۳۔ چھتر سال وسک اور اسپھٹ کاویہ ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۱۵ء میں وفات پائی۔

بھوشن کی شاعری

بھوشن ہندی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھیں ہم قومی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ ان کا قومی جذبہ اتنا شدید تھا کہ ہندی کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ بھوشن کا زمانۂ شاعری اورنگ زیب اور شیواجی کی لڑائیوں کا زمانہ تھا۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لڑائیوں

سے بحد متاثر ہوتے تھے اور ان کے دل میں قومی جذبات کی آگ بھڑک اُٹھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری میں ہر جگہ مسلمانوں اور اورنگ زیب کی توہین اور شیواجی کی تعریف نظر آتی ہے۔

شیواجی کی تعریف میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

ग्रीषम को भानु सों खुमान को प्रताप देखि

तारे सम तारे गये मूंदि तुरकन के

"گریسم کو بھان سوں کھمان کو پرتاپ دیکھ

تارے سم تارے گئے موند ترکن کے

شیواجی گویا موسم سرما کا آفتاب ہے جس کو دیکھ کر ترکوں کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

شیواجی کے قلعہ کی تعریف میں مبالغہ ملاحظہ ہو:۔

ऐसे ऊँचो दुरग महाबली को जा मैं

न खता बली सो बहस दिया बली करत है

ایسو اونچو درگ مہابلی کو جا میں

نکھتاولی سوں بحث دیا دلی کرت ہے

قلعہ اتنا اونچا ہے کہ اس کے چراغ آسمان کے تاروں سے بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شیواجی کی فوج اور اس کی نبرد آزمائی کا بیان ملاحظہ ہو:۔

चमकती चपला न फेरत फिरंगे भट

इन्द्र को न चाप रूप बैरख समाज को।

धारा धुरवान, धारा धरि के पतल मेघ

गाजिबो न बाजिबो है दुंदुभि दराज को।

भौंसला के उरन उरानी रिपुरानी कहें

देख उदौ पावस के साज को।

घन की घटा न गज घटनि सनाह साजे, भूषन भनत आयो सैन शिवराज को ॥

چمکتیں چپلا نہ پھیرت پھیرنگے بھٹ

اندر کو نہ چاپ روپ بیرکھ سماج کو

دھارادھر دان دھارا دھوری کے پٹل میگھ
گاچھو نہ باجو بے وند بھی دراج کو
بھونسلا کے اُرن ڈرانی ریورانی کہیں
پی بجو دیکھ ادو یادس کے ساج کو
گھن کی گھٹانہ گج گھنٹی سناہ ساجے
بھوشن بھنت آیو سین شیو راج کو

یہ بجلی نہیں ہے بلکہ تلواریں ہیں جو چمک رہی ہیں، یہ بادل نہیں ہے بلکہ گرد و غبار ہے، یہ گرج نہیں ہے بلکہ شیواجی کی فوج میں باجے بج رہے ہیں۔ دشمن کی عورت کہتی ہے گھر بھاگ چلو بادل آسمان پر چھا گیا ہے کہیں پانی نہ برسنے لگے۔ بھوشن کہتا ہے کہ یہ بادل نہیں ہیں بلکہ ہاتھی ہیں اور شیواجی کی فوج آگئی ہے۔ لڑائی کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو۔

भूषन यों गमसान भो भूतल घेरत लोथिन मानो मसानो।
ऊंचे सु छज्ज छटा उचटी प्रगट प्रभा प्रभात कि मानो ।।

بھوشن یوں گھمسان بھو بھوتل گھیرت لوتھن مانو مسانو
اونچے سو چھج چھٹا اچٹی پرگٹ پربھا پربھات کہ مانو

ایسی زبردست جنگ ہوئی کہ گویا لاشوں نے قبرستان کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اور بلندی پر تلواریں اس طرح چمک رہی ہیں گویا افق سے صبح طلوع کر رہی ہے۔

सब भेष ताके तहाँ सरजा शिवा के बांके,
वीर जाने हांके देत मीर जाने चलते।

سب بھیس تاکے تہاں سرجا شیوا کے بانکے
بیر جانے ہانکیں دیت میر جانے چلتے

میدان جنگ میں دونوں فریقوں کی فوج اس درجہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے اور دونوں کا لباس اس طرح ایک دوسرے سے یکسانیت رکھتا ہے کہ ان میں تمیز کرنے کی صرف یہ صورت باقی رہ گئی ہے کہ (شیواجی کے سپاہی) حملہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور دشمن بھاگتے ہوئے۔

नारा सों लरति धूरि धारा में लगति जिमि
पिय भजौ धारा पर पारा पारा वार यों लहति है ।

تاراسوں ترت دھوری دھارامیں لگت جمی

تھارا پرپارا پارا واریوں لہت ہے

زبردست دشمنوں کی فوج میں شیواجی ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے ریت کے ذروں میں کوئی ستارہ آجائے یا تھالی پر پارہ رکھدیا جائے جو ایک جگہ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔

मोटी भई चंडी बिन चोटी के चबाये सीस ,

موٹی بھئی چنڈی بن چوٹی کے چبائے سیس

بغیر چوٹی والے سروں کو چبا چبا کر تلوار موٹی پڑ گئی ہے۔

ہندی شاعری اور جذبات محبّت

ہندی کی عاشقانہ شاعری کو ہم دو قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو بھگت شعراء نے کی اور دوسری وہ جن کا تعلق تغزل سے ہے۔ بھگت شعراء سے میرا مطلب سور داس اور انھیں کی طرح اور شعرا ہیں جنھوں نے عشقیہ شاعری کو تصوف کے رنگ میں پیش کیا۔

راما نج آچاریہ کی کرشن بھگتی تحریک کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری میں اس رنگ نے رواج پایا تھا اور یہ کہنا غالبًا غلط نہ ہوگا کہ بھگت شعراء نے جیسے بلند جذبات محبت پیش کئے ہیں وہ دوسری جگہ ہم کو بہت کم نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندی بھگتوں کی عاشقانہ شاعری کا باب نہایت درخشاں باب ہے اور اگر ہم اسے نظر انداز کر دیں تو ہندی شاعری کی روح سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتے۔ لیکن جس طرح ہم ہندی شاعری سے بھگتوں کی شاعری کو الگ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہم خالص عشقیہ شاعری سے بھی ہندی کو الگ نہیں رکھ سکتے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندی میں اس رنگ کے شاعر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن کیشو داس، بہاری لال، دیو، متی رام، پدماکر، گوال، پجنبس، بھکھاری داس داس ہریشچندر، رحمن خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

یہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ عشقیہ جذبات ہندی شاعری میں کرشن پرستی کے ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ پہلے کے بھگت شعرا نے رادھا اور کرشن کے واقعات محبت کو تصوف کے رنگ میں پیش کیا۔ مگر بعد میں عشقیہ شاعری کی یہ صورت باقی نہ رہی اور زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ بھگتوں کا زمانہ بھی ختم ہوگیا، اور صوفیانہ شاعری کی جگہ خالص عشقیہ شاعری نے لے لی۔ اور شعراء نے انسانی جذبات کا اظہار اپنا مقصد بنا لیا۔ ہر چند بعد میں پھر ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس رنگ کو اختیار کیا جن میں دیو اور بہاری بہت مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا صحیح رنگ یہ نہ تھا۔

خالص عشقیہ شاعری کا زمانہ جسے ہم بالفاظ دیگر دنیوی محبت اور عیش و عشرت کا بھی کہہ سکتے ہیں، بھگت شعراء کے زوال کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اس قسم کی شاعری کا پہلا شاعر کیشو داس ہوا ہے۔ انھوں نے معاملات محبت کے بیان کرنے میں کافی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور عشق مجازی کی تمام وہ کیفیات جو محبت کرنے والوں میں پائی جا سکتی ہیں، ان کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں کیشو داس کے علاوہ دیو، بہاری، متی رام، پدماکر وغیرہ بھی اسی رنگ کے شاعر ہوئے ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ بیان ہجر و وصال اور تشبیہات و استعارات وغیرہ میں بڑی ندرت سے کام لیا ہے۔

صوفیانہ رنگ کی عشقیہ شاعری میں بدیاپتی، سورداس، تلسی داس، رنتداس خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور خالص تنزل کیشوداس، بہاری، دیو، متی رام، بھکاری داس، پدماکر اور ہرشچندر کے یہاں پایا جاتا ہے۔

اب ہم ان میں سے بعض کا کلام نمونتاً پیش کرتے ہیں جس سے ان کے رنگ سخن کا حال معلوم ہوگا:۔

میتھل کوکل ودیاپتی ان کا کلام زیادہ تر پد پر مشتمل ہے، یعنی یہ اپنے جذبات مسلسل کئی کئی شعروں میں بیان کرتے ہیں ان کا انداز بیان بہت سادہ و موثر ہے، یہ زیادہ تر مقامی رنگ موسمی کیفیات اور ماحول کے حالات کو پیش کرکے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، مثلاً:۔

आवत ही सखि समय बसंत ।। फुल्ल कुसुम सकल बन अंत
पिय परदेश हम सहत न पार ।। कोकिल कुल कलरवहिं विथार
आउव पिये हमार मन मान ।। अब यदि जाइ संवादहु कान
का संग बिलसब को कब ताह ।। यह सुख समय सोह मम नाह
विद्यापति कह पूरब काम ।। तोहू यदि रह सुख कह लघुठाम

آوت ہی سکھی سمے بسنت — پھوٹل کسم سکل بن انت
پی پردیس ہم سہت نہ پار — کوکل کل کلرونہہ بتھار
آؤ پیئے ہمر من مان — اب یدی جائے سنوادہو کان
کا سنگ بلست کو سب تاہ — یہ سکھ سمے سوہ مم ناہ
بدیاپتی کہہ پورب کام — توہو یدی اہ سکھ کہہ لگھوٹھام

بسنت کے آتے ہی کسم کے پھول کھل گئے ہیں، کوئلیں ادھر سے اُدھر کوک سنا رہی ہیں۔ مگر پریتم ہنوز پردیس ہی میں ہیں کیا کہوں یہ سماں دیکھکر دل کتنا بیقرار ہے، اگر کسی طرح سے اس موسم اور میری بیقراری کا حال ان تک پہونچ جاتا تو وہ ضرور چلے آتے۔ یہ عیش کا زمانہ بغیر ان کے مجھے ذرا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا، کون ہے جس کے ساتھ محبت کی باتیں کروں اور جسے اپنے ہردے کا ہار بناؤں۔

ایک اور پد ملاحظہ ہو:۔

پران پیا سکھی ہور پیا ــــ ابہوں نہ میلل کولس ہیا ــــ نکھ او کھل ہم دن لیکھی لیکھی ــــ
نین اندھایل پی پتھ دیکھے ــــ جب ہم بالا پر ہرگیلا ــــ کیہ دوکھ کیہ گن بوجھی نہ بھیلا ــــ
اس کو ونا ہیں گہے پیا پاس ــــ رادھا پتی کہہ کیس پریت ــــ رادھا پتی کرائیں ریت ــــ

نائکا اپنی سکھی سے محبوب کی بیوفائی کا ذکر کرتی ہوئی کہہ رہی ہے کہ سنگدل پریتم اب تک نہیں آئے، میرے ناخنو

دن گنتے گنتے گھس گئے، ان کا راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں دھندلی ہوگئیں۔ جب میں لڑکی تھی جبھی وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کچھ پتہ نہیں کہ کس گناہ کی سزا میں چھوڑ گئے تھے، ہائے کوئی ایسا نہیں جو پیا کی خبر لائے۔

بدیاپتی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے محبت میں یہی ہوتا ہے اور رادھا یعنی کرشن کی یہی عادت ہے

तहां पुनि मोती हार टूट फेकल कहत हार टूट गैल।
सब जन एक एक चुनि शनिचरो श्याम दरस धनि केलि
नेह चकोर का नेह कह शशिवर केलि अमी रस पान।
विधो विधो दश क्यारेल विद्यापति गोमी भान ॥

تہاں پن موتی ہار ٹوٹ پھیکل کہت ہار ٹوٹ گیل
سب جن ایک ایک چن سنچر و شیام درس دھن کیل
نین چکور کا نہہ کہ سسیور کیل امی رس پان
دو ہو دو ہو درشں کیارل بدیاپت گوی بھان

ناگہ جمنا سے نہاکر کنارے آئی تو دیکھا کہ سامنے محبوب بھی موجود ہے لیکن وہ آزادی سے دیکھ نہ سکتی تھی کیونکہ اور لوگ بھی موجود تھے۔ اس لئے اس نے یہ ترکیب سوچی کہ اپنا موتیوں کا ہار توڑ کر موتی بکھرا دئے جسے لوگ چننے لگے اور وہ اپنے محبوب کا دیدار کرنے لگی۔

سورداس سورداس کا مرتبہ ہندی شاعری میں وہی ہے جو آفتاب کا نظام شمسی میں۔ یہ ۱۴۸۳ء میں دہلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور سن شعور تک پہونچتے پہونچتے نابینا ہوگئے، یہ بلبھ آچاریہ مذہب کے پیرو تھے اور سری کرشن جی کی پرستش ان کی زندگی کا تنہا مقصود تھا، انھوں نے اپنی ساری عمر اپنے محبوب دیوتا کی بھگتی میں بسر کردی اور جو کچھ زبان سے نکلا اسی کی یاد میں نکلا۔ ۱۵۶۳ء میں ان کا انتقال ہوا اور سورساگر اپنی بہترین یادگار چھوڑ گئے۔ انھوں نے بھی زیادہ تر پدے کہے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

सखि री चातक मोहि जियावत। जैसेहिं रैन रटत हैं पीपी जैसेहि पुनिपुनि गावत। अतिहि सुकंठ दाहु प्रियतम को तार जेहि मन लावत। आप न पियत सुधारस सजनी विरहिन वोलि पियावत। जो यह पंछी सहाय न होतो प्रान वहुत दुख पावत ॥ जीवन सफल सूर ताही को काज पराये आवत ॥

سکھی ری چاتک موہے جیاوت ۔ جیسے ہی رین رٹت ہوں پی پی تیسے ہی وہ پن پن گاوت ۔

معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پانی سے مچھلی کو نکال کر باہر چھوڑ دیا ہو۔

कहां लौं कहिये ब्रज की बात। सुनहु स्याम बिन उन लोगन जैसे दिवस बिहात ॥ गोपी ग्वाल गाय गो सुत वै मलिन बदन कृस गात। परम दीन ज्यों शिशिर हिमी हत अम्बुज गन बिन पात ॥ जो कहि आवत देखि दूरि ते सब पूछत कुसलात ॥ चलन न देत प्रेम आतुर उर कर चरनन लपटात ॥ पिक चातक बन बसन न पावहिं वायस बलिहिं न खात। सूरश्याम सन्देशन के डर पथिक न कोऊ जात ॥

کہاں لوں کہیئے برج کی بات۔ سنہو سشیام بن ان لوگن جیسے دوس بہات۔ گوپی گوال گائے گوست وے ملن بدن کرش گات۔ پرم دین جیوں سسر ہمی ہت امبج گن بن پات۔ جو کہیں آوت دیکھی دور تے سب پوچھت کسلات۔ چلن نہ دیت پریم آتر ار کر چرنن لپٹات۔ پک چاتک بن بسن نہ پاویں بایس بلہیں نکھات سورشیام سندیشن کے ڈر پتھک نہ اودہی گگ جات۔

اودھو جی برج سے لوٹ کر کرشن جی کے سامنے گوپیوں کی حالت کا بیان کرتے ہیں کہ:۔ برج کی باتیں کہاں تک بیان کروں کچھ کہا نہیں جاتا۔ اے شیام سنو تمھارے بغیر گوپیاں بہت دبلی ہو گئی ہیں۔ کنول کی حالت یہ ہے کہ اُس کے سینے سوکھ گئے ہیں۔ پپیہا اور چکور نے وہاں جانا اور چُگنا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ گوپیاں اُن سے پیام کہتے کہتے پریشان کر دیتی ہیں۔ سورداس کہتے ہیں کہ اس خوف سے کوئی ادھر سے گزرتا نہیں کیونکہ وہاں ایسے ایسے پیام کہے جاتے ہیں کہ سننے والا بے چین ہو جاتا ہے۔

ऊधौ हम आज भई बड़भागी। जिन अंखियन तुम स्याम बिलोके ते अंखियां हम लागीं ॥ जैसे सुमन बास लै आवत पौन मधुप अनुरागी ॥ अति आनन्द होत है तैसे अंग अंग सुखरागी ॥ ज्यों दर्पन में दर्शन देखत दृष्टि परम रुचि लागी ॥ तैसे सूर मिले हरि हमको बिरह ब्यथा तन त्यागी।

اودھو ہم آج بھئیں بڑ بھاگی۔ جن آنکھن تم سشیام بلوکے تے انکھیاں ہم لاگی۔ جیسے سومن باس لے آوت پون مدھپ انوراگی۔ اتی انند ہوت ہے تیسے [illegible] درشن دیکھت درشٹ پرم رچی لاگی۔ تیسے سور ملے ہری ہم کو برہ بتھا تن تیاگی۔

اودھو جی کرشن کے پیام بر بن کر گوپیوں کو سمجھانے اور کرشن کا پیام سنانے آئے ہیں۔ گوپیاں اودھو کو

دیکھ کر کہتی ہیں کہ اسے اودھو آج ہم بہت خوش قسمت ہیں کیونکہ جن آنکھوں سے تم نے کرشن جی کو دیکھا ہے وہی آنکھیں آج ہماری آنکھوں سے مل رہی ہیں۔

پیا بن ناگن کاری رات
کبھوں جامنی ہوت جونھیا۔ ڈس الٹی ہو جات
جنتر پھیرت منتر نہیں لاگت۔ گات سکھا نو جات
سورداس برہن آس بیاکل۔ مری مری لہریں کھات

محبوب کی جدائی میں رات یوں بھی کالی ناگن سے کم نہیں لیکن جب چاندنی ہوتی ہے تو پھر وہ اس ناگن کی طرح ہو جاتی ہے جو ڈس کر الٹ جائے۔ سچ ہے محبت کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں اور انسان لہریں لیتے لیتے مر جاتا ہے۔

بہاری لال

بہاری لال ماتھر برہمن تھے اور سمبت ۱۶۶۰ میں گوالیار کے نزدیک بسود اگوبند پور میں پیدا ہوئے تھے۔ سمبت ۱۷۲۰ میں ان کی وفات بتلائی جاتی ہے۔ تلسی اور سور کو چھوڑ کر سب سے بڑا شاعر انھیں کو مانا جاتا ہے۔

بہاری لال کی صرف ایک کتاب ابھی تک مل سکی ہے جس کو بہاری ستسئی کہتے ہیں۔ اس میں ۷۱۹ دوہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کتاب کے ایک ایک دوہے پر بہاری لال کو ایک ایک اشرفی ملی تھی۔ یہ مہاراج جے پور کے درباری شاعر تھے اور ہر وقت دربار میں موجود رہتے تھے۔

ہندی ادب میں ان کی اس کتاب کا کتنا مرتبہ ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابھی تک ہندی، اردو، سنسکرت اور انگریزی میں تقریباً سیکڑوں شرحیں اس کی ہو چکی ہیں۔ چند دوہے بطور نمونہ یہاں پیش کئے جاتے ہیں:۔

खतर भौंह रूखे बचन करन कठिन मन नीठ
कहा करो है जात हरी हेरि हंसो कहीं दीठि
کھتر بھونہہ روکھے بچن کرن کٹھن من نیٹھ
کہا کروں ہوے جات ہری ہے ری ہنسوہی دیٹھ

سکھی نائکہ سے کہتی ہے کہ اپنا جذبۂ خودداری کبھی ہاتھ سے نہ دیا کرو۔ مگر نائکہ سکھی کو جواب دیتی ہے کہ کیا کروں، میں تو اُن کے آنے پر بھویں بھی ٹیڑھی رکھتی ہوں اور بات چیت بھی روکھی ہو کر کرتی ہوں مگر کیا کروں نگاہیں نہیں تھمتیں اور سارا بنا بنایا کام لمحہ بھر میں بگڑ جاتا ہے۔

सबही तन रामु हात कन. चलत सबन दे पीठि
वाही तन ठहरात यह किबलनुमा लौं दीठि ॥

سب ہی تن سموہات چھن چلت سین وسے پیٹھ
واہی تن ٹھہرات یہ کبل نالوں دیٹھ

یوں تو یہ آنکھیں سبھی کو دیکھتی ہیں لیکن جب محبوب سامنے ہوتا ہے تو پھر قبلہ نما کی طرح اُن کا رُخ اُدھر سے ہٹتا ہی نہیں

कहा भयो जो बीछुरे तो मन मो मन साथ
उड़ी जाइ कितहू गुडी तऊ उड़ा यक हाथ।

کہا بھیو جو بچھرے تو من مومن ساتھ
اڑی جائے کتہوں گڈی تو اُڑایک ہاتھ

کیا ہوا جو تم مجھ سے دور ہو تمہارا دل تو میرے دل کے ساتھ ہے۔ پتنگ کتنی ہی دور اُڑ جائے مگر وہ ہے اُڑانے والے ہی کے ہاتھ میں۔

लोने मुख दीठि न लगै यौं कहि दीनो ईठि
दूनी होय लागन लगी दीख दिठौना दीठि

لونے مکھ دیٹھ نہ لگے یہ کہہ دینو ایٹھ
دونی ہوئے لاگن لگی دئے ڈٹھونا دیٹھ

اس خیال سے کہ نظر نہ لگے اس کے چہرہ پر سیاہ تل کا نشان بنا دیا گیا لیکن نتیجہ بالکل اُلٹا نکلا کیونکہ اس سے اس کا حسن اور دوبالا ہوگیا، اور ایک عالم کی نگاہیں اس طرف اُٹھنے لگیں۔

धुरवा नोहिं न, लखि उठे धुवां धरन चहु कोर
जारत आवत जगत को पावस प्रथम पयोद

دھروا موہیں نہ لکھ اُٹھے دھواں دھرن چہوں کود
جارت آوت جگت کو پاوس پرتھم پیود

برسات کا زمانہ ہے اور آسمان میں ادھر اُدھر بادل اُڑ رہے ہیں لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ وہی بادل جو لوگوں کا دل ٹھنڈا کرتے ہیں، ایک فراق زدہ دل میں اور آگ لگا جاتے ہیں۔

जो वाके तनकी दशा, देखो चाहत आप।।
तो बल नीक बिलोकिये चली उचक चुप चाप

جو واکے تن کی دسا دیکھو چاہت آپ تو بلونیک بلوکیے چلی اچک چپ چاپ

یعنی اگر تمھیں اس کی بیقراری ہجر کا حال معلوم کرنا ہے تو چھپ چھپ کر دیکھو ورنہ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ تم موجود ہو تو اس کا رنگ کچھ اور ہو جائے گا اور اصل کیفیت کا پتہ نہ چل سکے گا۔

अंग अंग प्रति बिम्ब परि दरपन से सब गात
दुहरे तिहरे चौहरे भूषण जाने जात ॥

اس کا جسم بالکل آئینہ کی طرح شفاف ہے اس لئے جب زیور کا عکس اس پر پڑتا ہے تو وہ دوہرے تہرے نظر آتے ہیں۔

मानहु बिधि तन अच्छ छवि स्वच्छ राखिबे काज
दृग पग पोंछन को किये भूषन पायंदाज ॥

مانو ودھی تن اچھ چھب سوچھ راکھبے کاج
درگ پگ پونچھن کو کئے بھوشن پا...

اس کے جسم پر زیور نہیں ہیں بلکہ یہ پائنداز ہیں تاکہ پہلے نگاہیں ان پر صاف ہو جائیں اور اس کے بعد اس کے حسن و جمال تک پہونچیں۔

भई जुतन छवि बसन मिलि बरन सकै सुन बैन
अंग रूप आंगी दुरी आंगी अंग दुरै न

لباس کا حسن اس کے جسم سے ملکر بالکل غائب ہو گیا ہے۔ کپڑا جو چھپانے کے لئے استعمال ہوتا ہے، وہاں خود کپڑا اس کے رنگ جسم میں چھپ کر رہ گیا۔

متی رام

متی رام تکم پور ضلع کانپور کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام رتناکر تھا اور قوم کے برہمن تھے۔ یہ چار بھائی تھے۔ بھوشن، چنتامنی، نیلا کنٹھ اور متی رام یہ چاروں بھائی شاعر تھے۔ بھوشن مشہور رزم گو شاعر تھے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندی کے رزم گو شعرا میں ان کا ایک خاص درجہ ہے۔

متی رام کا نام عاشقانہ شاعری میں دیو اور بہاری کے بعد لیا جاتا ہے گو بعض کا خیال ہے کہ وہ دیو سے بہتر کہنے والے تھے۔ متی رام نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے آٹھ کا علم حاصل ہے۔ ان کے نام پھول منجری، رس راج، چھند سار پنگل، للت للام، متی رام ستسئی، ساہتیہ سار، لچھن سنگار، النکار پنچاشکا، ان کی کتابوں میں رس راج بہت مشہور ہے اور اس میں انھوں نے نائکہ بھید کا بیان کیا ہے۔

پھول منجری میں کے تمام دوہوں میں پھولوں کا بیان ہے۔ کہتے ہیں کہ کتاب جہانگیر کے حکم سے لکھی گئی تھی چھند سار پنگل فتح شاہ بندیلا کے لئے لکھا گیا اور للت للام مہاراج بھاؤ سنگھ مہاراج بوندی کے لئے متی رام ستسئی راجہ بھوگ راج کی فرمایش

پر لکھی گئی۔ یہ ۱۶۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۹۴ء میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

मलिन करी छवि जोन्ह की तन छवि सौं बलि जाउं।
क्यों जैहो पिय पै सखी लखि जैहै सब गाउं॥

ملن کری چھب جونھ کی　　تن چھب سوں بل جاؤں
کیوں جیہوں پی پے سکھی　　لکھ جیہیں سب گاؤں

محبوبہ اپنے عاشق سے ملنے کے لئے سب سے چھپ کر جا رہی ہے۔ سکھی اسکو دیکھ کر کہتی ہے کہ تمہارے حسن سے تو چاند کی چاندنی بھی ماند پڑ گئی ہے میں تم پر قربان جاؤں، یہ تو بتاؤ کہ اب چھپنے کی صورت کیا باقی رہی ہے۔

पानिय में घर मीन को कहत सकल संसार
दृग मीनन को देखियत पानिप पारा वार॥ ॥

پانیہ میں گھر مینن کو　　کہت سکل سنسار
درگ مینن کو دیکھیت　　پانپ پارا وار

محبوبہ کو روتے ہوئے دیکھ کر سکھی کہتی ہے کہ تمام دنیا تو یہ جانتی ہے کہ پانی سے ہی مچھلی کی زندگی ہے مگر کسقدر عجیب بات ہے کہ تمہاری آنکھیں پانی ہی کو اپنے سے دور کر رہی ہیں۔

बंदन तिलक लिलार में एसी सरव छवि होति।
रूप भवन में जग मगौ मानो दीप की ज्योति

بندن تلک للار میں　　ایسی کھ چھب ہوت
روپ بھون میں جگمگے　　منو دیپ کی جیوت

نائکہ کی پیشانی پر چندن کی بندی ایسی معلوم ہوتی ہے گویا محراب حسن میں چراغ کا اجالا ہو رہا ہے۔

मन ते नैननि को चली नैननि ते मन काज॥
द्वै दीपक की छाँहलौं बीच बिलानी लाज॥

من تے نینن کو چلی　　نینن سے من کاج
دو دیپک کی چھانہ لوں　　بیچ بلانی لاج

محبوبہ کی حالت حجاب سے ایسی ہو رہی ہے کہ شرم و حیا کبھی آنکھوں میں آ جاتی ہے اور کبھی دل میں رہ جاتی ہے گویا وہ دو چراغوں کے درمیان کا سایہ ہے جو کبھی نمایاں ہو جاتا ہے اور کبھی ہلکا۔

लाज छुरी गेह्यो छुत्यो सब सों छुत्यौ सनेह।
सखी कहियो व निठुर से रही छुटि वे देह।

لاج چھٹی گیہو چھٹیو   سب سوں چھٹیو سنیہ
سکھی کہیو وانٹھورت   رہی حھوٹ وے دیہہ

نائکہ سکھی سے نائک کے پاس پیام ہجر پہونچاتے ہوئے کہتی ہے کہ ان سے کہہ دینا حیا و شرم چھوٹ گئی گھر چھوٹ گیا، دنیا کا رشتۂ محبت ٹوٹ گیا۔ اب صرف جسم چھوڑنا باقی رہگیا ہے۔ سواب وہ بھی ہوا جاتا ہے، گھبرائیں نہیں۔

निठुर बटोही बाट में. ऊखन लेत उखारि।
अरे गरीब गंवार तू काहे करत उजारि ॥

نٹھر بٹوہی باٹ میں   اوکھن لیت اُکھار
ارے گریب گنوار تے   کاہے کرت اُجار

ایکھ کے درختوں کو دیکھ دیکھ کر نائکہ زمانۂ مفارقت گزار رہی تھی۔ کیونکہ نائک نے آنے کے متعلق ایکھ کے ہری رہنے رکھا تھا۔ اس لئے جب تک ایکھ سوکھتی نہیں ہے اُسوقت تک نائکہ کو بھی بہت امیدیں ہیں۔ مگر گنوار مسافر کو کیا خبر کہ ایکھ میں کس کی موت اور زندگی کا راز پنہاں ہے۔ وہ ایکھ اُکھاڑ لیتا ہے۔ بیچاری نائکہ مسافر کی یہ حرکت دیکھ کر تڑپ اُٹھتی اور ایکھ کے اُجڑنے کے ساتھ ہی اس کے دل کی دنیا بھی اُجڑ جاتی ہے۔

अचल भये हैं गात परस न जान्यो जात, कहे न सुनत बात जात बात ना कही।
सूंघे न सुबास न सुमन की समुझि परे। टकटकी बड़े बड़े दृगन में उलही ॥
कवि मतिराम तोहि नेक परवाह नहीं, ऐसी भांति भये तेरे नेह सौं नहीं ॥
ए रे चितचोर। चलि चाहि चन्द्र मुखि तोहि, चित्रही में चाहि चाहि चित्रही भै है रही ॥

اچل بھئے ہیں گات پرس نہ جانیو جات   کہی نہ سنت بات جات بات ناکہی
سونگھے نہ سو باس نہ سومن کی سمجھ پرے   ٹکٹکی بڑے بڑے دورگن میں اُلہی
کوی متی رام توہے نیک پرواہ نہیں   ایسی بھانت بھئی تیرے نیہہ سوں نہی
اے رے اچت چور چلی چاہی چندر مکھ توہی   چترہی میں چاہ چاہ چترہی میں ہوئے رہی

نائک کے پاس جاکر سکھی نائکہ کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ بالکل پتھر کی مورتی کی طرح ساکت ہوگئی ہے کچھ سنتی ہے نہ کہتی ہے، اُس کی بڑی بڑی آنکھیں ٹکٹکی لگائے ہوئے ہیں لیکن تم اتنے بے رحم ہو کہ اس کی اس حالت کی بھی پرواہ نہیں ہے۔ اسے دل کے لینے والے چل کر دیکھ تو سہی کہ وہ تیری تصویر سے محبت کرتے کرتے خود بھی تصویر ہوگئی ہے

करघर काधे कंत के चलें लटपटी चाल ।। ।।
थकित करति पथिकनिसब न थकित पंथ में बाल

کر دھر کاندھے کنت کے چلیں لٹپٹی چال
تھکت کرت پتھکن بسن تھکت پنتھ میں بال

اپنے عاشق کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نائکہ کہیں جارہی ہے۔ راستے میں راہگیروں کی محویت کا عجیب عالم ہے یعنی جب وہ تھک کر کسی جگہ کھڑی ہوجاتی ہے تو وہ بھی تھک کر ایک جگہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔

دیودت دیو ۱۶۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور قوم کے برہمن تھے۔ علاوہ بہترین شاعر ہونے کے یہ موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے چنانچہ ان کی ایک تصنیف "راگ رتناکر" بہت مشہور کتاب ہے۔ سراپا لکھنا ان کا خاص موضوع تھا۔ عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے صوفیانہ جذبات کی بھی شاعری کی ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار دیو نے اورنگ زیب کے بڑے لڑکے اعظم شاہ کو اپنی تصنیف بھاؤ بلاس سنائی تھی اور اس نے بہت پسند کی تھی، اعظم شاہ بھوانی دت، کشل سنگھ اور اکبر علی خاں وغیرہ ان کی امداد کرتے رہتے تھے۔ ان کا زمانۂ وفات ۱۷۴۵ء ہے۔

دیو اپنے زمانہ کا بہت بڑا شاعر تھا اور اپنے خیال کے اظہار پر اس کو بڑی قدرت حاصل تھی، اور تشبیہات و استعارات بھی بہت سلیقہ سے استعمال کرتا تھا۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

फटिक- सिलान सों सुधारयो सुधा मन्दिर ,
उदधि- दधि को सो अधिकाई उमगी अमंद ।।
बाहेर ते भीतर लौं भीति न दिखैये " देव "
दूध कैसो फेन फैलो आगन फरस बन्द
तारा सी तरुनि तामें ठाढ़ी झिलि मिलि होत ।।
मोतिन की जोति मिली मल्लिका को मकरंद ,
आरसी से अम्बर में आभा- सी उज्यारी लगै ,
प्यारी राधिका को प्रति बिम्ब सो लागत चंद ।।

پھٹک سلان سوں سدھاریو سدھا مندر ادھ ددھ کو سوں ادھکائی اُمگے اَمند
باہر تے بھیتر لوں بھیت نہ دکھئے دیو دودھ کیسو پھینو پھیلو آنگن پھرس بند

تاراسی ترن تا میں ٹھاڑھی جھل مل ہوت   موتن کی جوت ملی ملکا کو مکرند
آرسی سے امبر میں آبھا سی اجیاری لگے   پیاری رادھکا کو پرت بمب سوں لگت چند

سنگ مرمر کے بنے ہوئے چبوترے پر سکھیاں اور ان کے بیچ میں رادھکا جی کھڑی ہیں۔ ادھر زمین میں تو یہ نظارہ ہے ادھر آسمان پر تاروں کے بیچ میں چاند جگمگا رہا ہے۔

आज गई हुती कुंजन लो बरसैं उत बूंद घने घन घोरत।
'देव' कहे हरि भीजति देखि अचानक आय गये चित चोरत।
पोटि भट नट ओट कुटी के लपेटि करी सों कटी पट छोरत।
चौगुनो रंग चढ्यो चित मैं चुनरी के चुचात लला के निचोरत।

آج گئی ہوتی کنجن لوں   برسیں اُت بوند گھنے گھن گھورت
دیو کہیں ہر بھیجت دیکھ   اچانک آئے گئے چت چورت
پوٹ بھٹ نٹ اوٹ کٹی کے   لپیٹ کٹی سوں کٹی پٹ چھورت
چوگنو رنگ چڑھیو چت میں   چنری کے چچات للا کے نچورت

نائکا کو کنج میں پانی سے بھیگتے ہوئے دیکھ کر نائک بچانے آتا ہے۔ نائکا کی پانی سے بھیگی ہوئی چونری کو جب نائک خشک کرنے کے لئے نچوڑتا ہے تو حالت یہ ہوتی ہے کہ جتنا رنگ چونری کا نچوڑنے سے کم ہوتا جاتا ہے اتنا ہی نائکا کے چہرہ کا رنگ شوخ ہوتا جاتا ہے۔

स्याम स्वरूप घटा ज्यों अभूषन नील परा तन राधे के भूलै।
राधे के अंग के रंग रंग्यो पट बीजुरी ज्यों घन सो तन भूमै॥
हैं प्रति मूरति दोउ दुहू की किधो प्रति बिम्ब वही घट दू मैं
एक हिं देह दु देव दुदेह रे देह दुधा एक देव दुहू मैं

شیام سروپ گھٹا جیوں انوپم نیل پٹا تن رادھے کے جھومے
رادھے کے انگ کے رنگ رنگیو پٹ بجری جیوں گھن سو تن جھومے
ہیں پرت مورت دوؤ دہو کی بدھو پرتبمب وہی گھٹ دومے
ایکہیں دیہہ دو دیو دو دیہہ لے دیہہ دو دھا اک دیو دو ہومے

شیام کی صورت سانولے رنگ کی گھٹا ہے اور رادھکا جی اس گھٹا میں بجلی کی طرح چمک رہی ہیں۔ یعنی روح دونوں ایک ہیں لیکن کیفیتیں مختلف ہیں۔

بھکاری داس، داس | ان کا نمونۂ کلام،

आनन है अरबिंद न फूले अलीगन भूले कहां मंडरात हौ ॥
और कहां तुम्हें बाई लगी भ्रम बिम्ब के ओठन को ललचात हौ।
दास जू ब्यालो न बेनी बनाव है पापी कलापी कहा इतरात हौ।
बोलती बाल न बाजत बीन कहा सिगरे मिल घेरत जात हौ।

آنن ہے اربند نہ پھولے — الی گن بھولے کہا منڈرات ہو
کیر کہا تمھیں بائی لگی — بھرم بمب کے اوٹھن کو للچات ہو
داس جو بیالو نہ بینی بناؤ ہے — پاپی کلاپی کہا اترات ہو
بولتی بال نہ باجت بین — کہا سگرے مل گھیرت جات ہو

سکھی، نائکہ کی خوبصورتی اور اس کے متعلق بھونرے، توتے اور ہرن کی غلط فہمی کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ اے بھونرو، یہ نائکہ کا منہ ہے کنول کا پھول نہیں، اے توتو یہ اس کے ہونٹ ہیں آم کی پھانکیں نہیں اور اے ہرن تم کیوں پاگل ہوئے ہو یہاں بین نہیں بج رہی بلکہ نائکہ بول رہی ہے، تم سب کیوں گھیرے ہوئے چلے آ رہے ہو۔

प्रेम तिहारे में प्रानपियारी सब चेत की बात अचेत है भेटति।
पाती तिहारो लिख्यो कछु सो छिन ही छिन बांचत खोल पलेटति
छैल जू सैल तिहारी सुने तिहि गैल की धूरनि नैन धुरेटति ॥
रावरे अंग को रंग बिचारि तमाल की डार भुजा भरि भेटति ॥

پریم تہارے میں پران پیا سب چیت کی بات اچیت ہو بھیٹت
پاتی تہارو لکھیو کچھو سو، چھن ہی چھن باچت کھول لپیٹت
چھیل جو سیل تہاری سنے، تہیں گیل کی دھورن نین دھوریٹت
راورے انگ کے رنگ بچار، تمال کی ڈار بھجا بھری بھیٹت

سکھی نائک سے نائکہ کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تمہاری محبت میں اس کا عجیب حال ہے۔ اگر کبھی تمہارے ہاتھوں کا لکھا ہوا کاغذ پا جاتی ہے تو گھڑی گھڑی اسے کھول کر پڑھتی ہے اور پھر رکھ لیتی ہے اور تمہارے آنے کا ذکر ہوتا ہے تو تمہارے راستہ کی خاک آنکھوں میں لگاتی ہے۔

देखि री देखि आली संग जाइ धौं कौन है का घर में ठहराति है
आनन मोरि कै नैनन जोरि अबै भई औचक ले मुसकाति है।

दास जू जा मुख जोति लखै तें सुधाधर जोत खरी सकुचात है
आग लिये चली जात सो मेरे हिये बिच आगि दिये चली जात है।

دیکھری دیکھ الی سنگ جا نادھوں کون ہے کا گھر میں ٹھرات سے ہے
آنگن مورے کے نین جور اسے بھٹی او جھل کے مسکات سے ہے
داس جو جا مکھ جوت لکھے تیں سدھا دھر جوت کھری سکوچات سے ہے
آگ لئے چلی جات سو میرے ہیئے بیچ آگ دئے چلی جات سے ہے

اے سکھی ساتھ جا کر ذرا دیکھ تو سہی یہ کون ہے، یہ آنکھیں ملا کر شہ موڑ کر جانے والی کہاں رہتی ہے یہ جو آگ لینے آئی تھی اور میرے دل میں آگ لگائے جاتی ہے، کس کی لڑکی ہے۔

پدماکر ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:-

सेज परी री सो पलो टाते चौं ज्यों घटा घन की गरजे री।
त्यों पदमाकर लाजनि ते न कहे दुलही हिय की हरजे री।
आली कछू की कछू उपचार करे पै नहिं पाय सके मरजे री।
जाहि न ऐसे समय मथुरै यह कोऊ न कान्हर को बरजे री।

سیج پری پھری سی پلوٹت، جیوں جیوں گھٹا گھن کی گرجے ری
تیوں پدماکر لاجن تے نہ کہے، دلہی ہی کی ہرجے ری
الی کچھو کو کچھو اپچار کرے، اپے نہیں پائے سکے مرجے ری
جاہیں نہ ایسے سمے متھرے یہ کوؤ نہ کانھر کو برجے ری

نائکہ کو چھوڑ کر نائک (کرشن جی) متھرا جا رہے ہیں۔ نائکہ بہت پریشان ہے، اور مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے اسکی یہ حالت دیکھ کر لوگ علاج معالجے میں لگے ہوئے ہیں، مگر جوں جوں بادل زیادہ گرجتے ہیں، نائکہ کی حالت اور زیادہ خراب ہوتی جاتی ہے۔ مگر وہ غریب کیا کرے کچھ کہتے نہیں بنتا اپنے دل کی حالت نائک سے ظاہر نہیں کر پاتی۔ آخر کار وہ پریشان ہو کر کہتی ہے کہ لوگ میرے علاج میں تو لگے ہوئے ہیں لیکن ایسے وقت میں جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں اُنسے یہ کوئی نہیں کہتا کہ متھرا نہ جائیں، کہ اصل علاج یہی ہے۔

या अनुराग की फाग लखो जहां राग ही राग किशोर किशोरी
त्यों पदमाकर घाली घली फिर लालहि लाल गुलाल की झोरी
जैसी की तैसी रही पिय की करि काहू न केशरि रंग में बोरी।

गोरिन के रंग भीजिगो, सांवरो साम्वरे के रंग भीजीसुग रो।

یا انوراگ کی پھاگ　　جہاں راگت راگ کشور کشوری
تیوں یدما کر گھالی گھلی پھر لال ہیں لال گلال کی بھور ری
جیسی کی تیسی رہی پی کی گرکا ہو نہ کیشر رنگ میں بوری
گورن کے رنگ بھیج گو ساورو سانورے کے رنگ بھیجی سگوری

سکھی ناگر اور ناگ کی باہمی اُلفت کا حال بیان کرتی ہے کہ ان کی محبت کی ہولی بھی عجیب ہولی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے رنگ میں رنگے گئے ہیں سانورے کے رنگ میں ناگر رنگ گئی ہے اور ناگر کے رنگ سے ناگ شرابور ہے۔

بابو بھارتیندو ہرشچندر آپ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے آپ کا مولد و منشاء بنارس ہے آپ کے والد کا نام بابو گوپال چند المتخلص بہ گردھر داس تھا جو ہندی کے مشہور شاعر ہو چکے ہیں۔ آپ لڑکپن سے ذہین اور طباع تھے آپ نے ہندی کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ طبیعت میں جولانی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ صرف چھ برس کی عمر میں ایک دوہا لکھا تھا۔ سترہ برس کی عمر ہوتے ہوتے آپ ہندی کے خاصے شاعر ہو گئے۔ طبیعت میں حسن پرستی کا مادہ زیادہ تھا اس وجہ سے اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکے اور ایک حُسن کی دیوی کی پوجا کرنے لگے بزرگوں سے جو دولت ملی تھی وہ فیاضی اور عشرت میں برباد ہونے لگی یہ حال دیکھ کر ان کی نانی نے بقیہ نقد اور نانہالی جائداد کو اُن کے چھوٹے بھائی کے نام ہبہ کر دیا۔ چونکہ بغیر ان کے دستخط کے وہ ہبہ نامہ ناجائز تھا اس لئے نانی کے کہنے پر لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا سرمایہ جو ان کے حصہ کا تھا اپنے بھائی کو بخشدیا۔

ہندی ناٹک لکھنے کے موجد آپ ہی ہیں عام فوائد ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے چنانچہ آپ نے ایک اسکول اپنے نام سے بنارس میں کھولا تھا جو ابھی تک جاری ہے۔

آپ نے مختلف رسالے جاری کئے جو دوسروں کی ادارت میں جا کر بند ہو گئے۔ طبیعت میں فیاضی اتنی تھی کہ جس چیز کی کسی نے تعریف کر دی آپ نے اُسی کو بخشدی۔ آپ نے اکتیس سال کی عمر پائی اور مرض دق میں مبتلا ہو کر انتقال کیا آپ کی تصانیف میں لوگ ایکسو چھپتر کتابیں بتاتے ہیں مگر "سیتہ ہرشچندر ناٹک"۔ "چندراولی" "بھارت درشا" "پریم یوگنی" "کشمیر کسم"۔ "چترا دلی" "پریم پھلواری" "کرشن چرتر" وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:-

व्रजल लौ जो न मिले भी कहा हम तो तुम्हरे सब भांति कहावें।
मेरो उराहनो है　　कछु नाहीं सबै फल आपने भाग को पावें॥

जो हरिचंद भई सो भई अब प्रान चलै छिन तासों सुनावे ॥ ।

प्यारे जो है जग की यह रीति बिदा के समय सब कंठ लगावें ।

آج لوں جو نہ ملے تو کہا ہم تو تمہرے سب بھانت کہا دیں

میرو اُرا ہنو ہے کچھو نا ہیں سبے پھل آپنے بھاگ کو پا دیں

جو ہرشچند بھئی سو بھئی اب پران چلے چہیں تاسوں سنا دیں

پیارے جو ہے جگ کی یہ ریت، بدا کے سمے سب کنٹھ لگا دیں

تم ابھی تک نہیں ملے تو کیا ہوا، گویا نہ گویم تمہارے ہی کہلاتے ہیں۔ جو تقدیر میں ہوتا ہے وہی پیش آتا ہے اس میں کسی کی کیا شکایت۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تو میں اس دنیا سے جا رہی ہوں اور قاعدہ ہے کہ لوگ جانے والے کو گلے مل مل کر رخصت کرتے ہیں۔ اس لئے اے، پیارے کیا اب بھی تم میرے گلے آ کر نہ ملو گے۔

बार बार पिय आरसी मति देखहु चित लाय ।।

सुन्दर कोमल रूप पर दीठ न कहुं लगि जाय

بار بار پی آرسی مت دیکھو چت لائے

سندر کومل روپ پر دیٹھ نہ کہوں لگ جائے

بار بار آئینہ نہ دیکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے خوبصورت چہرہ پر تیری ہی نظر نہ لگ جائے۔

देखन देहौं न आरसी सुन्दर नन्द कुमार ॥

कहुं मोहित होव रूपनिजि मतो मोहिं देहु बिसार ॥

دیکھن دیہوں نہ آرسی سندر نند کمار

کہوں موہت ہوئے روپ نج متی موہ دیہوں بسار

اے میرے پیارے۔ تم کو میں آئینہ اس لئے نہیں دیکھنے دیتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی خوبصورتی میں محو ہو جاؤ اور مجھ کو بھلا دو۔

भूली सी भ्रमी सी चौंकी जकी सी थकी गोपी

दुखी सी रहति कछु नाहीं सुधि गेह की ॥

मोही सी लोभाई कछु मोदक सो खाये सदा

बिसरी सी रहै नेकु खबर न गेह की ॥

रस भरी रहै कबहूं फूली न समाति अंग ।

بھولی سی بھرمی سی چونکی جکی سی تھکی گوپی

دُکھی سی رہت کچھ ناہیں سدھ گیہہ کی

موہی سی لبھائی کچھ مودک سو کھائے سدا

بسری سی رہے نیک کھبر نہ گیہہ کی

رس بھری ہو کبھوں پھولی نہ سمات انگ

ہنس ہنس کہے بات ادھک اُمیہ کی   हंसि हंसि कहे बात अधिक उमेह की ,
پوچھتے کھسیائی ہوئے اُتّر نہ آوے تاہ   पूंछे ते रिवसियानी होय उत्तर आवे ताहि ,
جانی ہم جانی یہ نشانی ہے سنیہ کی   जानी हम जानी यह निशानी है स नेह की

کھوئی ہوئی سی رہنا، ڈرتے رہنا، چونک چونک پڑنا، ازخود رفتہ رہنا، غمگین رہنا، مکان کی خبر نہ رکھنا، صورت سے محبت آنکھوں سے حسرت ٹپکنا، کبھی غصے ہوجانا اور کبھی خوشی سے پھولے نہ سمانا، اگر کوئی پتہ کی بات کہے تو غصہ ہوجانا اور جواب نہ دے سکنا، یہ تمام باتیں صاف غمازی کر رہی ہیں کہ ضرور تمہاری آنکھ کہیں لڑی ہے۔

حکم توسیع میعاد ڈسچارج

(دفعہ ۲۷ (۲) ایکٹ ۵ سنہ ۲۰ء)

بعدالت جناب بابو شیو گوپال ماتھر صاحب جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۳۲ سنہ ۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی جان ولیم فنچ ولد مسٹر جے فنچ ساکن عالم باغ شہر لکھنؤ جان ولیم فنچ کی درخواست مورخہ ۶ نومبر سنہ ۳۵ء کو پڑھنے کے بعد یہ حکم دیا جاتا ہے کہ میعاد میں جو درخواست ڈسچارج گزارنے کے لئے مقرر کی گئی تھی ۶ ماہ کی مزید توسیع کی گئی۔ المرقوم ۲۶ نومبر ۳۵ء

بحکم عدالت
بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

ہندی زبان کی سخن گو خواتین

دورِ جدید میں جو ارتقائے تمدن کا انتہائی مرکز سمجھا جاتا ہے ہماری خواتین نے فلسفہ، تاریخ، اور ادب و شاعری میں حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ دنیا کے اسٹیج پر وہ مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہیں۔ تجارت، ملازمت، صنعت و حرفت، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں انھوں نے اپنی قابلیت کا بہترین ثبوت بہم پہونچایا ہے۔ لیکن نہایت قدیم زمانہ یعنی رگ وید کے زمانہ میں بھی عورتوں نے تحصیل علم میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ رگ وید میں بہت سی قابل خواتین کا ذکر موجود ہے۔ ان کے منتر اب تک اس میں محفوظ ہیں۔ دوسرے علوم کے ساتھ ادب و شاعری سے بھی ان کو دلچسپی تھی اس زمانہ کی علم دوست عورتوں میں ایک ایسی عورت کا پتہ ملتا ہے جو شاعرہ تھی۔ اس کا نام "گھوشا" تھا اور وہ راجہ کاک شون کی لاڈلی بیٹی تھی۔

قدیم سخن گو خواتین میں میرا بائی، روپ متی، سہجو بائی، دایا بائی، سندر کنور بائی، رسک بہاری رچست کنور بائی، مہارانی بانکوتی جی برجداسی، رنگ بزان، دلوی بندی جن، برجو بائی، اندستی بائی، گوپی رانی، پدیا سکھی، گنگا استری وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں مگر بلحاظ شاعری ان کا کلام بلند نہیں سمجھا جاتا۔

میرا بائی۔ ہندی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت جو شاعرہ سب سے پہلے ناظرین کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتی ہے وہ میرا بائی ہے، اس کے شیریں دوہے زبان زد خاص و عام ہیں۔ مارگیرٹ میکنیکل مصنفہ "شاعرات ہند" کا بیان ہے کہ میرا بائی سب سے زیادہ مشہور شاعرہ ہے، وہ ہندی اور گجراتی زبانوں میں شعر کہتی تھی گجراتی عورتوں میں اس کے گیت اب تک شوق سے گائے جاتے ہیں وہ کرشن جی کی پرستار تھی اس کو سری کرشن کے نام کے ساتھ عقیدت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ وہ خود اس محبت کو جو اسے سری کرشن کے ساتھ تھی اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کرتی ہے:-

"میں اپنے مالک سے محبت کرتی ہوں اور اس امر کے اظہار کرنے میں مجھے بالکل شرم نہیں معلوم ہوتی کیونکہ مجھے لوگوں نے علانیہ رقص کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے دن میں مجھے بھوک بالکل نہیں لگتی، رات کو نیند نہیں آتی، میں ہمیشہ بیقرار رہتی ہوں، ان تکلیفوں کو پس پشت ڈال کر میں دوسری طرف جاؤں گی کیونکہ ایک علم مخفی نے مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ میرے تمام اعزہ و اقربا آکر مجھکو شہد کی مکھیوں کی طرح گھیر لیتے ہیں اور سب مجھے میرے ارادے سے باز رکھنا چاہتے ہیں لیکن میرا ایمان

آقا کو (مگن (کرشن جی) کی لونڈی ہے، اسے کسی بات کی پرواہ نہیں، خواہ دنیا اس کے متعلق کچھ کہے۔"

میرا بائی راجپوتانہ کی ایک شہزادی تھی، اس کی شادی اودے پور کے مہارانا کے خاندان میں کنور بھوج راج ولی عہد سلطنت سے ہوئی تھی۔ بھوج راج تخت نشینی سے قبل ہی مرگیا اور مہارانا کمبھ کو اس کے دوسرے بیٹے اودے کرن نے زہر دیکر خود تخت پر قبضہ کرلیا۔

میرا بائی شروع ہی سے زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھی اور کرشن جی کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انھیں وجوہ سے اسکے شوہر اور تمام اعزہ اس سے ناراض رہتے تھے، اودیکرن جب تخت کا بلاشرکت غیرے مالک ہوگیا تو اس نے میرا بائی کو اس قدر تکلیفیں دیں کہ بالآخر وہ تنگ آکر چتوڑ کو الوداع کہنے پر مجبور ہوگئی، میرا بائی کو اپنی عقیدت و محبت کی بدولت جو اس کو سری کرشن سے تھی دنیا کے طعنے سننے پڑے لیکن وہ بدستور گوچہ و برزن میں زمزمہ سنجی کرتی اور کرشن جی کی پرستش میں ہر وقت مشغول و منہمک رہتی تھی۔ اس کے بھجنوں میں ایسا کمال اور اس قدر تاثیر تھی کہ جب وہ اپنا کوئی گیت گاتی تو سامعین کے دلوں کو مسخر کرلیتی اور وہ لوگ دیوی کی طرح اس کی عزت کرتے۔

میرا بائی "بھگتی اسکول" سے تعلق رکھتی ہے، اس کی شاعرانہ عظمت کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے کیونکہ اسکا کمال مستند ہے۔ اس کے الفاظ میں درد اور زبان میں جادو ہے۔ اس کے خیالات میں محبت کا دریا موجیں مارتا ہے۔ اس کے کلام کا مجموعہ موجود ہے جس کو لوگ انتہائی ذوق سے پڑھتے ہیں اپنی ایک نظم "جدائی" میں وہ لکھتی ہے:۔

"بادل ہر طرف سے جھوم جھوم کر آئے ہیں مگر وہ ہری کا کوئی پیغام نہیں لائے۔ طائر اپنی شیریں نوائی سے سننے والوں کے دلوں میں جوش پیدا کر رہے ہیں، کوئل چلا رہی ہے ایسی تاریکی میں بجلی چمک چمک کر ان غمزدہ عورتوں کو خوف زدہ کر رہی ہے جن کے شوہر باہر ہیں۔ معطر ہوا موسیقیت سے لبریز ہے، بارش مسلسل ہو رہی ہے۔ جدائی کی گھڑیاں کالے سانپ کے مانند ڈرا رہی ہیں مگر میرا کا دل ہری کے خیال میں کھویا ہوا ہے"

"بیداری کی وجہ سے آنکھیں خمار آلود ہوگئی ہیں، اے میرے مالک! جب سے تم مجھ سے علحدہ ہوئے ہو میرے دل نے قرار نہیں پایا ہے، تمھاری آواز سنکر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے تمھارے الفاظ میں مجھے شیرینی محسوس ہوتی ہے۔ میری آنکھیں تمھارے آنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ ہر رات مجھے نصف سال کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ اے میرے ندیم! میں تیری جدائی کی تکلیفیں کس سے بیان کروں؟ ساری رات میرا کو بیقراری میں گزر جاتی ہے۔ اے میرے آقا! میں کب تجھے پاؤں گی اور کب تو میری تکلیفوں کو دور کرکے مجھے مسرت بخشیگا؟"

یہ ہیں وہ جذبات جن کو سن کر دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ یہ خیالات جو ایک درد مند دل سے نکلے ہوئے ہیں اصلیت کی سچی تصویریں ہیں۔ اسی لئے سامع پر بیخودی، مدہوشی اور سرشاری کا ایک عالم طاری کر دیتے ہیں۔

اپنی ایک دوسری نظم "محبوب" میں وہ کہتی ہے:۔

"موہن (کرشن جی) کے حسن و جمال نے میرا من موہ لیا ہے۔ مجھے بازار اور راستہ میں انکا خیال ستایا کرتا ہے۔"

"اس کا جسم سراپا حسن ہے، اس کی آنکھیں کنول کے پھول ہیں اس کی نظر بلا کی دلفریب ہے، اس کا تبسم بیحد شیریں ہے۔ جمنا کے ساحل پر گایوں کو چرایا اور اپنی محبت آفریں بانسری بجایا کرتا ہے۔"

"میں اس کو اپنا جسم، اپنی روح اور اپنی دولت سپرد کرتی ہوں اور اس کے کنول کے مانند قدموں پر سجدہ کرتی ہوں۔"

سہجو بائی — یہ اٹھارھویں صدی کی شاعرہ ہر پرشاد ڈھوسر کی لڑکی تھی۔ میرا بائی کی طرح اسے بھی کرشن جی سے خالص عقیدت تھی۔ اس نے "سہجو پرکاش" ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ اس کی نظموں میں برج بھاشا، اور راجپوتی زبانوں کی آمیزش ہے جس سے ایک نیا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

اس کا کلام بہت سرور افزا ہے۔ اور پڑھنے والے پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زبان میں شیرینی اور تخیلات میں بلندی ہے۔ یہ شاعرہ "چرنداسی"[1] فرقہ سے تعلق رکھتی تھی، نمونہ کے طور پر اس کی ایک نظم "ہری کا نام" پیش کی جاتی ہے:۔

"ایشور کا نام لعل بے بہا، کی طرح قیمتی ہے جو صرف دولتمندوں کے محلوں میں پائے جاتے ہیں اور، ایک غریب آدمی ان کی قدر و قیمت نہیں جان سکتا، اور اسے کھو دیتا ہے۔"

"لیکن جس دل میں ایشور کا نام ہے اس میں ہمیشہ مسرت و انبساط ہے بغیر اس کے نام کے کیا حسین و جمیل اور کیا معلم و مالدار سب ہی بدقسمت ہیں۔"

"سہجو دنیا کے سمندر پر بہہ رہی ہے، جہاں تاریکی ہے اور سخت بارش ہو رہی ہے مگر وہ کشتی جو اس کے درمیان ہے ہری کا نام ہے۔ یہی نام لوگوں کو اس طوفان عظیم میں پناہ دیتا ہے ایک شخص کسی پہاڑ پر بیٹھکر نفس کشی کر سکتا ہے، گرمی اور سردی اس کی نظر میں یکساں ہو سکتی ہیں مگر

---

[1] چرنداس نے دہلی میں ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی تھی، وہ بت پرستی کا قائل نہ تھا۔

ہری کا نام ان سب سے زیادہ منفعت بخش ہے"

سہجو بائی کی ایک نظم "جھوٹے رہنما" موجودہ زمانہ کے اُن غیر تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے جو پیر پرستی میں مبتلا ہیں ایک درس عبرت ہے، وہ کہتی ہے:-

"بہت سے گرو گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں جو جاہل ہیں، جو کسی بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے جن کے دماغ ناکارہ ہیں، وہ لوگوں کو مکر و فریب سے اپنے دام میں لے آتے ہیں مگر در اصل وہ ایک آدمی کو بھی نجات نہیں دلا سکتے"

دایا بائی۔ یہ سہجو بائی کی بہن تھی، اس کی شاعری کا زمانہ بھی وہی ہے جو اس کی عزیز بہن کا تھا۔ اس کی " دایا بودھ" نامی کتاب آج تک شوق و ذوق سے پڑھی جاتی ہے۔

شاعری میں دایا بائی اپنی بہن سے زیادہ کامیاب تھی، اپنی ایک نظم میں وہ کہتی ہے:-

" اے خدائے بزرگ، مسرتوں کا منبع، ہر دلعزیز، تو ہی توصیف کے قابل ہے۔ اے رحم کے سمندر تو ہی دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے، دایا تیرے سامنے سربسجدہ ہے"

"تیرا نظر نہ آنے والا جسم ایک بحر کے مشابہ ہے جو بہت زیادہ عمیق ہے اس میں مسرتوں کی لہریں برابر اُٹھتی رہتی ہیں مگر میرا دل بیقرار ہے، تیری ضیائے پر نور سے میری تمام تمنائیں چمک اُٹھی ہیں اسی کو دیکھ کر دایا تہ دل سے تیری پرستش کرتی ہے"

سہجو اور دایا، دونوں بہنیں "چرنداسی مت" رکھتی تھیں جس میں وحید کی تعلیم غالب تھی۔ دایا بائی اپنی ایک نظم "حقیقی رہنما" میں بانی فرقۂ چرنداس کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہے۔

" چرنداس، ہمارا رہنما، برہما کی طرح عشرت و مسرت کا مرکز ہے، جو تکلیفوں کو دور کرنے والا اور خوشیوں کو بڑھانے والا ہے، دایا اسکے سامنے اپنا سر جھکاتی ہے"

" دایا بعض اعمال کے سبب سے دُنیا کے تاریک کنوئیں میں گر گئی تھی اور اس میں غرق ہو رہی تھی مگر اس کے رہنما نے علم کی ایک رسّی ڈال کر اسکو باہر نکال لیا"

" وہ ہمیشہ مسرور رہتا ہے، اس کا حسن حیرت خیز ہے اسی لئے دایا نے اپنے دل کو اسکی طرف لگا لیا ہے، اس دنیا میں کوئی بھی اس قدر مہربان نہیں ہے میرا سچا رہنما کیونکہ وہ غیر معمولی اصلاح کرتا ہے اور روح کو حفاظت سے دنیاوی سمندر کے پار لے جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے گرو کے کنول کے مانند پیروں پر اپنا سر رکھدیتے ہیں وہ دنیاوی تکالیف کو بھول جاتے اور ایک بڑی

دنیا میں پہونچ جاتے ہیں، ایک سچا رہنما حقیقت میں برہما ہے، اس کو صرف ایک انسان ہی تصور نہ کرو، جو ایسا خیال کرتے ہیں وہ بے عقل ہیں، تم ہمیشہ اپنے رہنما کی پرستش میں لگے رہو اور اپنے سر کو اس کے سامنے جھکا دو، پھر وہ تم ہری کی سچی تصویر دکھا کر تمھیں حقیقی مسرت بخش دے گا۔"

روپ متی۔ کے ذاتی حالات ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے عام طور پر مشہور ہیں۔ اگرچہ اس کے مجموعۂ کلام کا کوئی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا لیکن مالوہ میں آج بھی اس کے گیت خاص طور پر گائے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ باز بہادر کو موسیقی سے عشق تھا اور روپ متی سریلے راگ لکھتی اور اپنے شوہر کو سناتی تھی۔

ایک ادیب روپ متی کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

"جب خونخوار اور دہشت ناک لڑائیاں سکون میں تبدیل ہو جاتیں اور جب سرگرم حملے اختتام پذیر ہوتے تو باز بہادر اکثر تاروں بھری راتیں روپ متی کے مست کرنے والے اور عشرت آفریں راگوں میں بیخود ہو کر گزار دیتا۔"

الفنسٹن (ELPHINSTONE) اپنی تاریخ ہند میں خافی خان کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:۔

"باز بہادر کی بیوی، ایک ہندو خاتون تھی جو حسن و جمال کے لحاظ سے ہندوستان کی حسین ترین خواتین میں تھی، وہ خلیق و خوبصورت تھی اور اپنی شاعری کی وجہ سے ہندوستان میں مشہور تھی۔"

اس کی ایک نظم "کننگھمس آرکیالاجیکل رپورٹ" (جلد دوم) میں موجود ہے جس کا عنوان "استحکام محبت" ہے وہ اپنے رفیق شوہر باز بہادر کو مخاطب کر کے کہتی ہے:۔

"پیارے! دوسروں کو اپنے اپنے خزانہ پر ناز کرنے دے، مگر میرا خزانہ تیری محبت کا ہے جو بالکل محفوظ ہے، جس میں کسی کو دخل نہیں اور جو میرے دل میں بند ہے، اسے کوئی عورت دیکھ نہیں سکتی، وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتا خواہ میں آرام میں رہوں یا تکلیف میں مگر وہ ہمیشہ بڑھتا ہی رہیگا۔"

رنگریزن۔ رنگریزن ایک مسلمان رات تھی، اس کا پیشہ رنگسازی تھا اسی لئے وہ رنگریزن کہلاتی تھی، اس کے خاندانی حالات پردۂ خفا میں ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھی اور اصلی نام کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ ایک برہمن شاعر عالم نے اپنا عمامہ رنگنے کو اس کے پاس بھیجا، اس عمامہ میں غلطی سے ایک کاغذ لپٹا رہ گیا تھا جس میں اس کی ایک ناتمام نظم کا حسب ذیل حصہ تھا:۔

"سونے کی چھڑی کے مانند عورت کی کمر کیوں باریک ہے؟"

جس وقت وہ عمامہ رنگنے کو جا رہی تھی اسے یہ پرچہ ملا جس کو پڑھکر اس نے فوراً کاغذ کے نیچے یہ عبارت لکھ دی کہ کا

کاٹ کر سینہ میں رکھدیا ہے"۔

عالم کے پاس عمامہ رنگ کر گیا تو اُس نے اپنی نامکمل نظم کو مکمل دیکھا وہ پھڑک اُٹھا اور فوراً رنگریزن کے پاس گیا اور جب معلوم ہوا کہ یہ اُسی کی جدت طبع تھی تو اُسنے ایک ہزار روپئے اُسے انعام کے طور پر عطا فرمائے۔ اس کے بعد ان دونوں میں رسم اخلاص و مودت قائم ہوگئی اور آخر کار حُسن کی فتح ہوئی عالم فرط محبت سے مجبور ہو کر مسلمان ہوا اور اسنے رنگریزن سے شادی کرلی۔

اس کی زبان برج بھاشا تھی اور شاعری کا زمانہ سنہ ۱۷۰۰ء شمار کیا جاتا ہے، اس کی نظمیں واردات محبت سے لبریز ہوتی ہیں، وہ عشق کی پرستار ہے "مصر بندھو ونود" کے مصنف اُس کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اسکی شاعری فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے"۔

عالم اپنی ایک نظم میں رنگریزن کے متعلق کہتا ہے:

"ایک خوبصورت عورت کی نشیلی آنکھیں رات کی بیداری کی وجہ سے محبت آلود ہوگئی ہیں، جب کوئی ان کی طرف دیکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شباب ان سے پھوٹا پڑتا ہے، وہ آنکھیں محبت کے نشہ سے مخمور ہیں اور خمار کی سبب سے جھک گئی ہیں، اے عالم! ان آنکھوں میں ایک نئے حُسن کا جلوہ نظر آتا ہے وہ ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا کنول کے پھول پر بھونرے رقص کررہے ہیں"

رنگریزن اس نظم کو مکمل کرتے ہوئے لکھتی ہے:-

"وہ آنکھیں جو بھونرے کے مانند ہیں، چاہتے ہیں کہ اُڑ جائیں جس وقت وہ چاند کے چہرے کو دیکھتے ہیں لیکن یہ معلوم کرکے کہ یہ رات ہے وہ کنول کے پھول ہی میں رہ جاتے ہیں"۔

سندر کنور بائی راد ھا بلبھ۔ سندر روپ نگرا ور کرشن گڑھ کے راٹھور خاندان کے مہاراجہ راج سنگھ کی بیٹی تھی اور راگھو گڑھ کے مہاراج کنور بلونت سنگھ کو بیاہی گئی تھی، اس کے آباواجداد شاعری اور شعراء کے بڑے قدر داں تھے، اس نے "بھاگوت" کا ترجمہ ہندی نظم میں کیا تھا اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں مثلاً "نہندہ"، "بندرابن گوپی مہاتمے"، "سنکیت سوگل"۔ "رسپنج"، "پریم سمپٹ"۔ "بھار سنگرہ"، "رنگ جبر" "بھاونا پرکاش"۔ "پد" اور "رام رہس" لکھیں۔

اس کی تمام کتابیں شائع ہوچکی ہیں، زبان برج بھاشا ہے، اس کی ایک نظم یہ ہے:-

"میں شیام کے عشق کی پرغضب، دل میں اُٹھنے والی لہروں کے لطف کے سامنے کروڑوں امرت کی ندیوں سے پہنچنے جانے کے لطف کو کوئی وقعت نہیں دیتی"

"محبت کے نشہ میں طبیعت از خود رفتہ ہو رہی ہے، دل میں ایک تھرتھراہٹ محسوس ہو رہی ہے آنکھیں

خمار آلود ہو گئی ہیں، بدن ساکت ہو گیا ہے، اعضاء کی حرکت بند ہو گئی ہے، اب یہ نشہ اُترنے والا نہیں"[1]

کری رانی۔ بوندی کی رہنے والی اور چوبے لوکناتھ کی بیوی تھی، اس کی شاعری کا زمانہ سمبت ۱۷۰۵ بکرمی ہے۔ اس کی صرف چند نظمیں پائی جاتی ہیں، وہ بھی اعلیٰ پایہ کی نہیں، جب چوبے لوکناتھ کسی کام سے کابل جا رہا تھا تو اُسوقت اُس نے حسب ذیل نظم لکھ کر اپنے شوہر کے سامنے پیش کی تھی۔

"میں تو سمجھتی تھی کہ لوکناتھ سا شوہر پا کر اس کے ساتھ اس طرح رہوں گی جس طرح پاربتی مہادیو کے ساتھ رہتی تھی مگر اتنی محبت ہونے پر بھی وہ مجھ سے جدا ہونے پر مجبور ہوا۔ واقعی قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔"

مہارانی بانکوتی جی۔ اس کا تخلص برجداسی تھا اور جے پور کے کچھواہا راجہ آنند رام کی دختر تھی سمبت ۱۷۷۶ بکرمی میں کرشن گڑھ کے مہاراج راج سنگھ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئی، اس نے "بھاگوت گیتا" کا ترجمہ ہندی نظم میں کیا جو برجداسی بھاگوت کے نام سے مشہور ہے، اس کی زبان میں برج بھاشا اور میواڑی کی آمیزش ہے۔ اس کی شاعری دیوتاؤں کی تعریف سے لبریز ہے، اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔

چھت کنور بائی۔ روپ نگر کے راجہ سردار سنگھ کی بیٹی تھی، اسکی شادی سمبت ۱۷۳۱ بکرمی میں کوٹہ کے راجہ گوپال سنگھ کے ساتھ ہوئی سمبت ۱۷۶۵ بکرمی میں "پریم ونود" ایک گرنتھ مرتب کیا جو شاعرانہ حیثیت سے معمولی چیز ہے۔

رسک بہاری (بنی ٹھنی جی) مہاراجہ ناگری داس والی کرشن گڑھ کی بیوی تھی اس کی نظموں میں برج بھاشا اور راجپوتانی زبان کی آمیزش ہے اور وہ "ناگر سمچے" کے آخر میں شامل ہیں۔

سکھ سکھی جی۔ اس نے سمبت ۱۸۱۵ بکرمی کے قبل شاعری شروع کی "رنگ مالا" اور "آٹھوں ساتوک" اس کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔

پریا سکھی بخت کنور مہارانی۔ اس کی شاعری کا زمانہ سمبت ۱۷۹۱ بکرمی شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے "بانی" اور "پریا سکھی جی کی گاری" لکھی۔

دیوی بندی جن۔ سمبت ۱۰۵۰ بکرمی میں اس کی ولادت ہوئی، اس نے ایک نہایت ظرافت آمیز نظم "سوم ساگر" کے نام سے لکھی، جس میں بخیلوں کا مضحکہ نہایت خوبی سے اُڑایا ہے۔

(زمانہ) اختر عابدی

---

[1] سندر کنور بائی کے متعلق یہ تمام تر رسالہ "معر بنز" ھدو نو دسے اخذ کیا گیا ہے۔

ہندی شاعری میں مثنوی کا رواج

اور

ملک محمد جائسی

ہندی یا سنسکرت شاعری میں مثنوی کا رواج نہ تھا اور نہ ہندی ادب میں اس کا کہیں ذکر ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد جب ہندو مسلمانوں کے تعلقات پیدا ہوئے تو ان کا اثر دونوں کی شاعری پر بھی پڑا، یعنی جس طرح مسلمانوں نے ہندی شاعری کی طرف توجہ کی اسی طرح ہندی شاعری نے مسلمانوں کے لٹریچر سے متاثر ہو کر بعض ایسے اصنافِ سخن کو پیش کیا جو فارسی کے لئے مخصوص تھے اور انھیں میں سے ایک مثنوی نگاری بھی ہے۔

ہندی میں سب سے پہلے مثنوی نگار کتبن (قطبن) تھے۔ یہ شیخ برہان کے شاگرد تھے اور انھوں نے ۹۰۹ھ میں مرگاوتی نام کی ایک مثنوی تصنیف کی۔ اس مثنوی میں چندر نگر کے راجکمار اور کنچن نگر کی راجکماری مرگاوتی کا افسانۂ محبت نظم کیا گیا ہے۔ مرگاوتی کے بعد دھومالتی مگدھاوتی اور پریماوتی نام کی مثنویاں بھی تصنیف ہوئی ہیں۔ غازی پور کے شیخ حسین کے لڑکے عثمان نے بھی ایک مثنوی لکھی تھی جس کا نام چترآولی ہے اور جس میں نیپال کے راجہ دھرنی دھر کے لڑکے سوجان اور روپ نگر کے راجہ چترسین کی لڑکی چترآولی کا افسانۂ محبت درج ہے۔ اسی طرح کی ایک تصنیف نور محمد کی اندراوت بھی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور اور ہندی ادب کی مشہور مثنوی ملک محمد جائسی کی پدماوت ہے جس کے تتبع میں کچھ عرصہ بعد تلسی داس نے اپنی مشہور کتاب رام چرت مانس تصنیف کی۔

جائسی کہاں اور کب پیدا ہوئے اس کا پتہ ابھی تک نہ لگ سکا۔ ہاں اس کی ایک چوپائی سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جائس کے نہیں بلکہ کہیں اور کے رہنے والے تھے۔ اور وہاں سے آکر جائس میں آباد ہوئے تھے۔ جائس میں رہنے کی وجہ سے ہی یہ بعد میں جائسی کہلانے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ غازی پور میں کسی غریب مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے تھے سات سال کی عمر میں چیچک نکلی جس سے ایک آنکھ جاتی رہی۔ اس کے بعد ان کی والدہ مرگئیں والد کا انتقال پہلے ہی ہو چکا

تھا۔ چونکہ یکسن تھے اور کوئی پرورش کرنے والا نہ تھا اس لئے فقیروں کے ساتھ رہنے لگے اور آخیر عمر تک فقیروں کی طرح زندگی گزار دی۔ کہتے ہیں کہ ان کے بہت سے مرید تھے جو پدماوت کو ادھر اُدھر گایا کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ انکا ایک مرید، جائسی کا بارہ ماسا گاگا کر امیٹھی میں بھیک مانگا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے امیٹھی کے راجہ نے بھی اس بارہ ماسے کو سنا اور یہ معلوم ہونے پر کہ یہ ملک محمد کی تصنیف ہے۔ ملک محمد کو اس نے یہاں بلا لیا اور یہیں وہ رہنے لگے اور ان کی مشہور تصنیف (پدماوت) بھی یہیں مکمل ہوئی۔

پدماوت فارسی انداز کا فسانۂ محبت ہے فارسی انداز سے مراد یہ ہے کہ برخلاف ہندی اور سنسکرت ادب کے اس میں عورت کو معشوق اور مرد کو عاشق قرار دیا گیا ہے۔ فسانہ یہ ہے کہ:۔

سنہل دیپ کے راجہ کی لڑکی پدماوتی اسقدر حسین تھی کہ کوئی شوہر اس کے لائق نہ ملتا تھا، جس سے پدماوتی ملول رہتی تھی۔ پدماوتی کی یہ حالت دیکھ کر اس کے طوطے (ہیرامن) نے شوہر تلاش کرنے کی اجازت مانگی۔ یہ سنکر راجہ گندھرب سین بہت ناراض ہوا اور اس کو مار ڈالنا چاہا۔ مگر پدماوتی کے سمجھانے سے باز آیا۔ ہیرامن اس واقعہ کے بعد بہت دنوں تک پدماوتی کے پاس رہا لیکن اس کو ہر دم اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا۔ ایک دن مانسرور میں پدماوتی غسل کرنے گئی اور وہ اُڑ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک صیاد پرندوں کا شکار کرنے کے لئے جنگل میں آیا۔ سب پرندے اس کو دیکھ کر اُڑ گئے مگر ہیرامن گرفتار ہو گیا۔ اور صیاد اسے بازار لے گیا اور ایک غریب برہمن اسے خرید کر چتوڑ گڑھ لے آیا۔ اس وقت یہاں راجہ چترسین کا لڑکا رتن سین راج کرتا تھا۔ اس نے ہیرامن کو ایک لاکھ روپیہ دیکر اس برہمن سے خرید لیا۔

ایک دن راجہ رتن شکار پر تھا کہ اس کی رانی ناگمتی نے طوطے سے دریافت کیا کہ کیا دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت کوئی اور ہے۔ طوطے نے ہنسکر جواب دیا کہ سنہل دیپ کی پدماوتی میں اور تم میں دن اور رات کا فرق ہے۔ یہ سنکر رانی نے سوچا کہ طوطا کہیں راجہ سے بھی نہ کہدے اس لئے لونڈی کو حکم دیا کہ اسے مار ڈالے۔ مگر لونڈی نے طوطے کو مارنے کے بجائے چھپا دیا۔ اور ایک دن راجہ کے مانگنے پر اسے راجہ کے حوالے کر دیا۔ ہیرامن نے راجہ سے پدماوتی کے حسن وجمال کی اتنی تعریف کی کہ وہ اپنا سارا راج چھوڑ کر ہیرامن کے ساتھ پدماوتی کی تلاش میں چل پڑا۔ راجہ کے ساتھ ۱۶ ہزار شاہزادے اور بھی ساتھ ہو لئے۔

آخر کار ساتوں سمندر پار کر کے وہ سنہل دیپ پہونچ گیا اور مہادیو کے مندر میں پوجا کے لئے گیا۔ ادھر ہیرامن پدماوتی کے یہاں گیا۔ چلتے وقت وہ راجہ سے کہتے گیا کہ بسنت کے دن پدماوتی اس مندر میں مہادیو کی پوجا کرنے آئیگی اس وقت تمھیں اس کا دیدار نصیب ہوگا۔

پدماوتی طوطے کو پاکر بہت خوش ہوئی اور اس نے بھی اپنا سارا حال کہتے ہوئے راجہ رتن سین کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہ ہر طرح سے تمھارے لائق ہے اور فلاں مقام پر ٹھہرا ہوا ہے رانی یہ سب سن کر بہت خوش ہوئی اور بسنت کے

کے دن اس سے ملنے اور جے مال ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

بسنت کے دن اپنی سکھیوں کو ساتھ لیکر پدماوتی مہادیو کے مندر میں پہونچی۔ مگر جونہی راجہ رتن سین نے اسے دیکھا بیہوش ہوگیا۔ پدماوتی نے جگانے کے لئے لاکھ کوشش کی مگر وہ ہوش میں نہ آیا۔ اس لئے مجبور ہو کر وہ چندن سے اس کے سینہ پر یہ لکھ کر کہ "جوگی تو نے اچھا جوگ نہیں سادھا کیونکہ جب خیرات ملنے کا وقت آیا تو سو گیا" راجہ کو جب ہوش آیا تو اسے بہت افسوس ہوا اور آگ میں جل جانے کا ارادہ کیا۔ راجہ رتن سین کے اس ارادے کی خبر پا کر سب دیوتاؤں کو یہ فکر ہوئی کہ اگر یہ جلا تو ساری کائنات جل جائے گی اس لئے مہادیو اور پاروتی کے پاس گئے اور سارا قصہ کہہ سنایا۔ یہ سنکر مہادیو کوڑھی کی شکل میں رتن سین کے پاس آئے اور جلنے کی وجہ دریافت کرنے لگے۔ ادھر پاروتی جی کو یہ خواہش ہوئی کہ راجہ کی محبت کا امتحان لیں اور نہایت خوبصورت پری بنکر راجہ سے کہنے لگیں کہ مجھے اندر دیوتا نے روانہ کیا ہے، پدماوتی کو جانے دو۔ مگر راجہ رتن سین نے جواب دیا کہ مجھے پدماوتی کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔

ادھر مہادیو کو پہچان کر رتن سین ان کے قدموں پر گر پڑا۔ مہادیو نے خوش ہو کر اسے سنہل گڑھ میں داخل ہونے کا راستہ بتلا دیا اور ایک سدھ گٹکا دیا۔ رتن سین راستہ معلوم ہو جانے پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سنہل گڑھ پر چڑھنے لگا۔

راجہ گندھرب سین کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوا اور اپنے سپاہیوں کو رتن سین کے گرفتار کرنے کیلئے روانہ کیا۔ اس درمیان میں ہیرامن طوطے نے پدماوتی کا پیغام راجہ رتن سین اور رتن سین کا پیام شوق پدماوتی کے پاس پہونچایا۔ رتن سین کو پدماوتی کا پیام محبت سن کر اور بھی ڈھارس بندھ گئی۔ قلعہ کے اندر جو کنڈ تھا رات کو رتن سین اس میں داخل ہوا، مگر اسی اثنا میں صبح ہوگئی اور وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ راجہ گندھرب سین نے ارادہ کیا کہ جوگیوں کو سولی دیدی جائے۔ رتن سین کے ساتھیوں نے بھی جنگ کرنے کا ارادہ کیا مگر رتن سین نے یہ کہکر کہ راہ محبت میں غصہ کی ضرورت نہیں۔ ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا۔ ادھر یہ حال سنکر پدماوتی کی بہت بری حالت ہو رہی تھی مگر ہیرامن طوطے نے یہ کہکر کہ رتن سین اب کامل ہوگیا ہے وہ مر نہیں سکتا۔ پدماوتی کو تسکین دی۔

آخر کار رتن سین گرفتار کیا گیا اور اسے سولی دینے کی تیاری ہونے لگی۔ ادھر سولی کی تیاری ہو رہی تھی ادھر رتن سین پدماوتی کا نام رٹ رہا تھا۔ یہ سب حال سُن کر مہادیو اور پاروتی دونوں بھاٹ بھاٹن کی شکل میں وہاں پہونچے۔ ادھر ہیرامن پدماوتی کا یہ پیام محبت لیکر رتن سین کے پاس پہونچا کہ میں بھی ہتھیلی پر جان لئے بیٹھی ہوں اور مرا مرنا جینا تمھارے ساتھ ہے۔ بھانٹ کی شکل میں مہادیو جی نے راجہ گندھرب سین کو بہت سمجھایا کہ یہ جوگی نہیں راجہ ہے مگر اس سے راجہ اور بھی ناراض ہوا۔ اس درمیان میں جوگیوں کا سارا دل جنگ کے لئے آمادہ ہوگیا اور مہادیو کے ساتھ ہنومان وغیرہ دیوتاؤں نے جوگیوں کی مدد کی۔ گندھرب سین کی سپاہ اور ہاتھیوں کا ہجوم جب بہت زیادہ بڑھا تو ہنومان نے ہاتھیوں کو

اپنی دُم میں لپیٹ کر آسمان کی طرف پھینک دیا۔ آخیر میں مہادیو جی جنگ میں مہادیو جی جنگ کرتے ہوئے راجہ گندھرب سین کو دکھلائی دئے۔ جسے دیکھ کر راجہ کو بہت تعجب ہوا اور مہادیو جی کے قدموں میں گر کر کہا کہ لڑکی آپ کی ہے جسے چاہے دیجئے اور آخر کار پدماوتی کی شادی رتن سین سے ہو گئی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ فسانہ نہ صرف جذبات و واردات بلکہ تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے بھی ایک بےمثل چیز ہے۔ یہاں اس کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :-

जानहुं अगिन के उठे पहारा । औ सब लागे अंग अंगारा।
लागेउ जरै जरै जस भारू । फिर २ भुजेसि तजेउ न बारू।
جانیہوں آگن کے اٹھیں پہارا اور سب لاگے انگ انگارا
لاگیوں جرے جرے جس بھارو پھر پھر بھونجس تجیو نہ بارو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کے پھٹنے کی وجہ سے آگ سے پہاڑ اٹھ رہے ہیں اور میرے جسم کو پھونکے ڈالتے ہیں جس طرح بھاڑ میں پڑا ہوا اناج ادھر اُدھر ہوتا ہے مگر بعد کو پھر اُسی جگہ آ جاتا ہے، اسی طرح میں بھی جل رہی ہوں۔

कुहकि कुहकि जस कोइल रोई । रकत आंसु घुंघची बन बोई॥
जहं जहं ठाढ़ होय बनबासी । तहं तहं होय घुंघचि के रासी॥
बूंद बूंद महं जानो जीऊ । गुंजा गूंजि करै पिउ पीऊ॥
तेहिं दुख भये परास निपाते । लोहू बूड़ि उठे होय राते॥

کوہکی کوہکی جس کوئل روئی رکت آنسو گھونگچی بن بوئی
جہاں جہاں ٹھاڑ ہوئے بنباسی تہاں تہاں ہوئے گھونگچی کے راسی
بوند بوند مہہ جانو جیو گنجا گونج کرے پیو پیو
تہیں دکھ بھئے پراس نپاتے لوہو بوڑی اُٹھے ہوئے راتے

جس چیز کو لوگ گھونگچی کہتے ہیں وہ حقیقتاً کوئل کے خونیں آنسو ہیں جو اس نے تمام جنگل میں بوئے ہیں۔ یہ فراق زدہ جہاں جنگل میں پہونچ جاتی ہے، وہیں اس رنگین آنسوؤں (گھونگچیوں) کا ڈھیر لگ جاتا ہے جس کی بوند بوند میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جان ہے اور سب پیا کا نام جپ رہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر ٹیسو کے پتے گر گئے اور اس کے پھول ان خون کے آنسوؤں میں ڈوب کر نمایاں ہونے لگے۔

भस्म पर जरा बिरा धार गठा, मेघ सास भये धूम जो उठा।
दाढ़ा राहु केतु का दाधा . सूरज जरा चांद जरि आधा॥

और सब तरपत तरहि जरहीं टूटहि लोक धरती महं परहीं ॥

जरै सो धरती ठावहि ठाऊं, दहकि पलास जरै तेहि दाऊं ॥

اس پر جرا بدر کُٹھا میگھ شام بھئے دھوم جو اُٹھا

داڑھا را ہو کبت کا دادھا سورج جرا چاند جری دادھا

اور سب نکھت ترائی جریں ٹوٹیں لوک دھرت منھ پریں

جرے سو دھرتی ٹھاویں ٹھاؤ دھک پلاس جرے تہیں داؤ

بادل کالے کیوں ہیں، سورج آگ کیوں برساتا ہے، چاند کبھی کبھی آدھا کیوں رہ جاتا ہے، تارے کیوں ٹوٹتے ہیں اور پلاس کے پھول انگاروں کی طرح کیوں ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ سب کسی کی مفارقت ہی کا نتیجہ ہے۔

पिउ सों कहेव संदेसड़ा, हे भौंरा हे काग ॥

जो धनि बिरहै जरि मुई तेहि का धुवां हम लाग

پی سے کہیو سندیس ڑا ہے بھونرا ہے کاگ

سو دھنی برہے جری موئی تہی کا دھواں ہم لاگ

کوا اور بھونرا ایسے ہی تو کالے نہیں ہو سکتے اس کے کالے ہونے کی بھی کوئی وجہ ہونی چاہیے، ناگمتی کہتی ہے کہ اے بھونرے اور کوے میرے محبوب سے یہ پیام کہہ دینا کہ وہ تمہارے ہجر میں جل گئی ہے اور اسی کا دھواں ہم لوگوں کے بھی لگ گیا ہے

देखि मानसर रूप सुहावा । हिय हुलास पुरइन होइ छावा

गा अंधियार रैन मसि छूटी । भा भिनसार किरनि रवि फूटी

चमकि बीजु बरसै जल सोना । दादुर मोर सबद सुठि लोना

सीतल बुन्द ऊंच चौपारा । हरियर सब दिखाय संसारा ॥

دیکھ مانسر روپ سہاوا ہی ہلاس پرئن ہوئی چھاوا

گا اندھیار این مسی چھوٹی بھا بھنسار کرن روی پھوٹی

چمک بیجو برسے جل سونا دادر مور سبد سوٹھی لونا

سیتل بند اونچ چوپارا ہر یر سب دکھائے سنسارا

پدماوتی سے ملاقات وصال کے زمانہ میں دنیا کس طرح دیکھ رہی ہے ملاحظہ ہو:۔ مانسرور (جھیل کا نام) میں کھلا ہوا کنول کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے، دیکھنا نہیں ہے۔ میرا دل ہے جو وہاں جا کر کھل گیا ہے۔ اب کالی رات ختم ہو گئی صبح صادق ہے اور سورج نکل رہا ہے۔ بجلی کی چمک کے ساتھ بارش کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے مینڈک اور طاؤس

سکیسے خوش بول رہے ہیں۔ الغرض سارا جہان کیسا ہرا بھرا ہے۔

यह तन जारू छार के कहूं कि पौन उड़ाउ

मस्को थी मारग उड़ी परे कंथ धरे जहं पांउ

یہ تن جاروں چھار کے کہوں کہ پون اڑاؤ

مکو تہیں مارگ اڑی پرے کنت دھرے جہاں پاؤ

ناگمتی راجہ رتن سین کے ہجر میں کہتی ہے کہ جی چاہتا ہے اس جسم کو جلا کر خاک کر دوں اور ہوا سے کہوں کہ اس کو وہاں اُڑا لے جا جہاں میرا محبوب چلتا پھرتا ہے۔

हाड भये सब किंकरी नसै भई सब तांत।

रोंउ रोंउ से ध्वनि उठै कहं विरह केहि भांति

ہاڑ بھئے سب کنگری نسیں بھئیں سب تانت

روؤں روؤں سے دھنی اٹھے کہوں برہ کیہی بھانت

میرے جسم کی ساری ہڈیاں تمہارے ہجر میں کنکریاں ہو گئی ہیں اور رگیں تانت، اس لئے اب زبان سے حال بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ جسم کا ایک ایک رواں پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

तोर अकेल क जीतिंव हारू, मै जीतूं जगकर संगारो

बदन जीतूं जो शशि उजियारी, बेनी जीतूं भुजंगम कारी

नैनन जीतूं मृग के नैना, कंठ जीतूं कोयल के बैना

भौंह जीतूं अर्जुन धनुधारी, गवि जीतूं तुम चोर पुजारी

दामन जीतूं दम का हैं, अधरंग जीतूं बम बाहीं ॥

تورا اکیل کا جیتوں ہارو　　میں جیتوں جگ کر سنگارو

بدن جیتوں جو سسی اُجیاری　　بینی جیتوں بھجوانگم کاری

نینہیں جیتوں مرگ کے نینا　　کنٹھ جیتوں کوئل کے بینا

بھونہہ جیتوں ارجن دھنو دھاری　　گیو جیتوں تمچور پچھپاری

دامن جیتوں دسسن دمکاہیں　　ادھر رنگ جیتوں بمباہیں

رانی ناگمتی، رتن سین کی معشوقہ پدماوتی سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ میں صرف تمھیں سے نہیں ہاری بلکہ پریتم کے فراق میں سارے جہان سے ہار گئی ہوں۔ دیکھو نا میرے جسم کو ان کے فراق میں چاندنی رات نے جیت لیا ہے اور جوڑے کو کالی ناگن نے فتح کر لیا ہے۔ آنکھوں کو مرگ کی آنکھوں نے فتح کر لیا اور آواز کو کوئل کی آواز نے جیت لیا ہے ابروؤں کو ارجن کے کمان نے جیت لیا ہے اور بجلی نے دانتوں کی چمک کو پھیکا کر دیا ہے۔ ہونٹھ کے رنگ کو لال رنگ نے جیت لیا ہے۔ الغرض اکیلی تمھیں نے نہیں بلکہ ان کے فراق میں سارے جہان نے مجھے شکست دے رکھی ہے۔

کبیر داس

ہندی شاعری میں کبیر داس کو جو درجۂ قبول حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو کبیر داس کے نام سے واقف نہ ہو۔ کبیر داس کے مفصل حالات صحیح طور پر ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں لیکن یہ ایک حد تک تسلیم شدہ ہے کہ ان کا زمانۂ پیدائش و وفات ۱۳۸۸ء اور ۱۵۱۸ء کے درمیان تھا۔

ان کی پیدائش کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ یہ ایک برہمن کی بیوہ لڑکی سے پیدا ہوئے تھے جس نے انھیں شرم کی وجہ سے تالاب کے کنارے پھینک دیا تھا۔ اتفاق سے نیرو جولاہا اسی راستہ سے گزرا اور اس بچہ کو اٹھا کر اپنے گھر لایا اور پرورش کی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ دراصل جولاہے نیرو کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ انکے پیدائشی مسلمان ہونے کی تصدیق ان کی بعض بھجنوں اور دوہوں سے بھی ہوتی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

प्रेम न वाड़ी ऊपजै प्रेम न हाट बिकाय ।।
राजा प्रजा जेहि रुचै सीस देइ ले जाय ।।

پریم نہ باڑی اوپجے پریم نہ ہاٹ بکائے
راجہ پرجا جہیں رچے سیس دئے لے جائے

محبت نہ باغ میں پیدا ہوتی ہے اور نہ بازار میں بکتی ہے۔ یہ تو سر کا سودا ہے امیر غریب جس کی طبیعت چاہے سر دیکر اسے لے جائے۔

प्रेम छिपाया ना छिपैजाकट प्रगट होय।
जो पै मुख बोले नहीं नैन देत हैं रोय ।।

پریم چھپایا نا چھپے جا گھٹ پرگٹ ہوئے
جو پے مکھ بولے نہیں نین دیت ہیں روئے

محبت چھپانے سے ہرگز نہیں چھپتی اگر کوئی شخص زبان سے محبت کا اظہار نہیں کرتا تو اس کی آنکھیں رو دیتی ہیں۔

प्रीतम को पतियाँ लिखूं जो कहुं होय विदेश ।।
तन में मन में नैन में ताको कहा संदेश ।।

پریتم کو پتیاں لکھوں جو کہوں ہوئیں بدیس
تن میں من میں نین میں تاکو کہاں سندیس

محبوب کو خط تو اس حالت میں لکھا جاتا ہے جب وہ کہیں دور ہو مگر جو ہر وقت دل و جان اور آنکھوں میں بسا، اس کو پیام کیسا اور کیسے دیا جائے۔

आओ प्यारे मोहना पलक मूंदि तोहि लेउं।
ना मैं देखूं और कों ना तोहे देखन देउं॥

آؤ پریتم موہنا پلک موند توہے لیوں
نامیں دیکھوں اور کو نا توہے دیکھن دیوں

- اے محبوب میری آنکھوں میں آجا اور میں آنکھیں بند کرلوں تاکہ نہ تجھے غیر کو دیکھنے دوں اور نہ میں کسی کو دیکھوں

लाली मेरे लाल की जित देखूं तित लाल॥
लाली देखन मैं चली मैं भी हुइ गई लाल॥

لالی مورے لال کی جت دیکھوں تت لال
لالی دیکھن میں چلی میں بھی ہوئے گئی لال

میرے محبوب کا رنگ جس طرف دیکھتا ہوں، اسی طرف دکھائی دیتا ہے۔ اور جب اس کا رنگ دیکھنے کیلئے جاتا ہوں تو خود بھی اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہوں۔

सांझ पड़े दिन बीतवे, चकई दीन्हा रोय।
चलो चकवा वा देश को, जहां रैन ना होय॥

سانجھ پڑے دن بیتوے چکوی دینہاں روئے
چل چکوا دا دیس کو جہاں رین نا ہوئے

شام ہوئی دن گزر گیا۔ یہ حال دیکھ کر چکوی نے چکوے سے رو کر کہا اے چکوے وہاں چل جہاں رات نہ ہوتی ہو۔

राता राता सब कहे अन राता कहे न कोय।
राता सोई जानिये जा तन रक्त न होय॥

راتا راتا سب کہے، ان راتا کہے نہ کوئے
راتا سوئی جانئے، جا تن رکت نہ ہوئے

راتا۔ مست چور۔ اپنے کو مست سبھی بتلاتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں مست و بیخود نہیں ہوں۔ مگر مست وہی ہے

بس کے جسم میں خون نہ ہو۔

जाघट प्रेम न संचरै, सो घट जान मसान।
जैसे खाल लोहार की सांस लेतबिन प्रान॥

جا گھٹ پریم نہ سنچرے سو گھٹ جان سان
جیسے کھال لوہار کی سانس لیت بن پران

جس کے دل میں درد محبت نہیں ہے وہ دراصل مردہ کی طرح ہے۔ جیسے لوہار کی دھونکنی جو بے روح ہے اور سانس لیتی ہے۔

दुर्बल को न सताइये, वाकी मोटी हाय
मुई खाल की सांस सों सारभस्म हो जाय

دربل کو نہ ستائیے جاکی موٹی ہائے
موئی کھال، سانس سوں سار بھسم ہوئے جائے

کمزور کو نہ ستاؤ کیونکہ اس کا آہ کر دینا ہی غضب ڈھا دے گا۔ کیا نہیں جانتے کہ لوہار کی دھونکنی کی مردہ کھال لوہے کو جلا دیتی ہے۔

जो तो को काट बवै ताहि बोउ तू फूल।
ताको फूल के फूल हैं, वाको हैं तिरसूल

جو تو کو کانٹا بووے تاہی بو ڈ تو پھول
تاکو پھول کے پھول ہیں واکو ہیں ترسول

تیرے راستے میں جو کانٹا بکھیرے اس کی راہ میں تو پھول بکھیر۔ تیرے لئے دراصل وہ پھول ہیں مگر اس کے لئے ترسول ہیں۔

دادو دیال | کبیر کے شاگردوں یا معتقدوں میں ایک شاعر دادو دیال بھی تھے جو ۱۵۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بعض انہیں برہمن بعض موچی اور بعض دھنیا کہتے ہیں۔ ان کے کچھ بد ایسے ضرور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روئی دھنتے کا کام کرتے تھے۔

کبیر کی طرح دادو کے بھجنوں کو بھی لوگ اکثر گایا کرتے تھے۔ اور دیہاتیوں میں تو انکے بھجنوں کا کافی رواج ہے کبیر پنتھ کی طرح ایک دادو پنتھ بھی ہے۔ دادو کی شاعری کا رنگ وہی جو کبیر کا ہے اور اگر گیتا نجلی کو دیکھا جائے تو دادو کے کلام کا دوسرا اڈیشن نظر آتا ہے۔ دادو کا کلام جذبات سے لبریز ہے اور بلحاظ شعرا میں انھیں خاص درجہ

حاصل ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

जतन जतन करि पंथ निहारहुं 　　　 جتن جتن کر پنتھ نہارہوں

पिय भावहि त्यों आप संवारहुं 　　　 پی بھاوہی تیو آپ سنوارہوں

अब सुख दीजै जाउं बलिहारी 　　　 اب سکھ دیجے جاؤں بلہاری

कह दादू सुन विपति हमारी ॥ 　　　 کہہ دادو سن بپت ہماری

میں طرح طرح سے تیرا راستہ دیکھا کرتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ جو سنگار تجھے پسند آئے وہی کروں اس لئے اے میرے محبوب اب تو آجا اور میرے بیقرار دل کو سکون پہونچا۔

साज सिंगार किया मनमाहीं 　　　 अजहूं पी पसीजे नाहीं

पिया मिलन को अहनिस जागी 　　　 अजहूं मेरी पलक न लागी

ساج سنگار کیا من ناہیں 　　　 اجہوں پی پسیجے ناہیں

پیا ملن کو اہنس جاگی 　　　 اجہوں میری پلک نہ لاگی

اس سے ملنے کے لئے بہت سے سنگار کئے مگر اس کا دل آج تک نہ پسیجا۔ ان سے ملنے کے لئے راتوں جاگتی رہی کہ نہیں معلوم وہ کب آجائیں مگر اب تک وہ نہیں آئے۔ آہ! آجتک ان کے انتظار میں میری پلک سے پلک نہیں لگی۔

अंतरजामी छिपि रहे हम क्यों जीवैं दूर ॥
तुम बिन व्याकुल केसवा नैन रहे जलपूर।
आप अपर छन है रहे कैसी रैन बिहाय
दादू दर्शन कारहीं तलफ तलफ जियजाय

انتر جامی چھپ رہے ہم کیوں جیوہیں دور
تم بن بیاکل کیسوا نین رہے جل پور
آپ اپر چھن ہوئے رہے کیسے رین بہائے
دادو درشن کار نہیں تلپھ تلپھ جی جائے

اے میرے خانۂ دل کے آباد کرنے والے جب تم چھپ رہے تو میں تم سے دور رہکر کیسے زندہ رہوں تم نہیں ہو تو طبیعت بےچین ہے اور آنکھیں ہر دم آنسوؤں سے لبریز رہتی ہیں۔ تمھارے دور ہونے پر یہ رات کیسے گزرے۔ دادو کہتے ہیں کہ دیدار کے لئے تڑپ تڑپ جان جا رہی ہے۔

अजहूं न निकसे प्रान कठोर ।।
दरशन बिना बहुत दिन बीते, सुन्दर पीतम मोर ।।
जार पहर चारिहु जुग बीते, रैन गंवाई भोर ।
अवधि गये अजहूं नहिं आये, कतहुं रहे चित चोर ।।

اجھوں نہ نکسے پران کٹھور
درشن بنا بہت دن بیتے سندر پیتم مور
چار پہر چارہو جگ بیتے رین گنوائی بھور
اودھ گئے اجھوں نہیں آئے کہتوں رہے چیت چور

ہجر میں ابتک جان نہیں نکلی۔ ان کے دیدار بغیر بہت دن گزر گئے۔ نہ جانے کتنے دن اسی طرح گزر گئے کتنی راتیں اسی طرح اور تڑپتے ہوئے گزر گئیں۔ مگر وہ ابتک نہیں آئے۔ آہ! معلوم نہیں میرے "وہ" کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

بول پوجا میرے ناہیں   دھیان کچھو نہیں دھرنا
جوگ جگت کچھو ناہیں کبیرے   ناہیں سادھن جانوں

میں پوجا پاٹ کچھ نہیں جانتا بلکہ میں تو تمہارا نام لینا ہی نہیں جانتا۔ تم سے ملنے کی کوئی ترکیب مجھے معلوم نہیں، (لیکن پھر بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں)

دھرم داس | قوم کے بنئے تھے اور باندھوگڑھ میں مہاجنی کرتے تھے یہ کبیر سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے شاگرد بھی ہو گئے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

मोरा पिया बसे कौने देश हो ?
अपने पिया को ढूंढन हम निकसी कोई न कहत सनेस हो ।।
पिया कारण हम भई हैं बावरी धर्यो जोगिन का भेस हो ।।

مورا پیا بسے کونے دیس ہو
اپنے پیا کو ڈھونڈھن نکسیں کوئی نہ کہت سندیس ہو
پی کارن ہم بھئیں ہیں باوری دھریں جوگن کا بھیس ہو

میرا محبوب کس دیس میں بس رہا۔ میں اس کی تلاش میں نکلی ہوں مگر کوئی میرا پیام ان تک نہیں پہونچاتا۔ انکی تلاش میں دیوانی ہو گئی ہوں اور جوگن کا بھیس اختیار کر لیا ہے۔

گرونانک دیو | یہ پنجاب میں کلیان چند کھتری کے گھر ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ کبیر سے یہ بھی بہت متاثر

ہوئے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

हिरदय जाके हरि बसैं, से जन कहिये सूर ।
कहीं न जाई नानका , पूरि रहयो भर पूर ।।

ہردے جاکے ہری بسیں۔ سے جن کہئے سور
کہیں نہ جائے نانکا پوری رہیو بھرپور

جس کے خانۂ دل میں آباد ہوجائے، اسی کو بہادر کہنا چاہئے۔ اے نانک وہ کہیں نہیں جاسکتا جو اچھی طرح اس رنگ میں رنگ چکا ہے۔

سندر داس یہ دادودیال کے چیلے تھے سنسکرت اور بھاشا کے اچھے جاننے والے تھے۔ یہ قوم کے بنئے تھے ان کے باپ کا نام پرمانند تھا۔ ان کا زمانۂ پیدائش ۱۵۹۶ء ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

वैद्य हमारे राम जी औषधि हूं हरि नाम ।
सुन्दर यहे उपाय अब सुमिरन आठों याम ।।

بید ہمارے رام جی اوشدھ ہوں ہر نام
سندر یہے اپائے اب سمرن آٹھو یام

ہمارا چارہ گر سوائے رام کے کوئی نہیں اور ہمارا علاج صرف اس کا نام ہے اے سندر اس درد کو مٹانے کی ترکیب یہی ہے کہ ہردم اس کا نام زبان پر رہے۔

چرن داس یہ قوم کے بنئے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۷۰۳ء میں راجپوتانہ کے موضع دیہرا میں ہوئی تھی۔ ان کے باپ کا نام مرلیدھر تھا اور اُستاد کا سکھدیو۔ ان کی تصانیف میں گیا سورودیہ اور چرن داس کی بانی دو کتابیں ملتی ہیں، رنگ کلام یہ ہے:-

हिरदयामाहीं प्रेम जो नैनो झलके आय ।
सोई छमा हरि रस पगा वा पग परसो धाय ।।

ہردے ماہیں پریم جو نینوں جھلکے آئے
سوہی چھما ہری رس پگا وا پگ پرسوں دھائے

دل میں محبت ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ ایسا انسان کوئی نظر آئے تو میں اس کے قدموں پر گر جانے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہوں۔

تلسی داس جی اور اُنکی وِنے پتر کا

ضرورت ہے کہ ہم اپنے اکابر کے سوانح حیات اور ان کی تصانیف کا مطالعہ اس ماحول کو سامنے رکھ کر کریں، جس میں وہ پیدا ہوئے اور بڑھے، تاکہ ہم کو معلوم ہو سکے کہ کن حالات میں انھوں نے نشو و نما پائی اور کس طرح انھوں نے ادبی خدمات انجام دی ہیں۔

یہی وہ طریقہ ہے جس پر مغربی مستشرقین عمل پیرا ہیں اور خصوصیت سے جب ادبی و تاریخی مباحث پر گفتگو کی جاتی ہے تو وہ اسی اُصول پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔

تلسی داس جی جو شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنے زمانہ کے تمام شعراء سے ممتاز نظر آتے ہیں اور جن کا درجہ بلحاظ علم و فضل اپنے معاصرین سے بہت بلند ہے وہ ہندی ادبیات میں مسلم طور پر "شاعر اعظم" تسلیم کئے جاتے ہیں، اور بعض مستشرقین تو اس حد تک کہہ گئے ہیں کہ وہ ہر وقت اور ہر موسم کے لئے یکساں شاعر ہیں "تلسی داس جی کا زمانہ ۱۶ ویں صدی عیسوی تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ دیگر اکابر سلف کی طرح اُن کی ابتدائی زندگی کے حالات بھی تاریکی میں ہیں۔

اُن کا سال ولادت (حسب قول شری بینی مادھو داس) سنہ ۱۴۹۷ عیسوی ہے جو ہندوستانی حساب سے ۱۵۵۴ سمبت پڑتا ہے، کیونکہ انگریزی سال ہمیشہ ۵۷ سال کم ہوا کرتا ہے لیکن اگر یہ سنہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس حساب سے ان کی عمر ۱۲۶ سال اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اکثر محققین اس سے متفق نہیں ہیں اور اُن کے خیال میں سنہ ۱۵۳۲ء مطابق سنہ ۱۵۸۹ سمبت زیادہ صحیح ہے خود تلسی داس جی نے اپنی تصنیف رام چرت مانس میں اُس کا سال تصنیف سنہ ۱۶۳۱ سمبت دیا ہے جو سنہ عیسوی کے لحاظ سے سنہ ۱۵۷۴ء ہوتا ہے اور اُن کا سنہ وفات سنہ ۱۶۸۰ سمبت ہر شخص تسلیم کرتا ہے جو انگریزی حساب سے سنہ ۱۶۲۳ء پڑتا ہے۔ اس لئے ان کی ولادت کا دوسرا اندازہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس گفتگو کا مقصد صرف یہ تھا کہ صحیح تاریخ کی روشنی میں ہم اُس عہد پر تاریخی نگاہ ڈال سکیں جب شاعر اعظم نے دنیا میں قدم رکھا اور اس لحاظ سے ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ جس دور میں شاعر نے اپنی تصانیف پیش کیں وہ یقیناً اکبر اعظم کا زریں عہد تھا اور اس حقیقت سے تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ دور مغلیہ میں اکبری دور ہندوؤں کے دور حکومت سے کسی طرح برا نہ تھا۔

قبل اس کے کہ تلسی داس جی کی شاعری کا آغاز ہو چند مذہبی شعرا بہت کچھ کام کر چکے تھے۔ کبیر جی جو گرو را مانند جی کے پیرو تھے فرقہ وارانہ تعصبات اور رواج پرستی کے خلاف نرگن بھگتی کی تبلیغ کر چکے تھے۔ علاوہ ان کے ولبھ چاریا جی، گرو نانک جی اور دادو دیال جی اپنے اپنے دور میں صحیح مذہبی روح کو پیش کر کے مذہبی تنگ نظری کے خلاف لکھ چکے تھے بہاریں دیابت جی کے دوہے اس سے پہلے زبان زد ہو چکے تھے اور بنگال میں سری کری تن تحریک کا زبردست طوفان اُٹھ چکا تھا، جسکے بانی شری چیتنیا مہا پربھو تھے۔ یہ ایسی زبردست تحریک تھی جس سے اثرات کی کوئی حد نہ تھی اور نہ اس بڑھتی ہوئی رو کو آسانی سے روکا جا سکتا تھا۔ اس تحریک نے بہت سے علما کو بھی متاثر کیا وہ لوگ برہمی تعلیمات کے تحت مخالف تھے لیکن وہ اس تحریک کے زیر اثر ہو کر بہت سخت بھگتی اور کرشنئی بن گئے دکن میں بھی اسی قسم کے اثرات کارفرما تھے۔ الغرض تلسی داس جی سے قبل اس قوم کی مذہبی تحریکیں رونما ہو چکی تھیں اور ان کے لٹریچر سے تلسی داس جی کا متاثر ہونا لازم تھا۔

اُس وقت ہندو قوم مختلف فرقوں میں منقسم تھی اور یہ تقسیم حد درجہ سخت تھی اور مختلف الخیال فرقوں کی جنگ رقیبانہ میں تخریبی تنقید کا جذبہ بہت نمایاں ہوتا تھا اور کوئی شخص بھی خاموشی اور سنجیدگی سے اپنے ذاتی معتقدات پر عمل پیرا نہ ہو سکتا تھا۔ ایک فرقہ کا خدا دوسرے فرقوں کے خدا سے بہت برتر سمجھا جاتا تھا اور بسا اوقات ایک فرقہ کی انتہائی محبت میں دوسرے فرقہ والوں کو بُرا کہا جاتا تھا۔ اس وقت اور اس نازک دور میں تلسی داس جی نے دنیا میں قدم رکھا اور اپنے ذاتی نظریۂ بھگتی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اُس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ خدا کی محبت جس درجہ اس شخص میں سرایت کر گئی تھی وہ اُس کے دیگر معاصرین میں عنقا تھی۔ چونکہ تلسی داس جی کی شاعری بھگوت اور گیتا کے اشلوک اور اپنشید کی تعلیمات کا مجموعہ ہے اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے مجبور ہیں کہ تلسی داس جی مذہبی علوم اور سنسکرت کے عالم متبحر تھے اور یہ تعجبناک امر ہے کہ انھوں نے کس خوش اسلوبی سے تلسی کی طرح اس مذہبی تعلیم کو عام فہم اور سلیس بھاکا میں عوام کی تشفی کے لئے پیش کیا۔

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ میں اصل سنسکرت کی تحریروں کو پیش کر کے تلسی داس جی کے تراجم کو پیش کر دوں لیکن جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں وہ میرے دعویٰ کی تصدیق کریں گے کہ تلسی داس نہ صرف یہ کہ سنسکرت کے فاضل تھے۔ بلکہ باوجود اس علم و فضل کے وہ سراپا انکسار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ وشنوئی تھے لیکن رام چرتر مانس میں انھوں نے اپنے وشنوئی ہونے کا تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ میرے خیال میں کسی دوسری تصنیف میں بھی انھوں نے اپنے ان مخصوص عقاید کی تبلیغ نہیں کی۔ وہ ہر کرم کے حضور میں جھک جاتے تھے اور اچھوت اور دلدر جاتیوں کو گلے لگانے میں مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ اُن کی تصانیف کی اہمیت صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے ہندی زبان کو سنوارا بلکہ یہ بھی کہ ہندو بھگتوں کی حالت کو سدھارنے میں بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اور یہ تعلیمات گروہانہ عقاید کی تبلیغ سے بہت بلند تھیں اور عام انسانی محبت کی حد تک پہونچ چکی تھیں۔

ایک بہت آزاد تبصرہ ہم کو بتلاتا ہے کہ تلسی داس کی تصانیف کی تعداد ۲۰ سے زیادہ ہے۔ اُن کی بعض تصانیف ضخیم ہیں اور بعض ۳ یا ۴ سو بیتوں سے زیادہ نہیں۔ مثلاً رام چیتر مانس، ونے پتر کا، گیتاولی، کوی تاولی اور کرشنا ناولی اُن کی مشہور اور اہم تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں لیکن ہم کو یہاں محض ونے پتر کا سے تعلق ہے اور اسی کتاب پر ہم چند اوراق میں تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ونے پترکا ہی وہ تصنیف ہے جس میں شاعر اعظم کے صحیح خد و خال زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ کتاب مشتمل ہے نغمات پر جن کا تعلق یکسر تصوف اور مذہبی عقیدت سے ہے اور اسی لئے ہندی شاعری میں اس کتاب کا درجہ بہت بلند اور ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ کوئی باضابطہ تخیل دماغ میں نہ تھا اس لئے شاعر نے اپنے دل کو کاغذ پر رکھدیا ہے۔ قواعد مقررہ سے انحراف بھی کیا ہے اور جس طرح چاہا ہے اپنے خیالات کو دنیا کے سامنے پیش کردیا ہے اور یہی بے راہ روی شاعر کا بالآخر ہنر بن گئی ہے۔ باقاعدہ تصانیف (مثلاً پربندھا کو یا مس) بھی نہایت خوب ہیں جن میں شاعرانہ بلاغت اور معجزانہ خطابت کے نمونے ہر جگہ نمایاں ہیں دلکشی اُنکا حصۂ خاص ہے۔ لیکن ان نغمات کا درجہ ان تمام باقاعدہ تصانیف سے بہت بلند ہے کیونکہ وہ مشل کرتی ہی گویا سکے قلب و جگر کو برما یا ستے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعری وہ ہے جس کا تعلق صرف دل سے ہے اور فنی قواعد شعری سے اُن کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھ کو اس امر کے اظہار میں بھی تامل نہیں ہے کہ سور داس کی سب سے بہتر شاعری بھی انھیں منتشر نغمات میں مستتر ہے

ہم ونے پتر کا پر مختلف حیثیتوں سے بحث کرسکتے ہیں اور سب سے نمایاں حیثیت اس کی جذبات نگاری ہے اس شاعری میں تصوف بھی ہے اور فلسفہ بھی، لیکن وہی فلسفہ جو ریب و تشکک کے حدود سے ماورا چپکے چپکے اپنا کام کرتا ہے اور شاعرانہ حسن کاریوں کو ایک خوبصورت عنوان سے پیش کرتا ہے۔

ان کی جذباتی شاعری کے متعلق مسٹر ابند ھوس کی رائے ہے کہ:۔

"جذبات کے لحاظ سے کوئی کتاب ونے پتر کا کو نہیں پہونچتی۔ بلکہ ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیڈوں کے بعد مناجات کا اعلیٰ تخیل رکھنے والی نظم ونے پتر کا کے سوا کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔"

ونے پتر کا میں شاعر کا منکسرانہ پہلو بہت عجیب ہے، ہر چند شاعر اپنی ذات کو ایسی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو دنیاوی مصائب میں گھرا ہوا ہے اور جس سے چھٹکارا نصیب نہیں، لیکن جس وقت حل کا سوال پیدا ہوتا ہے تو یہ انکسار سراپا اضطراب ہوجاتا ہے اور خود اعتمادی کا بہترین درس دیتا ہے۔ وہ خدا کے وجود کے قائل ہیں اور اسی کے ساتھ انتہائی صبر کے ساتھ تمام مصائب کو برداشت کرنے کا سبق دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ:۔

"خدا کی بے نیازیاں اور بندہ کی عصیانکاریاں، دونوں او خدا! او مظلوموں کے والی! اس مظلوم تلسی کو غم کی آگ میں تڑپا رہی ہیں۔"

لیکن ... [illegible]

" اگر تو نہ ہوتا تو اسے مالک، دیا ہی مجھ سے محبت نہ کرتا"۔

اور اس سے بھی زیادہ یہ کہنا۔

"اگر بہ فرض محال مجھ سے محبت بھی کی جائے اور میں راستی پر کار فرما ہوں تو یہ معتقدات کا مشاہدہ گا کہ

میں سب سے اچھا ہوں خواہ لوگ مجھ سے کتنی ہی نفرت کریں"۔

ونے پترکا میں انھوں نے رام نام ہی کی تفصیل بیان کی ہے، ان کا خیال ہے کہ کائنات کا مقصد وجود رام نام میں ہے

نظم کی زبان اور اسکی ادبی حیثیت

اس کتاب میں تلسی داس جی نے برج بھاشا کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور جا بجا سنسکرت کا امتزاج بھی موجود ہے یہ نظمیں مختلف اوتاروں کے نام معنون کی گئی ہیں، گویا ان کی محامد و توصیف ہیں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں تلسی داس پر اس حد تک سنسکرت کا غلبہ تھا کہ وہ کتاب میں بھی سنسکرت کے بغیر نہیں رہ سکے اور یہی خصوصیت رام چرتر مانس میں بھی نمایاں ہے۔ النکار بھی جا بجا پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ خواہ نہیں استعمال کئے گئے ہیں بعض منیوں میں رعایت لفظی کی صفت بھی بحسن و کمال موجود ہے اور محاکات کا حق بھی ادا کیا گیا ہے جہاں وقت رواں پر بیان کیا گیا ہے وہاں شاعرانہ کام نہیں رہا ہے، اور خصوصیت سے مہادیو جی کی شکل و شباہت بیان کرنے میں تو شاعر نے حقیقتاً کمال ہی کر دیا ہے، اور ہمارا خیال ہے کہ ونے پترکا انداز بیان کے لحاظ سے ویسی ہی مکمل چیز ہے جس طرح تخیل کے لحاظ سے — ہمارا خیال ہے کہ ہندی ادبیات کا ہر سنجیدہ طالب علم ونے پترکا کو ہندی ادبیات کی جان تصور کرے گا لیکن خود شاعر کی حقیقت آگاہ نگاہ میں جیسا کہ اس نے ظاہر کیا ہے (اور ان لوگوں کی نگاہ میں جو تلسی داس جی کو بحیثیت ایک بزرگ کے ان کی عظمت کرتے ہیں) یہی بہت ہے کہ خود مالک نے اس نظم کو شرف قبول عطا کر کے تلسی داس کو حیات جاوید بخش دی۔

اودیش دیال سریواستو ایم۔ اے

ملاحظات

ہندی شاعری کے متعلق جتنا اور جیسا کچھ مواد فراہم ہو سکا وہ ناظرینِ نگار کے سامنے حاضر ہے، میں نے اس کام کو صرف اس امید پر اپنے ہاتھ میں لیا تھا کہ ہندو اہل قلم میری مدد کریں گے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ شاید وہ اُردو رسم الخط میں ہندی ادب کا ذکر بھی کرنا گوارا نہیں کرتے، بہرحال کوشش کی گئی ہے کہ ہندی شاعری کے متعلق اُردوداں حضرات کے سامنے اتنا ذخیرۂ معلومات فراہم کر دیا جائے کہ وہ اس سے بالکل بیگانہ نہ رہیں اور شاید میں اس میں ناکامیاب نہیں رہا۔

پہلا مضمون ہندی شاعری کی تاریخ سے متعلق ہے اور تمام ادوار پر حاوی ہے۔ شعراء کے کلام کا نمونہ اس کے ساتھ دینے کا موقعہ نہ تھا اس لئے اس کمی کو بعد کے مضامین سے پورا کیا گیا ہے۔ مجھے اس رسالہ کی ترتیب اور فراہمی مواد میں سب سے زیادہ مدد جناب رسول احمد صاحب سے ملی جو اصلاً بریلی کے رہنے والے اور ہندی میں ابودھ تخلص کرتے ہیں۔ یہ کئی سال سے یہیں لکھنؤ میں مقیم ہیں اور ہندی رسائل میں تحریر و ادارہ کے خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔

یہ بات بہت مشہور ہے کہ ہندی شاعری میں تشبیہات بہت اچھوتی ہوتی ہیں اور انداز بیان حد درجہ دلچسپ۔ لیکن اب جو تحقیق و جستجو کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ چونکہ مقامی رنگ کی تشبیہات کا رواج اُردو میں کم ہے اس لئے ہندی کی تشبیہات اُردوداں حضرات کو انوکھی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ خود ہندی شاعری میں ان کا یہ اچھوتا پن کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ تمام شعراء نے وہی چند مخصوص تشبیہات استعمال کی ہیں اور کوئی نئی بات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس حد تک خیالات کی بلندی یا مطالب کے عمق کا تعلق ہے، ہندی شاعری اُردو شاعری سے بہت پیچھے ہے اور اسلوب بیان کی وسعتیں بھی اس میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ لیکن اُس کی یہ حیثیت کہ اس میں اظہار جذبات عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں اور اسی لئے اس کے اثرات نہایت گہرے اور قوی ہوا کرتے ہیں۔

میں کو نومبر میں حیدرآباد جانے والا تھا آج بھی کہ دسمبر کا ۲۳ واں دن ختم ہو رہا ہے یہیں لکھنؤ میں ہوں، اور اب یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہاں جاؤں گا بھی یا نہیں۔ بہرحال اب اگر جانا ہوا بھی تو نہایت اطمینان سے ہوگا۔ کیونکہ جنوری کا پرچہ ختم ہو چکا ہے اور مسئلہ خلافت و امامت کے متعلق اپنا موعودہ مضمون بھی پورا کر کے کاتب کو دے چکا ہوں۔ جناب مندوزنی صاحب حیدرآبادی کا مراسلہ مسئلہ مہدویت کے متعلق البتہ باقی رہ گیا ہے سو وہ انشاء [illegible] نہیں تھوڑی دیر کا کام ہے۔ اور اس جھگڑے کو بھی فروری میں ختم کر دینا ہے۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ر تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۲۹)	فہرست مضامین مارچ ۱۹۳۶ء	شمارہ (۳)

ملاحظات -- ۲
س ش س ج س ---------- وصی احمد بلگرامی بی۔ اے ---------- ۹
مشرق بعید کے زرد خطرہ کی داستان ---------- عبدالرحیم شبلی ---------- ۲۱
اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام -- ۴۸
علم نجوم اور انسانی مستقبل -- ۶۰
چوری ---------- الیاس اسلام پوری ---------- ۶۱
مکتوبات نیاز -- ۷۴
اعتبارات -- ۷۷
باب الاستفسار -- ۷۸

نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

جلد (۲۹)	مارچ سنہ ۳۶ء	شمار (۳)

ملاحظات

خلافت و امامت

اس مسئلہ پر پچھلے مہینے کے نگار میں جو محاکمہ میرا شایع ہوا ہے اسے خلاف توقع سنی و شیعہ دونوں جماعتوں کے آزاد خیال افراد نے بہت پسند کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ متقشف حضرات ہنوز مطمئن نہ ہوں گے اور نہ شاید کبھی ہو سکتے ہیں

میں نے جن نتایج کو اپنے مضمون میں پیش کیا ہے ان میں سے بعض جو حضرات شیعہ کیلئے قابل قبول ہیں اہل تسنن کے نزدیک غلط ہیں اور جو سنیوں کے موافق ہیں وہ شیعوں کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہو سکتے اسلئے ضرورت ہے کہ اسی سلسلہ میں ان تمام مسایل کو بھی لے لیا جائے جو میرے مضمون کو پڑھنے کے بعد معرض بحث میں آ سکتے ہیں مثلاً

ا— عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے، گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان یا

اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے تو کیوں ؟

۲۔ انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلایل کیا ہو سکتے ہیں ؟

۳۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے، اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے ؟

۴۔ قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیت میں اس سلسلہ کا قایم رہنا کیوں ضروری ہے ؟

۵۔ وصایت جناب امیر ثابت کرنے کے لئے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں ؟

۶۔ امامت کا بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے ؟

۷۔ جو سلسلۂ امامت دوسرے شیعی فرقوں کے نزدیک صحیح ہے، اس کو غلط قرار دینے کے لئے اثنا عشری جماعت کیا دلایل اپنے پاس رکھتی ہے

۸۔ امام مستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہہ

۹۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں۔ اگر پڑا تو کیا ؟

۱۰۔ مسئلۂ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے ؟

۱۱۔ اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لئے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں۔

چنانچہ میں ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ نہایت سنجیدگی سے ان تمام مسایل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور جہاں تک ممکن ہو ان روایات سے استدلال نہ کریں جن کا تعلق صرف خوش عقیدگی سے ہے اور درایۃً قابل قبول نہیں ہیں

میں اس بحث کے لئے زیادہ سے زیادہ اپریل سے دسمبر تک نو مہینے کی مہلت دے سکتا ہوں، اسکے بعد مجھے حق حاصل ہوگا کہ تمام شایع شدہ مضامین کے مباحث و دلایل کو سامنے رکھ کر خود اپنی رائے پیش کروں اور بالکل ممکن ہے کہ آیندہ جنوری کا پرچہ صرف اسی موضوع کے لئے وقف ہو (اگر ناظرین نگار نے اس کو پسند کیا) میں اس دوران میں ایک استفسار بھی ہر دو مذاہب کے علماء سے کروں گا اور جو جوابات مجھے موصول ہونگے ان سے میں اپنے محاکمہ کے وقت کام لوں گا۔

حبشہ و اطالیہ

اس وقت تک جتنی خبریں محاذ جنگ سے آرہی ہیں وہ خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہوں، لیکن خلاف توقع ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔۔۔ حبشہ و اطالیہ کا مقابلہ ہی کیا۔ ہاتھی اور چیونٹی کی لڑائی کیسی، لیکن اس جنگ

مسی داس جی اور اٹلی، دوسنے ترکا

کے بیک گروںڈ میں جو نقوش یورپین سیاست کے ظاہر ہو رہے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔

جمعیۃ الاقوام کے ممبر اطالیہ و حبشہ دونوں ہیں، لیکن اسے رنگ و نسل کا معجزہ کہئے یا قوی کا ضعیف کو کھا جانے کا قدرتی قانون کہ اطالیہ برابر غاصبانہ سرزمین حبش میں گھستا چلا جا رہا ہے اور جمعیۃ الامم اسوقت تک یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ اطالیہ کی راہ میں کونسی اقتصادی دشواریاں حایل کی جائیں گی اور کب۔ جلسے پر جلسے طلب ہو رہے ہیں، کمیٹیوں پر کمیٹیاں بن رہی ہیں، لیکن نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آخر وہ کرنا کیا چاہتے ہیں اور اگر کوئی ارادہ ہے تو وہ کونسی مبارک تاریخ ہوگی جب اس کو پورا کیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ معاملہ بہت اہم ہے، جب تک دنیا کی تمام اقوام سے استصواب نہ کر لیا جائے کیونکر کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حکومتوں کے نمایندوں سے تبادلۂ خیال کے لئے کافی وقت چاہئے۔ چونکہ یہ معاملہ ایک سیاہ فام، غریب و ناچار حبشہ کا ہے اس لئے تار، ٹیلی فون، ریڈیو، ہوائی جہاز اور تمام وہ ذرائع جو فوری مخابرت و مراسلت کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں بیکار ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن اگر زیادتی حبش یا کسی اور غیر یورپین قوم کی ہوتی تو کبھی کا یہ فیصلہ ہو چکا ہوتا کہ:۔

"فسلوہ والی الجحیم صلوہ" پکڑ لو اس حرامزادہ کو اور ڈالدو کھینچکر جہنم میں ۔۔۔ اس سے قبل ہم اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ جمعیۃ الامم کی ہمدردیاں حبشہ کے ساتھ کوئی معنی نہیں رکھتیں اور اندرونی طور پر حبشہ کا حصہ بانٹا پہلے ہی ہو چکا ہے ۔ سر سموئیل ہور کی تقریر سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ فرانس و اطالیہ کے درمیان پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا، رہ گیا برطانیہ سو ظاہر ہے کہ جب تک فرانس اس کا ہمنوا نہ ہو وہ تنہا کیا کر سکتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں جنگ زرگری اور یہی ہیں وہ شاطرانہ چالیں، جن پر ایک حبشہ کیا خدا جانے کتنی قوموں کی آزادیاں اس سے قبل قربان ہو چکی ہیں ۔۔۔ اطالیہ کا قبضہ، حبشہ کے وسیع علاقہ پر حقایق مسلمہ میں سے ہے اور آپ خود دیکھ لیں گے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد جب حصوں کی تقسیم کا سوال آئے گا تو وہ قومیں بھی محروم نہ رہیں گی جو آج اطالیہ کے اس غاصبانہ اقدام کے خلاف شدید ترین صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ ہیں۔ سچ ہے دنیا میں ضعیف و کمزور ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ خدائے کلیسہ بھی اسے معاف نہیں کر سکتا، بندگان کلیسہ کا کیا ذکر ہے۔

شہید گنج کی مسجد

اس دوران میں سب سے زیادہ اہم واقعہ جس نے پنجاب اور علی الخصوص لاہور کی فضا کو حد سے زیادہ مکدر کر رکھا ہے شہید گنج کی مسجد کا واقعہ ہے جس کی تفصیل اخباروں کے ذریعہ سے سب کو معلوم ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ مسجد ہو یا مندر محض عمارت ہونے کے لحاظ سے ان میں سے کسی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے، لیکن تمدن و معاشرت کے باہمی تعلقات میں صرف مادی چیزوں کی قیمت ہی کا سوال پیدا نہیں ہوتا

بلکہ ان جذبات وکیفیات کا بھی ہوا کرتا ہے جو انفرادی طور سے رونما ہوتے رہتے ہیں چہ جائیکہ وہ جنھوں نے جماعتی حیثیت اختیار کرلی ہو۔ اس لئے ایسے معاملات میں قبضہ وملکیت کا ایک دعویٰ روادارانہ سوال اُٹھاکر کسی قوم یا جماعت کے جذبات کو صدمہ پہونچانا کبھی قرین عقل نہیں ہوسکتا۔ مانا کہ شہید گنج کی مسجد غیر آباد تھی ویران ومسمار تھی، گوردوارہ کے احاطہ میں تھی، سکھوں کے قبضہ میں تھی، لیکن تھی بہرحال وہ ایک ایسی چیز جسے مسجد کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور اس لئے سکھ جماعت بھی بخوبی واقف تھی کہ مذہبی حیثیت سے عام مسلمانوں کے نزدیک وہ واجب الاحترام ہے اور اس کے ڈھادینے سے قدرتاً ان کو صدمہ پہونچایا جائے

اب دیکھنا یہ ہے کہ سکھوں نے باوصف اس علم کے کیوں اس کی مسماری پر اصرار کیا اور اس سے کیا فائدہ انھیں حاصل ہوا۔ مجھے نہیں معلوم اور نہ اس سے بحث کرنے کی ضرورت کہ حکومت کا نقطۂ نظر اس باب میں کیا تھا اور وہ سکھوں کے اس مطالبہ کی تکمیل کی کس حد تک ذمہ دار ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ جس حد تک دو مختلف قوموں کے رابطۂ باہمی کا تعلق ہے، سکھوں کی یہ حرکت قطعاً غیر دانشمندانہ تھی۔ اور ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ کسی ایسے مسئلہ میں جس کا تعلق کسی جماعت کے قومی وقار سے ہو کوئی قدم بغیر سوچے سمجھے ہوئے اُٹھانا خطرہ سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ وقتی طور پر سکھوں نے اس کو محسوس کرکے کوئی مسرت حاصل کی ہو کہ انھوں نے مسلمانوں کو مذہبی شکست دیدی، لیکن اتنے بچے تو شاید وہ بھی نہیں ہیں کہ اس ایک مسجد کے ڈھادینے کو وہ مسلمانوں یا اسلام کی ہزیمت سے تعبیر کریں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوائے ایک جاہلانہ جوش کے اس کو اور کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اگر سکھ جماعت قانون یا حکومت کی امداد حاصل کئے بغیر اس مسجد کو ڈھادینے میں کامیاب ہوجاتی تو خیر ایک معنی کرکے یہ ان کی جرأت وبہادری کا کارنامہ ہوسکتا تھا، لیکن انھوں نے حکومت کی امداد حاصل کرکے اس فخر کو بھی اپنے ہاتھ سے کھودیا اور مسلمانوں کے قومی وقار کو صدمہ پہونچانے کے غیر دانشمندانہ جوش میں انھوں نے سب سے پہلے اپنے قومی وقار کو تباہ وبرباد کردیا۔

مسلمانوں نے اس مسئلہ میں جس جوش کا اظہار کیا وہ بالکل قدرتی امر تھا اور اگر وہ چند دن کے بعد فرو ہوجائے تو یہ بھی خلاف توقع نہ ہوگا، کیونکہ جب کسی محکوم ملک کی دو محکوم قوموں میں باہمدگر آویزش ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے کیونکہ بہرحال امن کا ذمہ دار کوئی اور ہے اور وہ اپنی قوت سے ان سب کو بآسانی خاموش کرسکتا ہے۔ اس لئے میں ایک حد تک مسلمانوں کے موجودہ طرز عمل کا بھی حامی نہیں ہوں اور ایسی شورشوں کو جو آخرکار خود ملکی مصالح کو تباہ کرنے والی ثابت ہوں، میں کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات خواہ کیسے ہی ناخوشگوار ہوگئے ہوں، لیکن ان دونوں

کو اپنی اپنی جگہ سمجھنا چاہیئے کہ انھیں رہنا اسی سرزمین میں ہے، جو سکھ ہے وہ سکھ ہی رہے گا اور جو مسلمان ہے وہ مسلمان ۔۔ اس لئے آپس کی مخالفت سوائے اس کے کہ دونوں کے لئے مضرت رساں ہو کوئی اور نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

اگر سکھ جماعت نے ایک بلند و شریفانہ جذبہ سے کام لیکر مسجد واپس کرنے کا اقدام نہ کیا، تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ کم از کم وہ تو اپنی شرافت و رواداری کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اور قتل و خون کی کوئی ایسی مثال اپنی طرف سے قائم نہ کریں جو کسی ذلیل جذبۂ انتقام کو ظاہر کرنے والی ہو۔

اب معلوم ہوا ہے کہ مسٹر جناح نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور مسلمانوں کی طرف سے قانون کی مخالفت بند کر دی گئی ہے۔ یعنی اب ان کے جتھے مسجد میں اذان دینے اور نماز پڑھنے کے ارادہ سے چلکر اپنے آپ کو گرفتار نہیں کراتے۔ ہر چند اسوقت تک کوئی علامت باہمی مناہمت کی ظاہر نہیں ہوئی، کیونکہ اس باب میں جب تک سکھ جماعت بھی رواداری کے لئے تیار نہ ہو فیصلہ دشوار ہے تاہم اس وقفہ سے اتنا فایدہ ضرور ہوگا کہ جو صورت مقابلہ کی مسلمانوں نے اختیار کر رکھی تھی، ممکن ہے وہ پھر پیدا نہ ہو اور ان کو یہ سمجھنے کا موقعہ مل جائے کہ

کفِ خونے کہ دارم تا چکیدن خاک می گردد
چساں گیرم بہ ایں بے مائگی دامانِ قاتل را

جاپان و چین

سیاسیات کے جہاں اور بہت سے رمز ہیں انھیں میں ایک وقت کی نباضی بھی ہے یعنی یہ دیکھنا کہ لوہا گرم ہو گیا ہے یا نہیں اور جب گرم ہو جائے تو پھر ضرب لگانے میں پس و پیش نہ کرنا۔ دول یوروپ تو خیر اس میں کافی مشاق ہیں، لیکن مشرق میں جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اس کو سمجھتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔

مشرق پر مغربی تسلط کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک داستان ہے صرف کمزوری سے فایدہ اُٹھانے کی جس کا اصطلاحی نام تہذیب و تمدن کی اشاعت ہے۔ ہندوستان پر برطانیہ نے صرف اسی لئے قبضہ کیا کہ یہاں کے حیوانوں کو انسان بنائے، اٹلی حبش پر قابض ہونا چاہتا ہے وہ محض اس لئے کہ وہاں تہذیب کی اشاعت کرے یوروپ کی حکومتوں نے ترکی کو صرف اسی نیت سے پامال کر دینا چاہا کہ وہ ناتراشیدہ تھی، الغرض کوئی فتوحانہ اقدام مغرب کا ایسا نہیں جس میں بنی نوع انسان کی ترقی کا جذبہ کام نہ کرتا ہو، اب یہ اور بات ہے کہ بدقسمتی سے کوئی مفتوح قوم بدستور مفلوک الحال اور پریشان روزگار بنی رہے ۔۔۔ لیکن جاپان اس باب میں غالباً اہل مغرب

سے بھی بازی لے گیا ہے، کیونکہ ایک طرف وہ اپنے ہمسایہ ملک چین کی کمزوری سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور دوسری طرف دول مغرب کی باہمی رقابتوں سے بھی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جب کبھی یہ صورت پیش آئی اس نے اسی وقت کسی نہ کسی بہانہ سے چین کو دبایا اور فایدہ حاصل کر لیا۔ گزشتہ سال اس نے لیگ اقوام کی کمزوری سے پورا فایدہ اُٹھایا اور اب کہ اطالیہ و حبش کی جنگ نے دول یوروپ کے سامنے ایک عالمگیر جنگ کے امکانات پیش کر رکھے ہیں وہ پھر شمالی چین کو اپنے عسکری نظام سے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔۔ جاپان کا مطالبہ یہ ہے کہ چین کے شمالی صوبوں کی حکومت نانکن کے اثر سے بالکل آزاد ہونا چاہئے اور اس خواہش کی محرک تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ وہ اس تحریک اشتراکیت (کمیونزم) سے خایف ہے جس نے اسوقت چین کے نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے، کیونکہ اگر یہی تحریک جاپان میں پھیل گئی تو اس کی موجودہ عسکریت و ملوکیت خاک میں مل جائے گی، دوسرا سبب یہ ہے کہ جاپان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور خام پیداوار حاصل کرنے کے لئے دوسری زمینوں کی ضرورت ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے شمالی چین سے زیادہ موزوں کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں لاکھوں ایکڑ زمین غیر مزروعہ پڑی ہوئی ہے اور معدنیات بھی بہت کافی پائی جاتی ہیں تیسرا سبب یہ کہ وہ سویٹ حکومت اور جاپان کے درمیان ایک زبردست مانع حایل کرنا چاہتا ہے اور وہ یہی علاقہ ہو سکتا ہے۔۔ سب سے پہلے ستمبر ۳۴ء میں جنرل ٹاڈا (ٹین-سٹن کے کمانڈر) نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چین کے پانچ شمالی صوبوں کو حکومت نین کنگ کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے اور حکومت منچوکو کو جاپان کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ اس مطالبہ کو جاپان کی مجلس وزراء نے بھی تسلیم کر لیا اور اسی کے چار ماہ بعد وزیر خارجہ نے اس جدید پالیسی کا اعلان کر دیا۔ یہاں تک تو خیر صرف زبانی باتیں تھیں، لیکن اسی کے ساتھ عملاً جو تدبیر جاپان نے اختیار کی وہ بھی سن لیجئے۔ ستمبر ۳۵ء کے اس زبانی مطالبہ کے بعد ہی اکتوبر میں ایک جاپانی مشن شنگھائی پہونچا اور قایدین افواج سے گفتگو کرنے کے بعد آرمی کانفرنس میں اعلان کر دیا گیا کہ حکومت نین کنگ نے اگر اپنی معاندانہ پالیسی ترک نہ کی تو چین کے شمالی صوبوں سے چینی فوج نکال دی جائے گی اور اس علاقہ کو حکومت نین کنگ سے بالکل آزاد کر دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ چند چینی افسران بھی گرفتار کر لئے گئے اور دیوار چین کے جنوب میں جو غیر معسکر علاقہ ۲۵۰ میل کا جاپانی نگرانی میں ہے اس کے کمشنر نے بھی ایک تلغرافی سرکلر کے ذریعہ سے پانچ صوبوں کے گورنروں کو ہدایت کی کہ وہ خود مختاری کا اعلان کر دیں ۔۔۔

جاپان کا خیال تھا کہ یہ تمام تدابیر کاربرآری کے لئے کافی ہوں گی لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور چین نے متحدہ آواز سے ان تمام مطالبات کو مسترد کر دیا۔ اب جاپان نے دوسری تدبیر اختیار کی اور وہ یہ کہ بیک وقت تمام صوبوں کی خود مختاری چاہنے کے ایک ایک صوبہ کو علحدہ کرنا چاہا چنانچہ سب سے پہلے غیر معسکر علاقہ کے کمشنر نے اعلان آزادی کیا اسکے بعد علاقہ سویان کو آزادی ملی اور اب دوسرے صوبوں کو بھی ملنے والی ہے۔ حکومت نین کنگ جو اسوقت حکومت چین سمجھی جاتی ہے وہ صرف ساحلی-صوبوں پر قابض ہے اور اپنی کمزوری کے ساتھ لیگ اقوام کی بیچارگی سے بھی پوری طرح آگاہ ہے

اس لئے اب اگر کوئی چیز اسکے لئے امید افزا ہی تو صرف سوویٹ حکومت جو علاقۂ منچکوآن میں کسی طرح جاپانی اقتدار کو دیکھنا پسند نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ روس میں عسکری طیاریاں نہایت تیزی کے ساتھ ہو رہی ہیں اور عجب نہیں کہ وہ جاپان سے اپنی گزشتہ شکست کا انتقام لینے کے لئے اس نزاع کو بہانہ قرار دے۔ بہرحال اسوقت مشرق اقصیٰ کی سیاسیات نہایت خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور عجب نہیں کہ پھر دنیا ایکبار اس آگ میں کود پڑنے کے لئے مجبور ہو، جو ۱۹۱۴ء میں مشتعل ہوئی تھی۔ حال ہی میں جرمنی کے پیغمبر قاید ہر ہٹلر نے جن الفاظ میں اپنی کھوئی ہوئی مستعمرات کا مطالبہ کیا ہے اور جن خفیہ فوجی طیاریوں میں وہ مصروف ہے، وہ بجائے خود اتنا زبردست خطرہ ہے کہ یورپ کی سلطنت اس کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتی۔ دوسری طرف مسولینی نے حبشہ کے خلاف فوجکشی کرکے دنیا کو عجیب وغریب پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ در لیگ اقوام کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے والا ہے۔ تخفیف اسلحہ کی جو کانفرنسیں اس وقت تک منعقد ہوئی ہیں وہ بھی جنگ کے خطرہ کو دور نہ کر سکیں اور بحری قوت میں بھی اسوقت تک کوئی ایسا توازن پیدا نہیں ہو سکا کہ آیندہ امن کی توقعات اس پر قایم ہو سکیں۔ حال ہی میں جاپانی سپاہ کا اقدام بغاوت اور بعض بڑے بڑے عسکری قایدین و وزراء کا واقعۂ قتل بھی وہاں کی عام ذہنیت پر نہایت خوفناک روشنی ڈالتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عجب نہیں وہاں فیسسٹ نظام حکومت یا اشتراکیت کسی وقت پیدا ہو جائے کیونکہ جاپان کی روز افزوں آبادی اور اس کی اقتصادی خستہ حالی مجبور رہے کہ وہ لڑ کر فنا ہو جائے یا اپنی زندگی کے لئے اور نئی زمینیں حاصل کرے۔ الغرض سیاسی مطلع نہایت مکدر ہوتا جا رہا ہے اور دنیا کو ہر وقت جنگ کے آتشیں بادلوں کا منتظر رہنا چاہئے، خواہ وہ مشرق اقصیٰ کے افق سے بلند ہوں یا ساحل افریقہ سے۔

کانگرس کا آیندہ اجلاس

امسال کانگرس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہونا قرار پایا ہے اور چونکہ جدید آئین حکومت سے رد و قبول کا فیصلہ اس اجلاس میں ہونے والا ہے اس لئے اسکی اہمیت ظاہر ہے۔ اسوقت کانگرس کے اندر متعدد پارٹیاں نظر آتی ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ زبردست نیشنلسٹ جماعت ہے اور اسی کے مقابل سوشلسٹ، اور انھیں کے فتح و شکست پر کانگرس کا آیندہ لائحۂ عمل مرتب ہونے والا ہے۔ اول الذکر جماعت جدید آئین میں حصہ لینے کی طرفدار ہے اور موخر الذکر اس کو بالکل بے نتیجہ بات ظاہر کی ہے۔ گاندھی جی جس وقت تک کانگرس پر قابض رہے، اس کی پالیسی خواہ غلط ہو یا صحیح انھیں کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے ستیاگرہ و ترک موالات کا پروگرام پیش کیا تو سب نے اسی کو کعبۂ مقصود سمجھ لیا اور جب ملک کی خستگی کو دیکھ کر اس پروگرام کو انھوں نے منسوخ کر دیا تو سب پھر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے۔ اور چونکہ اس دوران میں انھوں نے عملاً کانگرس کے معاملات میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا، اس لئے طوائف الملوکی کی سی حیثیت پیدا ہو گئی اور منزل تک پہونچانے کے لئے اتنے دعویدار پیدا ہو گئے کہ لوگوں کو رہبر و رہزن میں تمیز دشوار ہو گئی۔ اب سنا ہے کہ وہ پھر اس اجلاس میں شریک ہوں گے اور ان کی شرکت کے معنی اب صرف یہ ہیں کہ وہ ہریجن تحریک کو اہم ترین مقصد کی حیثیت سے کانگرس کے سامنے پیش کریں، لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور ہمیں امید نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو سکیں۔ کیونکہ پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگرس کا رُخ یقیناً کسی نہ کسی ہنگامہ خیز مقصد کی طرف مایل ہونا چاہئے اور ہو سکتا ہے کہ سوشلسٹ جماعت کو اس مرتبہ کامیابی ہو جائے بہرحال اس اجلاس کی اہمیت ظاہر ہے اور جدید آئین حکومت کی بہت سی آسانیاں و دشواریاں اسی پر منحصر ہیں۔

س-ش-ص

(مسلسل)

باب دوم در بیان ش

میرزا اہلی شیرازی کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

جانم بروزِ واقعہ پہلوے اوکنید ۔۔۔ اوقبلۂ من است۔ رخم سوئے اوکنید

اوقبلۂ من است اور رخم سوئے اوکنید کا معمّا اس وقت حل ہوا جب میرزا اہلی شیرازی کو خواجہ حافظ شیرازی کے پہلو میں جگہ ملی۔ اور سنگ مزار پر یہی غزل کندہ ہوئی، رحلتِ حافظ کی تاریخ خاکِ مصلّٰی (۷۹۲) اور رحلت اہلی کی تاریخ بادشاہِ شعرا بود اہلی (۹۴۲) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایران میں ڈیڑھ سو برس تک ایک شخص بھی اس اہلیت کا نہ مل سکا کہ حافظ کے پہلو میں جگہ پاتا۔ اس کا اہل صرف اہلی شیرازی تھا جو عالمِ غیب میں آج تک حضرت لسان الغیب سے غیب کی باتیں کر رہا ہے۔

میرزا اہلی شیرازی کا برادر عینی میرزا محمد ہاشم شیرازی۔ ہاشم کا چراغ ملا محمد رفیع شیرازی۔ رفیع کا پارۂ دل ملا غلام محمد شیرازی۔ ملا غلام محمد کا ماہِ دو ہفتہ میرزا غلام حسین۔ یہ چاند اکبر آباد میں دیکھا۔ یعنی حضرت جلال الدین شاہ عالم بادشاہ غازی نے سنہ ۱۸ جلوس میں اس بچہ کی پیدائش کی خبر سنی تو پرورش کے لئے خزانہ عامرہ سے ایک سو روپیہ ماہانہ وظیفہ عطا[1] فرمایا۔ فرمان شاہی مورخۂ رمضان المبارک سنہ ۱۱۹۰ ہجری کے الفاظ یہ ہیں:۔

> دریں وقت میمنت اقتران از وقایع مولود فرزند ملا غلام محمد نوادہ ملا ہاشم شیرازی و نام نہاد مسمّٰی غلام حسین بسمع ہمایوں رسیدہ۔ حکم جہاں مطاع عالم مطیع بنام خازن خزانۂ عامرہ سلطانی بارشاد اموری یکصد روپیہ سکہ کہن ماہانہ مصارف

---

[1] جس میرزا غلام حسین کی پرورش خود حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی نے کی اُس کو مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ تعصب کی راہ سے کاغذ۳۴

مرقعہ وغیرہ ہم شرفِ صدور فرمودہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

میرزا غلام حسین کا لختِ جگر میرزا سلامت علی وہ سلامت علی جس کے گھر دولتِ سیادت بھی ہاتھ باندھے آئی ۔ یعنی

---

۴۳ فروش لکھنوی لکھتے ہیں (تذکرہ سخن شعرا ۔ ص ۸۱۵) میرزا غلام حسین کا سنگین جرم یہ تھا کہ مرزا دبیر لکھنوی کے وہ باپ تھے اور مرزا دبیر کا سنگین جرم یہ تھا کہ لیلائے شاعری اُن کے قدم چومتی تھی ۔ نساخ کو اس کی تاب کہاں ؟ نساخ کا ادبی کمال یہ ہے کہ شہنشاہِ اقلیم سخن میر انیس کے بارے میں فرماتے ہیں (ص ۵۶) :- "سوائے مرثیہ کے اور کسی صنفِ سخن میں مطلق دخل نہیں رکھتے تھے ۔ بلکہ مرثیہ بھی ان کا ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو" اور پھر میر انیس کی رسوائی کے لئے نمونۂ کلام میں صرف تین شعر دئے

ہوا ہے ۔ ابر ہے ۔ ساقی ہے ۔ مے ہے   پر اک تو ہی نہیں افسوس ۔ ہے ہے

کس سے لے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی   نورتن آج جو ڈھلکا ہے ترے بازو سے

کل تو آغوش میں شوخی سے ٹھہرنے نہ دیا   آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

حضرت غالب نے اسی موقع کے لئے کہا تھا ۔ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے !

نساخ کو اکثر فضلائے روزگار سے چشمک تھی ۔ حضرت شاہ اُلفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی کے بارے میں پہلے تو یہ لکھا کہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں اور پھر انتخاب میں صرف دو شعر دئے جس میں ایک شعر یہ ہے (ص ۳۲۶)

نفس کو نالۂ دل سے اسیر رد کرتے ہیں   صبا کے پاؤں میں زنجیر بوئے گل سے بھرتے ہیں

مصرعۂ ثانی مہمل ہے کیونکہ زنجیر بھرنا کوئی محاورہ نہیں ہے ۔ مگر نساخ کو ثابت بھی یہی کرنا ہے کہ فریاد عظیم آبادی اگرچہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں مگر جاہل ہیں ۔

نساخ نے میر انیس و میرزا دبیر کے کلام میں غلطیاں نکالیں اور رسالہ انتخاب نقص شایع کیا ۔ اس کا جواب حضرت ناسخ کے شاگرد مرزا محمد رضا معجز نے رسالہ نسخ النساخ میں دیا مطبوعہ ۱۲۹۶ ہجری مطبع شعلۂ طور کانپور ۔ اعتراضات نساخ کا نمونہ یہ ہے :-

یاں تیغِ جگر بندِ علی میاں سے نکلی   کس زرق سے کس برق سے کس شان سے نکلی

(میر انیس)

اعتراض یہ تھا کہ توابع کا جدا ہونا جائز نہیں ۔ اس لئے زرق برق کو جدا کرنا غلط ہے ۔ جواب دیا گیا کہ فارسی میں توابع کے درمیان واؤ عاطفہ لاتے ہیں مثلاً زرق و برق گفت و شنید اور اسی کا نام جدا کرنا ہے ۔ چنانچہ خانِ آرزو کا فیصلہ ہو چکا ہے :-

" آنچہ نوشتہ کہ تابع بعطف مستعمل نہ شود غلط صریح است "

اور میر انیس کی طرح نیشاپوری بھی فرماتے ہیں ؎

زد سخن بر لبِ نظیری خوشش   عشق در گفت و در شنود آمد

سیدہ بی بی بلبل ہزار داستان میر انشاء اللہ خاں کی حقیقی نواسی۔ سیدہ بی بی بنت میر معصوم علی از معصوم علی؟
بود او زوج دختر انشا　　　سید و شاعر فصیح زبان؟

میرزا سلامت علی کون؟ تخلص دبیر۔ شاگرد میر مظفر حسین ضمیر۔ استاد ضمیر اپنے شاگرد دبیر کو دیکھ کر باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ پھولا نہیں سماتا۔ خط میں لکھتا ہے ا؎ برہانِ من۔ اسنادِ من۔ اعتضادِ من۔ اعتمادِ من سلمہ اللہ تعالیٰ۔"

میرزا سلامت علی دبیر وہ ہیں جن کے غلاموں کی فہرست میں خود سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان حضرت جانِ عالم محمد واجد علی شاہ نے اپنا نام لکھوایا تھا۔ ثبوت؟ ثبوت یہ کہ:-

"........روزے در مجلس بالائے منبر بحضور اعلحضرت بخواندن مرثیہ اتفاق افتاد ناگاہ شامیانہ بالائے منبر ہمچو ابرِ رحمت سایہ گستر بود از ہوا پراگندہ گشتہ کیسو شد و عکس آفتاب بر روی آنجناب افتاد۔ فی الفور ظل اللہ چتر خود طلبیدہ و چوں بدست خود گرفتہ قریب منبر استادہ تا اختتام مرثیہ سایہ افگن ماند.......۔"
شمس الضحیٰ مصنفۂ مولوی صفدر حسین صفحہ ۱۶۶

لکھنؤ کا واقعہ ہے کہ مجلس عزا میں ایک دن اعلحضرت واجد علی شاہ بھی شریک تھے۔ منبر پر میرزا دبیر۔ بالائے سر شامیانہ اتنے میں ہوا جو زور سے چلی تو شامیانہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا اعلحضرت نے دیکھا کہ میرزا دبیر کے رخ پر دھوپ ہے۔ فوراً چتر شاہی طلب فرمایا خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ منبر کے پاس تشریف لے گئے۔ اپنے ہاتھ میں چتر لیا۔ اور میرزا دبیر کے سر پر سایہ کیا۔ جب تک تاجدارِ ملکِ سخن منبر پر جلوہ فرما رہا تب تک تاجدارِ ملکِ اودھ چتر برداری کی خدمت بجا لاتا رہا۔

ناز برداری اس کو کہتے ہیں۔ مجنوں بھی لیلیٰ کی کفش برداری کرتا تو اس سے زیادہ کیا کرتا؟ ــ اودھ کی تباہی کے بعد ۱۲۷۴ھ ہجری میں جب امام باندی بیگم صاحبہ نے میرزا دبیر کو عظیم آباد آنے کی تکلیف دی۔ اور میرزا دبیر منبر پہ تشریف لے گئے تو یہ رباعی پڑھی ؎

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے　　　اس دور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ تھا جنت　　　آدم ٹھہرے۔ جو ہم جناں سے نکلے

مطلب یہ کہ جب تک جنت تھی تب تک عالم سرور تھا۔ بیداری کیسی؟ عالم خواب تھا! ہم کون ہیں؟ یہ جانتا کون تھا؟ جب وہ جنت چھن گئی تب آنکھ کھلی۔ مدہوشی کیسی؟ خمار تھا! آدم کو اب معلوم ہوا کہ وہ آدم ہے۔ آدم کی پہچان یہی ہے کہ وہ جنت سے نکالا جائے۔ جو نکالا نہیں گیا وہ آدم نہیں۔

میرزا دبیر نے ایک دوسری رباعی امام باندی بیگم کے امام باڑہ میں پڑھی اس کا چوتھا مصرع تھا ؎

پختہ جو ثمر ہوا۔ چمن سے نکلا!

مطلب یہ کہ پھل جب تک لکھنؤ میں تھا خام تھا۔ خام کو پوچھتا کون ہے؟ پھل جب پوچھنے کے قابل ہوا تو

گاہک بھی دوڑ آیا - گاہک کون کہ عظیم آباد - اس گاہک کو دیکھ کر ڈالی ہاں ہاں کرتی ہی رہی اور یہ پھل توڑ ہی لایا - مگر اس کا رونا کیا ؟ ڈالی سے جدائی تو پھل کی قسمت میں روزِ ازل سے لکھی ہوئی ہے -

جس روز یہ رباعی گلزار باغ میں پڑھی گئی اُسی روز سہ پہر کو بانکی پور میں چوہٹہ پر میر اسمٰعیل کے ہاں مجلس تھی مجمع تھا مگر مجلس شروع نہیں ہوئی تھی - لوگ ابھی آ رہے تھے - مجلس میں میرزا دبیر پر تبصرہ ہو رہا تھا - میر جان علی اصدقی عظیم آبادی شاگرد نثار علی وکیل عدالت باقر گنج نے کہا صاحبو ! میرزا دبیر فرماتے ہیں ؎ "پختہ جو ثمر ہوا - چمن سے نکلا" سوال یہ ہے کہ چمن میں پھول ہوتا ہے یا پھل ؟ سب کے کان کھڑے ہوئے - ہر طرف سے آواز آئی کہ - پھول ! پھول ! پھول ! - مگر ایک اجنبی جو ابھی ابھی صحن میں داخل ہوا تھا بول اُٹھا کہ - پھول بھی پھل بھی ! حضرت سودا فرماتے ہیں ؎

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ۔۔۔ او خانہ برانداز چمن ! کچھ تو ادھر بھی

اجنبی کو مجمع نے سر سے پاؤں تک دیکھا - پوچھا آپ کون ؟ اجنبی نے جواب دیا ؎

انتخاب زمانہ ہوں میں صفیر ۔۔۔ کہ وطن بلگرام ہے میرا

وہاں عصائے موسیٰ نے دریائے نیل کو ، اور یہاں اس واقعہ نے بانکی پور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا - اہلِ یقین اور اہلِ شک -

اہلِ یقین صفیر بلگرامی کا کلمہ پڑھنے لگے - میر جان علی اصدقی پہلے خود شاگرد ہوئے - پھر میر رفعت حسین و میر کفایت حسین اپنے بھانجوں کو اُستاد کی خدمت میں پیش کیا - بڑے بھانجے نے کبیر اور چھوٹے نے صغیر تخلص فرمایا - مولوی محمد بخش شائق عظیم آبادی نے اصرار کیا کہ عظیم الاخبار کا کام آپ اپنے ہاتھ میں لیں - نواب سید الطاف حسین خاں رئیس باڑہ مقیم باقر گنج نے کہا کہ ذہبی سید حسین علی کو آپ کی میزبانی کا کوئی حق نہیں ہے - خاندانی مراسم کی رو سے یہ حق ہمارا ہے - اسی طرح سیکڑوں قدرداں پیدا ہو گئے - اور اس قدر دانی نے صفیر بلگرامی کو آرہ نہیں جانے دیا - اسی زمانے میں نواب سید الطاف حسین خاں رئیس باڑہ کی فرمائش سے صفیر بلگرامی نے آٹھ سو صفحوں کی ایک کتاب فارسی زبان میں ' مرغوب القلوب ' نام ، مذہب و اخلاق میں تالیف کی - چند سطریں ملاحظہ ہوں :-

گویند وقتے ابلیس نزد فرعون آمد - و شاخے انگور در دست گرفتہ بود - بفرعون گفت کہ ہیچ کس می تواند کہ ایں خوشہ را مروارید کند ؟ فرعون گفت نہ - ابلیس درحال یک دم بدمید - مروارید گشت - فرعون تعجب کرد و گفت عجب استاد مردی - ابلیس سیلئی برگردن فرعون بزد و گفت مرا ایں استادی

ابلیس ہاتھ میں انگور کا خوشہ لئے ہوئے ایک مرتبہ فرعون کے پاس پہونچا پوچھا ۔۔ ہے کوئی یہاں ایسا جو ان انگور کے دانوں کو موتی کر دے ؟ فرعون نے کہا - نہیں ! تب ابلیس نے ایک ہی پھونک میں خوشۂ انگور کو موتیوں کا گچھا بنا دیا - فرعون کو بڑا اچنبھا ہوا - کہا کہ او استادی اسکو کہتے ہیں - یہ سُننا تھا کہ ابلیس نے فرعون کی گردن پر ایک مُکّا مارا - اور کہا ۔۔۔ مردود ! اس اُستادی پر بھی تو بندگی ہماری اُس

به بندگی قبول نه کرد تو بایں نادانی دعوئ خدائی چوں کنی؟ | جناب میں قبول نہیں ہوئی۔ اور تو ابوجہل ہو کر آیا ہے خدائی کا دعوی کرنے؟

صفیر بلگرامی کی کتاب مرغوب القلوب ایک مرتبہ نواب سہراب جنگ بہادر نے نواب سید الطاف حسین خاں سے دیکھنے کو لی۔ اور اس رقعہ کے ساتھ واپس کی:-

"الطاف گستر بے پایاں۔ سلامت!

اخلاص پرست یکرنگ، بندۂ بے ریا سہراب جنگ بدیں رنگ مدعا طراز۔ نسخۂ مرغوب القلوب کہ بہت مطالعہ ازاں الطاف گستر آوردہ بودم الاولالآخرہ مطالعہ نمودہ بصحابت حامل واپس می دارم ---- بمطالعہ نسخہ مذکور خیلے محظوظ شدم۔ مؤلف را، و آں شفیق را کہ بانیٔ تالیف ہستند، بدعائے خیر یاد کردم۔ و شک نیست کہ آں الطاف گستر از تالیف کنانیدن نسخہ مذکور خیلے ماجور و مثاب شدند۔ خدا جزائے خیر دہاد۔ بہ محمد و آلہ الامجاد۔

زیادہ و السلام خیر الانام ــــ سہراب جنگ عفی عنہ۔ یوم الادینہ"

اس رقعہ سے معلوم ہوگا کہ آج سے ستر برس پہلے بانکی پور اور عظیم آباد کی کیا فضا تھی۔ غالب فرماتے ہیں:- ؎

جادہ زعلم بے خبر۔ علم زجادہ بے نیاز

مگر یہ رقعہ شاہد ہے کہ نواب سہراب جنگ بہادر کے ایسے رئیس بھی علم سے باخبر تھے۔ اہل علم کی قدر کرتے تھے۔ عربی و فارسی تصانیف کے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے۔ منشیانہ فارسی قلم برداشتہ لکھتے تھے اور شب و روز فضائے علم میں بسر کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی اور لکھنؤ کی خزاں بہار پر تھی۔ اور بہار کی ملکہ پچھم سے منھ موڑ کر پورب میں یعنی عظیم آباد میں جلوہ فرما تھی ؎

چمن آتش گل سے دہکا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

جب حالت یہ تھی تو ظاہر ہے کہ کسی بیرونی شخص کا عظیم آباد میں فروغ پانا آسان نہ تھا۔

چنانچہ اہل شک نے کہا کہ بلگرام خطۂ یونان سہی مگر بغیر امتحان طرح سمجھے بوجھے کسی کو یوں ہی مان لینا درست نہیں۔ اس فیصلہ کی رو سے باقر گنج دارالامتحان قرار پایا۔ اور میر حشمت علی حشمت کے ہاں مشاعرے شروع ہوئے مشاعرے نہیں معرکے شروع ہوئے۔ یہ آگ بڑھتے بڑھتے شہر عظیم آباد پہونچی۔ وہاں ایک مرتبہ محلہ گزری میں نواب سید محمد حسین خاں ہجرتی شاگرد ناظر وزیر علی عبرتی کے ہاں مشاعرہ تھا۔ یہ عظیم آباد کا پہلا مشاعرہ تھا جس میں صفیر بلگرامی کی شرکت ہوئی۔ طرح میں جو غزل انھوں نے پڑھی بہت دقیق تھی۔ اہل شک کو موقع ملا۔ مولوی یوسف علی شہید شاگرد نجم نے کہا کہ سر مشاعرہ امتحان ہونا چاہئے۔ صفیر بلگرامی نے کہا کہ بسم اللہ! اُسی وقت مشاعرہ میں دیوان ناسخ لایا گیا۔ کھولا گیا تو یہ غزل نکلی ؎

ہے دلا کس کو دوام اس گردشِ افلاک میں　　خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں
کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موج سے　　پاک میں ہو کب وہ کیفیت جو ہے ناپاک میں
مست عالم کو کیا چشمِ سیاہ یار نے　　ساغرِ مے کا ہے عالم ساغرِ تریاک میں

ممتحن نے خیال کیا کہ افلاک میں۔ خاک میں پامال زمین ہے۔ ممکن ہے صفیر بلگرامی کی غزل اس زمین میں پہلے سے موجود ہو۔ اور نہ بھی ہو تو وہ امتحان ہی کیا جس میں لوہے کے چنے نہ چبائے جائیں۔ اس لئے حضرت ناسخ کے ساتویں شعر کا مصرع دیا گیا۔ یعنی ؎ "کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موج سے"۔۔۔ صفیر بلگرامی نے فی البدیہہ ۲۱ شعر کی دو غزلیں کہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

مست استغنا نہ ہو سن لے بیانِ موج سے　　ہے لبِ ساغر سے کچھ کہتی زبانِ موج سے
عکس تیرا جب پڑا ساقی میانِ موج سے　　سایہ افگن خم سے ہوگا سائبانِ موج سے
دُردِ مے اس کی زمیں ہو۔ تو حباب مے فلک　　دیکھ لے ساقی زمین و آسمانِ موج سے
پی کے مے سیرِ جہانِ لامکاں کر شوق سے　　عالمِ امکاں سے باہر ہو جہانِ موج سے
چشمِ مست ساقیِ خود بیں سے کیا جامِ شراب　　آنکھ کے ڈوروں پہ مجھکو ہو گمانِ موج سے
جستجو اس کو ہے یہ کس یوسفِ گم گشتہ کی　　گردشوں میں رات دن ہو کارواں موج سے
جس سے دو باتیں ہوئیں وہ مست دیکھو ہو گیا　　آپ کی موجِ تبسم میں ہے شانِ موج سے
عیش میں بھی بانکپن سفاک کا جاتا نہیں　　وقتِ مے نوشی ہو ہاتھوں میں کمانِ موج سے
۔۔ اے صفیر اک اور لکھئے اب تو مستانہ غزل　　یاروں کو منظور ہو یاں امتحانِ موج سے ۔۔

صفیر بلگرامی یہ غزل کہہ کر اُٹھے تو یوسف علی شہید نے انگشتِ شہادت اُٹھائی اور کہا لاریب قادر الکلامی اسکو کہتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے مشاعرہ میں جوش نے کہا کہ شاعر ہم اُسی کو مانیں گے جو خنجر تہِ خنجر باندھ کر دکھلا دے صفیر بلگرامی نے ۱۳ شعر کی فی البدیہہ غزل کہی۔ دس شعر یہ ہیں ؎

تھامے ہوں تری زلفِ معنبر تہِ خنجر　　ہے سلسلۂ عمرِ خضر زیرِ تہِ خنجر
خنجر کو جو دیکھا تو بندھا ابروؤں کا دھیان　　پڑھنے لگا میں بچھو کا منتر تہِ خنجر
سفاک نے رگڑا جو دیا حلق پہ میرے　　بل کھا گیا میں صورتِ خنجر تہِ خنجر
قاتل مری میت پہ رہے تیغ کا سایہ　　جائے بھی تو اکشتۂ خنجر تہِ خنجر
سر دینا بھی مجھ عاشقِ جانباز کو ہے کھیل　　دیکھا کیا میں جوہرِ خنجر تہِ خنجر
جس طرح سے جی چاہے مجھے قتل کرو تم　　تڑپوں گا نہ اے صاحبِ خنجر تہِ خنجر

اک خنجر ابرو نہیں - پلکیں بھی ہیں نیچے | رکھے ہیں وہاں سیکڑوں خنجر تہ خنجر
کہنے لگا سرمہ کی وہ تحریر دکھا کر | خنجر تہ خنجر ہے تہ خنجر تہ خنجر
ہے جوشؔ کو دعویٰ یہ کہ شاعر اُسے سمجھوں | باندھے جو کوئی قافیہ خنجر تہ خنجر

شاعر مجھے کہتے ہیں صفیرؔ سخن آرا
یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہ خنجر

اسی طرح نئی نئی اور سنگلاخ زمینوں میں سات امتحان لئے گئے - چنانچہ صفیر بلگرامی فرماتے ہیں ؎

کام رستم کا نہ تھا - جو کیا فردوسی نے | نہیں ہر ایک سے کھنچتی ہے کمانِ شاعر

رستم یعنی ہفت خوانِ رستم - فردوسی یعنی شاہنامہ - مطلب یہ کہ رستم سے اگر کہا جاتا کہ کمانِ موج سے تیراندازی کر اور جو ہر خنجر تہ خنجر دکھلا تو وہ کمان اپنے ہاتھوں سے پھینک دیتا - اور خنجر اپنے سینہ میں بھونک لیتا - امتحان کبھی نہ دیتا - ہفت خوانِ رستم کو اُن سات امتحانوں سے کیا نسبت جو عظیم آباد میں لئے گئے - رستم فردوسی نہیں ہو سکتا -

میدانِ جنگ میں آج سناٹا ہے - معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وہی عظیم آ[illegible] ہے وہی گذری ہے، جہاں ہجرتی عظیم آبادی کے مشاعرے ہوتے تھے - شہید و جوشؔ مسلح ہو کر آتے تھے - توپیں سر ہوتی تھیں چھپتیں اُڑتی تھیں - دیواریں ناپید ہوتی تھیں - آج ہر طرف سناٹا ہے - بقول حضرت صفیر بلگرامی ؎

زمینِ سخن میں پڑے سو رہے ہیں | شہیدانِ تیغِ سخن کیسے کیسے !

ان شہیدانِ تیغِ سخن میں جناب بدر آروی بھی ہیں جن کی [illegible] میر عنایت حسین صاحب امداد عظیم آبادی شاگرد شاد عظیم آبادی فرماتے ہیں ؎

مرقع محنتوں کا ہے یہ دیواں | ریاضت ہائے عمر بے وفا ہے | یہ اب مقبول اربابِ سخن ہو | یہی امدادِ خستہ کی دعا ہے
نہ کیوں ہو شانِ اُستادی نمایاں | کہ تصنیف بدر بے ریا ہے | یہ وہ اہلِ ہنر ہے صاحبِ فن | وطن میں اسکا شہرہ جابجا ہے
خلیق و خوش مزاج و بامروت | شکستہ نفس و خوشخو باوفا ہے | نہ دیکھا انکسارِ نفس ایسا | خودی جس میں نہ مطلق ادعا ہے

شکستگیٔ نفس کے ثبوت میں جناب بدر آروی کا ایک خط ملاحظہ ہو:-

" عزیز گرامی مولوی سید وصی احمد صاحب بلگرامی - بخیریت رہکر نوید صحت مزاج کا خواستگار ہوں - میرا دیوان ۲۸ جزوں پر چھپ کر تیار ہو گیا .... یہ دیوان آپ کے جد امجد (حضرت صفیر بلگرامی) بہشت مکان کی زندہ یادگار ہے - ناپسند ہونے پر بھی ایک جلد آپ کی الماری میں ہونا ضرور ہے -

بذلِ رنداں کردم از ساقی گرفتہ جامِ مل! | نذرِ سلطاں ساختم از باغِ سلطاں چند گل

حضرت اُستادی علیہ الرحمہ کی کفش برداری کا فیض ہے جو دیوان کی شکل میں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے

آپ کی چیز ہے۔ آپ کے گھر کی چیز ہے۔۔۔۔۔۔"

سید محمد امیر حسن بدر

آرہ - یکم مارچ ۱۹۲۹ء روز جمعہ

اس خط میں زندہ یادگار کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ مختصر یہ کہ آج عظیم آباد کا میدانِ جنگ خموش ہے۔ مگر ستر بچھتر برس پہلے جو توپیں وہاں سر ہوئی تھیں اُن کا دھواں اب تک اُڑ رہا ہے۔ اُن معرکوں کی یاد اب تک تازہ ہے یعنی جن زمینوں میں صفیر بلگرامی کا عظیم آباد میں امتحان ہوا تھا اُن زمینوں میں ایک مدت دراز کے بعد جناب بدر نے اپنے اُستاد کی اجازت سے غزلیں کہیں اور پتھر کو پانی کی طرح بہادیا ؎

بدر آروی	صفیر بلگرامی
اے بدر بجا حضرت اُستاد کا ہی قول	(۱) شاعر مجھے کہتے ہیں صفیر سخن آرا
یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہِ خنجر	یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہِ خنجر
بدر لکھتا ہوں ابھی اک اور مستانہ غزل	(۲) اے صفیر اک اور لکھئے اب تو مستانہ غزل
ہے طبیعت موج پر اپنی بسانِ موج مے	یاروں کو منظور ہے یاں امتحانِ موج مے

زبانِ موج مے کی زمین میں حضرت صفیر بلگرامی نے ۱۲ شعر کہے تھے۔ جناب بدر نے ۱۸ شعر کہے اور ۱۳ قوافی باندھے۔ مثلاً استخوان۔ بادبان۔ داستان۔ نردبان وغیرہ۔ مگر امتحان سے قصداً پرہیز کیا۔ کیونکہ امتحان، اور وہ بھی سر مشاعرہ امتحان، اُستاد کا ہو چکا تھا۔ شاگرد کو اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے سعادتمند شاگرد نے اس قافیہ کو ہاتھ لگانا سوء ادب سمجھا۔

سہسرام کے ایک مشاعرہ میں جناب بدر کو داستانِ موج مے سُنانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی خبر کسی نے جناب سید حسن مرتضیٰ شفق رضوی عماد پوری کو پہونچائی۔ ظالم آسمان شفق کو بدر سے کبھی ملنے نہیں دیتا مگر ایک مشاعرہ[۱] میں یہ ناممکن بات بھی ممکن ہوگئی تو جناب شفق نے بدر سے کہا کہ داستانِ موج مے سننے کے لئے کان مشتاق ہیں۔

---

[۱] اس مشاعرہ میں جناب شفق نے ایک رباعی کہی تھی، جس کا پہلا اور دوسرا مصرع یہ ہے ؎

روشن ہے جہاں میں بدر سے نام صفیر ناچیز شفق ہے کفش بردارِ امیر

حضرت امیر مینائی کے پہلے جناب شفق کو شوق نیموی سے تلمذ تھا۔ اُس زمانہ کا نمونہ کلام یہ ہے ؎

۱- تو گرفتارِ محبت ہوں۔ ابھی کیا جانوں! فرقت اچھی ہے کسی کی کہ وصال اچھا ہے

۲- کیا مزا ہو۔ انقلاب ایسا اگر ہو دہر میں میں تو روٹھوں اور وہ آئیں منانے کے لئے

اس داستان کو سنکر جناب شفق کے دل پر کیا اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۳۴۸ھ ہجری میں خمخانۂ بدر طبع ہوا اور جناب شفق نے قطعۂ تاریخ کہا تو اُس قطعہ میں اس داستانِ موجِ مے کا خاص طور سے ذکر کیا ؎

بلّٰہ الحمد آب و تاب طبع رنگیں سے شفق	صورتِ صحنِ چمن ہے گلفشاں دیوانِ بدر
ہے مئے جامِ کہن میں کہنہ مشقی کا اثر	مست ہوں پڑھ کر نہ کیوں ہر دو جامِ دیوانِ بدر
اس کی ہر ہر بیت ہے گویا بیانِ موجِ مے	کیوں نہ ہو پھر ترجمانِ میکشاں دیوانِ بدر
جلوۂ حسنِ معانی سے دکھاتا ہے مجھے	لمعۂ فیضِ صفیر نکتہ داں دیوانِ بدر

حضرت ناسخ نے ۱۲۵۴ھ ہجری میں رحلت کی۔ یہ ۱۳۵۴ھ ہجری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کاروانِ موجِ مے اس ایک سو برس میں کن کن منزلوں سے گزرا ہے :-

(۱) پہلی منزل لکھنؤ۔ محلہ ٹکسال۔ جہاں کلکِ ناسخ نے ایک شعر کے مصرعِ اول میں اتفاقیہ زبانِ موجِ مے لکھدیا۔

(۲) دوسری منزل عظیم آباد۔ محلہ گذری۔ جہاں ہجرؔی عظیم آبادی کے مشاعرہ میں یوسف علی شہید نے حضرت صفیر بلگرامی کا امتحان لینا چاہا۔ اور اس امتحان کے لئے دیوانِ ناسخ کھولا گیا تو عجب اتفاق کہ وہی مصرع طرح قرار پایا۔

(۳) تیسری منزل آرہ۔ ملکی محلہ۔ جہاں جناب بدرؔ آروی نے مسلسل پانچ غزلیں کہہ کر دکھلایا کہ موجِ مے کتنی زبان دراز ہے

(۴) چوتھی منزل عماد پور۔ علاقہ رفیع گنج ضلع گیا۔ جہاں جناب شفق عماد پوری نے خمخانۂ بدر کی تاریخِ طبع کا قطعہ لکھا تو بیانِ موجِ مے آہی گیا۔ اور تماشہ کی بات یہ ہے کہ دیکھنے میں تو کاروانِ موجِ مے لکھنؤ سے عظیم آباد اور آرہ ہوتا ہوا گیا پہونچا۔ لیکن غور کیجئے تو یہ کارواں جس نقطہ سے چلا تھا ایک سو برس کے بعد پھر اُسی نقطہ پر آگیا۔ نقطۂ اول ناسخ کی ایک بیت کا پہلا مصرع۔ نقطۂ آخر شفق کی ایک بیت کا پہلا مصرع !

جناب شفق کے اس قطعہ کا ایک مصرع قابل توجہ ہے ؎ "لمعۂ فیضِ صفیر نکتہ داں دیوانِ بدر" یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس مصرع میں نکتہ داں محض قافیہ پیمائی ہے۔ جناب شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جسکی مدح میں مرزا محمد باقر صحبت لاری شیرازی کے قصاید موجود ہیں۔ تین شعر ایک قصیدہ کے یہ ہیں ؎

کیست آں نجلِ نبی۔ شبلِ علی۔ میر صفیر	کہ در دانش بصفا مجمعِ اسرار آمد
در فنِ شعر یکے کہنہ ادیبے است ادیب	کہ بوصفش قلم از شرح بتکرار آمد
دیدۂ وہم نیابد بہ سخن سنجیٔ او	انجم آسا اگرش خود ہمہ ابصار آمد

جناب شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جس کو حضرت غالب کے دربار سے نورِ بصر لختِ جگر قرۃ العین اسد خطاب ملا تھا۔ اور جس کو خود جناب شفق کے اُستاد حضرت امیر مینائی اپنے خطوں میں "بلبلِ شیراز و طوطیٔ ہند کے ہمصفیر"

لکھا کرتے تھے -

راجہ کے بھنڈار میں اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے[۱]- بھنڈار کے ایک کونے میں مصری کا پہاڑ بھی ہے - چیونٹی کہتی ہے کہ یہ پہاڑ اپنے سر پر کیونکر اُٹھا لائیں - ہاں اپنی بساط بھر ایک ریزہ منہ میں داب کر لائے ہیں کہ مہمان بھوکے نہ اُٹھ جائیں -

نمونہ کلام حضرت صفیر بلگرامی -

قطعہ

بڑے شوق سے بھیجتا ہوں میں قاصد ۔ رہیگی نظر راہ پر دیکھ لینا ۔ نہ تو خیر سے پھر کے آئیگا جب تک ۔ نہ ٹھہریگا دل نے جگر دیکھ لینا

بتا کوئے قاتل کا بتلا دوں تجھکو ۔ جو کہتا ہوں میں ڈھونڈ کر دیکھ لینا ۔ پڑے ہر جگہ پر ہیں ٹکڑے جگر کے ۔ تڑپتے ہیں دل خاک پر- دیکھ لینا

کہیں خاک اُڑاتے ہیں گیسو کے اُلجھے ۔ کسی کا ہو دم ہونٹھوں پر دیکھ لینا ۔ خراشوں سے سینہ گلستاں کسی کا ۔ کوئی گل ہو داغِ جگر- دیکھ لینا

کوئی ہوگا ایڑی رگڑتا زمیں پر ۔ کسی کا عدم کو سفر دیکھ لینا ۔ کہیں چاک دامن کئے ہیں ہزاروں ۔ کھڑے ہیں کہیں بخیہ گر- دیکھ لینا

کوئی شام غم میں بگرفتارِ کلفت ۔ کسی لب پہ آہِ سحر دیکھ لینا ۔ ہلا دیں گے دل تیرا نالے کسی کے ۔ کسی کی فغاں بے اثر- دیکھ لینا

کوئی ہوگا دھونی رمائے وہاں پر ۔ کسی کو کھڑے ننگے سر دیکھ لینا ۔ نہ کھانے کی سدھ بدھ نہ پانی کی پروا ۔ غذا سب کی خونِ جگر دیکھ لینا

---

[۱] فہرست تصانیف حضرت صفیر بلگرامی تا ۱۲۹۴ھ ہجری

نظم		نثر			
دیوان ———	فارسی ۳- اُردو ۸	بوستانِ خیال	۸ جلد	معراج العقول	۱ جلد
مثنویات ———	فارسی ۴- اُردو ۲۶	فیضِ صفیر	۲۱ "	فالنامہ	۱ "
قصائد ———	فارسی ۲- اُردو ۴	تذکرہ مردم دیدہ	۱ "	ترجمہ تفسیر	۱ "
کلیات مولود و مراثی —	۲ جلد	مضامین مختلف	۶۵	ترجمہ کتب مختلف	۵
دیوان خمسہ جات —	۱ جلد	گلبن موزوں	۳۳		
دیوان رباعیات -	۱ جلد	قصص	۷		
قطعات -	۱ جلد	مرغوب القلوب	۱ جلد		
واسوخت -	۴ جلد - نظم مختلف - ۱ جلد	جوہر مقالات	۳ جلد		

کہیں ہڑیاں طائر نامہ بر کی، کسی جا کبوتر کے پر - دیکھ لینا
یہ ساماں گلی میں کوٹھے پہ ہونگے، بھری ہوگی سب سے نظر - دیکھ لینا
لحد ایک حسرت بھری بین در پہ، لکھا شعر یہ لوح پر - دیکھ لینا
تجھے اپنی آنکھوں کی سوگند قاتل، مری قبر روز اک نظر - دیکھ لینا

غزل

آنکھ میں دل میں کرم فرمائیں آپ ... آئیں آپ - اے بندہ پرور آئیں آپ
حالِ دل میرا اگر سن پائیں آپ ... بے بلائے آپ دوڑے آئیں آپ
ہمکو کیا - غیروں کے آگے جائیں آپ ... پائے نظارہ کی ٹھوکر کھائیں آپ
یہ سکھاتی ہے اُن آنکھوں کو حیا ... شرم بھی آئے تو شرما جائیں آپ
خط کے آنے پر خط آیا آپ کا ... اس کے معنی کیا - ذرا بتلائیں آپ
زندگی بھر تو جلایا ہے مجھے ! ... شمع مرقد بھی جلانے آئیں آپ

سلئے یہ کوٹھا وہی کوٹھا ہے جو عرش سے باتیں کر رہا ہے - اس کوٹھے کے نیچے زنجیروں کی جھنکار ہے - تیروں کی بوچھار ہے - رسن ہے - دار ہے - خون کی ندیاں ہیں - ظلم کی بجلیاں ہیں ——— —— ———

ماہِ کنعاں قیدخانہ جا رہا ہے - زلیخا کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے ——— سید الشہدا ایک شیر خوار کو ہاتھوں پر لیئے ہوئے فریاد کر رہا ہے "ایک گھونٹ پانی خدا کی راہ میں" حرملہ کا تیر علی اصغر کی پیاس بجھانے آتا ہے - ادھر معصوم کے حلق سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے اور اُدھر فوجِ یزید میں عید قربان ہے ——— ایک ماں اپنی گودڑی کے لعل کو صندوق میں بند کرکے دریائے نیل کو سونپ رہی ہے اور صندوق بہتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جا رہا ہے ——— اللہ کا ایک فرماں بردار غلام یہودیوں کے نرغہ میں ہے اور اس غلام کے لئے سولی کھڑی کی گئی ہے - ——— سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے اور تاجدار شہید مقدس کو زہر آلود انگور بھیجے جا رہے ہیں ——— ایک میدان میں کبوتر کے پر بچھے ہیں - جس کو شک ہو وہ آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے - کہیں عباس علمدار کے دست بریدہ ہیں - کہیں علی اکبر کا تنِ بے سر ہے - کہیں حبیب ابن مظاہر کا سر بے تن ہے - یہ میدان کرب میدانِ بلا ہے - یعنی کربلا ہے -

گلی میں یہ سامان فدائیوں کی یہ شان اور کوٹھے والا دیکھتا ہے مگر دیکھتا نہیں - بے نیاز ہے - دیکھتا نہیں مگر باغ باغ ہوا جاتا ہے - اسی دن کے لئے اُس نے آگ کو حکم دیا تھا کہ مٹی کو سجدہ کر - مٹی کا وزن آگ سے زیادہ ہے - مگر مٹی کہیں اترا نہ جائے غرور نہ کر بیٹھے - اس لئے ؎

"بھری ہوگی سب سے نظر دیکھ لینا"

آرزو بھی اپنی نکلے دم کے ساتھ — نزع میں دم بھر اگر ہو جائیں آپ
وصل قسمت میں نہیں ہے۔ کیا کریں — آپ کھو جائیں اگر مل جائیں آپ
ہو گئے یکتا لطافت کے سبب — آئینہ میں عکس کیونکر پائیں آپ
ہائے رے گردن جھکانا آپ کا — اک ذرا پھر اس طرح شرمائیں آپ
دفن میں تجھکو تردد ہو اگر! — تیرے کشتے شرم سے گڑ جائیں آپ
وجد میں آکر لحد ہلنے لگے — اپنے پاؤں سے اگر ٹھکرائیں آپ

بلبلیں گائیں گی یہ غزلیں صفیر
شعر اچھے اچھے کہتے جائیں آپ

جائیں آپ اب، جائیں آپ اب، جائیں آپ — چار غیروں میں نہ یوں فرمائیں آپ
گور میں رکھوالیں تو گھر جائیں آپ — بیٹھ کے لاش مری اٹھوائیں آپ
شاعروں سے اڑتی ہیں آنکھیں بہت — دیکھئے ایسا نہ ہو بندھ جائیں آپ
آنکھ سے میرا مکانِ دل ہے خوب — اب تو اس کوٹھے سے نیچے آئیں آپ
زرد ہوں۔ لیکن نکھرا ہوں عشق میں — خوب اس سونے کو میرے تائیں آپ
ڈر ہے جذبہ سے مرے۔ کیا دور ہے — بے طلب گھر میرے دوڑے آئیں آپ
حضرتِ دل کیا مجھے بھاری ہے جان؟ — خنجر ابرو کی چوٹیں کھائیں آپ
میں تمھیں دیکھوں۔ وہ دیکھے غیر کو — اب تو اپنی آنکھ سے شرمائیں آپ
کب سے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اے حضور — پھر ہیکے خوب۔ اپنے گھر میں آئیں آپ
تم سے چھٹ کر دل بہت کرتا ہے تنگ — اس کو بھی ساتھ اپنے لیتے جائیں آپ
دیکھتا ہوں، دیکھتا ہوں سامنے — اچھا اچھا کچھ چھپاتے جائیں آپ
بسمل اٹھ اٹھ کر لپٹتے ہیں حضور — عید ہاں دیکھتے تو جائیں آپ
گل تو بلبل کو ملے۔ قمری کو سرو — یا الٰہی مجھکو بھی مل جائیں آپ
غیر مجھ سے لڑ رہا ہے دیر سے — اور آکر ہاں میں ہاں ملوائیں آپ
منھ چھپایا خال کے بوسوں پہ بھی — کوئیلوں پر مہر اب دلوائیں آپ
آپ دیکھیں جو دکھاتے ہیں مجھے — آپ سمجھیں مجھکو جو سمجھائیں آپ
شعر ہیں ان بحروں کے موتی صفیر — جوہری بازار میں لے جائیں آپ

ہجر آیا۔ وصلِ جاناں الغیاث! — تیرہ شب ہے۔ ماہِ تاباں الغیاث!
دل لئے کب سے کھڑا ہوں ہاتھ میں — الغیاث اے تیرِ مژگاں الغیاث!
ہم سے مفلس چاہتے ہیں انقلاب — الغیاث اے چرخِ گرداں الغیاث!
رات فرقت کی نہیں کٹتی ہے۔ آہ — الغیاث اے مہرِ رخشاں الغیاث!
اُن کے در سے اب اُٹھاتے ہیں رقیب — الغیاث اے کوئے جاناں الغیاث!
زلفِ شبگوں نے کیا عالم تباہ — الغیاث اے روئے تاباں الغیاث!
بھر گیا ہے دل میں جاناں کے غبار — الغیاث اے ابرِ مژگاں الغیاث!

قابلِ امداد ہے اب تو صفیرؔ
الغیاث اے شاہِ مرداں الغیاث!

میرے آگے غیر سے اس طرح یارانے کی بات — واقعی ہے اے ستمگر یہ تو مر جانے کی بات
واقعی ہے اے محبت آگ ہو جانے کی بات — کیوں نکالی اُن کے گھر میں میرے ویرانے کی بات
جب کہا حیرت ہے۔ میں تم پر فدا۔ تم غیر پر — ہنس کے بولے۔ اپنے اپنے دل کے آجانے کی بات
میرے منہ سے اور شکوہ آپ کا۔ اچھی کہی — کیا خیال آیا یہ حضرت صاحب کے فرمانے کی بات
ایک بھی منہ سے نہ پھوٹا۔ ہو گئے پتھر یہ بت — زاہد ان کو سناؤں کیا میں تیجانے کی بات
شب کو ایسا ارتباط۔ اور صبح ایسی احتیاط — اے صنم سچ ہے کہ ہے یہ دل میں آجانے کی بات

اے صفیرؔ اس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے؟
جل بجھا کل رات۔ دیکھی تم نے پروانے کی بات!

شمع و پروانہ کا ذکرِ خیر آ ہی گیا تو غازی پور اور الہ آباد کا ایک فسانہ بھی سن لیجئے۔ مولوی عبدالصمد صمد غازی پوری نے سنہ ۱۲۹۱ھ میں صفیرؔ بلگرامی کو مدعو کیا۔ صفیرؔ بلگرامی غازی پور پہونچے اور للّن نے ان کا آنا سنا تو ملنے کے لئے آئی۔ ان کو معلوم تھا کہ للّن ملک الموت ہے اور سید کاظم علی مضطرؔ الہ آباد میں موت کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ للّن سامنے آئی تو دیکھتے ہی صفیرؔ بلگرامی نے پوچھا۔
؎ "کیا ہوئی عاشقِ مضطرؔ کی یاد"؟ اس کا جواب للّن کی زبان اور صفیرؔ بلگرامی کے قلم سے سنئے ؎

سن کے آنکھوں کو پھرایا اُس نے — عجب انداز دکھایا اُس نے — بولے اُس بت کے لب شکر خند — کیا یہ کہتے ہو۔ خدا کی سوگند
جلوۂ طورِ صفا کی سوگند — جذبۂ اہلِ وفا کی سوگند — اپنی شرم اور حیا کی سوگند — انکی مہر اور وفا کی سوگند
شوخ چشموں کے غضب کی سوگند — پیار کی نظر دنکے ڈھب کی سوگند — حسنِ بے پردہ کی ضو کی سوگند — شمعِ رخسار کی لو کی سوگند
بسملِ تیغِ نگہ کی سوگند! — زخمِ کاری کی جگہ کی سوگند — غمزۂ شوخ روش کی سوگند — نظرِ نیم خلش کی سوگند
اپنے مژگاں کی خلش کی سوگند — دل مضطر کی طپش کی سوگند

گرم جوشوں کی محبت کی قسم
سرد مہروں کی عداوت کی قسم
شعلۂ شمع فروزاں کی قسم
عشقِ پروانۂ سوزاں کی قسم
عشق کی بے خطر آہوں کی قسم
حُسن کی نیچی نگاہوں کی قسم
اپنے انجان تغافل کی قسم
اُن کے سامانِ تحمل کی قسم
کہ مرے دل کا وہی عالم ہے!

سستیِ عہدِ شکیبائی کی قسم
حسرتِ گوشہ گزیناں کی قسم
سینہ کاویِ نظارہ کی قسم
دلِ جانبازو دوپارہ کی قسم
خونچکاں نالۂ بلبل کی قسم
خونفشانیِ رگِ گل کی قسم
اپنے گیسوئے دل آرا کی قسم
اُسی آشفتہ و شیدا کی قسم
جانِ بسمل کا وہی عالم ہے

رات دن آنکھوں میں ہے دھیان اُنکا
دھیان بھولا نہ کوئی آن اُنکا
زندگی اپنی کٹے تو کیونکر؟
عمر طے اپنی بھلا ہو کیونکر؟
سامنے ہو وہ دل آرا ہر دم
دھیان میں رہتی ہوں شاد و خرم
کھولدی اُسنے کھوری چوٹی
سانپ کی طرح زمیں پر لوٹی
دست بوسی جو گریبان نے کی
پائے بوسی سرِ داماں نے کی
مجھکو وحشت ہوئی اس حالت پر
ہوگیا دیکھ کے اُس کو مضطر
اُسکی ایسی ہوئی حالت تغیر
کہ بنی صاف وہ غم کی تصویر
ایسے بیمار سنبھلتے ہیں کہیں؟
بے موئے گھر سے نکلتے ہیں کہیں؟
بعد دو سال کے معلوم ہوا
کہ وہ سامان ہی معدوم ہوا
جان اُسکی ہدفِ غم جو ہوئی
اُسی آزار میں گھل گھل کے موئی
مجھ پہ تھا حقِ محبت جو صفیر
حال میں نے کیا اُس کا تحریر

وہ نہ خط بھیجیں۔ نہ بھیجیں پیغام
دو اُفتادوں سے سچ ہے کیا کام
طعن و تشنیع کہانتک سنئے؟
کبتلک اس راہ میں تنکے چنئے؟
کہہ کے یہ بوسہ زنِ لب ہوئی آہ
دفعتاً اُس کا ہوا حال تباہ
ہاتھ مل مل کے چھڑائی مہندی
ایڑیاں گھس کے اُڑائی مہندی
تا گریباں جو وہ داماں پہونچا
تا بہ دل چاک گریباں پہونچا
دوستانہ اُسے سمجھانے لگا
اتنے میں غش بھی اُسے آنے لگا
میں نے منگوا کے دوائی اُس دم
بھیجا گھر اُس کے بصد رنج و الم
میں نے مفصل کر روانہ کیا خط
اطلاع اسکی مناسب تھی فقط
کھا گئی اُس کو تمنا دل کی
جانِ مضطر ہوئی کشتہ دل کی
مرغِ جاں اُس کا ملک سیر ہوا
لیجئے۔ خاتمہ بالخیر ہوا
یادگار اُس کے ہیں یہ چند اشعار
بخشے اب اُسکو خدائے غفار!

غزل

اُڑ کے ڈسنا افعیِ زلفِ دو سر کا کھیل ہے
وحشیوں کو روکنا تیری نظر کا کھیل ہے
لختِ دل کا کھیل ہے اور اشکِ تر کا کھیل ہے
عشق کے بازار میں لعل و گہر کا کھیل ہے
کاسۂ سر ہاتھ میں لیکر چلا منصور کیا
یہ تو ادنیٰ عاشقِ آشفتہ سر کا کھیل ہے
طبعِ معنی یاب بھی درکار ہے اس کو صفیر
شاعری میں کیا فقط علم و ہنر کا کھیل ہے

مرزا اسلام حیدر مجروح عظیم آبادی نے ایک قطعہ میں شاگردانِ صفیر بلگرامی کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست مورخہ ۱۲۹۴ھ میں اُنھیں شاگردوں کو جگہ ملی تھی جن پر صفیر بلگرامی نے برسوں محنت کی تھی۔ ۲۹ شعر میں ۱۶ یہ ہیں :-

پسر فرزند احمد آنکہ صفیر ہست مشہور عالم ایجاد
بلگرام اصل و آرہ مسکن او سالہا منزلش عظیم آباد

طوطیِ خوش نوائے گلشن نظم بلبل نغمہ سنج گلبن داد
ہم زبیر پائی خزینہ کشا ہم ز قید غرور ہست آزاد

امور در جہان تلامذہ اش بہرہ ور صاحبانِ استعداد
مایہ دار از فیوض او شاگرد ہم ز تعلیم اوست شاد استاد

فیض یاب از صفیر با تمکیں سخن احمد امیر سلطاں شاد
مخلص و شورش اکبر و اصغر ہاشم و محسن خجستہ نہاد

عیاں و عنقا ہما امیر اخلاص ہم شمیم و کلیم طور شاد
حسن اکبر حقیر درد زہیر ہم گرامی ضیائے مہر سداد

سخن اکرام قیصر و جباد ہم سلیم و وزیر صاحب داد
احسن و جوش و حیرت و فیاض ہم طبیب و تہمینہ نیک نہاد

آں صغیر و مطہر تمکیں شور آں عنایت کبیر ہم فرہاد
جاذبی غلام لائق نیز اصدی و حکیم و ہم ایجاد

ناصر و باقر و ثریا مہر دانش و ہم ذکی عالی نژاد
آں نہال و جمیل و محزوں نیز باز تلامذۂ لائق ارشاد

ضلع شاہ آباد میں جو لوگ شاگرد ہوئے اُن سے قطع نظر کر کے باقی اور شاگردوں کا مختصر حال یہ ہے :-

سخن خواجہ سید محمد فخر الدین حسین خاں۔ خلف خواجہ محمد جلال الدین عرف حضرت صاحب خلف خواجہ فقیر صاحب چشتی مودودی سجادہ نشین مقام لکھنؤ۔ سال غدر میں یہ اپنے عم نامدار مرزا محمد ابراہیم کے ساتھ آرہ آئے — عمر تقریباً پندرہ برس۔ مرزا صاحب موصوف نے ان کو حضرت صفیر بلگرامی سے ملایا۔ اسی زمانہ میں ان کو ایک فسانہ لکھنے کا شوق ہوا۔ مگر سکۂ رائج الوقت فسانۂ عجائب تھا جس کی شاعرانہ خصوصیات کا برتنا اور قیود و قوانین سے عہدہ برآ ہونا بچوں اور نومشقوں کا کام نہیں تھا۔ انھیں مجبوریوں سے جناب خواجہ فخر الدین حسین خاں نے نظم و نثر میں صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی کیونکہ اس صوبہ میں اُس وقت صفیر بلگرامی کی جگہ پرستارانِ اُردو کی صفِ اول میں تھی۔ بہر کیف خواجہ صاحب نے اُستاد سے سخن تخلص پایا۔ معمول یہ ہوا کہ جناب سخن اپنے فسانہ کا ایک یا دو ورق لکھ کر روزانہ اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جس روز خود نہ آ سکتے سپاہیوں پیادہ کے ہاتھ اوراق بھیج دیتے۔ سال بھر کی محنت میں وہ فسانہ تمام ہوا۔ یعنی ۱۲۷۶ھ میں چنانچہ تاریخی نام سروش سخن ہوا۔ اس کے دو برس کے بعد خواجہ صاحب نے وکالت کا امتحان دیا۔ اور آرہ میں وکالت شروع کی۔ پھر منصف اور صدر اعلیٰ ہوئے۔

سروش سخن کا مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے اُستاد حضرت غالب دہلوی کے پاس اس عریضہ کے ساتھ بھیجا تھا:-

> "....... ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخر الدین صاحب سخن جن کا دادیہال لکھنؤ اور ننیہال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں بعمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے۔ اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب ہوئے، اور مجھ سے تلمذ کیا، اور قصہ مسمیٰ بہ سروش سخن جس کو اُن کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا تھا۔ چونکہ اُس قصہ کو چھپنا چاہئے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں۔ اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے، اس لئے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اُس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے

اور طبیعت اُن کی سخن کی اچھی ہے چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ میں اصلاح کو آئی ہے۔ اُس کا ایک شعر میرے دل میں کھپ گیا۔ وہ یہ ہے ؎

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اس خط کا جواب حضرت غالب نے یہ دیا:

"مولوی سید فرزند احمد .... اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہونچے۔ آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترواں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے ؎

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ سروشِ سخن اس کے دوسرے دن پہونچا ....

..... قصہ دیکھا۔ آپ کی جوہر طبع کی لمعانی اور زبانِ قلم کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگر یہ وہ قصہ تو بچوں کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ آیندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی .... جا بجا اوپار لکھا ہے ....

لا کا لگانا کاتب کی جہالت ہے .... ہائے خدا کی مار کاتبان ناہنجار پر۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا .... تو۔ بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک اُن کو چپکا بٹھا رکھا۔ اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہونچاتے ہیں۔"

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا ؎

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غیلیٰ کی ہے دعا خدا کرے مرا غالب بنے ہزار برس

جناب غالب کے خط کا ایک جملہ تشریح طلب ہے۔ یعنی "اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کیا کہا ہے"۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب میں اہل دہلی کو بہت کچھ ناسزا کہا تھا سروشِ سخن میں اُس کا بھی جواب دیا گیا:۔

فسانۂ عجائب	سروشِ سخن
"جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے، کسی نے کبھی سنی ہو سنائے، لکھی دیکھی ہو دکھائے۔ عہد دولت بابر شاہی سے تا سلطنت اکبر ثانی کہ مثل مشہور ہے نہ چولھے آگ نہ گھڑے میں پانی۔ دہلی کی آبادی	اور جو اس قصہ کو ملاحظہ کرے وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانۂ عجائب کا جواب لکھا ہے .... کہاں فسانۂ عجائب کہاں سروشِ سخن، گمس کو ہما کے ساتھ کیا ہمسری؟ ذرہ کو سہا سے کیا برابری

دیرانی تھی ۔۔۔۔۔ یہ لطافت ، فصاحت اور بلاغت کبھی نہ تھی۔ نہ اب تک زبان میں ہے ۔۔۔۔۔ عیش و نشاط کی طرف (نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی) طبیعت جو آئی تو ایک ایک کنجڑہ ادنیٰ اعلیٰ ہفت ہزاری بنائی محمد شاہ (بادشاہ دہلی) کی گور تھرائی ۔۔۔۔۔۔"

جو لفظ و نثر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے ۔۔۔۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ جو اردوے معلیٰ کی زبان نہیں جانتا۔ تذکیر و تانیث نہیں پہنچانتا جو شاہجہاں آباد میں نہیں رہا ہے جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا ہے۔ وہ فسانہ کیا لکھے ؟ اردو جن کی زبان انھیں پہ طعن! ایسا بھی آدمی بے پیر نہ ہو بقول حضرت نسیم دہلوی ؏ نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

نمونہ کلام سخن دہلوی اصلاحی حضرت صفیر بلگرامی سے

(۱) کوئی بلا سے تیر کے پہلو نکال لے — یا رب! جو دل یہی ہے تو اک روز ہم نہیں

(۲) بہ مجبوری تمھاری ہاں میں ہاں ہم بھی ملاتے ہیں — نہیں کہنے کی جو باتیں ہیں وہ ناچار کہتے ہیں

کیا پامال ٹھوکر سے۔ جلایا جنبش لب سے — اُسے رفتار کہتے ہیں۔ اسے گفتار کہتے ہیں

جنوں! یوں تو بہت تنکے پڑے رہتے ہیں صحرا میں — چبھے جو پاؤں میں کانٹا اُسی کو خار کہتے ہیں

سلطان نواب سید تجمل حسین خاں۔ عرف سلطان میرزا۔ خلف نواب بہادر سید ولایت علی خاں۔ رئیس اعظم عظیم آباد یہ صاحب دیوان ہیں مثنوی درد دل بھی ان کی یادگار ہے۔ باب اول در بیان سن میں تفصیل موجود ہے جناب سلطان نے ایک غزل (سکندر دیکھ کر۔ چادر دیکھ کر) صفیر بلگرامی کو اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ اس غزل میں ایک مصرع لگا کر مقطع کر دیا۔

خود کیا ہے ہم نے سلطاں اپنے قاتل کو پسند — جس طرح تلوار کو لیتے ہیں جوہر دیکھ کر

اس مقطع کی داد دینے والے سب مر مٹے۔ باقیات الصالحات میں صرف تین بزرگ اسوقت عظیم آباد کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔ سید فضل حق آزاد۔ میر عنایت حسین امداد اور ڈاکٹر سید مبارک حسین مبارک۔ جس کو سمجھنا ہو کہ سلطان کے مصرع ثانی کو صفیر بلگرامی کے مصرع اول نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے، وہ اُن باقیات الصالحات کے پاس جائے اور سمجھے۔

جوشش شاہ خلیل الدین احمد عرف شاہ خلیل۔ خلف شاہ محمد اصغر۔ منیر شریف ضلع پٹنہ۔ ان کو خواجہ سخن دہلوی بابو مہدی بخش تسلیم عظیم آبادی کا شاگرد لکھتے ہیں اور جناب ناسخ ان کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں۔ سخن کی روایت میں کلام ہے۔ ناسخ کا بیان صحیح ہے کیونکہ ناسخ کچھ دنوں کے لئے مونگیر میں تھے۔ اُنکے جانے کے بعد مونگیر ہی میں جناب جوشش حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے اور اپنا فارسی اور اردو کلام اصلاح کے لئے پیش کیا۔ جناب جوشش اپنے ایک مکتوب میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔۔۔۔ اور ایک بات خیال آئی ہے - وہ یہ کہ جوشؔ تخلص بوجہ اس کے کہ بہت لوگوں کے اور اچھے اچھے شعرائے مغربی کے ہو گئے ہیں اب ترک کر دینا منظور ہو گیا ہے - اس لئے رمزؔ اور عقلؔ اور لاؔ تا ثیار ۔۔۔۔۔۔ پسند آئے ہیں - کیونکہ آفتاب کے سامنے ذرہ کی تابش کہیں ہو سکتی ہے ؟ اگر یہ التماس میری حضور میں پسند آئے تو رمزؔ تخلص تحریر فرما دیں گے (یعنی اُن دیوانوں میں جو اصلاح کے لئے صفیرؔ بلگرامی کے پاس آئے تھے) - اور رسید اس کی ارسال فرما دیں گے کہ شبہ نہیں پہونچنے کا نہیں رہے - زیادہ تسلیمات -

فقیر زادہ خلیل الدین احمد منیری - خاندان برباد کردہ مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری علیہ الرحمۃ"

نمونہ کلام ہے

اے ناخدائے کشتیٔ عمرِ روانِ ما ۔۔۔ خوش لبستہ زنّارِ نفس بادبانِ ما

سایہ کی طرح در پہ تو پیشے دے پامال ۔۔۔ مانا کہ پا سباں کے برابر نہیں ہوں میں

اصدقؔ میر جان علی شاگرد مولوی نثار علی وکیل عدالت باقر گنج بانکی پور - یہ حضرت شاہ قیام الدین اصدق کے مرید تھے اور اسی رعایت سے اصدقؔ تخلص کیا - خواجہ فخر الدین سخنؔ دہلوی بھی حضرت اصدق کے مرید تھے چنانچہ سروشِ سخن میں ایک قصیدہ کے دو شعر ہیں ؎

ستونِ کعبۂ اسلام - عرشِ اعظمِ علم ۔۔۔ کُلِ بہشتِ کمالات - خضرِ راہِ صفا

وہ کون حضرت شاہ جہاں قیام اسدقؔ ۔۔۔ کہ جس کے زیرِ کفِ پا ہے جنت الماوا

میر جان علی اصدقؔ وہی ہیں جنھوں نے مرزا دبیرؔ کی رباعی کے ایک مصرعہ پر اعتراض کیا تھا - اور صفیرؔ بلگرامی نے سودا کی سند پیش کی تھی - اصدقؔ نے ہار مان لی اور کچھ عرصہ کے بعد صفیرؔ بلگرامی کے شاگرد ہوئے - پھر اپنے دو بھانجوں کو شاگردی کے لئے پیش کیا - میر رفعت حسین بڑے بھانجے نے کبیرؔ اور میر کفایت حسین چھوٹے بھانجے نے صغیرؔ تخلص پایا - نمونۂ کلام اصدقؔ ؎

ہم رکھتے ہیں دونوں عکس و آئینہ کی کیفیت ۔۔۔ رخِ روشن وہاں اُس کا - دلِ روشن یہاں اپنا

نہالؔ سید شاہ نہال حسن - وطن مولا نگر ضلع مونگیر - مسکن بخشی محلہ عظیم آباد - پہلے یہ حکیم مولانا عبد الحمید صاحب پریشاں عظیم آبادی کے شاگرد تھے ۱۲۸۶ھ ہجری میں صفیرؔ بلگرامی کے شاگرد ہوئے - نمونۂ کلام ؎

آپ تلوار تولتے ہی رہے ۔۔۔ نگہ ناز کام کر بھی گئی !

حکیم مولانا عبد الحمید عظیم آبادی کے نام پر قلم واسطی بلگرامی کو رُک جانا چاہیئے تھا - کیونکہ اُن کا اور اُن کے گھرانے کا علم و فضل و تقدس داستانِ عظیم آباد کا ایک ضروری باب ہے - مختصر یہ کہ خاندانِ صادق پور کا رویہ اسلام کے ساتھ وہی رہا ہے جو مجنوں کا لیلیٰ کے ساتھ تھا یعنی ؎

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا یہی ۔۔۔ دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

چنانچہ مولانا عبدالحمید کے پدرِ گرامی قدر مولانا احمد اللہ صاحب نے سنہ ۱۲۸۱ ہجری میں آبِ دریائے گنگ کے بدلے آبِ دریائے شور قبول فرمایا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ؎

شرابِ زندگانی پی ہے صفیرؔ　　　یہ دیکھیے شراب عمر بھر جائیں گے

میرے کا ٹکڑا بھی سیراب ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ حکیم مولانا عبدالحمید بھی یگانۂ روزگار نہ ہوتے۔ موروثی جائدادیں ضبط ہوگئیں کتب خانہ لٹ گیا۔ گھر تباہ ہوگیا۔ مگر علم و فضل کا دریا خشک نہ ہوا۔ البتہ دریا پہلے صادق پور میں بہتا تھا۔ اب خواجہ کلاں محلہ میں بہنے لگا۔ ذرا اس تلاطم، اور تباہی، اور خانہ ویرانی، اور شکستہ پائی، اور پریشانی کی حد ملاحظہ ہو کہ مولانا عبدالحمید کا تخلص تک پریشاں ہوگیا ؎

پریشانی ہماری کاکل محبوب جانے ہے　　　پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے

چاند چودھویں کا ہو یا پہلی کا۔ یہ بھی چاند۔ وہ بھی چاند۔ مولانا عبدالحمید مرحوم کے نواسہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم (پی۔ اچ۔ ڈی) آج بھی صدر نشینِ مسندِ علم و فضل ہیں۔ بقول حضرت صفیرؔ بلگرامی ؎

کسی صورت میں اے واعظ نہیں نقصان پینے کا　　　کہ شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پیمانہ ہوتا ہے

شاد سید علی محمد شاد کی شاگردی کا واقعہ نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان میرزا یعنی سلطان عظیم آبادی اپنی تالیف مرقع فیض میں اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"شاد۔ سید علی محمد خلف جناب میر عباس صاحب مرحوم۔ رئیس حاجی گنج پٹنہ۔ یہ مولف تذکرہ کے بہت بڑے دوست لڑکپن سے ہیں۔ اکثر شب و روز کی صحبت رہا کرتی تھی۔ سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں جناب سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب ہجرتی نے جب مرزا علی صاحب کے امام باڑہ میں مشاعرہ شروع کیا اُس وقت میر علی محمد صاحب کو شاعری کا شوق شروع ہوا۔ اور جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد مدظلہ کے شاگرد ہوئے۔ اور شاد تخلص مقرر کیا۔

وہ مشاعرہ کوئی چھ سات مہینے تک رہا۔ اُس کے بعد محرم وغیرہ کے سبب سے موقوف ہوا۔ اُسی مشاعرہ میں حضرت صفیرؔ بلگرامی مدظلہ بھی بہ تحریک جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مظیرؔ آرہ سے تشریف لائے کہ شاہ صاحب انھیں دنوں آرہ میں جاکر حضرت کے شاگرد ہو چکے تھے اور مظیر تخلص پا چکے تھے۔ المختصر جب سنہ ۱۲۸۱ ہجری شروع ہوا تو بعد اربعین جناب سید حامد حسین صاحب نکہت نے کشمیری کوٹھی میں مشاعرہ بخاطر حضرت صفیر مقرر فرمایا کہ جناب ممدوح بھی انھیں کے مکان میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور دیوان صفیر بلبل چھپ چکا تھا چنانچہ اُس میں ایک تاریخ میر علی محمد صاحب شاد کی بہ شاگردی فریاد موجود ہے۔ غرض دوسرے مشاعرہ کی طرح میں میر علی محمد صاحب شاد بمعیت شاہ حفاظت حسین صاحب چار بجے دن کو میر حامد حسین صاحب نکہت کے مکان میں تشریف لائے۔ اور باستبداد تمام جناب صفیر کے شاگرد ہوئے۔ اور سنہ ۱۲۸۷ ہجری تک یک قلم بار تعلیم پائی۔ اور

دور و نزدیک یعنی بذریعۂ خطوط و ملاقات فیض پایا گئے۔ اور عین مشاعرہ میں اصلاح لیا گئے۔ اور شاد کامل ہوگئے۔

اور سب پہلے پہل بندہ سلطان کو بھی انھوں نے آمادہ کیا۔ اور اُن کی شاگردی سے دو چار روز بعد انھیں کے

مکان میں مجھے حضرت صفیر کی شاگردی کا اتفاق ہوا۔

اس تحریر کو دیکھئے اور نواب بہادر سید ولایت علی خاں رئیس عظیم آباد کے ہاں کی تقریب کو یاد کیجئے۔ اُس تقریب میں دو لڑکوں کا مونڈھے سے کھیلنا یاد کیجئے۔ ایک نووارد کا احباب کو اشعار سنانا یاد کیجئے اس روز س۔ش۔ ص۔ کا قضا و قدر کے جال میں آنا یاد کیجئے۔ اور پھر نو برس کے بعد ش اور ش کا ایک ہی ہفتہ کے اندر ص کی خدمت میں شاگردی کے لئے حاضر ہونا دیکھئے بقول حضرت امیر مینائی ؎

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی۔ عرف میرن صاحب کے ہاں مہینہ میں دو بار مشاعرہ ہوتا تھا۔ غزلیں شگوفۂ نکہت میں چھپتی تھیں۔ یہ گلدستہ عظیم المطابع واقع کشمیری کوٹھی عظیم آباد سے نکلتا تھا۔ ۴۰ برس پہلے کا ایک اشتہار ملاحظہ ہو ؎

شہر میں پھر بہار آئی ہے تازہ تازہ شگوفے لائی ہے
یعنی پھر یاں مشاعرہ ٹھہرا خوش زبانی کا پھر مزا ٹھہرا
پندرہ دن یہ جلسہ ہوتا ہے باغ و بستاں کا رنگ کھوتا ہے
بانی جلسہ با مروّت ہیں میر حامد حسین نکہت ہیں
مغتنم ہے بہت عظیم آباد اس کو رکھے خدا کریم آباد
اس طرح جب مشاعرہ ٹھہرا دوستوں کا یہ مشورہ ٹھہرا
ہے مزا جو مشاعرہ چھپ جائے خوش زبانوں کا تذکرہ چھپ جائے
از الف تا بہ یائے تحتانی ایک مجموعہ ہوگا لاثانی
ہوئی جب ردیف کی ترتیب پھر تو دیوان ہے عجیب و غریب
ڈھنگ شہرت کا یہ نرالا ہے بے تردد کلام چھپتا ہے
بے مشقت ہو مشق کی صورت کھل رہا ہو شگوفۂ نکہت

اس اشتہار میں ۲۷ شعر ہیں۔ صرف ۱۱ شعر یہاں لکھے گئے۔ یہ وہی یادگار گلدستہ ہے جس سے جناب شاد کی شاگردی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ وہی نکہت عظیم آبادی ہیں جن کے مکان میں جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ مفاظت حسین مطیر کے ساتھ صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اس یادگار مشاعرہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مظیرؔ عظیم آبادی شاگرد صفیرؔ بلگرامی

پھیلا ہوا جو اُن کی نگاہوں کا جال ہے
اب میرے مرغِ رنگ کو اُڑنا محال ہے

ہم کارزارِ عشق میں ثابت قدم رہے
رستم ہمارے منہ پہ پڑھے کیا مجال ہے

لایا ہے اُن بتوں کے محلے میں مجھ کو دل
مذہب میں جن کے خونِ مسلماں حلال ہے

محشر ہوا ہے مظیرؔ اگر میں برس پڑوں
پھر اُن کی نشست نہ گردوں کی چال ہے

شادؔ عظیم آبادی شاگرد صفیرؔ بلگرامی

[illegible] تشبیہ میں جو سب اُسے انتقال ہے
[illegible] ذات صنم سب لا زوال ہے

[illegible] گرہ گیر سے ہوا
[illegible] کیا مجال ہے

[illegible] بہار کہ پھولا ہے لالہ زار
گلشن میں جس درخت کو دیکھو نہال ہے

اے شادؔ کس طرح سے کروں عرضِ مدعا
ناآشنا ابھی صنم خورد سال ہے

اس زمین میں صفیرؔ بلگرامی کے چند شعر یہ ہیں سے

تیرا ہمارے درمیان سے جانا محال ہے
تو اے پری اسیرِ طلسمِ خیال ہے

تیری مثال نوعِ بشر میں محال ہے
آئینہ خانہ تیرا جہانِ مثال ہے

اس سے اُلجھ گئی۔ کبھی اُس سے اُلجھ گئی
تیغِ نگاہِ یار کی کچھ طرفہ چال ہے

ہنسنے میں اُس کے کھل کر باتیں نکلتی ہیں
سوجِ تبسم اُس کی زبانِ سوال ہے

نامہ نہیں، پیام نہیں، پوچھنا نہیں
کیونکر کہوں کہ آپ کو میرا خیال ہے

ہوتا ہے مجھ کو رنج تو ہوتے ہیں آپ خوش
دیوار قہقہہ مری گردِ ملال ہے

آہو ہے تو۔ تو کیا ہے؟ چھلاوا ہے تو۔ تو کیا؟
غافل! صفیرؔ پاس کمندِ خیال ہے

جناب شادؔ نے صفیرؔ بلگرامی کی شاگردی اختیار کی تو مرثیہ کہنے کا بھی شوق ہوا حضرت علی اکبر علیہ السلام کی شان میں اکادن بند کا ایک مرثیہ کہہ کر شادؔ نے صفیرؔ بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لئے پیش کیا۔ مرثیہ نامر بوط تھا۔ اُستاد نے جا بجا قطع و برید کی۔ رفو کیا اور اپنی طرف سے اکتالیس بند کا پیوند لگا کر مرثیہ کو درست کیا۔ یہ بانوے ۹۲ بند کا مرثیہ شادؔ کا سب سے پہلا مرثیہ ہے۔ اور یہ تبرک آج ستر برس سے آرہ میں ہے۔ آرہ میں کیوں ہے اس کی وجہ حضرت صفیرؔ بلگرامی سے سنئے:۔

"......... میں نے اکتالیس بند اور ملا کر ربط دیکر بانوے بند کا مرثیہ اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا۔ اور اُس پر اُنھوں نے

(شاد نے) چند رباعیاں پھر اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ اُس پر بھی میں نے اصلاح دی۔ آخر محرم میں معہ اُس مرثیہ کے اُن کو (شاد کو) جناب میرزا دبیر صاحب کے پاس لے گیا۔ جناب محسن صاحب مرحوم (انھیں سید محسن کے پوتے نواب سید نصیر حسین خاں خیال مرحوم ہیں) اُن کے ہم نام ابھی تھے مرزا صاحب کے پاس اُسوقت کوئی پچاس آدمی بیٹھے تھے (ان پچاس آدمیوں میں میر بادشاہ علی بقا لکھنوی خلف میر وزیر علی صبا لکھنوی بھی تھے)۔ جناب محسن صاحب نے فرمایا یہ میرا بھتیجا ہے۔ اور اس نے مرثیہ کہا ہے۔ حضور کے پاس اصلاح کو لایا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا آپ کس کے شاگرد ہیں۔ جناب شاد نے کہا میر صفیر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے دیکھ لیا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ اور میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ اُس وقت میرزا صاحب نے دو ایک بندوں پر اصلاح دی۔ اور پھر رکھ لیا آخر وہ مرثیہ مرزا صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ اور دوسرے یا تیسرے برس وہ مرثیہ اصلاح دیکر مرزا صاحب نے لاکر جناب شاد کو دیا۔ انھوں نے مجھے دکھایا۔ میں نے اُن سے لے لیا اور وہ بجنسہ معہ مسودہ جناب شاد اور اُس پر جناب مرزا صاحب کی اصلاح میرے پاس موجود ہے۔"

یہ مسودہ آج انمول ہے۔ اس کو گلِ بکاؤلی بھی نہیں پا سکتا۔ کیونکہ وہ شنیدہ ہے اور یہ دیدہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کی تحریر، صفیر بلگرامی کی تحریر، میرزا دبیر لکھنوی کی تحریر۔ ان تینوں تحریروں کی زیارت نصیب ہو سکتی ہے تو اسی مسودہ میں، اب نمونۂ اصلاح ملاحظہ ہو ۔

اصل بند شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
بند ۵۷ رخ کے قریں جو لٹی ہے زلفِ سیاہ فام	پہلوئے رخ میں دیکھ کے زلفِ سیاہ فام
غل ہے کہ اک جگہ ہے بہم نورِ صبح و شام	کہتے ہیں سب کہ آج بہم دیکھے صبح و شام
یا شام میں ہے یوسفِ ذیجاہ و احترام	یا چاہ میں ہیں یوسفِ ذیجاہ و احترام
کعبہ میں یا خلیل نے آکر کیا مقام	یا کعبہ میں خلیلِ خدا نے کیا مقام
پھر دعا جو عزم شہِ کائنات ہے مشغول سیر ہاں عقبِ ذرات ہے	عزمِ دعا میں ابن شہِ کائنات ہیں مشتاقِ سیر کی عقب روندارات ہیں
بند ۵۸ ڈوبا ہے وصفِ چاہِ ذقن میں دلِ حزیں	ڈوبا جو وصفِ چاہِ ذقن میں دلِ نزار
زمزم میں یا کہ ہے مہِ کنعانِ برتریں!	گوہر کی طرح مل گئے مضمونِ آبدار
کہتا ہے یہ تلاطمِ دریا نہیں - نہیں	خالی نہیں ہے آب سے یہ چاہِ زینہار
ظاہر ہے صاف دُرِ نجف کا ہے یہ نگیں	ہے چشمۂ دہن سے یہاں آب برقرار
چاہِ ذقن کے پاس خطِ مشکبار ہے کوثر کے گرد سبزۂ رنگیں بہار ہے	چاہِ ذقن کے پاس خطِ مشکبار ہو کوثر کے گرد سبزہ کی دونی بہار ہے

ئردکس طرح ٹھوکریں کھاتا ہے اور اُستاد اُس کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ یہ دیکھنا ہو تو پہلے بند کی ٹیپ کا پہلا رع اور دوسرے بند کا دوسرا مصرع دیکھئے یعنی شہہِ کائنات اور زمزم میں مہِ کنعان۔ شاہ کائنات کا فرزند شاہ کائنات ہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ماہِ کنعاں کو زمزم سے کوئی واسطہ نہیں۔ جاسئے اُستاد خالی است!

اس مرثیہ کا آخری بند یہ تھا ؎

اے شادؔ بس۔ کہ طول کا دینا نہیں پسند   پہونچی ہے اب کہاں سے کہاں فکرِ ارجمند
مضموں کے ساتھ ہونگے ترے مرثیے بلند   مطبوعِ طبعِ اہلِ سخن ہونگے سب یہ بند
شایانِ خود پسندی و اعزاز تو نہیں
یہ پٹنہ ہے۔ یہ پٹنہ ہے۔ کچھ لکھنؤ نہیں

مرزا دبیرؔ لکھنوی کی مروّت اور بلند نظری نے یہ گوارا نہ کیا کہ عظیم آباد کا پلّہ لکھنؤ کے مقابلہ میں سبک ہو۔ اس لئے بادشاہِ لکِ معانی نے اصلاح یہ فرمائی ؎

یارب یہ باغِ نظم ترا بے خزاں رہے   اک رنگ پر بصورتِ باغِ جناں رہے

س پہونچے ہوئے فقیر کی دعا کا اثر دیکھئے کہ آج شادؔ کی پھلواری میں بہارِ بے خزاں کا دور دورہ ہے!

شاگردی کے زمانہ میں جناب شادؔ کو کن کن منزلوں سے گزرنا ہوا تھا اس کی تفصیل کے لئے دفتر چاہئے اس دفتر کا یک پرزہ یہ ہے:-

کلام شادؔ عظیم آبادی	اصلاح صفیرؔ بلگرامی
(۱) گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کا دخل ہے	گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کی ہلچل ہے
خدا کے فضل سے کیا ان دنوں آباد جنگل ہے	ذرا دیکھ لے جنوں۔ کیا ان دنوں آباد جنگل ہے
ہماری آنکھ سے وہ شمعِ خوبی جب سے اوجھل ہے	عجب اندھیر ہے۔ وہ شمعِ خوبی جب سے اوجھل ہے
تو اپنے خانۂ تاریک میں آہوں کی مشعل ہے	مرے تاریک گھر میں نالۂ سوزاں کی مشعل ہے
کہیں سر وجد میں ساکن۔ کہیں لاشے اوچھلتے ہیں	کہیں سر وجد میں جنباں۔ کہیں لاشے اوچھلتے ہیں
ترے آنے سے او سفاک بزمِ حال مقتل ہے	ترے آنے سے او سفاک بزمِ حال مقتل ہے
دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی	دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی
صدف مینا ہے۔ ساغر ساقیا نیساں کا بادل ہے	صدف ساغر ہے۔ مینا ساقیا نیساں کا بادل ہے
(۲) نہ ہوئے عاشقوں میں نام تک لا سکا کبھی روشن	نہ ہوتا عاشقوں میں نام تک میرا کبھی روشن

بجھا دی شمع تربت کا فرشتے آکر میرے مدفن پر
نزاکت نے دیا قاتل کا میرے دیا ان کو
کہ خنجر تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر
چمن میں جب تلک ملتے رہے مستی رہ ہونٹوں میں
میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر

(۳) پہلو سے چھوٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
جنگل سے اسے جنوں کوئی وحشی جدا نہ ہو
لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو
ملنے کا تیرے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو
چاہا تو تھا کہ فیصلہ جسم و جاں کرے
ہجراں کا کیا گناہ جو سیری قضا نہ ہو
نازک ہے دل مزاج کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو
زیبا نہیں ہے رشک دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ ہماری قبا نہ ہو
رہنے دو تا بہ رگ تصور اس آنکھ کا
آنکھوں سے میری ساغر و مینا جدا نہ ہو
مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
اسے شاد کیا کروں جو طبیعت [illegible] نہ ہو

(۴) گئی ہرگز نہ بوسے میرزا یا نہ [illegible]
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ [illegible]
حرارت بوسے کی جس دم سوا گرمیِ محشر سے
چھپا لوں گا [illegible] جسم زار اپنا دامن تر سے
جو وہ زلف سیاہ فتنہ ساماں رام ہو جائے
تو بھر دوں یا الٰہی طاق مسجد خشک عنبر سے

بجھا دی شمع تربت کا فرشتے آکر میرے مدفن پر
نزاکت نے نہ چاہا خنجر کو ان کے ہاتھ کا کشتہ
کہ خنجر تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر
وہ جب تک باغ میں ملتے رہے مستی کو دانتوں میں
میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر
پہلو سے چھوٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
نکہت میں اسے جنوں کوئی گھر سے جدا نہ ہو
لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو
ملنے کا تجھ سے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو
چاہا تو تھا کہ فیصلہ جسم و جاں کریں
وحشت کا کیا گناہ جو اپنی قضا نہ ہو
اپنے دل غیور کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو
زیبا نہیں ہے ناز دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ ہماری قبا نہ ہو

{ "یہ شعر کچھ نہیں"

مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
کیوں شاد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو
گئی ہرگز نہ بوسے میرزا یا نہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ زر سے
حرارت جبکہ بھڑکے گی سوا خورشید محشر سے
چھپا لوں گا میں جسم زار اپنا دامن تر سے
جو وہ زلف سیاہ فتنہ ساماں ہاتھ آجائے
بھروں گا یا الٰہی طاق مسجد مشک و عنبر سے

مثالِ عاشقِ شیدا جو ہر دم اس کا طالب ہے
ملا کیا لطف اس غم کو ہماری جانِ مضطر سے
براقت ہیں صفا میں روشنی میں۔ ایک پاتا ہوں
کروں گا استعارہ دل کا رخسارِ منوّر سے
شبِ فرقت جب آئی خونِ دل اپنا پیا آکر
نہیں مہماں بھرا بھوکا۔ خلیل اللہ کے گھر سے
دمِ رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
گئی باری اجل پھر پھر گئی آ آ کے بستر سے

(۵) مخمس بر غزل خواجہ وزیر لکھنوی

کون سی ساعتِ بدتھی جو یہاں آکے پھنسے
پاسئے وحشت زدہ بڑھ بڑھ کے مژہ نے چومے
حضرتِ خضر کچھ آگاہ ہیں ان باتوں سے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہئے
گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر

حلقۂ گیسوئے پیچیدہ نہیں۔ زنداں ہیں
یہ بھی انسان۔ کرو غور۔ نہیں۔ حیواں ہیں
چھوٹنے کی نہیں صورت۔ تو عجب حیراں ہیں
دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کر دو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

مژۂ وحشتِ دل دشت میں چکھا ہم نے
اے جنوں رتبۂ عالی ترا دیکھا ہم نے
کر کے صحرا میں گزر۔ لطف اٹھایا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے
چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر
شاد سے پوچھئے کیفیتِ حالِ دلگیر

بلسانِ عاشقِ شیدا جو ہر دم گرم ہے اس کے
ملا کیا لطف ہے غم کو ہماری جانِ مضطر سے
صفائی میں جلا میں روشنی میں ایک پاتا ہوں
بجا ہے استعارہ دل کا رخسارِ منوّر سے
شبِ فرقت جب آئی خونِ دل کا کر دیا حاضر
نہیں مہماں بھرا بھوکا خلیل اللہ کے گھر سے
دمِ رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
گئی باری اجل پھر پھر گئی آکر مرے سر سے

.. ..

جائے رقت ہے۔ اسیری کے محن کیا کہئے
ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ حالِ بدن کیا کہئے
جس کی تحقیق نہ ہو کچھ وہ سخن کیا کہئے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہئے
گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر

بے وفا! دونوں ہیں گیسو ترے یا زنداں ہیں
ان کے حلقوں میں ہیں دل۔ یا کہ مہِ کنعاں ہیں
سالہا سال سے بیچارے بلا گرداں ہیں
دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کر دو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

جب کیا وادیٔ وحشت کا ارادہ ہم نے
جسم سے رختِ تعلق کو اتارا ہم نے
جا کے لی سلطنتِ وادی و صحرا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے
چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر
قابلِ رحم ہے اب شاد کا حالِ دلگیر

ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے اُلفت کے اسیر	ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے اُلفت کے اسیر
حال کیا کیجئے اب آپ سے اپنا تقریر	حال کیا کیجئے اب آپ سے اپنا تقریر
ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھ کو وزیر	ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھ کو زیر
زیر پا چاک گریباں ہے۔ تو داماں سر پر	زیر پا چاک گریباں ہے۔ تو داماں سر پر

ان اصلاحوں کا سلسلہ کامل سات برس تک جاری رہا۔ ۱۲۹۱ھ سے ۱۲۹۸ھ تک۔ اس زمانہ میں صفیر بلگرامی کا قیام زیادہ تر عظیم آباد کشمیری کوٹھی میں تھا۔ اس وجہ سے جناب شاد کو فیض حاصل کرنے میں بہت سہولت ہوئی۔ خود حضرت صفیر بلگرامی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"........ (ہمبری عظیم آبادی کے ہاں جو مشاعرہ ہوا تھا اُس میں) جناب میر علی محمد صاحب شاد کا حال معلوم ہوا کہ پانچ چار مہینے سے شعر کہتے ہیں۔ اور جناب شاہ اُلفت حسین صاحب فریاد سے اصلاح لیتے ہیں استنے میں گزری کا مشاعرہ برخاست ہوا۔ اور اب میری خاطر سے کشمیری کوٹھی میں جناب نکہت کی طرف سے ہونے لگا.... اُسی مشاعرہ کی دوسری طرح میں (زمین ملال ہے خیال ہے).... غزل کہہ کر جناب شاد میرے پاس اصلاح کیلئے لائے۔ اور شاگرد ہونے آئے..... میں تو جانتا تھا کہ وہ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد کے شاگرد ہیں مجھ کو تامل ہوا۔ اور استفسار کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا وہ کلکتہ جاتے ہیں اور میں آپ کے سوا کسی دوسرے کو قابل اصلاح دینے کے نہیں پاتا..... آخر میں نے بعد اصرار کے قبول کیا اور چند رئیسانِ کشمیری کوٹھی کے سامنے اُن کی غزل پر اصلاح دی اور ہر اصلاح پر وجہ اصلاح کی بھی لکھ دی۔ اُس دن سے جناب شاد اصلاح لینے لگے۔ اور میں بھی روزانہ چار گھڑی دن رہتے حاجی گنج جاتا اور نو دس بجے شب کو سواری پر وہاں سے آتا۔ اور یہی حال برسوں رہا۔ اس مدت میں بیسیوں مشاعرے ہوئے اور جناب شاد کو شوق بڑھتا گیا اور میں نے بھی اپنی کم مائگی پر جو کچھ جانتا تھا بتانے میں دریغ نہیں کیا۔ اور اُن کی طبیعت کو اول جو پستی تھی اُس کو طریقہ بتا بتا کر بلند کر دیا اور اپنے ڈھنگ اور اپنے خاندان کی وضع پر لایا...."

اس بیان کی تصدیق خود جناب شاد کا قلم اس طرح کرتا ہے

مخمس ۱

دروغ گو نہیں کچھ شاد جو زباں پھیرے		جہاں میں کہنے کو شاعر ہیں یوں تو بہتیرے
جو مجھ سے پوچھ تو یہ ہے گماں میں میرے		صفیر لطف ہے ملتا کلام میں تیرے
زباں خوب ہے تیری۔ بیاں بہت اچھا

مخمس ۲

کر لیا ہے شاد کو زلفِ مضامیں نے اسیر		فی الحقیقت آپ اس فن میں نہیں رکھتے نظیر
اب نئی طرحوں میں پڑھئے شعر ہائے دلپذیر		یہ زمیں تفریح کی تھی۔ بس کریں آپ اے صفیر
ہو چکے اس میں بہت اشعار رہنے دیجئے

زمانۂ شاگردی میں جناب شاد نے اپنے اُستاد صفیر بلگرامی کو جو خطوط بھیجے اُن میں سے چند یہ ہیں :۔

مکتوب اوّل بلبل شاخسار حدیقۂ جادو بیانی جناب اوستاذی میر فرزند احمد صاحب ظلہ العالی۔ بعد تسلیم عرضہ سا است بخیریت بودہ صحت وری مزاج اقدس می خواہد۔ از چندے احوال صحت وری معلوم ندارم۔ خداوند کریم ذات عالی را از جمیع بلیّات محفوظ دارد۔ بمنہ وکرمہ۔

دریں مشاعرہ سوائے بندہ وشاہ حفاظت حسین صاحب وسید کاظم حسین صاحب کسے نبود۔ جناب خود تشریف نداشتند تا بدیگراں چہ رسد؟ بنائے جلسہ را لاحاصل دانستہ موقوف ساختم۔ وباوجود وعدہ جناب میر حامد حسین صاحب نیز تشریف نیاوردند۔ برائے تفریح طبع دریں روزہا میخواہم کہ بخدمت شریف حاضر شوم۔ اطلاعاً عرض ساخت۔ زیادہ حد ادب۔

کمترین علی محمد عفی عنہ

مکتوب دوم بلبلۂ صفیر منقار گہربارش لب طوطیان ہند بند د۔ دام ظلہ۔ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد عفی عنہ تسلیم و نیاز می رساند۔ روزیکہ جناب والا رونق افروز خانہ ام بودند بحسب تذکرہ دو چہار بند مختلف از مراثی جناب مرزا دبیر صاحب خواندہ بودند۔ پس منجملہ آں اگر کدامی مرثیہ ایں جا باشد بعنایتش ممنون تواں فرمود۔ والّا دو چار بند کہ یاد باشد نوشتہ عنایت فرمایند۔ بخدمت جناب میر حامد حسین صاحب نکہت سلام می رسانم۔ فقط

علی محمد شاد

مکتوب سوم ہادی ہر گروہ معرکہ آرایان سخن اوستادی۔ شبستان فصاحت را شمع انجمن دام عنایتہ۔ شاد چوں دل خود در اضطراب ہدیہ سلام وتحیات تسلیمات رسانیدہ عرضہ دہ اینکہ عرصہ ہوا کہ آپ کی خیریت سے آگاہ نہیں ترسیل عنایت نامہ ضرور ہے کہ اس سے باعث زور وقوت شاگرد نیاز مند متصور ہے۔

ان دنوں عجب واقعہ، طرفہ ماجرا، برپا ہے۔ ہر چند پہلے مولوی محمد احسن صاحب شاعر گرو میر محبوب شیر شاگرد اُن کے ہم سے مباحثہ میں الزام اُٹھا چکے ہیں، اب پھر وہی تقریب پیش آئی۔ ایک آشنا کے مکان پر بندہ گیا تھا۔ وہاں ایک سادی کتاب رکھی تھی۔ اُس میں کچھ اشعار مولوی صاحب کے لکھے تھے۔ اور ایک رنڈی ہر مسمی جُبّا۔ ردیف غزل اُسی کے نام سے تھی۔ بندہ نے وہیں ایک غزل اُسی قافیہ ردیف میں کہہ کے لکھ دی۔ جب مولوی صاحب کے ملاحظہ میں آئی تب اُنھوں نے ایک مطلع اور دو شعر اُس کتاب میں لکھ کر جو عبارت کہ ہم آگے لکھیں گے لکھ دی۔ جب بندہ نے وہ دیکھا خدا کے فضل سے وہیں جواب اُس کا لکھا اور پھر مولوی صاحب نے اُس کو دیکھ کے جواب لکھا۔ بندہ نے پھر اُس کا جواب لکھا جب سے پھر اُس کا جواب مرحمت نہ ہوا۔ اس شہر میں ایک دھوم ہوئی کہ جناب شاعر گرو صاحب سپر انداختہ ہوئے اور الزام کھایا۔

چونکہ اطلاع اس کی آپ کی جناب میں حقیر کو ضرور تھی اس واسطے التماس کیا۔ فقط کمترین علی محمد شاد

مکرر آنکہ جو کچھ امان علی خاں صاحب پدر یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاء اللہ۔

نقل عبارت مولوی صاحب

"جس شخص کو دعویٰ شاعری ہو، اس میں شعر کہے، تب حقیقت امر کھلے۔

ببیں کہ دارم بسوز عشقت　　جگر میں داغوں کا ایک گلشن
متاعُ رُوحی فِداکَ اُنظُر　　تنک تو پیارے ہمار کلپن　} سلہ

ثنائے حسنت چہ بہ نگارد　　تمہارے غمزوں کا کشتہ احسن
تخجّل الشُمس والکواکب　　تمہارے مکھ کی دمک سے سرجن　} سلہ

اور یہ مطلع ہے کہ جس پر ہم کو دعویٰ ہے کہ درائے قافیہ جبّا و قبّا کوئی نہیں کہہ سکتا۔

کل جو ہم نے طرفِ سینۂ جبّا دیکھا　　صفحۂ حسن میں اس نور کا قبّا دیکھا

راقم محمد احسن عفی عنہ

الجواب :۔ تیغ آبدار مربای سوال اول کے جواب میں رطب اللسان ہے ؎

بگو دلا۔ چیست حالتِ تو　　بتا تو اے عقل و دین کے دشمن
فجاءَ من فی الخیالِ الآن　　جو بیٹھا بیٹھا کرے ہے سن سن　} سلہ

چناں ز وحشت تبنگ گشتم　　کہ روز کرتا ہوں چاک دامن
فکنتُ کالقیسِ یا حبیبی　　پڑے جو بپتا تو لاج کیسن　} سلہ

وصالِ تو بہر دردِ فرقت　　دوا ہے اے حور عیسوی فن
لِعلّتی لاشفاءَ قط　　لگاؤ ہو ماتھے پر جو چندن　} سلہ

سلہ برہ کی سلگن سے جگر داغ داغ ہے۔ داغوں کی پھلواڑی ہے۔ اے پیارے! ہماری جان تجھ پر فدا ہو! اس تڑپن کو ایک نظر دیکھ تو لے!

سلہ تیری اداؤں کا مارا احسن تیرے حسن کی تعریف کرے تو کیا کرے؟۔ جب تیرے مکھڑے کی دمک سے سورج اور سورج نبستی تک شرمائے جا رہے ہیں۔

سلہ اے دل! اے عقل اور دین کے دشمن! تیرا حال کیا ہے؟۔ تجھ کو اس وقت کس کی یاد آگئی جو تو بیٹھا ہوا یوں سن سن کر رہا ہے؟

سلہ وحشت کا اب یہ زور ہے کہ دامن ہر روز پھٹتا ہی رہتا ہے۔ اے لیلیٰ! تیرا دیوانہ کہتا ہے کہ بپت کا مارا لاج کرے تو کہاں تک کرے؟

سلہ جدائی کا درد وصل سے جاتا ہے۔ ماتھے پر چندن لگانے سے نہیں جاتا۔ بیدجی مہاراج! اب آپ ہی بتلائیں کہ آپ کا روگی اچھا ہو تو کیونکر ہو؟

شدہ است حالم چناں ز وحشت — کہ ہوئے جس کے بیاں سے اُلجھن
فَفِی فِرَاقِ الحَبِیبِ سِرتُ — اتیت جیسے پھرے ہے بن بن [۱]

صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے — تمھاری آفت کی چشم پُرفن
یَکُونُ سَیفاً لِقَلبِ مَحزُونِ — غضب کریں ہیں تہارے چتون [۲]

شدہ است تاریک و تار از حد — مری نظر میں جہانِ روشن
رَأَیتُ فِی اللَّیلِ یَا اِلٰہِی، — یہ ہم نے سپنے میں کِہ کا درسن [۳]

دلم شکستہ چو جام شیشہ، — خبر ہے او عاشقوں کے دشمن
مِنَ الحِجَارِ الفِرَاقِ اُنظُر — یہ تم نے چھوڑیو ہمار باسن [۴]

سگے چو آمد بزیر پایش — ز اتفاقات میرا مدفن
فَقَالَ مِنَ الرَّحمِ قُم بِاِذنِی — موئے ہو تم شاد کِہ کے کارن [۵]

اب جواب سوال ثانی کا بیان ہے۔ بہت عجب ہے۔ اور مقام فکر و تعب کہ کس دانائے بے بدل، اور کس جادو نگار شیوا زبان نے یہ مطلع، مثل مطلع خورشید، آسمانِ کاغذ پر جلوہ گر کیا ہے، اور کس ناظم دور اندیش، انشا کیش نے اس عبارت کو لکھ دیا ہے۔ اول مشبہ بہ واحد کا اُس مقام پر استعمال ضرور ہے۔ اور اگر مشبہ جمع ہے تو مشبہ بہ جمع لانا ایسے مقام پر دستور ہے۔ لیکن یہ مطلع عاشقانِ بے سروپا کی طرح، دونوں سے مہجور ہے۔ اگر یہ مطلع پھر درست کر کے لکھیں تو ہم اس پر توجہ کریں۔

اور ایک دو قافئے نادر اگر تلاش سے ہاتھ آئیں تو باعث فخر و مباہات نہیں۔ اکثر ہم کو بھی نکال لیتے ہیں۔ کچھ بات نہیں یہ امر اتفاقیہ دلیل شاعری نہیں۔ برہانِ ماہری نہیں۔ وہ بھی ٹھیک نظر نہیں آتا۔ کیونکہ لفظ حبا ساتھ الف مقصورہ کے علم ہے۔ اور قبا ہائی مختفی کے ساتھ ضم ہو۔ ہر چند صحت قافیہ آشکارا ہے۔ پر طبع رسا کو کب گوارا ہے سے ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

---

[۱] جنوں کا اب یہ عالم ہے کہ اس کے بیان تک سے اُلجھن ہوتی ہو۔ جس طرح بیراگی بن بن مارا پھرتا ہو اسی طرح اپنے پیارے کی جدائی میں ہم بھی کہیں چین نہیں

[۲] اے پیارے بتا تجھ کو کوئی کس طرح سمجھائے کہ تیری جادو بھری آنکھ کیسی تھہری اس بیچارے دل کو دیکھ اور اپنی تلوار کو دیکھ۔ اللہ رے تیری چتونوں کا غضب۔

[۳] اے اللہ! یہ ہم نے رات سپنے میں کس کا درشن کیا ہو کہ اسوقت دن دوپہر ہے مگر آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے!

[۴] اے چاہنے والوں کے دشمن! تو نے تو ہمارا باسن ہی چھوڑ دیا۔ دیکھ لے کہ جدائی کے پتھر سے دل کا شیشہ چور چور ہے یا نہیں!

[۵] ایک دن اتفاقیہ اُس کے پاؤں کے نیچے ہمارا مدفن آ گیا تو رحم اُس کو آ ہی گیا۔ کہنے لگا کہ "قم باذنی!" اب اُٹھ جا۔ اور ہاں اے شاد تو نے کس کے کارن اپنی جان گنوائی ہے؟

پردے میں گفتگو کب خوب ہے۔ اپنے نزدیک معیوب ہے۔ گیسوئے مشکبار سخن کو طول ہو۔ کسی صحبت میں اس کا چرچا معقول ہو۔ ہچو مرداں سرمیداں آیند درپسِ پردہ زباں نکشایند
مطلع کا جواب پائیں۔ کچھ حظ اٹھائیں۔

کتبہ خادم الشعرا سید علی محمد شاد عفی عنہ

مکرر یہ کہ ایک غزل بندہ نے کہی ہے۔ طالب جواب ہے ؎

یاد آئی کیوں اسیری میں ترے بالے کی گونج	توڑتی ہے سقفِ زنداں کو مرے نالے کی گونج
میکدہ میں قلقلِ مینا سے شورِ صور ہے	حشر برپا کر رہی ہے آج متوالے کی گونج
ابتدائے حسن میں کب تھی تمھیں اتنی تمیز	یاد ہے۔ کہتے تھے اکثر کھولدو بالے کی گونج
دسترس ہو کاش ہم کو بھی کبھی اے آسماں!	وصل میں وہ ہم سے کھلوایا کریں بالے کی گونج
زلفِ جاناں کے تصور میں جو روئے دشت میں	میرے نالوں سے کہیں دب دب گئی بالے کی گونج

کیا اسے ہالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد
غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

جواب از طرف محمد احسن :۔
یہ چند سطریں کسی کی لکھی ہوئی نظر سے گزریں۔ کیفیت استعداد کاتب ہویدا ہے۔ اگر سوال قابلِ جواب ہوتا دیا جاتا۔ قابلِ خطاب نہ جان کر احتراز کیا۔ مگر باصرار عنایت فرمائے حاضر الوقت دو تین بیت بجواب ہرزہ ایراد معترض لکھ دئے جاتے ہیں

فردوسی :۔ چو بکشاد آں طرۂ مشکناب شب آمد بپا بوسئ آفتاب

مولانا جامی علیہ الرحمہ :۔ چو فرق آراست آں پاکیزہ گوہر کشیدہ بر محک گویا خطِ زر

قلق :۔ سامنا سلطانِ عالم سے ہمارا ہو گیا پرتو خورشید سے ذرہ ستارا ہو گیا

العاقل تکفیہ الاشارہ۔ اگر خرد است ہمیں قدر بس است۔

محمد احسن

جواب الجواب :۔ یا قوم انی لکم من الناصحین۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ کاتب کا لکھا دیکھا۔ یہ جو تحریر ہے کہ سوال قابل جواب نہیں۔ یہ وہی مثل ہے کہ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔ اور جو اشعار اساتذہ نے لکھے ہیں وہی ہے کہ ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا الایا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

وہ اشعار جواب نہیں۔ جواب دہندہ کامیاب نہیں۔ جو اصل قاعدہ ہے وہی مطلع میں رہ گیا ہے۔ اس میں جائے گنا کیا ہے۔ مگر عارفوں کی بول چال ہے۔ اس کا سمجھنا محال ہے۔ فقط

عبدالمذنب سید علی محمد شاد

نقل لفافہ مہری ڈاکخانہ پٹنہ وآرہ۔

بعالی ملاحظہ یہ بہ جا تک صاحبانِ بلگرام بعونہٖ تعالیٰ بقصبہ آرہ ضلع شاہ آباد ۔
بلبل شاخسار خوش بیانی جناب اوستادی سید فرزند احمد صاحب قبلہ المتخلص بصفیر دام ظلہٗ
مشرف باد ۔ از عظیم آباد ۔ علی محمد شاد ۔ بیرنگ

جناب شاد کا اپنے استاد صفیر بلگرامی کے نام یہ بیرنگ خط پڑھیے اور پھر نواب سید محمد خاں رند لکھنوی کا یہ مقطع پڑھیے ؎

چل کے اب عرض کرو حضرتِ آتش سے رند معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

جناب شاد کے اس پرلطف خط میں چند باتیں تفصیل طلب ہیں :۔

(۱) عظیم آباد میں ایک مرتبہ ڈھول پٹ گیا کہ صفی پور ضلع ہردوئی سے ایک استاد ایسا آیا ہوا ہے جو آٹھ دن میں شاگرد کو خاقانی اور سعدی اور فردوسی بنا دیتا ہے ۔ یہ غوغا ہوا تو پچھم سے پورب سے دکھن سے اتر سے جو آتا ہے وہ سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے مکان کا پتہ پوچھتا ہے کیونکہ یہ عجیب وغریب استاد اسی مکان میں جلوہ فرما تھا۔ اس جادو گھر میں ایک نومشق بھی جاتا ہے تو دو دن کے بعد حافظ اور جامی کے لباس میں نکلتا تھا۔ سید محبوب شیر اور دیگر شاگردوں سے پوچھا گیا کہ آخر معمہ کیا ہے تو جواب ملا کہ استاد کا حکم ہے کہ یہ راز فاش نہ ہو۔ تب ایک جاسوس بھیجا گیا یعنی عبدالحکیم تمکین قنوجی ۔ اس جاسوس نے شاگردی اختیار کی اور دو دن کے بعد راز فاش کیا کہ ـــــ استاد کے پاس دو کتابیں ہیں ۔ ایک میں مترادف الفاظ ہیں ۔ دوسری میں مترادف فقرات ۔ جس شاعر کی غزل کے موافق کہنا ہو وہ کتاب سامنے رکھ دی جاتی ہے ۔ الفاظ کی تبدیلی کر کے مصرع موزوں ہو جاتا ہے ۔ پہلے تو کتاب رکھنے کی حاجت ہوتی ہے ۔ پھر مبتدی اس کے الفاظ و فقرات مترادف کو یاد کر لیتا ہے ۔ اور غزل پر غزل کہہ دیتا ہے ۔

یہ استاد وہی استاد ہے جس کو جناب شاد نے اس خط میں مولوی محمد احسن شاعر گر لکھا ہے ۔ شاعر گر سے مراد یہی واقعات ہیں ۔ اور عجب اتفاق کہ تمکین قنوجی جنھوں نے احسن کا راز فاش کیا ۔ اور شاد عظیم آبادی جنھوں نے احسن کو شکست دی ، دونوں صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے ۔ احسن کو بدگمانی ہوئی کہ پس پردہ صفیر بلگرامی ہیں ۔ حالانکہ جناب شاد کا یہ خط شاہد ہے ۔ کہ عظیم آباد میں جس وقت یہ معرکہ ہو رہا تھا صفیر بلگرامی اسوقت آرہ میں تھے ۔

احسن کا قیام سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے ہاں تین چار برس رہا ۔ مگر تمکین و شاد کا بخار انھوں نے صفیر بلگرامی سے نکالا ۔ اور باوجود ہموطنی کے (صفی پور موضع بلگرام کے پاس ہے) ان سے ملاقات نہ کی ۔ صفیر بلگرامی نے ایک مرتبہ رقعہ لکھ بھیجا ، جس میں کسی کا یہ شعر بھی تھا ؎

تعجب کی جگہ ہے ۔ ہم تم اک بستی میں بستے ہیں اور اُس پر یہ مزا ہے ۔ دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

اس کا جواب احسن نے دیا کہ جو مشتاق ہو وہ خود آئے ۔ الغرض احسن تین چار برس رہ کر اور سید محبوب شیر صولت کو صاحب دیوان بنا کر غازی پور چلے گئے ، وہاں محمد تقی کوکب جونپوری ، حکیم محمد اسحاق حاذق لکھنوی وغیرہ احسن کے

شاگرد ہوئے۔ اب عظیم آباد کا واقعہ سنئے کہ سید محبوب شیر نے اپنا دیوان میر قاسم شیر کے ہاتھ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت میں بھیجا۔ اور تقریظ لکھنے کی استدعا کی۔ مولانا حسرت نے یہ لکھ کر ٹال دیا:۔

"وصف کلام فصاحت التیام سامی کہ مالا مال نازک خیالی ہاست چہ گویم کہ می ترسم کہ تحسین ناشناس موجب شکست قدر آں گوہر شاہوار نگردد"

یعنی آپ کے کلام کی تعریف ہم کریں تو کیونکر کریں؟ ڈر یہ ہے کہ تحسین ناشناس اس کو بے قدر کر دے گی۔ تقریظ آپ کسی سخن شناس سے لکھوائیے۔ بہرکیف سید محبوب شیر نے ۱۲۸۵ھ میں رحلت کی۔ چار برس کے بعد مرحوم کے خلف سید علی شیر نکہت نے یہ دیوان چشمۂ علم پٹنہ میں طبع کرایا۔

آج نہ احسن ہیں۔ نہ سید محبوب شیر ہیں۔ نہ شاد عظیم آبادی ہیں۔ مگر اس ہنگامہ کی یاد شاد کے مقطع سے آج تک تازہ ہے ؎

کیا اسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد غور کرکے دیکھتا ہے چاند کے بالے کی گونج

مصرع اول میں "محبوب" کا اشارہ جناب احسن کے محبوب یعنی سید محبوب شیر کی طرف ہے۔

(۲) جس زمانہ میں احسن کا دور دورہ تھا اس زمانہ میں زلیخائے مصری کی دو بہنیں نجا اور جبا سارے عظیم آباد کو جانے ہوئے تھیں۔ نجا کی نشانی باندی۔ باندی کی نشانی سعیدہ۔ مگر جبا کی نشانی پوچھئے تو شاد و احسن کا یہی معرکہ ہے

صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے تمہاری آفت کی چشمِ پرفن
یکونُ سَیفاً لِقلبِ مَحزُونٌ غضب کریں ہیں تہ رخ جتون

شاد نے جن آنکھوں کی دوہائی دی ہے وہ آنکھیں ایک باکمال عورت کی تھیں۔ جبا کی فارسی دانی اور ادبی قابلیت سے لوگوں کا ناطقہ بند تھا۔ ایک مرتبہ کشمیری کوٹھی میں مخصوص فارسی قصاید کے لئے مشاعرہ تھا۔ فارسی گو اساتذہ کا مجمع تھا اور صدر میں جبا تھی۔ شعرا اپنے اپنے قصائد سنا رہے تھے۔ استنے میں ایک ممتاز رئیس و ادیب نے اپنا قصیدہ شروع کیا تو جبا بول اٹھی:۔

"میں اس کا قصیدہ سن کے کیا کروں گی؟"

رئیس و ادیب بیچارہ پانی پانی ہوگیا۔ مجمع انگشت بدنداں تھا۔ مگر جبا کے سامنے کوئی دم نہ مار سکا۔

(۳) جناب شاد کے اس خط میں ایک جملہ ہے:۔ "جو کچھ امان علی خاں صاحب پدر یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاء اللہ" اس سے مراد مرزا قتیل کے شاگرد مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اردو میں قصہ امیر حمزہ انھیں کی تالیف ہے۔ ان کا قیام دیوان محلہ عظیم آباد میں تھا۔ غالب لکھنوی کے بیٹے مرزا نوروز علی خاں یکتا عظیم آباد

وہی ہیں جن کی یکتائی عبدالغفور خاں نساخ کو نہ بھائی۔ نساخ کا نشتر ملاحظہ ہو:-

"ان میں (یکتا میں) ایک بڑا عیب ہے کہ دوسرے شاعروں کے شعر کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں"

مگر ناظر وزیر علی عبرتی کا ایسا مستند ادیب وچشم دید گواہ کہتا ہے:-

"چشم بد دور تلاشے دارد رنگین تراز دہنِ گل، و فکرے دارد آتشیں تراز نغمۂ بلبل... نظم آبدار می نگارد۔ و نثر ثریا نثار می طرازد۔ ایزد تعالیٰ نہالِ خیالش را ہمہ بہار داراد......"

(باقی)

وصی احمد بلگرامی - بی - اے

مشرقِ بعید کے زرد خطرہ کی داستان

اور

جاپانِ جدید

مسلسل

کوریا کی اہمیت

جاپان کے سیاسی فروغ کا آغاز ۹۵-۱۸۹۴ء سے ہوتا ہے جب اُس نے چین پر مکمل فتح حاصل کر لی۔ جھگڑے کی بنیاد وہ پہاڑی جزیرہ نما تھا جو منچوریا سے لیکر ساحلِ جاپان کے سو میل اندر تک پھیلا ہوا ہے اور جس کو کوریا کہتے ہیں۔ یہ مقام اپنے محل وقوع کے لحاظ سے تجارتی، سیاسی اور عسکری مفاد کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس علاقہ کی حکومت نہایت فرسودہ اور خام بنیاد پر قایم تھی اور اس وجہ سے ہر زبردست قوم اُس پر قابض ہو سکتی تھی۔ جاپان کا طرزِ عمل کوریا کے ساتھ کچھ تو مدافعانہ تھا اور کچھ جارحانہ۔ ایک طرف تو اُسے خطرہ تھا کہ روس اس علاقہ کو اپنے قبضہ میں نہ کر لے اور دوسری طرف وہ خود چاہتا تھا کہ کوریا کو اپنا ماتحت ملک بنا کر وہ ٹین سین اور پیکنگ کی طرف جانے والے بحری راستہ کو اپنی تجارتی اغراض کے لئے استعمال کر

چین بھی ایک عرصہ سے کوریا پر ایک موہوم سے اقتدار کا دعویٰ کرتا تھا۔ لیکن بہت جلد اُس نے جاپان کے زور دینے پر ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے جوزن کی (جو کوریا کا پُرانا نام تھا) آزادی تسلیم کر لی گئی۔ اُس وقت سے جاپان کا یہ مقصود رہا ہے کہ وہ اُمراء کی ذی اثر پارٹی کے ذریعہ سے کوریا کے دارالخلافہ سیئول پر اپنا اقتدار جمائے رکھے۔ اس کے مقابلہ پر چین نے بھی اپنا ایک نمایندہ جاپان میں مقرر کر دیا جو حکومتِ چین کو حالات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ بعد میں اس نمایندہ نے کوریا کی حکومت میں اس قدر اثر و رسوخ پیدا کر لیا کہ وہ چینی اصلاحات بھی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد چینیوں کو کئی قسم کے ٹھیکے دئے گئے جن میں سے محکمۂ تار کا اجارہ سب سے اہم تھا۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں روس نے ٹرانس سائبیرین ریلوے بنانی شروع کی جس کی وجہ سے کوریا کی حالت نازک ہو گئی

در جاپان و چین دونوں کو خطرہ لاحق ہوا لیکن اسی عرصہ میں کوریا میں ایک بغاوت ہوئی جو کچھ تو مذہبی تھی اور کچھ ذاعتی
حکومتِ کوریا نے چین سے امداد طلب کی جس نے اپنی فوجیں فوراً بھیجدیں۔ جاپان نے ایک تجویز پیش کی کہ کوریا
کے حالات کی اصلاح چین اور جاپان کی حکومتیں مل کر کریں لیکن چین نے صاف انکار کر دیا جسکی وجہ سے یکم اگست
۱۸۹۴ء کو باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔

چین اور جاپان کی جنگ ۱۸۹۴ء

چین کی فوجیں اور سامانِ جنگ اگرچہ اچھا تھا لیکن اندرونی بدنظمی کی وجہ سے جاپان کا مقابلہ نہ کرسکیں اور آسن اور پنگ ینگ کی
جنگوں کے بعد چین کو کوریا چھوڑنا پڑا۔ ان کامیابیوں سے جاپان کو جرأت ہوئی اور وہ منچوریا تک جا پہونچا۔ جہاں
اُس نے بندرگاہ آرتھر کے قلعہ پر بمباری کی اور اُس کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس کے بعد وہ چین کے دارالخلافہ
پیکنگ کے قریب جا پہونچا اور چین نے مجبور ہو کر صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

جب سے جنگ شروع ہوئی چین نے پے درپے دیگر حکومتوں کو امداد کے لئے لکھا جس پر اُن سب نے مداخلت
کے مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔ برطانیہ عظمیٰ کو خطرہ تھا کہ چین میں اُس کے وسیع تجارتی مفاد کو نقصان پہونچے گا اس لئے
اُس نے امریکہ، جرمنی، فرانس اور روس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جرمنی اور امریکہ نے اگرچہ امداد کرنے سے
انکار کر دیا لیکن دوسری طرف جاپان کو تنبیہ کیا کہ وہ معتدل شرائط پر بہت جلد صلح کر لے۔ جاپان نے خفیہ طور پر روس
اور برطانیہ کو یقین دلایا کہ وہ کوریا کو اپنے قبضہ میں نہیں کرے گا۔ اس لئے جب چین کا نمایندہ صلح کرنے کے لئے
پہونچا تو جاپان نے نہایت سخت شرائط پیش کیں۔ بالآخر اپریل ۱۸۹۵ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے چین نے
کوریا کی خود مختاری تسلیم کر لی اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ کبھی اُس پر اپنا حق نہیں جتائے گا۔ نیز اُس نے جنوبی منچوریا کا
کچھ حصہ اور "لیاؤٹنگ" کا جزیرہ نما جس پر آرتھر کی بندرگاہ واقع ہے جاپان کو دیدیا۔

اس صلح کے بعد برطانیہ عظمیٰ کی رائے تو تبدیل ہو گئی کیونکہ اُسے یقین ہو گیا کہ جاپان کی نیت چین کے اندرونی
حصہ کے متعلق کچھ بُری نہیں ہے لیکن جرمن گورنمنٹ کو خطرہ ہو گیا کہ اگر روس، فرانس اور برطانیہ آپس میں مل گئے
اور اُنھوں نے چین کے حصے بخرے کر لئے تو مشرقِ اقصیٰ میں جرمنی کے لئے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ایف۔ سی۔
جونس مصنفِ کتاب "جاپان" کے الفاظ میں جرمن شہنشاہ کے پرسکون دماغ پر "زرد خطرہ" کا ہوّا اس قدر سختی
کے ساتھ مسلط ہوا کہ وہ روس کے پاس یہ التجا لیکر پہونچا کہ جاپان کے مطالبات ذرا ہلکے کر دئے جائیں۔
روس کے ساتھ فرانس بھی مل گیا اور تینوں حکومتوں نے جاپان پر زور دینا شروع کیا جس کے
نتیجہ میں اُس نے جنوبی منچوریا کا وہ حصہ جو اُس نے چین سے لیا تھا واپس کر دیا اور اُس کے بدلے میں کچھ
تاوان اور لے لیا۔

روس کے دندان آز

اُس زمانہ میں روس کا وزیر خارجہ کاؤنٹ وٹے (Count Witte) تھا جو آہستہ آہستہ اسکیم بنا رہا تھا کہ تمام شمالی چین کو اپنے قبضہ میں کر لیا جائے۔ وہ اس بارہ میں کوئی سریع الاثر کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے کوئی معقول علاقہ ہاتھ نہ آئیگا ۱۸۹۶ء میں جب چین کا نمایندہ "لی ہنگ چنگ" زار نکولس دوم کی رسم تاجپوشی میں شریک ہونے کے لئے روس گیا، تو کاؤنٹ وٹے نے اُس کو ایک خفیہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس خفیہ معاہدہ کی رو سے قرار پایا کہ اگر جاپان دونوں میں سے کسی کے علاقہ پر حملہ کرنا چاہے تو وہ مل کر اُس کا مقابلہ کریں گے اور صلح کے لئے ایسی شرایط پیش کریں گے جو دونوں کے موافق ہوں اسی کے ساتھ یہ بھی قرار پایا کہ روس کو منچوریا میں ریلوے لیجانے کا حق حاصل ہوگا۔ چنانچہ اُسی سال ستمبر میں چین اور روس کے معاہدۂ ریلوے کے متعلق اعلان کر دیا گیا اور قرار پایا کہ چھتیس سال کے بعد چین اس ریلوے کو خرید سکتا ہے یا اسی برس کے بعد اُس کو مفت حاصل کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ موخر الذکر وعدہ کا پورا ہونا محال تھا۔ اس ریلوے کو مشرقی چینی ریلوے کہتے ہیں جو اب تک جھگڑے کی بنیاد بنی ہوئی ہے، جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

زارِ روس کی جوع ارضی اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ مشرق بعید کی تمام زمینوں پر قبضہ جما لیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں باوجود کاؤنٹ وٹے کی پیہم منت وزاری کے اُس نے وزیر حرب جنرل کوروپاٹکن (General Kuropatkin) کی باتوں میں آکر جزیرۂ نما لیوٹنگ کو پچیس سال کے لئے ٹھیکہ پر لے لیا اور اُس میں پورٹ آرتھر تک مشرقی چینی ریلوے کی ایک شاخ بنائی۔ وٹے کا خیال ہے کہ اس موقعہ پر "لی ہنگ چنگ" کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے رشوت ستانی سے کام لیا گیا (سوانح عمری مصنفہ وٹے) اسی عرصہ میں جرمنی نے "شان ٹنگ" کے علاقہ میں "کیا ؤ چاؤ" کا ٹھیکہ لیا کیونکہ اس صوبہ میں اُس کے دو مشنری مارے گئے تھے اور چین نے اس کے تاوان میں یہ معاہدہ کر لیا۔ اسی طرح فرانس کو بھی اسی قسم کی مراعات جنوبی چین میں حاصل ہو رہی تھیں۔

روس اور جاپان کی جنگ ۱۹۰۴ء

برطانیہ عظمیٰ اور جاپان کو اس باہمی تقسیم سے قدرتاً خطرہ پیدا ہوا اور وہ آپس میں متحد ہو گئے برطانیہ نے چاہا کہ روس یا جرمنی وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے اور اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ چین کے کسی علاقہ پر سیاسی قبضہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن انھوں نے کسی فیصلہ کن معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اُدھر روس خفیہ طور پر ارادے کر رہا تھا کہ کسی طرح سے کوریا پر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے اپنے گزشتہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا شروع کر دی۔ جاپان نے درخواست کی کہ اگر کوریا میں اُس کا اقتدار

مان لیا جائے تو وہ روس کے منچوریا میں خاص حقوق تسلیم کرے گا، لیکن روس نے یہ ناپسند کیا۔ آخرکار سنہ ۱۹۰۴ء میں جاپان نے تمام گفت و شنید کو بالائے طاق رکھ کر اعلانِ جنگ کر دیا اور اس مرتبہ وہ مکمل طور پر طیار تھا۔ اُس نے اپنی فوج کو جنگِ چین کے بعد از سرِ نو منظم کیا تھا اور تعداد میں بھی روس کے وہم و گمان سے بالاتر اُس کو بڑھا لیا تھا۔

جاپان کو اس جنگ میں نمایاں فتح حاصل ہوئی اور روس کا جنگی بیڑا بالکل تباہ ہو گیا۔ آخرکار اُس کو کوریا میں جاپان کا اقتدار تسلیم کرنا پڑا اور چین سے مشورہ کے بعد لیا ؤٹنگ اور شرقی چینی ریلوے کی جنوبی شاخ بھی (جو پورٹ آرتھر سے "چینگ چن" تک تھی) اُس کو دیدی۔ روس کو منچوریا کے متعلق اپنے خاص حقوق واپس لینے پڑے اور فیصلہ ہوا کہ منچوریا کے دروازے ہر قوم کے لئے کھلے ہیں۔

زرد خطرہ

اس فتح سے جاپان کی ہمت اور بڑھ گئی اور منچوریا میں اس کے اقدامات زیادہ وسیع ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں چین کے ساتھ اُس کا ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے منچوریا کے سولہ شہر خارجی تجارت کے لئے کھول دئے گئے اور جاپان کو حق حاصل ہوا کہ وہ مکڈن سے ان ٹنگ تک اپنی ریلوے مکمل کرے جو دوران جنگ میں ادھوری رہ گئی تھی۔ یہ بھی قرار پایا کہ اُس علاقہ میں چین کوئی متوازی ریلوے نہیں بنائے گا۔ مگر بعد میں اس معاہدہ کی خلاف ورزیاں ہوتی رہیں اور بالآخر چین نے ایک ریلوے بنالی۔ دونوں قوموں نے دوسرے ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف اُبھارنا شروع کیا جس کے نتیجہ میں کئی بار معاہدے ہوئے جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یورپی طاقتیں جاپان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں سے لرزاں تھیں اور وہ ہر دم یہی چاہتی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح سے "زرد خطرے" کا قلع قمع کیا جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی واشنگٹن کانفرنس میں جاپان کی بحری طاقت کو مسلوب کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور سنگاپور میں ایک مضبوط برطانوی بیڑا رکھا گیا۔ ادھر امریکہ کو خطرہ تھا کہ کہیں جاپان بحرالکاہل پر قابض نہ ہو جائے اس لئے اُس نے زور دیا کہ جاپان کا بیڑا امریکہ اور انگلستان کے بیڑوں سے بہرحال کمزور رہے۔

سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۳۱ء تک جاپان اپنے اندرونی معاملات میں مشغول رہا کیونکہ سنہ ۱۹۲۳ء کے ہیبت ناک زلزلے نے جاپان کے سرمایہ کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور اُس کو از سرِ نو اپنی حالت سنبھالنے کے لئے اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کرنی پڑیں۔ اس لئے وہ خاموشی سے حالات کا مطالعہ کرتا رہا کہ کس طرح چین میں قومیت زور پکڑ رہی ہے اور اُس کے مال کا مقاطعہ کیا جا رہا ہے۔ اور روس میں پنجسالہ اسکیم کامیاب ہو رہی ہے۔ بالآخر سنہ ۱۹۳۱ء میں جب اُس نے دیکھا کہ اب خاموش بیٹھنا گناہ ہے تو اُس نے چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

منچوریا سے جاپان کی دلچسپی

اس باہمی آویزش کے کئی سبب ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ جاپان کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے لیکن وسائلِ خوراک اُسی نسبت سے ترقی نہیں پاتے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جاپان میں طریقۂ فلاحت ہندوستان کی طرح تا حال دقیانوسی ہے اور

انکشافات عصریہ سے بالکل روشناس نہیں ہوا۔ اور دوسرے یہ کہ جاپان کے لوگ ضرورت سے زیادہ قومیت پسند واقع ہوئے ہیں اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اُن کو کسی وقت باہر کے چاول (جن کو وہ ازرہِ طنز "خارجی چاول" کہتے ہیں) کھانے پڑ جائیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ میکسیکو وغیرہ کے چاول جاپان بھیجے جائیں لیکن اُن کا خیر مقدم نہ کیا گیا۔ بہرحال جاپان کی آبادی ۱۸۶۹ء سے اسوقت تک دو چند سے زیادہ ہو چکی ہے لیکن وسائل رسد تا حال وہی ہیں۔ اس وجہ سے جاپان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی مملکت کو وسیع کرے اور کوئی قریب ترین علاقہ اپنے ساتھ ملحق کرلے تاکہ ایک طرف تو اُس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی کھپت ہو جائے اور دوسری طرف اُس کو اپنی مصنوعات کے لئے ایک نفع بخش منڈی مل جائے۔

اسی خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جاپان کی یہ خواہش عرصہ سے تھی کہ کسی طرح منچوریا کے علاقہ پر قبضہ حاصل کر لیا جائے۔ یہ علاقہ زراعت کے لحاظ سے نہایت امید افزا ہے ابھی تک اس میں صرف آٹھ کروڑ ایکڑ زمین زیرِ کاشت ہے اور قریباً چھ کروڑ ایکڑ ایسے باقی ہیں جن میں نہایت عمدہ کاشت ہو سکتی ہے۔ اس علاقہ کی سب سے اہم پیداوار مٹر ہے جس کی مختلف قسمیں تمام یورپ میں انسان اور حیوان کی خوراک اور کھاد کیلئے مستعمل ہوتی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں چودہ کروڑ من غلّہ یہاں پیدا ہوا جو ہرچند کاشت کے لحاظ سے منچوریا کے زمیندار کا رہینِ منت ہے لیکن اس کی فروخت اور عمدگی کی ذمہ دار جاپان کی تجارتی اور کیمیاوی تدابیر تھیں۔ گیہوں، اُرد اور چاول اس جگہ کی دیگر زراعتی پیداواریں ہیں جو اگر کوشش کی جائے تو زیادہ تعداد میں کاشت کی جا سکتی ہیں۔ شمال میں ایک وسیع علاقہ ایسا ہے جو جنگل ہی جنگل ہے اور لکڑی کا بہترین مخزن ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ علاقہ معدنیات کے لحاظ سے بھی بُرا نہیں۔ اسوقت جاپان اپنی تیل کی ضروریات ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ڈچ ایسٹ انڈیز سے پورا کرتا ہے اور تیشیری وغیرہ بھی امریکہ اور برطانیہ سے منگواتا ہے لیکن اگر وہ تمام چیزیں منچوریا سے حاصل کر سکے تو دولِ یورپ کے مقاطعہ کا ڈر اسے باقی نہیں رہتا اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ منچوریا کے ساتھ جاپان کی دلچسپی بجائے تجارتی اور صنعتی ہونے کے زیادہ تر فوجی لحاظ سے ہے اگر آج ہندوستان اپنی روئی کی برآمد جاپان میں بند کر دے یا آسٹریلیا سے وہاں ذرہ بھر بھی اون نہ آئے یا ملایا ربڑ دینے سے انکار کردے یا امریکہ اقتصادی لحاظ سے قطع تعلق کرلے تو جاپان بالکل بیدست وپا ہو جائے اسی خطرہ کے ازالہ کے لئے جاپان اپنی مملکت کو وسیع کرنا چاہتا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو وہ کافی بالذات رہے۔

روسی خطرہ جاپان کے خطرہ کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ ایشیا میں روسی طاقت کا از سرِ نو اقتدار پذیر ہونا ہے۔ روس نے ۱۹۲۸ء میں ایک اقتصادی پنجسالہ پروگرام بنایا تھا جس کی رو سے وہ اپنے چیدہ چیدہ شعبہ جات کو یکدم بامِ رفعت تک پہونچانا چاہتا تھا اور اسی طرح اُس کی خواہش تھی کہ وہ نہ صرف

اقتصادی طور پر خود مختار ہو جائے بلکہ اس کے ذریعہ سے وہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرلے۔ یہ اسکیم ۳۳ء میں مکمل ہوئی اور ارباب سیاسیات کا خیال ہے کہ روس اب اسقدر مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہو چکا ہے، کہ اگر ساری دنیا اُس کا مقابلہ کرنا چاہے تو بھی اس کو نقصان نہیں پہونچ سکتا سب سے نزدیک حکومت جس کو روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خطرہ ہو سکتا ہے وہ جاپان ہے۔ روس نے اب ایک دوسرا اقتصادی پروگرام شروع کیا ہے جس کی روز افزوں ترقی جاپان کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہی ہے اُدھر روس نے ٹرانس سائبیرین ریلوے کی پٹری دوہری بنالی۔ اس لئے جاپان کو ہر دم یہی فکر ہے کہ اگر روس کی تمام تجاویز مکمل ہوگئیں تو اُس کا کیا حشر ہوگا۔

مشرقِ اقصیٰ میں فوجی اقتدار کا خواب

لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جس کا شگون اچھا نہیں جاپان کی خارجی پالیسی آج کل اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو مشرقِ بعید میں کسی غیر شخص کا اقتدار برداشت نہیں کر سکتے وہ چاہتے ہیں کہ جاپان کو وہی اختیارات حاصل ہو جائیں جو اس وقت ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پاس ہیں یعنی جس طرح دولِ یوروپ "نئی دنیا" کے کسی علاقہ پر بغیر امریکہ کی رضامندی کے قبضہ نہیں کر سکتے اور نہ وہاں زمینیں خرید سکتے ہیں اسی طرح حکومتِ جاپان کو بھی یہ اختیار مل جائے کہ وہ مشرقِ بعید کے کسی علاقہ میں یوروپی طاقت کو داخل نہ ہونے دے۔ اس اختیار کو Doctrine of Monroe یا "نظریہ منرو" کہتے ہیں اور یہ امریکہ کو معاہدہ لیگ آف نیشنز کی اکیسویں دفعہ کے مطابق ملا ہے اس کا اگرچہ یہ مطلب نہیں کہ پریزیڈنٹ متحدہ امریکہ کو جنوبی امریکہ یا کریبین میں کلی اختیارات حاصل ہوگئے ہیں لیکن ان اختیارات کی تفسیر یقیناً اُسی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ جب چاہے ان علاقوں کے اندرونی معاملات میں دخل دے سکتا ہے اور دیتا رہا ہے بلکہ کئی مرتبہ پولیس کا استعمال بھی کیا ہے انہی مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جاپان کا یہ تقاضا ہے کہ مشرقِ بعید کے معاملہ میں اسے بھی ایسے اختیارات دیدئے جائیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ چاہتا ہے کہ مشرقِ اقصیٰ میں کوئی یوروپی طاقت اپنے لئے آراضی نہ خرید سکے اور چین کے متعلق اگر بیرونی حکومتیں کوئی قدم بڑھانا چاہیں تو پہلے جاپان سے مشورہ کر لیا جائے۔ تیسرے اگر وہ مناسب سمجھے تو چین کے اندرونی معاملات میں دخل دے سکتا ہے۔ چوتھے اگر وہ دخل دے تو کوئی مغربی طاقت حایل نہ ہو اب اس مطالبہ کی موافقت میں جاپان کے دلائل خواہ کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں مگر جو حکومتیں چین اور بحرالکاہل سے دلچسپی رکھتی ہیں وہ کبھی اس کو برداشت نہیں کریں گی۔ اسی وجہ سے جاپان سمجھتا ہے کہ لڑائی کا ہونا ضروری ہے اور اُس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ منچوریا پر قبضہ کر کے اپنی سیاسی اور اقتصادی طاقت کو بڑھائے۔

عبدالرحیم شبلی

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام

سرودِ زندگی

سالِ گزشتہ جناب اصغر نے سرودِ زندگی کی ایک جلد میرے پاس ریویو کے لئے روانہ کی تھی اور میں نے کتب موصولہ کے سلسلہ میں مختصراً اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن چونکہ تفصیلی مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لئے باب الانتقاد کے ماتحت اظہارِ خیال سے معذور رہا۔

اس دوران میں اتفاق سے مجھے دو چار دن کے لئے لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو اس مجموعہ کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ اور اس طرح سے مجھے کافی وقت اس سے لطف اندوز ہونے کا مل گیا۔

اس سے قبل، جناب اصغر کی شاعری کے متعلق ایک سے زاید بار اپنی رائے نگار کے صفحات پر ظاہر کر چکا ہوں اور اب بھی جو کچھ لکھوں گا وہ بہ لحاظ نتیجہ شاید اسی کا اعادہ ہوگا لیکن چونکہ جناب اصغر اپنی شاعری کے لحاظ سے ایک مخصوص امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں اس لئے نہ ان کے اس جدید مجموعۂ نظم پر یوں سرسری گزر جانا مناسب ہے اور نہ کوئی حرج اگر میں اپنی کسی سابق رائے کی توثیق میں کوئی مزید ثبوت پیش کر سکوں۔

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات اور زیادہ سے زیادہ تین چار سو اشعار پر مشتمل ہے، لیکن ہے بہرحال "مجموعہ" اس لحاظ سے بھی کہ "نشاطِ روح" کی اشاعت کے بعد جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ اس کی ہر غزل بجائے خود اک "نظم" کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم سے میری مراد اس شاعری سے ہے جو تغزل سے کوئی علاقہ نہ رکھتی ہو۔ خود اصغر صاحب اس کو غزلوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں یا منظومات کا، مجھے اس کا علم نہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ تفریق ہی سرے سے بے معنی ہو بہرحال میرے لئے یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ میں اس مجموعہ کو صرف غزلیات کا مجموعہ کہوں یا صرف منظومات کا کیونکہ جب میں تغزل کی جستجو کرتا ہوں تو ساتھ ہی ساتھ نظم کے رنگ کے اشعار بھی سامنے آجاتے ہیں اور جب غیر تغزلانہ شاعری کی مثالیں ڈھونڈھتا ہوں تو بعض جگہ غزل کیا

"غزل الغزلات" ہاتھ آجاتی ہے۔

اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے باوجود تقشّف مذہبی نہایت نیک نفس انسان ہیں اور اپنے اعمال و اوراد کے لحاظ سے اچھے خاصے مردِ متورّع، اس لئے اُصولاً انھیں شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہونا چاہئے تھا لیکن خوش قسمتی سے، وہ صاحبِ حال و قال صوفی بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب ایک صوفی حال سے گزر کر قال میں آتا ہے تو وہ اکثر شعر ہی کہتا ہے، اور صرف اپنے لئے یعنی وہ خود کہتا ہے اور خود ہی اس کو سمجھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اصغر صاحب کی شاعری کا بھی اکثر حصہ اسی قسم کا ہے کہ اگر کسی کو تصوف کے مدارج عالیہ حاصل نہ ہوں، تو اس بدنصیب کو ہمیشہ اپنے قصورِ فہم کا اعتراف کرنا پڑے گا اور باوجود انتہائی کوشش کے وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کرسکے گا جو الفاظ اور تصورات کی شاید کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوسکتی۔ یہ خیال میں نے صرف اپنی بلید ذہنیت کو سامنے رکھ کر ظاہر کیا ہے جو آج سے نہیں بلکہ ابتدا ہی سے مجھ پر مسلط ہے۔

میں نے جس وقت ہوش سنبھالا تو ایک طرف مولویوں سے گھرا ہوا تھا اور دوسری طرف صوفیوں سے یعنی اگر پانچ وقت کی نماز تازہ وضو سے باجماعت ادا کرنا میرے فریضۂ زندگی میں داخل تھا تو قوالی کی صحبتوں میں شریک ہونا بھی اسی حد تک لازم، لیکن یاد رہے کبھی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ زیادہ نمازیں پڑھنے والا کیوں زیادہ خشک و عبوس ہوتا ہے اور موسیقی ایسی لطیف چیز کے ذریعہ سے کیوں ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ معشوق سے مراد کوئی خوبصورت عورت نہیں بلکہ سفید داڑھی والا پیرِ خانقاہ ہے۔ میں نے ایک بزرگ کے سامنے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تو انھوں نے اپنے پندار میں حد درجہ ذہانت صرف فرماتے ہوئے جواب دیا کہ "پیرِ خانقاہ نہ سہی، خدا سہی، ایک ہی بات ہے۔" وہ مسکرا رہے تھے اور میں حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہا تھا، وہ سمجھ رہے تھے کہ اب اسکے آگے کوئی کیا کہہ سکتا ہے، اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ چند دن مجھے ان حضرت کے پاس رہنا پڑ جائے تو میری موت خفقانِ قلب سے ہو یا تپِ دق سے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ فارسی کے صوفی شعراء کی غزلوں میں بھی مجھے کبھی کوئی لطف نہیں آیا، اُردو والوں کا کیا ذکر ہے کہ یہاں تو سوائے نقل و اتباع کے وہ بے خود و غلط جوش بھی نہیں ہے جو اُن کے یہاں پایا جاتا ہے

جن حضرات کو خانقاہوں کی مجلسِ سماع میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ صوفیہ کو سب سے زیادہ حال جن اشعار پر آتا ہے وہ وہی ہیں جن میں "ہمہ اوست" کو مختلف پیرایوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ فلسفہ صحیح ہے یا غلط، بلکہ سوال یہ ہے کہ اس کو شاعری سے کیا واسطہ، محبت سے کیا تعلق آپ اگر خدا کا جلوہ بلکہ عین ذاتِ خدا کو ہر ہر چیز میں ساری و طاری دیکھتے ہیں تو دیکھئے شوق سے دیکھے جائے لیکن آپ اسے اس زبان (تغزل) میں کیوں بیان کرتے ہیں جس کے لطف کی ابتدا ہی خدا کے بھول جانے

سے ہوتی ہے۔

آپ تمام صوفیہ کے کلام کا مطالعہ کر جایئے سوائے چند مخصوص اُلجھے ہوئے خیالات کے آپ کو کوئی نئی بات نہ ملے گی، مثلاً :۔

۱۔ تو میں ہے، میں تو ہوں، پھر تو تو کیسا، میں میں کیوں ؟

۲۔ تو ہی شاہد ہے، تو ہی مشہود ہے، پھر شاہدہ کیسا ؟

۳۔ تو نے مجھے دیکھا، مگر تو مجھ میں ہے اس لئے تو نے خود کو دیکھا، اور خود کو کیا دیکھا، اپنے دیکھنے کو دیکھا، نہ دیکھ سکنے کو دیکھا

۴۔ قطرہ دریا ہے اور دریا قطرہ، نہ معلوم قطرہ دریا میں سمایا ہوا ہے یا دریا قطرہ میں

۵۔ حجاب حُسن خود حُسن ہے اور حُسن خود حجاب، اس لئے نہ حجاب حجاب رہا نہ حُسن حُسن

۶۔ وہی ساز کا تار ہے اور وہی ساز، وہی مغنی ہے اور وہی گوش برآواز۔ پھر یہ صدائے لن ترانی کیسی ؟ وغیرہ وغیرہ

ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی نہایت بلند فلسفہ ہو، اعلیٰ درجہ کی للہیت ہو لیکن عشق کی دنیا میں اور دنیا کی کارگاہ عشق میں اس قدومیت سے کیا کام چل سکتا ہے۔ اگر قطرہ دریا ہے اور دریا قطرہ تو ہوا کرے، محبت میں پھنکنے والے دل کی آگ تو اس سے نہیں بجھ سکتی، اگر "تو میں ہو گیا ہے اور میں تو" تو ہوا سے ہو جائے، عاشق کو اس "تو تو میں میں" سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

غزل نام ہے ان باتوں کا جو گوشت پوست والے عاشق اور گوشت پوست والی معشوقہ کے درمیان ہوا کرتی ہیں، وہ اس سے ملنا چاہتا ہے اور اسی حس کے ساتھ اسی تمنا کے ساتھ جو ایک انسان میں دوسرے انسان کے لئے پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر آپ لاکھ کہئے کہ "تو وہ ہے اور وہ تو" لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں اسوقت تک نہیں آسکتی جب تک "وہ" اس کی آغوش میں نہ ہو۔ خدا سے محبت کرنے کے سلسلہ میں ممکن ہے یہ "اڑن گھائیاں" کام دے جائیں، لیکن ایک انسان کی محبت انسان سے، کبھی ان چیستاں طرازیوں سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ الغرض یہ "جھاڑ پھونک" والی شاعری مجھے کبھی پسند نہیں آئی اور باوجود انتہائی غور و فکر کے آج تک اس کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اصغر صاحب کے پہلے مجموعہ میں بھی جو نشاطِ روح کے نام سے شائع ہوا تھا اس نوع کے اشعار کی کمی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں انھوں نے تصوف کے زیادہ بلند مدارج طے کر لئے ہیں اور اسی لئے انکے دوسرے مجموعہ میں پہلے سے کہیں زیادہ یہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔

شاعری خواہ کسی موضوع کو سامنے رکھکر کیجائے دو قسم کی ہوا کرتی ہے، ایک وہ جس میں کسی حال یا واقعہ

کا اظہار ہو اور دوسری وہ جس میں کوئی دعویٰ پیش کیا جائے۔ اول الذکر بہت آسان چیز ہے لیکن دوسری قسم نہایت مشکل ہے، کیونکہ دعوے کے ساتھ اس کا ثبوت فراہم کرنا ضروری ہو جاتا ہے، صوفی شعراء اکثر و بیشتر اسی قسم کی شاعری کرتے ہیں جس میں اول تو دعویٰ ہی بالکل مہمل زبان میں کیا جاتا ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ کبھی اپنے دعوے کا ثبوت پیش نہیں کرتے، وہ ایک بات خود فرض کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا بغیر کسی دلیل و برہان کے اسکو صحیح سمجھنے لگے۔ اس کا دوسرا نام انھوں نے فلسفیانہ شاعری بھی رکھا ہے۔ اب میں اصغر صاحب کے کلام سے چند مثالیں پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بھی کس فراخدلی سے اس "فلسفیانہ" شاعری سے کام لیا ہے اور کتنے دعوے انھوں نے ایسے کئے ہیں جس کی دلیل شعر میں کیا غالباً خود ان کے ذہن میں بھی موجود نہ ہوگی۔

اُٹھا کے عرش کو رکھا ہے فرش پر لاکر
شہود غیب ہوا، غیب ہوگیا ہے شہود

یہ شعر ان کی غزل کا ہے، کسی مسلسل نظم کا نہیں کہ اس کا تعلق ماسبق یا مابعد سے ہو۔ اپنی جگہ ایک مستقل مفہوم رکھتا ہے لیکن وہ مفہوم کیا ہے۔ اس کو خدا ہی بہتر جان سکتا ہے۔ میں اس کے دوسرے مصرعہ کو جب بار بار دہراتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی ہلاکت کے لئے کوئی "سیفی" پڑھ رہا ہوں

عرش کو فرش پر لاکر رکھنا، شہود کا غیب اور غیب کا شہود ہو جانا، ان میں سے ہر دعویٰ بجائے خود ایک چیستاں ہے اور عقل حیران ہے کہ اصغر صاحب نے کس حال کے ماتحت تصوف کے کس رمز عظیم کو اسمیں ظاہر کیا ہے۔ اگر عرش سے مراد خود اُن کی ذات مراد ہے تو غیب کا شہود میں آجانا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن شہود کا غیب ہو جانا کیسا؟ اصغر صاحب نے خود ایک جگہ غزل کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ:۔

اصغر غزل میں چاہئے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں، جو مستی شراب میں

ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس "غیب و شہود" والے شعر میں "حسنِ بتاں" بھی نظر آتا ہو اور "مستی شراب" بھی لیکن مجھے تو یہ بالکل درود شریف کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور دعویٰ ملاحظہ ہو:۔

کبھی سنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی
کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

لاہوت کے معنی الوہیت کے ہیں اس کی اصل لاہ ہے جو اِلٰہ کے معنی میں آتا ہے اس میں دو حرف (و ا) اور (ت) مبالغہ کے اضافہ کئے گئے ہیں، اس لئے پہلے مصرعہ کے معنی یہ ہوئے کہ "میری حقیقت ذات خداوندی

سے نسبت رکھتی ہے"۔ بہتر ہے، رکھتی ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق۔ ہیولیٰ،
مادۂ اولیٰ کو کہتے ہیں اور صوفیہ کے نزدیک مادۂ اولیٰ بھی اسی ذات خداوندی سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے لاہوتی
ہونا ہیولائے ارتقا کے منافی کیونکر ہوا۔ یہ تو نقص معنوی ہوا اب بیان کے سقم کو دیکھئے کہ پہلے مصرعہ میں (کبھی سنا)
کا ٹکڑا نظم کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں (کبھیں یہ ضد)۔ اس لئے تقابل کی صورت پیدا نہ ہوئی۔

اگر یہ شعر یوں ہوتا:۔

کبھی یہ ہٹ کہ حقیقت ہے میری لاہوتی
کبھی یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

تو کم از کم یہ سقم دور ہو جاتا۔

یہ شعر اصغر صاحب کی ایک نظم "کیا ہوں میں" کا ہے جس میں متعدد اشعار ایسے ہی لاہوتی قسم کے نظر آتے ہیں مثلاً:۔

یہ مجھ سے پوچھئے کیا جستجو میں لذت ہے
فضائے دہر میں تحلیل ہو گیا ہوں میں

فضا میں تحلیل ہو جانا بالکل علمی بات ہے جس کا تعلق طبیعیات او علم کیمیا سے ہے [illegible] سے
لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے استعارتاً اس کو گم ہو جانے کے معنے میں لے لیا جائے تو بھی پہلے مصرعہ سے اس کا
کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اور لذت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔

اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

یہ مجھ سے پوچھئے کیا جستجو کی غایت ہے

تو پھر ایک مفہوم یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ جستجو یہ خود آپ گم ہو جانا جستجو کی انتہا ہے۔

ایک اور شعر اسی نظم کا ملاحظہ ہو:۔

کہاں ہے سامنے آ مشعل یقیں لیکر
فریب خوردۂ عقل گریز پا ہوں میں

اس شعر سے یہ بات بالکل ظاہر نہیں ہوتی کہ مشعل یقیں لیکر کس کو سامنے آنے کی دعوت دی جاتی ہے اگر اس سے
مراد علاوہ اللہ کے کوئی اور ہے تو انداز بیان درست نہیں کیونکہ اس سے مبارزطلبی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ التجا۔ شاعر
غالباً یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ عقل کی فریب خوردگی صرف یقین کی کیفیت سے دور ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کو وہ
اچھی طرح ظاہر نہ کرسکا، اول تو پہلے مصرعہ میں مشعل کا لفظ بالکل بیکار ہے، کیونکہ دوسرے مصرعہ میں تاریکی کا

مفہوم کسی لفظ سے پیدا نہیں ہوتا، اس لئے بجائے مشعلِ یقین کے حجتِ یقین لکھنا چاہیئے تھا تاکہ فریب کا تقابل ہو جاتا، علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کا اندازِ بیان یہ نہ ہونا چاہیئے تھا بلکہ اس میں التماس و التجا کی کیفیت پیدا کرنا چاہیئے تھی۔ دوسرے مصرعہ میں عقل کی صفت گریز پا ایمہ بے محل ہے۔

عقلِ گریز پا کے معنے ہوئے "جلد زایل ہو جانے والی عقل" کے، ذرا غائیکہ مفہوم شعر کو دیکھتے ہوئے عقل دیرپا ہونا چاہیئے تھا، نہ فریب خوردگی ناتمام رہی جاتی ہے۔ میرے نزدیک اس شوکو اس طرح بلند کیا جا سکتا ہے:۔

نہیں ہوں درخورِ ایقاں، یہ جانتا ہوں مگر
فریب خوردۂ عقلِ گریز پا ہوں میں

اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

کچھ انتہا نہیں نیرنگِ زیست کی میرے
حیاتِ محض ہوں، پروردۂ فنا ہوں میں،

پہلے مصرعہ میں تو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نیرنگِ زیست کی کوئی انتہا نہیں اور ثبوت میں اس نیرنگ کے صرف دو منظر (حیاتِ محض اور پروردگیِ فنا کے) پیش کئے گئے ہیں، علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں اندازِ بیان غیر متوازن ہے، اگر حیاتِ محض کہا تھا تو تقابلاً فنائے محض کہنا چاہیئے تھا، پروردۂ فنا ہونے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ یہ پورا شعر اس طرح بدلا جا سکتا ہے:۔

عجب تضاد ہے نیرنگِ زیست میں میرے
حیاتِ محض کبھی ہوں، کبھی فنا ہوں میں

بعض کا خیال ہے کہ جناب اصغر غزلگو شاعر نہیں ہیں بلکہ نظم نگار ہیں۔ لیکن آپ نے ابھی دیکھا کہ نظم میں ان کا رنگِ شاعری کیا ہے۔ ایک دوسری نظم اور ملاحظہ ہو جس میں مسلم سے خطاب کیا گیا ہے:۔

کہاں اے مسلمِ سرگشتہ تو محوِ تماشا ہے — جب اس آئینۂ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے
ہجومِ کفر بھی جنبش ہے تیری زلفِ برہم کی — فضائے حسنِ ایماں انعکاسِ روئے زیبا ہے
جہانِ آب و گل میں ہے شرارِ زندگی تجھ سے — تری ذاتِ گرامی ارتقا کا اک ہیولا ہے
تجھی سے اس جہاں میں ہے بنا آئین و حکمت کی — کہ سب مے کی بدولت اصطلاحِ جام و مینا ہے
ضوابط دینِ کامل کے دئے ہیں تیرے ہاتھوں میں — تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے
تجھی کو دیکھتا ہوں روحِ اقوام و مذاہب میں — یہ رازِ زندگی تجھ سے ہے کہ ہر قطرہ میں دریا ہے
فرشتوں نے وہاں پر حرزِ جاں اس کو بنایا ہے — فرازِ عرش پر تیرا ہی کچھ نقشِ کفِ پا ہے

جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا — اگر اغراض ہو تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے
فرائض کا رب ہے احساس عالم کے مظاہر میں — یہی عارف کا مقصد ہے، یہی شارع کا ایما ہے

اس نظم پر اظہار خیال کی ضرورت نہیں، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شروع سے لیکر اخیر تک سوائے آورد و تصنع کے اس میں اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی جوش و ولولہ ہے، نہ کوئی تاثر و کیفیت، نہ بیان میں کوئی جدت ہے نہ خیال میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھے ہوئے راہ نجات پڑھ رہے ہیں۔

پھر اگر سیدھی سیدھی باتیں کی جاتیں تو بھی خیر سادگی کا لطف آجاتا، لیکن قیامت تو یہ ہے کہ اس میں بھی وہی تصوف کا جامع اضداد اور مفروضاتی لٹریچر موجود ہے۔ للّٰہیت۔ ہیولیٰ۔ ارتقا۔ عارف، شارع۔ عرش وغیرہ یہ سب اس قبیل کے الفاظ ہیں جن کو شاعری کی لطافت مشکل سے برداشت کر سکتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اصغر صاحب باوجود ایک معیاری مسلمان ہونے کے کیونکر ایسی پھیکی، اسدرجہ بے کیف اور اسدرجہ بے معنی و بے نتیجہ نظم لکھ سکے۔ اس نظم میں مسلم سے خطاب ہے اور اسی کو مقصود آفرینش قرار دیا جاتا ہے لیکن دوسرے شعر میں ہجوم کفر کو بھی اسی کی زلف برہم کی جنبش بتا کر تفریق کفر و ایمان کو اٹھا دیا جاتا ہے۔ الغرض نہ کوئی پیام ہے نہ درس عمل نہ کسی مقصد کی تعیین ہے نہ کسی منزل کی تخصیص، منتشر و پریشاں خیالات ہیں جنھیں زبردستی ایک سلسلہ سے وابستہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ نظمیں اس مجموعہ میں یہی دو ہیں، اس لئے آئیے اب غزلوں کی طرف متوجہ ہوں۔

اصغر صاحب کی غزلوں میں تین قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ ایک وہ جو واقعی صحیح تغزل کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم ہیں، تاہم میں مضمون کے آخر میں ان سب کو یکجا درج کر دوں گا۔

دوسری قسم اُن اشعار کی ہے جن کا کوئی مفہوم تو کھینچ تان کے پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن تغزل سے انھیں کوئی علاقہ نہیں اور تیسری قسم میں وہ اشعار داخل ہیں جو نہ غزل ہیں نہ نظم اور جن میں شاعر اپنے مقصود کو ظاہر کرنے میں کامیاب ہوا ہی نہیں۔

سب سے پہلے میں اسی موخر الذکر قسم کے اشعار کو پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ دیوان کا اولین شعر خیر سے اسی رنگ کا ہے۔ فرماتے ہیں:-

ترک مدعا کر دے عین مدعا ہو جا — شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خدا ہو جا

یہ شعر خالص فلسفۂ تصوف کی پیداوار ہے اور سوائے لفظوں کی اُلٹ پھیر کے اس میں قطعاً کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اصغر صاحب ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہیں کہ انھوں نے صرف ترکِ مدعا پر قناعت کی ورنہ صوفیہ کے یہاں تو یہ منزلیں چار ہیں:- ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک۔

اور اسی لئے اس مسلک کے صوفیہ جو ٹوپی استعمال کرتے ہیں اسے "کلاہِ چار ترکی" کہتے ہیں۔ اصغر صاحب تو ترکِ مدعا کے بعد مظہرِ خدا ہو جانا ہی بڑی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ تیسری منزل "ترکِ خدا" کی ہے اور چوتھی اس سے زیادہ بلند "ترکِ ترک" کی یعنی "خیالِ ترک" بھی ترک ہو جائے۔ بہر حال اگر ان مفروضات مہملہ کو سامنے رکھا جائے تو بھی یہ شعر نہ صرف یہ کہ بلند مرتبہ کا نہیں بلکہ غلط بھی ہے کیونکہ لف و نشر کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کا عین مدعا (دوسرے مصرعہ کا) "مظہرِ خدا" قرار پاتا ہے، اور "خدا" و "مظہرِ خدا" میں زمین و آسمان کا فرق ہے، صوفیہ کے یہاں مظہرِ خدا تو ہر چیز ہے، یہاں تک کہ ایک کافر و زندیق بھی مظہرِ خدا ہے، اس لئے ترکِ مدعا کے بعد ارتقا تو اس وقت ہوتا جب بجائے مظہرِ خدا کے عین خدا کہا جاتا۔

اس غزل کا مقطع بھی اسی شان کا ہے:-

قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو   اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا کوئی مفہوم پیدا کر سکوں لیکن کامیاب نہ ہوا۔ پہلے مصرعہ میں قطرۂ تنک مایہ سے خطاب ہے، یعنی قطرہ کو شاعر خود بھی تنک مایہ سمجھتا ہے در انحالیکہ فوراً اس کے بعد ہی اس کے بحرِ بیکراں ہونے کی خبر دیتا ہے اور اس طرح تضادِ بیان ظاہر ہے۔ اگر قطرۂ تنک مایہ سے مراد وہ قطرہ ہے جو خود اپنے کو تنک مایہ سمجھتا ہے تو ترکیب سے متبادر نہیں۔ لیکن اگر اسے بہ سبیل "تعریض" یا نظر "بہ صورتِ ظاہری" گوارا بھی کر لیا جائے، تو دوسرے مصرعہ کا کیا علاج ہے۔

کسی چیز کا "اپنی ابتدا ہونا اور پھر اپنی ہی انتہا ہو جانا" عجیب و غریب معمہ ہے۔ اگر اس کا مفہوم یہ قرار دیا جائے کہ "جو تیری ابتدا ہے وہی تیری انتہا ہے"، تو الفاظ سے ظاہر نہیں۔ اپنی اور ہو کر دونوں لفظ بالکل بیکار و لایعنی طور پر نظم کئے گئے ہیں۔

شعاعِ مہر کی جولانیاں ہیں ذروں میں   حجابِ حسن ہے آئینہ دارِ حسنِ نمود

پہلا مصرعہ دوسرے سے بالکل بے تعلق ہے۔ دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ ذروں میں شعاعِ آفتاب کی جولانیاں پائی جاتی ہیں، بالکل ٹھیک۔ ہر شخص واقف ہے، انکار کی گنجائش نہیں۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں ذروں کو حجابِ حسن کہنا بالکل خلافِ حقیقت و واقعہ ہے، کیونکہ وہ شعاعِ آفتاب کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتے"

دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخیٔ پنہاں   چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

پہلے مصرعہ میں (پر) کا استعمال غلط ہے، (سے) ہونا چاہئے یا (میں) اور دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ (معنیٔ گل) کوئی علٰحدہ چیز (گل) سے نہیں ہے۔ اگر (نکہتِ گل) کہتے تو بیشک (صورتِ گل) سے تفریق ہو سکتی تھی۔

یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

دکھایا برگ گل سے گاہ رنگِ شوخیٔ پنہاں چھپایا نکہت گل میں کبھی حسن نمایاں کو

یہ راز ہے میری زندگی کا پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا

دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ میں خودی میں مبتلا ہوں، لیکن یہ زندگی کا راز کب ہوا۔ بجائے (راز) کے (حال) یا (رنگ) کہنا چاہئے تھا۔ صرف ایک لفظ (راز) نے شعر کو بے معنی کر دیا۔

عالم یہ ہے اک سکون بیتاب یا عکس ہے میری خامشی کا

پہلے مصرعہ میں وہی "ادعائے بے دلیل" کا نقص موجود ہے۔ کیونکہ عالم پر "سکون بیتاب" ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ حقیقتاً عالم پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اگر بجائے عالم کے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا جاتا جس میں واقعی کوئی سکون پایا جاتا ہے تو بیشک کسی دلیل لانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

ہے بحر پر اک سکونِ بیتاب

تو یہ اعتراض وارد نہ ہوتا، کیونکہ بحر میں واقعی اک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جس میں سکون و بیتابی دونوں شامل ہیں۔

یاس ایک جنونِ ہوشیاری امید فریب زندگی کا

امید کو تو خیر فریب زندگی کہنا غلط نہیں، لیکن یاس کا (جنونِ ہوشیاری) ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، یاس اور جنون دونوں کی کیفیتیں بالکل متضاد ہیں اس سے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا:۔

یاس ایک سکون ہوشیاری

اس کے سوا تو معنیٔ مجنوں بھی کچھ نہیں ایسا بھی ربط صورتِ لیلیٰ نہ چاہئے

یعنی صورت لیلیٰ کے ساتھ اتنا ربط کہ مجنوں کا مفہوم سوائے اس ربط کے اور کچھ نہ رہ جائے، مناسب نہیں ہے حالانکہ عشق کی کامیابی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حسن کے نام سے پکارا جانے لگے۔ پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جب مجنوں کا مفہوم بھی سوائے ربطِ صورتِ لیلیٰ کے اور کچھ نہ رہا تو اور دل کا بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہئے۔ حالانکہ مجنوں کے علاوہ اور دل کو لیلیٰ سے کیا تعلق؟

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

اگر دوزخ کو فردوس حسن کا جلوہ کہنا درست ہو سکتا ہے تو فردوس کو نمونۂ جہنم بھی کہہ سکتے ہیں پھر کیوں نہ یہ شعر اس طرح پڑھا جائے:۔

جنت بھی ایک شعلۂ نار جحیم ہے　　جو اس سے بیخبر نہیں وہ ہیں عذاب میں

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں　　بکھرا دئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

دوسرا مصرعہ پہلے سے کوئی معنوی تعلق نہیں رکھتا۔ آسمان پر اگر تارے بکھرا دئے گئے ہیں تو ندائے درد سے اسکو کیا واسطہ۔ اگر مراد یہ ہے کہ "رات بھر تارے گنا کرو" تو لفظ (کچھ) بیکار ہے، کیونکہ قلت کو ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ اسکے لفظ مہ کے ساتھ یوں بھی (کچھ) کا استعمال صحیح نہیں کیونکہ کرۂ ارض کا چاند تو ایک ہی ہے۔

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے　　ہے زندگی کا راز تلاشِ سراب میں

اگر زندگی کا راز واقعی تلاشِ سراب ہے تو موت کا راز جستجوئے حقیقت ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے کہ اس کا سب سے زیادہ مہمل نظریہ سب سے زیادہ مستحق ستایش سمجھا جاتا ہے۔

کچھ شورشوں کے نذر ہوا خونِ عاشقاں　　کچھ جم کے رہگیا اسے حرماں بنا دیا

یہ بالکل جدید انکشاف ہے کہ جس چیز کو یاس و حرماں کہتے ہیں وہ عاشقوں کا منجمد خون ہے، اگر یہ شعر یوں ہوتا:-

جو خون بہ گیا اسے امید کر دیا　　جو جم کے رہگیا اسے حرماں بنا دیا

تو حرماں کے مقابلہ میں امید کے اجزار ترکیبی کی بھی تحلیل ہو سکتی۔

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہو کفر کی　　کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

یہ شعر بھی بالکل بے معنی ہے، کیونکہ ایمان کی حقیقت یہ بتانا کہ وہ فی الاصل کفر ہے پابند رسوم، حد درجہ لغو توجیہ ہے۔
اصغر صاحب مصرعہ پورا کرنے کے لئے لفظ (کچھ) اکثر استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ بلا ضرورت چنانچہ یہاں بھی موجود ہے اور بالکل بے محل۔

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے　　زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

اصغر صاحب راز کی جب کوئی بات ظاہر کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ ایسی ہی عجیب و غریب ہوتی ہے، پہلے انھوں نے راز زندگی، "خودی کا کفن" بتایا اس کے بعد تلاش سراب ظاہر کیا اور اب مجبوری میں پنہاں بتاتے ہیں جس کا دوسرا نام ان کے یہاں روزنِ زنداں بھی ہے۔
دوسرے مصرعہ کی بے تعلقی پہلے سے ظاہر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ مبادا اس میں بھی کوئی راز پنہاں ہو۔

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں　　ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

معلوم نہیں وہ کون سا مقام ہے جس کو ساقی نے آسان بنا دیا۔ اگر یہ کوئی مقام تصوف نہیں ہے تو اس کے مخصوص کرنے میں کیا حرج تھا جبکہ لفظ (اس) کے اشارہ نے یوں بھی ایک حد تک اس کے ابہام کو دور کر ہی دیا ہے۔

محو ہے ذوقِ دید بھی جلوۂ حسنِ یار میں ایک شعاع نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) کا صرف بالکل بیکار ہے۔ جلوۂ حسن میں ذوقِ دید محو نہیں ہوتا تو کیا لامسہ اور سامعہ محو ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں لفظ (اب) یکسر بے محل استعمال ہوا ہے، کیونکہ نظر نام ہی شعاعِ نور کا ہے، اس میں اب اور جب کیا؟

چاہئے داغِ معصیت اسکے حریم ناز میں پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

محبوب کے دامن عفت کو داغ معصیت سے آلودہ دیکھنے کی تمنا کرنا اگر کوئی مقام تصوف ہے تو اس میں شک نہیں کہ نہایت دلچسپ ہے اگر اس کا تعلق اپنے سے ہو اور حد درجہ رشک انگیز اگر یہ خدمت کسی اور کے سپرد کیجائے

اب وہ عدم، عدم نہیں پرتوِ حسنِ یار سے باغ و بہار بن گیا آئینہ دستِ ناز میں

پہلے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا بالکل بیکار ہے کیونکہ معنی صرف اتنا کہنے سے بھی پورے ہو جاتے ہیں کہ "پرتوِ حسن یار سے دستِ ناز میں آئینہ باغ و بہار بن گیا"۔ اب وہ عدم، عدم نہیں کا شعر سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اول تو آئینہ کو عدم سے تعبیر کرنا درست نہیں اور اگر سادگی کے لحاظ سے اس کو عدم کہا جائے تو دو بار (عدم، عدم) کہنے کی ضرورت نہیں۔ پہلا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا:۔

اب وہ عدم نہیں رہا پرتوِ حسنِ یار سے

علاوہ اس کے باغ و بہار کے مقابلہ میں بجائے عدم کے خزاں کہنا زیادہ موزوں تھا یا عدم کے مقابلہ میں بجائے باغ و بہار کے نقش وجود، نقشِ حیات کہتے۔

مئے بے رنگ کا سو رنگ سے رسوا ہونا کبھی میکش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

یہ شعر "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کی قسم کا ہے اور فلسفۂ وحدت الوجود سے تعلق رکھتا ہے یعنی وہی ایک "مئے بیرنگ" ہے جو کبھی میکش نظر آتی ہے اور کبھی ساقی و مینا۔ یہ مئے بیرنگ کیا چیز ہے یہ شاعر کا کوئی ذہنی مفروضہ ہے یا پھر علم نیرنجات کا کوئی تماشہ کہ ایک ہی چیز مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے۔

پہلے مصرعہ میں لفظ (کا) غلط ہے، اس کے بجائے (کو) ہونا چاہئے۔ یہ غزل تقریباً پوری کی پوری "صنعتِ اہمال" میں لکھی گئی ہے اور اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ازل تا بہ ابد محوِ تماشہ ہونا[1] میں وہ ہوں جس کو نہ مرنا ہے نہ پیدا ہونا

[1] یہ شعر تو اصغر صاحب نے غالباً پیدا ہونے کے بعد ہی کہا ہوگا اس لئے اب "نہ پیدا ہونا" کیسا۔ اصل میں کہنا چاہئے تھا "نہ زندہ رہنا"، حالانکہ اس صورت میں بھی یہ معما لاینحل رہجاتا کہ وجود کی یہ صورت کہ انسان نہ زندہ رہے نہ مرے کیونکر متعین ہو سکتی ہے اور اس کا تعلق "تماشہ" سے کیا ہے۔ محاورہ کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کی ردیف بالکل غلط قرار پاتی ہے "محوِ تماشہ رہنا" کے بجائے "محوِ تماشہ" ہونا لکھا گیا ہے

سارے[1] عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا ہائے اس شوخ کا ہمشکل تمنا ہونا
فصل[2] گل کیا ہے، یہ معراج ہے آب و گل کی میری رگ رگ کو مبارک رگِ سودا ہونا
حسن[3] کے ساتھ ہے بیگانہ نگاہی کا مزہ قہر ہے قہر مگر عرضِ تمنا ہونا

یہ تمام اشعار مفہوم کے لحاظ سے نہایت ادنیٰ درجہ کے ہیں اور فن کے لحاظ سے بھی اسقام سے پاک نہیں۔

ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

معنیٔ آدم کجا، صورت آدم کجا یہ نہاں خانے میں تھا اب تک نہاں خانے میں ہے
خرمن بلبل تو پھونکا عشق آتش رنگ نے رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے
میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی تو کمال زندگی کہتا ہے مرجانے میں ہے

یہ تینوں اشعار بالکل مفہوم سے معرّا ہیں اور اصغر صاحب کے مرتبۂ شاعری کی توہین ہے اگر کوشش کرکے کوئی مفہوم ان کا پیدا کیا جائے۔

(باقی)

خطبات خالدہ خانم

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے خطبات جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دئے تھے پہلے چار لکچروں میں ترکی کی تاریخ نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ پانچویں اور چھٹے لکچر میں ترکی ادب، ان کی شاعری، ان کے ڈرامے اور ان کے صحیح ذوق پر ایک بے انتہا دلچسپ تبصرہ ہے، ساتویں لکچر میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کی عورتوں نے کس طرح مردوں کے دوش بدوش قومی تعمیر میں حصہ لیا اور آٹھویں لکچر میں آیندہ کی امیدوں کو پیش کیا گیا ہے۔

انگریزی قیمت سے ر - اُردو قیمت عا ر

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

---

[1] "شوخ کا ہمشکل تمنا" عجیب بات ہے۔ اور اگر اس "ان ہونی" کو "ہونی" فرض کرلیں تو معنًا یہ نقص پیدا ہوتا ہے کہ جب معشوق خود "ہمشکلِ تمنا" ہوگیا یعنی خود وہ "آرزومند" ہوگیا تو پھر عالم میں بیتابی و شورش کیونکر پیدا ہوسکتی ہے۔

[2] پہلے مصرعہ میں لفظ (یہ) بالکل بیکار ہے اور صرف وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "رگِ سودا" کا استعمال درست نہیں — [3] (ساتھ) بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ "بیگانہ نگاہی" کسی چیز (سے) ہوتی ہے، نہ کہ اس کے (ساتھ)

علم نجوم اور انسانی مستقبل

قدیم زمانہ میں ماہرین علم الکیمیا کی انتہائی تمنا یہ تھی کہ وہ ادنیٰ قسم کی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکیں اور ہر چند وہ اس میں تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن جدید علم الکیمیا کی بنیاد ضرور ڈال گئے جو بغیر قصد و ارادہ کے اس منزل تک پہونچ گیا جو اسلاف کا منتہائے نظر تھا۔ چنانچہ جدید تجربات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ جس چیز کو اسوقت ریڈیم کہا جاتا ہے اور جو دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی عنصر سمجھا جاتا ہے اپنی ابتدائی حالت میں صرف سیسہ تھا اور امتداد زمانہ و طبیعی تغیرات کے زیر اثر آخر کار ریڈیم بن گیا۔

اس انکشاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعیات اور علم الکیمیا کے باہمی تعلق کی طرف علماء کو غور کرنے کا موقعہ ملا اور آخر کار ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا ممکن ہے یعنی پارہ یا سیسہ کو سونا بنانے کا خیال جو کسی وقت مضحکہ انگیز امر سمجھا جاتا تھا، اب ممکنات میں شمار ہونے لگا ہے۔

اسی طرح علم نجوم کو لیجئے کہ علماء قدیم سیاروں کی گردش کا مطالعہ کر کے انسان کے مستقبل پر حکم لگانے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہوئے اور اب فلکیات جدیدہ ان کی اس تمنا کو پورا کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس کو ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسان کی صحت اور اس کی قوت عمل بہت کچھ منحصر ہے ملک کی آب و ہوا اور فضا کی حالت پر۔ اگر کسی ملک کی آب و ہوا صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہاں کی آبادی توی ہوگی، طویل العمر ہوگی، نشاطِ عمل بھی اس میں زیادہ پایا جائے گا اور اس کا مستقبل بھی شاندار رہوگا۔ اسی طرح اگر موسمی تغیرات کسی ملک کے انسان کے ذہنی، حجانات و قوائے عمل کو مضمحل کر دینے والے ہوں گے تو اس کا مستقبل اسی نسبت سے تاریک ہوگا۔ پھر چونکہ اقلیموں کی آب و ہوا، موسمی تغیرات، طبیعی حوادث کا تعلق آفتاب کی حرارت اور اس کے اضطرابات کہربائی سے ہے اور آفتاب کی یہ اثراندازیاں بہت کچھ منحصر ہیں اُن سیاروں کی گردش پر جو اس کا چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ کرۂ ارض کے مختلف حصوں کی آبادیوں کا مستقبل بڑی حد تک گردش سیارگان پر منحصر ہے۔

اگر سیاروں کی تخلیق و آفرینش کا سلسلہ بند ہوگیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ موسمی تغیرات بھی ایک حال پر قایم رہتے اور اسی لحاظ سے ملکوں کا مستقبل بھی ہمیشہ کے لئے متعین ہوجاتا، لیکن چونکہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور بیشمار اجرام فلکی روزانہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں اس لئے آفتاب کی حرارت اور اس کے تغیرات کہربائی میں بھی ردوبدل ہوتا رہتا ہے اور اسی لسبت سے کرۂ ارض کی موسمی کیفیت اور اسکے طبیعی حالات بھی مختلف مقامات میں بدلتے رہتے ہیں۔

اب آیئے ان موسمی اثرات پر بھی اک نگاہ ڈال لیجئے کہ انسانی آبادی اس سے کس درجہ متاثر ہوتی ہے سب سے پہلے آپ ہوا کو لیجئے۔

صبح کا وقت ہے، خنک ہوا آہستہ آہستہ چل رہی ہے، ہر شخص اپنی اپنی جگہ اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے کہ دفعتہً اس میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہونچتی ہے کہ درخت اُکھڑنے لگتے ہیں، مکان گرنا شروع ہوتے ہیں، ساحل غرق ہوجاتے ہیں، جہاز ڈوبنے لگتے ہیں، ریل کی پٹریاں اُکھڑجاتی ہیں اور ان تباہیوں سے کروڑوں روپیہ کا نقصان انسان کو پہونچ جاتا ہے۔ اسی طرح سردی اور پالے کو دیکھئے کہ ہر سال کتنا خسارہ اسکی وجہ سے برداشت کرنا پڑتا ہے اور کتنے آدمی اور مویشی برفباری کی شدت سے مرجاتے ہیں۔

خشک سالی کے نقصانات بھی کو معلوم ہیں۔ آسٹریلیا میں ۱۹۰۳ء کی خشک سالی میں ۲ کروڑ بھیڑیں ضایع ہوگئیں اور ہندوستان و چین میں جہاں اکثر قحط پڑتا رہتا ہے مویشی اور انسان لاکھوں کی تعداد میں مرجاتے ہیں۔

اب موسمی تغیر کے اثرات کو ملاحظہ کیجئے۔ نیویارک میں تعداد اموات اور اسباب موت کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ صرف ایک درجۂ حرارت گھٹنے بڑھنے سے اموات کی کمی و زیادتی پر نمایاں اثر پڑتا ہے اور اگر کبھی دس درجے کا فرق ہوجائے تو موتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، چنانچہ وہاں اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر درجۂ حرارت کا گھٹنا بڑھنا انکے اختیار میں ہو تو صرف امریکہ کے اندر ایک لاکھ پچاس ہزار نفوس کی سالانہ ہلاکت بند ہوجائے۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان کا اوسط عمر پانچ سال بڑھجائے۔

جس وقت مختلف سالوں اور مختلف موسموں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت خشک سردی کے بعد تر گرمی شروع ہوتی ہے تو اموات کا اوسط وہاں ۵۰ ہزار سے دولاکھ تک پہونچ جاتا ہے۔

اب وبائی امراض کو لیجئے۔ طاعون، ہیضہ اور انفلوئنزا کی تباہکاریاں کس سے مخفی ہیں۔ الغرض موسم اور آب وہوا کے غیر معتدل ہونے سے جتنے نقصانات نوع انسانی کو ہر سال پہونچتے رہتے ہیں وہ اتنے ہیں کہ اگر اربوں روپیہ صرف کیا جائے تو بھی ان کی تلافی ممکن نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو فلکیات سے کیا تعلق ہے لیکن ایسا کہنا درست نہیں کیونکہ یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ موسموں کے تغیر اور طبیعی اثرات کا تعلق بالکل آفتاب اور اس کے داغوں سے ہے۔ جس سال آفتاب میں زیادہ داغ پیدا ہوتے ہیں اسی سال گرمی کم ہوتی ہے اور جب

داغ کم ہوتے ہیں تو گرمی بڑھ جاتی ہے۔ ہر چند حرارت کی یہ کمی و زیادتی ایک درجہ سے بھی کم ہوتی ہے لیکن اس کے اثرات بہت قوی ہوتے ہیں مثلاً یوں سمجھئے کہ اگر کسی سال آفتاب کے داغ بڑھ جاتے ہیں تو آندھیاں بکثرت چلتی ہیں اور ان سے جتنا نقصان پہونچتا ہے ظاہر ہے، اسی طرح جس سال داغ کم ہوتے ہیں تو خشک سالی ہوجاتی ہے اور اس کی تباہیاں بھی سب کو معلوم ہیں۔

الغرض کرۂ زمین اور اس کی فضا کے تغیرات کا بڑا سبب داغہائے آفتاب کا گھٹنا بڑھنا ہے اور چونکہ آفتاب میں یہ تغیرات دوسرے سیاروں کی وجہ سے ہوتے ہیں اس لئے سیاروں کی گردش سے انسان کا متاثر ہونا لازم ہے۔ اس کو اب ہم کسی قدر علمی تفصیل کے ساتھ سمجھانا چاہتے ہیں۔

پولینڈ کا نہایت مشہور ہیئت داں ارکتوسکی کہتا ہے کہ اس امر کے دلائل بکثرت موجود ہیں کہ آفتاب میں داغ اسوقت نمودار ہوتے ہیں جب گردش کے دوران میں متعدد سیارے ایک ہی سمت میں آجاتے ہیں۔

ڈاکٹر بور (افریقی) نے اس مسئلہ پر طویل بحث کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ آفتاب کے گرد جتنے سیارے گردش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت دوری پر واقع ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثر آفتاب کے کسی ایک سمت میں آجاتے ہیں اور ان سب کا اجتماعی اثر آفتاب کی حرارت پر، اس کی روشنی پر، اسکی جاذبیت و کہربائیت پر بہت شدید ہوتا ہے۔

آفتاب ہر وقت اپنے چاروں طرف فضا میں کہربائی شعاعیں پھینکتا رہتا ہے اور علماء کہربا کی تحقیق یہ ہے کہ اوپر کا طبقۂ لطیف قبول کہربائیت میں حد درجہ حساس واقع ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب کہربائی دباؤ ایک معین درجہ تک پہونچ جاتا ہے تو پھر فضا میں کہربائی شعاعیں پھیلنے لگتی ہیں اس لئے جب سیاروں کے خارجی طبقات سورج کی کہربائی شعاعوں سے حد درجہ متاثر ہوجاتے ہیں تو ایک معین درجہ تک پہونچنے کے بعد ان سے بھی کہربائی شعاعیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور آفتاب بھی ان سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ تو حال ہوا اُن سیاروں یا اجرام فلکی کا جو آفتاب کے گرد طواف کرتے ہیں اور اسی کے ماتحت سمجھے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ دوسرے نظامہائے شمسی کو لیجئے جو ہمارے آفتاب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور جن کا دائرۂ گردش ہمارے نظام شمسی سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا اثر بھی ہمارے آفتاب پر ہوتا ہوگا اور اس لئے کیسے خبر ہے کہ وہ غریب کس اضطراب و ہیجان میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے اور ہر آن کیا کیا تغیرات اس کے حالات میں ہوتے رہتے ہیں۔

اس وقت تک صرف ۳۸ سیارے ایسے دریافت ہوسکے ہیں جو ہمارے آفتاب کو برابر متاثر کرتے رہتے ہیں ان میں پانچ سیارے اب سے تقریباً ۴ ہزار سال قبل ہمارے آفتاب سے بہت قریب آگئے تھے

اور یہ وہ زمانہ تھا جسے کرۂ ارض کا عصر جلیدی (Ice age) کہتے ہیں اور آیندہ اتنی ہی مدت کے بعد سات سیاروں کا اس کے نزدیک آجانے کا امکان ہے گویا کرۂ ارض پر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ عصر جلیدی دوبارہ آنے والا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہی اس کے فنا ہونے کا وقت ہو۔

بہر حال آفتاب کی مختلف حالتوں سے کرۂ زمین کا متاثر ہونا اور دوسرے سیاروں کے قرب و بُعد سے آفتاب کے نوامیس کا متاثر ہونا فلکیات کے حقایق ثابتہ میں داخل ہے اور اس لئے یہ کہنا کہ نجوم کی گردش کا انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا درست نہیں ہے۔

البتہ انفرادی طور پر ہر انسان کے مستقبل پر سیارگان کی گردش سے حکم لگانا کوئی معنی نہیں رکھتا اور اس طرح کی پیشین گوئی پر اعتبار کرنا سخت حماقت ہے۔

چوری

پنڈت راما شنکر چوبے موضع دھرم پور میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اونچی ذات کے برہمن تھے اور مندر کے پوجاری ہونے کے سبب مذہباً ان کا احترام ہر ہندو پر فرض تھا۔ بیچارے دیہاتی اس فرض کی ادائی میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے لیکن اگر کوئی سہواً مہاراج کے پاؤں پڑنا بھول جاتا تو مہاراج اس کو سخت تنبیہ فرماتے۔ مہاراج گاؤں میں زمیندار کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ مندر میں جتنی جائدادیں وقف تھیں ان پر وہ بلا شرکت غیرے متصرف تھے۔ جس وقت مہاراج گاڑھے کی مرزئی اور گاڑھے کی دھوتی پہنکر گاؤں میں سے گزرتے ہوئے ندی پر اشنان کے لئے جاتے تو بستی میں ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پنڈت جی گاؤں میں سے گزریں اور راستہ میں کوئی اپنے دروازہ پر پلنگ بچھا کر بیٹھا رہے۔ بچہ بچہ آکر مہاراج کے ڈگوڑ لگتا اور مہاراج سب کو آشیرباد دیتے ہوئے کھڑاؤں کھٹکھٹاتے ندی پر چلے جاتے۔ ندی میں جا کر اشنان کرتے وقت گھنٹوں سورج نارائن کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے اور ان کے نام پر جل چڑھاتے۔ وہاں سے واپس آکر مندر میں دیوی جی کی پوجا شروع کر دیتے۔ گھنٹوں کی ٹن ٹن اور سنکھ کی آواز سنکر بستی کے لڑکوں کی ایک جماعت وہاں آجاتی اور مہاراج سب کو پرشادی دیتے۔

مہاراج سود کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ رام چرن حلوائی۔ سورج مل بزاز۔ رام ٹہلا پاسی سبھی ان کے مقروض تھے۔ دیہات کا جاہل طبقہ روپیوں کے لین دین میں کسی باضابطہ کارروائی کا عادی نہ تھا۔ مہاراج کے پاس ایک بہی تھی جس میں وہ شرح سود کی جتنی مقدار چاہتے لکھ دیتے۔ لیکن واجب الادا رقم زبانی طے پاتی اور مہاراج اکثر اسی پر اکتفا بھی کرتے۔ بہی سے مصرف اُسوقت لیا جاتا جب کسی شکار کو وہ تاکتے یا جب کسی بدنصیب سے وہ ناخوش ہو جاتے۔ کسی دیہاتی کی مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف چون و چرا کر سکے۔ اس کی قسمت کا فیصلہ خود مہاراج کے رحم و کرم پر منحصر ہوتا۔ جس سے اور جب کبھی وہ چاہتے اپنا انتقام لیتے اور اس طرح لیتے کہ اس غریب کے پاس ایک ٹھیکرا تک باقی نہ رہتا۔

(۲)

دھرم پور گنگا کے کنارے بہت قدیم آبادی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جب سرزمین ہند

ترقی کے معراج کمال پر پہونچی ہوئی تھی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں رام نے جنم لیا اور دنیا کو اخلاق و وفاداری کا سبق دے گئے۔ یہیں پیدا ہوئے اور دنیا کو محبت کا ایسا جام پلا گئے جس کی سرشاری قیامت تک فنا نہیں ہو سکتی یہیں گوتم بدھ نے دنیا کی بے ثباتی پر مہر دوام ثبت کی اسی زمانہ کی یادگار دھرم پور بھی ہے۔ مشہور ہے کہ یہاں کے مندر میں اس کمان کا ایک ٹکڑا آج بھی محفوظ ہے جسے توڑ کر رام جی سیتا جی کو بیاہ لائے تھے۔

دھرم پور کی رونق بیشتر منحصر تھی انھیں قدیم روایات پر۔ سال کے مختلف حصوں میں جاتریوں کا گروہ یہاں پہونچتا اور دوکانداروں کو ان کی ذات سے آمدنی کا ایک ذریعہ ہاتھ آجاتا۔ یہاں کا بازار مختصر تھا۔ اسمیں چند دوکانیں حلوائیوں کی تھیں۔ ایک دو دوکان کپڑے کی کچھ بنئے تھے اور ایک تمباکو کی دوکان۔

پھاگن کا مہینہ ہندوستان میں دیہاتیوں کے لئے اس درجہ روح افزا مہینہ ہے کہ اس کی دوسری مثال دنیا میں نظر نہیں آتی۔ ان کی معصوم مسرتیں حقیقتاً ایک ایسا جذبہ مسرت و بہجت اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں جو شہریوں کو بڑے سے بڑے جشن میں بھی میسر نہیں۔ سال کا یہ مہینہ وہ ایسی خود فراموشیوں میں بسر کر دیتے ہیں جس کی شادمانیوں کو سرمایۂ حیات ہی کہہ کر ظاہر کر سکتے ہیں۔ ہر شخص عبیر اور گلال میں سر سے پاؤں تک لپٹا نظر آتا ہے۔ گاؤں کی معصوم عورتیں ایک دوسرے سے ٹھٹھولیں کرتی گزر جاتی ہیں۔ بوٹی بوٹی سے زندگی اور جوانی ٹپکتی ہے۔ راستہ میں اگر کوئی مرد ملجاتا ہے تو اس کی دعوت بھی رنگ سے کی جاتی ہے۔ پنگھٹ پر غیر معمولی ہنگامہ ہوتا ہے ایک دوسرے کی پکڑ دھکڑ۔ رنگ وعبیر میں ایک دوسرے کو لت پت کر دینا کچھ ایسے مناظر ہیں کہ چار طرف آگ لگا دیتے ہیں۔

ہولی ختم ہو چکی تھی لیکن ابھی چہروں سے اس کے نشانات محو نہیں ہوئے تھے۔ دوسری صبح کارو حلوائی اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا ناریل پی رہا تھا اور بیچو کہار، رامو کاچھی اور رامرت گوالا ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے۔

بیچو۔ (آستین سے انگلیاں مار کر چہرہ اڑاتے ہوئے) بھائی کارو ہولی ختم ہوگئی۔ ہولی لوگوں کی دلچسپی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ ایشور جانے پھر یہ دن دیکھنا نصیب ہو کہ نہیں۔

کارو۔ (ناریل پر ایک دم لگا کر) ہاں بھائی! بات تو سچ ہے رام ہی جانے . . . . لیکن یار اب کے سمے بڑا جشن رہا۔

رامو۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) میں اب بوڑھا ہوا۔ پھر یہ تیوار ہاں اور میں کہاں۔ لیکن یار بیچو! سچ تو یہ ہے کہ اب کے کارو کی بدولت سب کچھ ہوا۔ سچ کہنا کارو یہ سب نئے نئے گانے تم نے کہاں سے سیکھے؟

کارو۔ (اپنی سیاہ گھڑی جیبیوں سے کھمیاں اڑاتے ہوئے) بیچو، یہ کیا کہتے ہو! تم سے زیادہ بوڑھے لوگ ابھی بیٹھے ہوئے ہیں . . . . . گیت سیکھنے کہاں جاؤں گا، خود ہی جوڑ جاڑ لیتا ہوں۔ سال بھر جب محنت کرتا

ہوں تب کہیں جاکر دو چار گیت بنا پاتا ہوں۔ کیا بتاؤں مجھے ایشور کے بھجن میں کیسا مزہ آتا ہے۔ تم جانتے ہو راموا پرہلاد جی اسی ایشور بھگتی کے بدولت انسان سے دیوتا بن گئے۔ انہی کی یاد میں ہم لوگ یہ ہولی کا تہوار مناتے ہیں۔

یہ لوگ باتوں میں مشغول تھے کہ مہاراج راما شنکر ندی سے اشنان کرکے اسی طرف آئے اور کارو حلوائی کی دوکان پر آکر کھڑے ہو گئے۔ مہاراج کی صورت دیکھ کر کارو جلدی سے ناریل علٰحدہ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر مہاراج کو "پاؤں لاگن" کیا۔ مہاراج نے آشیرباد دی۔

کارو۔ (اسی طرح ہاتھ جوڑے ہوئے) کدھر کرپا کی مہاراج! کہیے کیا حکم ہے؟

مہاراج۔ کارو تم تو جانتے ہو بے ضرورت تو کہیں جاتا نہیں۔ میں تم سے پوچھنے آیا ہوں یہ مکان کس کا ہے؟

کارو۔ بجرنگ ساہوکار کا سرکار! جس کو مرے ہوئے دو برس ہو چکے۔

مہاراج۔ ہاں مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ کب مرا۔ لیکن تم جانتے ہو یا نہیں یہ مکان وہ مندر میں وقف کر گیا ہے۔

کارو۔ ہاں مہاراج! مجھے کیا سارے گاؤں کو معلوم ہے۔

مہاراج۔ تو پھر تمہیں دو برس کا کرایہ ادا کرنا چاہیے۔

کارو۔ لیکن سرکار! آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ یہ مکان وقف کرنے سے پہلے میں ٹھیکہ پر لے چکا تھا۔ میں نے اس کے بدلے پانچ سو روپے نقد دئے ہیں۔ یہی شرط تھی کہ جب تک سب روپے ادا نہ ہو جائیں مجھے کرایہ نہیں دینا پڑے گا۔

مہاراج۔ میں شرط ورط کچھ نہیں جانتا۔ مندر کی تمام چیزوں کی حفاظت مجھے کرنی ہے۔ میں تم سے کرایہ چاہتا ہوں۔

کارو۔ اور میرے روپے کا کیا ہوگا سرکار!

مہاراج۔ میں کیا جانوں۔ وقف کے کاغذ میں تو کہیں اس کا تذکرہ ہے نہیں۔

کارو۔ سرکار! میرے پاس تو رجسٹری کا کاغذ موجود ہے۔ مہاراج! ایسا ظلم نہ کیجئے۔ میری عمر بھر کی کمائی وہی پانچسو روپے تھے۔ میرے بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ میں کرایہ کہاں سے ادا کر سکتا ہوں۔

پنڈت راما شنکر کی مغرور طبیعت کب گوارا کر سکتی تھی کہ ایک غریب حلوائی ان کے ظلم کا تذکرہ زبان پر لائے۔ شعلے کی طرح بھڑک اٹھے۔ غصہ سے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ کڑک کر بولے "کارو اب تیری یہ مجال ہو گئی کہ ایک برہمن کو انیائی کہے۔ تیری گستاخی کا مزہ تجھے معلوم ہوگا"

کارو۔ ایشور مجھے نہ کریں اگر دل میں گستاخی کا خیال بھی گزرا ہو (پاؤں پر گر کر) مہاراج! صرف روپیوں کا عذر ہے۔ اگر آج سرکار کی طرف سے مل جائے تو کرایہ دینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

"اچھا دیکھا جائے گا" کہکر مہاراج رخصت ہوئے۔

کاردو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مہاراج کے غصہ کا انجام کیا ہوگا۔ تمام عمر میں کس طرح خون کو پانی کر کر کے فاقے کر کر کے مصیبتیں سہہ سہہ کے اس نے اتنی رقم جمع کی تھی تب کہیں جا کر اسے کرایہ سے نجات ملی تھی اور اب اس قابل ہوا تھا کہ روکھا سوکھا دونوں وقت کھا سکے۔ یکایک اپنی پوری دولت کو زندگی بھر کی کمائی کو اس طرح برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر اسے خفقان ہونے لگا۔ اور اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو شاید رو پیٹ کر صبر کر لیتا مگر سب سے زیادہ جو چیز اسے خوفزدہ کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ اب اس کی عزت و آبرو بھی خطرہ میں تھی۔ اس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ ایک غریب کو، ایک مزدور کو، ایک فاقہ کش، ایک مصیبت زدہ انسان کو اس دنیا میں اتنا حق بھی نہیں پہونچتا کہ وہ اپنے جائز حق کے چھینے جانے پر زبان بھی ہلا سکے۔ شوخی نہیں، گستاخی نہیں مقابلہ نہیں، محض التجا وہ بھی رحم و کرم کی، لطف و عنایت کی۔ ایک صدائے احتجاج وہ بھی ظلم و تعدی کے خلاف، لوٹ مار کے خلاف، اپنے حق کے غصب کئے جانے کے خلاف۔ فطرت کا قانون امیر غریب سب کے لئے ایک ہے۔ سب کو ایک طرح ننگا اور تہی دست پیدا کرتی اور ایک ہی طرح خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ پھر انسان کی یہ خون آشامیاں کس غرور پر؟ کیا صرف اس لئے کہ ایک کا باپ مرنے کے بعد زر و سیم کا کچھ انبار چھوڑ گیا اور دوسرے کو چاندی کے چمچے سے دودھ پینا نصیب نہیں ہوا۔ لیکن دنیا ان کی طرف کیوں توجہ کرے اسے غریبوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اگر انسان ہونے کی حیثیت سے اقتضائے قدرت کے لحاظ سے، غریبوں کے جذبات و احساسات کا بھی خیال کیا جائے تو سرمایہ داروں کی غلامی کون کرے۔ ان کے حرص و آز کے آدم خور عفریت کسے اپنی غذا بنائیں۔ ان کے بہ فلک بوس محلوں کی تعمیر کیونکر ممکن ہو جب تک غریبوں کی ہڈیوں کے چونے ان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے میسر نہ آسکیں۔ غریب کی بے دست و پائی۔ مجبوری و بیچارگی کچھ ایسی چیزیں نہ تھیں جن کی بنا پر اسے انسانیت کے تمام حقوق سے محروم کر دیا جاتا لیکن شیطنت خود غرضی اور نفس پرستی ایک طبقہ میں فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ ایسی صورت میں تو شاید قدرت کے زبردست ہاتھ بھی غربا کی دستگیری میں بیکار ثابت ہوں۔

کاردو اپنی اس نئی مصیبت پر غور کرتا ہوا گھنٹوں دوکان پر خاموش و ساکت بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس کے ساتھ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل جاتے کہ ایشور یہ میرے کس پاپ کی سزا ہے۔ کیا زندگی بھر کے لئے کشٹ بھوگنا ہی قسمت میں لکھا ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ کیا پاپ ہے تو اس کی پرائشچت کرتا۔ پھر جب اس کا جی کسی طرح نہ لگا تو دوکان بند کر کے گھر چلا گیا۔ بیوی جسے وہ پیار سے بدری کہا کرتا تھا اس کی بے وقت آمد سے متعجب ہوئی اور چہرہ پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر اس کا بھی رنگ فق ہو گیا۔ اس کی لڑکی کیسری محلہ سے آگ لیکر واپس آئی، باپ کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو کر پوچھنے لگی:۔

"کیوں پتا جی آج اتنے سویرے کیوں آ گئے۔ بہت سست بھی معلوم ہوتے ہیں کیا بات ہے؟"

لڑکی کے سوال پر کارو کی حالت اور زیادہ المناک ہوگئی۔۔۔ زخم کو نشتر سے چھیڑ دیا گیا تھا، آبلہ کو ٹھیس لگ گئی تھی، دل و دماغ جل رہے تھے۔۔۔۔ آنکھوں نے اس آگ پر پانی ڈالنا چاہا کامیابی ہوئی لیکن بہت دیر کے بعد۔ بیوی اور بیٹی کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا۔ وہ بھی کھڑی روتی رہیں اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ بالآخر کارو کو جب سکون ہوا تو۔۔۔۔۔۔۔ سب کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

کارو۔ پریمی! اب تو مجھے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔

پریمی۔ آخر جائیں کہاں، اپنا پرایا کوئی بھی تو نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک برہمن کا سراپ ہمیں کہیں نہ چھوڑے گا۔

کارو سراپ کے نام سے تھرا گیا۔ ہاتھ پاؤں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد سنبھلا اور بولا:۔ نہیں پریمی! میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ ایشور پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ ایسے سراپوں سے کیا ہوتا اور پھر مہاراج ہمیں کیوں سراپ دینے لگے، ان کی مرضی کے مطابق تو گھر چھوڑ ہی دوں گا۔

پریمی۔ پھر یہیں کیوں نہ رہیں۔ یہاں جنم بھومی ہے۔ پرائی جگہ میں ہم ایسے غریبوں کو کون پوچھیگا؟

کارو۔ یہاں رہنے کی کیا صورت ہے، سوال صرف روپئے کا نہیں جو میں نے بجرنگ ساہو کو مکان کے لئے دیا تھا۔ بلکہ یہاں تو بہت بری زندگی چھینی جارہی ہے۔ میری شرافت، میری عزت سب کچھ خطرہ میں ہے۔ اگر محض دوکان سے علحدہ ہو جاؤں تو دو برس کا کرایہ کہاں سے ادا کروں۔ اور نہ دینے کی صورت میں معلوم نہیں کیا کیا سزا بھگتنی پڑے۔

پریمی۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں خود جاکر مہاراج سے کہوں گی، گڑگڑاؤں گی، معافی مانگوں گی۔ آخر انسان ہیں رحم کریں گے۔

—— ۳ ——

شام ہونے کو ہے آسمان پر رنگ و نور کے امتزاج کی وہ کیفیت نمایاں ہے گویا فطرت اہل دنیا کو مسرت و شادکامی کی دعوت دے رہی ہے۔ آفتاب نے کائنات پر سونے کی بارش کر رکھی ہے۔ شاید اسے بھی معلوم ہے کہ دنیا میں صرف زر و سیم کے انبار ہی سے مسرت حاصل ہوسکتی ہے۔

رات ابھی شروع ہوئی ہے۔ مہاراج راماشنکر ابھی ابھی سندھیا ختم کرکے بیٹھے ہیں کہ لالہ سورج مل آئے اور پرنام کرکے بیٹھ گئے۔ مہاراج نے انھیں اپنے پاس کمبل پر جگہ دی۔

لالہ سورج مل دھرم پور کے سب سے بڑے دوکاندار تھے۔ لیکن اقتصادی اعتبار سے ان کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ ہمیشہ مہاراج راماشنکر کے قرضدار ہی رہتے اور یہی سبب تھا کہ مہاراج کے سب سے بڑے

آڑ کار تھے۔ لالہ جی کی بزازے کی دوکان تھی جو کار دھلوائی کی دوکان کے برابر واقع تھی۔
مہاراج۔ لالہ جی افسوس ہے آپ نے اب تک کچھ نہیں کیا۔۔۔۔ اتنی مدت گزر گئی۔
لالہ جی۔ کیسی باتیں ہیں مہاراج! آپ کا حکم اور میں پورا نہ کروں۔ سارا انتظام ٹھیک ہو گیا ہے۔ اتنی دیر تو قصداً کی گئی ایسا نہ ہو لوگ ۔۔۔ ہو جائے
مہاراج۔ آپ بھی بڑے ۔۔۔ ہیں ۔۔۔ داڑھی۔ کوئی بدگمانی کر کے میرا کیا بگاڑ سکتا ہے مجھے ان باتوں کی کب پرواہ ہوئی ہے۔ اچھا خیر، مگر اب دیر نہ ہونا چاہئے۔
لالہ جی۔ ایشور نے چاہا تو کل ہی مہاراج!
گفتگو یہاں تک پہونچی تھی کہ ایک عورت میلی ساری پہنے آئی اور دروازہ کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی
مہاراج۔ بندھو! ارے بندھوا (مہاراج کا نوکر) دیکھ کون آیا ہے؟
بندھو۔ سرکار کار دھلوائی کی جناتہ (بیوی) ہے۔
مہاراج۔ پوچھ اسوقت کہاں آئی ہے؟
ابھی بندھو نے کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ پریمی مہاراج کے چرنوں میں گر پڑی۔ وہ رو رہی تھی۔ آنسو جاری تھے، ہچکیوں سے وہ اچھی طرح بولنے پر قادر بھی نہ تھی
پریمی۔ مہاراج ۔۔۔۔ دیا کیجئے ۔۔۔ آپ بڑ ۔۔۔ ہمن ۔۔۔۔ ہیں اور ۔۔۔ وہ آپ کے ۔۔۔ داس۔ ان سے ۔۔۔ پاپ ہو اب اُن کو ۔۔۔ کشٹ سے بچا لیجئے۔
مہاراج۔ میں نے کیا کیا ہے؟ میں تم سے مندر کا حق مانگتا ہوں اور جب تک یہ نہیں لیگا زبانی معافی مانگنے سے کیا کام چل سکتا ہے۔ دیوی جی کی چیز میں کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ لالہ سورج مل! تم ہی انصاف کرو میں کیا غلط کہتا ہوں!
لالہ جی۔ بات صحیح ہے مہاراج۔
پریمی۔ نہیں مہاراج ۔۔۔۔ میں اس سے انکار تو نہیں کرتی ٹھیکے کے روپئے بھی تو واجب ہیں۔ اور اگر ہم لوگ اس سے محروم کر دئے گئے تو پھر کھانے کا ٹھکانہ بھی ہم لوگوں کے لئے باقی نہ رہے گا
مہاراج۔ آج پھر گڑے مردے اکھاڑنے آئی ہے۔ مرد یا چکا تو عورت بحث کرنے آئی ہے۔ میں فضول بکواس نہیں سننا چاہتا۔ تم لوگ دیوی جی کا حق ہضم کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اس سے کیا وہ خود تم سے وصول کر لیں گی۔ ایسا نہ ہو کہ کرودھ (غضب) تم لوگوں کو خاک کر دے۔
پریمی۔ مہاراج سرا پئے نہیں۔ میں آپ سے دیا کی التجا کرنے آئی ہوں۔ غریب ہوں زندگی کا بردان مانگتی ہوں

عزت اور آبرو کی بھیک مانگتی ہوں۔ کرپا کیجئے مہاراج! میں سب کچھ کروں گی جو آپ کی آگیا ہوگی لیکن اتنی پرا رتھنا سن لیجئے۔ غریب ہوں بھوکوں مرجاؤں گی۔ مکان چھوڑنے کو طیار ہوں لیکن سرا پئے نہیں

مہاراج۔ مکان چھوڑ دوگی اور کرایہ کون ادا کرے گا۔ میں اسے معاف نہیں کرسکتا۔

پریمی۔ پیسہ پیسہ کو تو محتاج ہوں کرایہ کی رقم کہاں سے دے سکتی ہوں۔ اتنی دیا کیجئے مہاراج!

مہاراج۔ بس میں فضول بکنا نہیں چاہتا۔ مجھے پاٹ کرنے ہیں، میں کب تک تمہارے ساتھ سر کھپاتا رہوں گا۔

آخرکار پریمی مایوس ہوکر مکان لوٹ آئی۔

—— ۴ ——

صبح کا وقت ہے، آفتاب نکل آیا ہے۔ بازار کی دوکانیں کھلنی شروع ہوگئی ہیں لالہ سورج مل اپنی دوکان میں داخل ہوئے اور یکبارگی چیخ پکار شروع کردی۔ دوکان میں چوری ہوگئی تھی دوکان کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دو سو روپئے نقد اور کچھ کپڑے چور اُٹھالے گئے۔ چور دوکان میں پشت کی دیوار کاٹ کر داخل ہوئے تھے۔ دوکان کے سائبان کے بعد ایک کوٹھری تھی جو گدام کا کام دیتی تھی۔ دوکان کی پشت پر کھنڈر زمین تھی، چوروں نے اُسی طرف سے کوٹھری کی دیوار کاٹ دی تھی۔ ہنگامہ سنکر گاؤں کے لوگ ٹوٹ پڑے۔ مشورہ کے بعد پولیس کی چوکی میں خبر دی گئی۔ تھوڑی دیر میں پولیس سب انسپکٹر دو کانسٹبل کو لیکر موقعہ پر آگئے۔ تحقیقات شروع ہوگئی۔ لالہ سورج مل نے بتایا کہ کارو حلوائی کی دوکان پر گاؤں کے چند بے فکرے جمع ہوکر بھجن گایا کرتے ہیں ممکن ہے یہ انہی لوگوں کا فعل ہو۔ پولیس کیلئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ دھڑا دھڑ تلاشیاں ہونے لگیں۔ کارو حلوائی کا مکان بھی اس زد میں آگیا۔ تلاشی لینے پر ایک صندوقچہ ٹوٹا ہوا اس کے کھنڈر میں پایا گیا جسے سورج مل نے پہچانا کہ یہی صندوقچہ ہے جس میں روپئے رکھے گئے تھے۔ گھر کا ایک ایک کونہ چھان ڈالا گیا لیکن کوئی دوسری شئے برآمد نہ ہوسکی ہاں ایک جوڑ چاندی کے کنگن ملے جسے سورج مل نے کہا کہ کل ہی کلدیپ سنگھ نے اس کے یہاں رہن رکھے تھے اور یہ بھی اسی بکس میں پڑے ہوئے تھے۔ کارو کا بیان تھا کہ کئی برس ہوئے یہ کنگن اس کی پریمی کو اس کے ماں باپ نے دئے تھے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت وہ پیش نہیں کرسکتا تھا۔ کارو کی سسرال میں اب کوئی نہ تھا سب مرچکے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں بنے اور کس وزن کے تھے۔ کپڑے اور روپیوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ سب انسپکٹر نے دونوں کے بیانات قلمبند کئے۔ کارو مجرم تھا۔ پولس نے حراست میں لے لیا۔

کارو کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ دیوانوں کی طرح سب کا منہ تک رہا تھا۔ آنسو خشک تھے اور اب اس میں یہ بھی صلاحیت نہ تھی کہ اپنی برأت میں ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ پریمی اور کیسری پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ سب انسپکٹر کے سامنے ہزاروں منتیں کیں۔ خوشامد کی لیکن قانونی شکنجے سے کسی طرح نجات ممکن نہ ہوسکی گاؤں

کے تمام لوگ کارو کی ایمانداری سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ حیرت میں تھے کہ یکایک کارو پر شیطان کیونکر سوار ہو گیا۔ یقین کرنے کو ان کا جی ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ حرکت کارو کی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ دیکھ رہے تھے بکس کارو کے مکان سے نکلا تھا۔ آنکھوں کو کس طرح جھٹلا دیتے۔ جرم ثابت ہو چکا تھا اور کارو سب کی نظر میں ذلیل ہو کر رہ گیا تھا۔

تھانہ پہونچکر ضروری کاغذات مرتب ہوئے تھانیدار نے لوگوں سے دریافت کیا کہ کوئی ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ امرت گوالے نے اس کی ضمانت دی اور رہائی دلاکر مکان واپس لے آیا۔

شام کے وقت رامو کانو، بیجو کمہار اور امرت سب کے سب کارو کے مکان پر جمع ہوئے۔ امرت نے کہا۔

"کارو، زیادہ فکر نہ کرو۔ اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ تمھاری بے گناہی کا ہم سب کو یقین ہے۔ لیکن یار یہ بتاؤ کہ لالہ سورج مل سے تم سے کہاں کا بیر تھا کہ اس کا بدلہ لیا۔

کارو۔ کیا کہوں اپنی قسمت کے سوا کس کو دوش دے سکتا ہوں۔ یہ پہلے جنم کا پاپ ہے جس کے بدلے اس جنم میں نرکھ میں جل رہا ہوں۔

بیجو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کرودھی نے تم پر یہ جال بچھایا ہے۔

کارو۔ میرا اس گاؤں میں کوئی دشمن نہیں پھر کس کو الزام دوں؟

رامو۔ یار ایسے جو کچھ کہو۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے۔ بیجو ذرا ادھر اُدھر دیکھ لو کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس روز جو مہاراج راما شنکر سے تم سے باتیں ہوئی تھیں اس پر وہ بے طرح بگڑ گئے تھے۔ میں اسی روز ڈر گیا تھا کہیں تم سے وہ بدلہ نہ نکالیں۔ وہ ہمیشہ اپنے دشمن کو اسی طرح تباہ کر ڈالتے ہیں۔ دیکھا نہیں سرناتھ لال کا گھر تک بکوا دیا۔ گوپی چمار کو کس طرح پٹوایا۔ بیچارے سرناتھ کو تو گھر ہی چھوڑ دینا پڑا اب وہ گوردا سپور میں رہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی کارو کا چہرہ زرد ہو گیا اور گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا:-

کارو۔ برہمن اور اتنا کرودھی۔ کل پرمی وہاں گئی تھی۔ اچھا یاد آیا اس نے آکر کہا تھا کہ لالہ سورج مل اور مہاراج آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اب تو مجھے بھی شبہ ہوتا ہے۔ لیکن رامو! میرے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے، میری مٹی تو پلید ہو چکی۔ میں منھ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔

— ۵ —

کارو نے چوری کی تھی یہ صرف قانونی جرم نہ تھا۔ سماجی جرم بھی تھا۔ جج کے سامنے اسے جواب دینا تھا، اور اگر اس کا عذر قبول نہ ہوا تو پھر اپنی ذات والوں کے سامنے بھی اسے سزا بھگتنی پڑے گی۔

رام چرن حلوائی نے ساری باتیں پنچ کے سردار سے جا لگائیں اور مقررہ تاریخ میں سب کے سب جمع ہو گئے
انسان کی فطرت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس میں انتہائی لچک کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔
عاجز و بیکس انسان مصائب برداشت کرتا ہے، تکلیفیں اٹھاتا ہے اور اپنی بیچارگی کو روتا ہے۔ یہی مصائب یہی اذیتیں جب حد سے گزر جاتی ہیں تو ہمیں بغاوت اور سرکشی کا جذبہ رونما ہوتا ہے۔ پھر اس کی شدت اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مخالف قوت کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فطرت اور خدا سے بھی برسرِ پیکار ہو جاتا ہے۔ کارو عاجز تھا، بیکس تھا، غریب تھا، اور مصائب کا شکار۔ لیکن راما شنکر اور لالہ سورج مل نے اسے انتہائی ذلت و رسوائی میں مبتلا کر دیا تھا، اب زیادہ برداشت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ پوری قوت سے مقابلہ کرنے کو طیار ہو گیا تھا۔ دولت تو خیر تھی ہی نہیں، عزت و آبرو جو بچ رہی تھی اسے بھی لوٹا جا رہا تھا پھر وہ کس لئے ان کی پرواہ کرتا۔ پنچ کے سامنے جو اس نے بیان دیا وہ گاؤں والوں کے لئے جس درجہ بھی تعجب خیز ہو۔ لیکن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ حریف سے اب پوری طرح جنگ کے لئے آمادہ تھا۔ اس نے کہا:۔
"مجھے سزا بھگتنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن میں ایشور کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ یہ سب میرے دشمن کی کارروائی ہے۔ میں نے مہاراج سے روپیوں کا عذر کیا تھا۔ انھیں یہ گوارا نہ ہوا۔ اس پر بھی میں مکان چھوڑنے کو طیار تھا۔ لیکن وہ مجھ سے دو برس کا کرایہ بھی طلب کرتے ہیں۔ آپ لوگ انصاف کیجئے ایک محتاج جو کھانے کو ترستا ہو اتنی رقم کہاں سے دے سکتا ہے انھوں نے لالہ جی سے کہہ کر یہ تمام انتظام کرایا اور مجھے دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کر کے چھوڑا۔" ایشوران کا بھلا کرے" یہ کہتے کہتے کارو رونے لگا۔ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "آپ لوگ جھوٹ سمجھیں گے لیکن ایشور جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ لالہ جی میرے پاس آئے اور کہہ رہے تھے کہ اب بھی بچنا چاہتے ہو تو کرایہ کی رقم ادا کر دو۔ میں کہاں سے دیتا۔ کہتا ہوں میں نے جا کر کہہ دیا اب دوسرے جنم میں لیجئے گا مہاراج! اب میں حاضر ہوں آپ لوگ جو سزا چاہیں دے دیجئے۔" پنچوں نے کارو کا بیان سنا۔ ہر شخص متاثر ہوا۔ رام چرن حلوائی نے کہا "ان بیدل باتوں سے کیا حاصل ہے۔ جرم ثابت ہے اس کی سزا کارو کو بھگتنی پڑے گی۔"
پنچ کے سردار نے کہا۔ "ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ کارو نے سچ مچ جرم کیا ہے۔ ممکن ہے حقیقتاً بے قصور ہو۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہم لوگ کارو کے مقدمہ کے فیصلہ کا انتظار کریں اس کے بعد ہم لوگ صحیح نتیجہ پر پہونچ سکیں گے۔"
یہ بات سب لوگوں کو پسند آئی اور پنچ کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا۔

— ۶ —

مقدمہ کے دوران میں غریب کارو کو کئی بار کچہری دوڑنا پڑا اس کے پاس روپئے نہ تھے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل کرتا۔ پرتمی کے پاس کچھ ٹوٹے پھوٹے زیور تھے انھیں فروخت کر دیا اور بابو کرشنا پرشاد وکیل کی خدمات

میں حاضر ہوکر اپنے دکھ کی ساری داستان سنائی۔ انھیں کچھ ترس آگیا اور بہت تھوڑی فیس لیکر کام کرنے کو راضی ہو گئے۔
دوران مقدمہ میں سورج مل بھی طلب کیا گیا اور جب کچھ دوسرے کنگنوں کے ساتھ ملا کر مسروقہ کنگن رکھدئے گئے اور اس سے شناخت کے لئے کہا گیا تو وہ بالکل ناکام رہا۔ وہ صحیح وزن بھی نہ بتا سکا۔ بابو کرشنا پرشاد نے جرم میں وہ داستان بھی چھیڑ دی کہ کس طرح پنڈت راماشنکر زبردستی کارو کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور دو برس کا کرایہ بھی وصول کرنا چاہتے ہیں۔ لالہ سورج مل سے یہ بھی اقرار کرالیا کہ پنڈت راماشنکر سے برابر روپیوں کا لین دین اور دوستانہ ہے۔ تمام کارروائی کے بعد مجسٹریٹ نے فیصلہ صادر کر دیا جس میں کارو حلوائی بری کر دیا گیا تھا مجسٹریٹ نے تمام کارروائی سازشی قرار دی لیکن قانونی ثبوت نہ ہونے کے سبب سے پنڈت راماشنکر پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ پھر بھی انھیں تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر وہ کسی قسم کی سختی مکان کے متعلق کارو پر کریں گے تو سخت سزا کے مستوجب قرار دئے جائیں گے۔ ساتھ ہی کارو حلوائی کو لالہ سورج مل کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ چلانے کا حکم دیا گیا۔
فیصلہ کی خبر بجلی کی طرح گاؤں میں پہونچ گئی اور ساری بستی میں پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص کو اس مقدمہ سے خاص تعلق تھا۔ ہر گھر میں خوشی پھیل گئی۔ لیکن پنڈت راماشنکر اور لالہ جی کے لئے تو قیامت ہو گئی۔ بچہ بچہ کہہ رہا تھا کہ غریب کو ستایا گیا۔ ایشور ان کے پاپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔
کارو کے گھر میں عید ہو گئی۔ کیسری جلدی جلدی درگا استھان جانے کی طیاری کر رہی تھی۔ آج وہاں گھی کے دئے جلائے گی اور مہابیر جی پر مٹھائی چڑھائے گی۔ اسی چہل پہل میں نصف شب گزر گئی۔ پریمی اور کیسری خوشی سے دیوانی ہو رہی تھیں۔ آج انھیں نیند بھی نہیں آرہی تھی، دروازہ پر کسی کے پکارنے کی آواز آئی کارو اٹھکر باہر گیا دیکھا تو مہاراج اور لالہ سورج مل کھڑے ہیں۔ مہاراج کہنے لگے " کارو! دیکھو جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہم لوگوں کو آخر اسی بستی میں رہنا ہے۔ لالہ جی تم سے کشما مانگنے آئے ہیں تمھارے نقصان کے عوض لو یہ دو سو روپئے دیتے ہیں۔ اسے قبول کر لو اور اب مقدمہ چلانے سے تمھیں کیا فایدہ ہوگا۔ انھیں معاف کر دو۔
مصیبت زدہ دل دوسروں کی تکلیفیں نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا تاب دوسروں کی اذیتیں دیکھ کر گھٹتا ہے اور اپنی مصیبت کا نقشہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ کارو کا دل بہت زیادہ دردمند واقع ہوا تھا۔ اسے اپنے آلام یاد آگئے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ کہنے لگا:-
" مہاراج! آپ کس سے کہہ رہے ہیں۔ اپنے ایک داس سے، برہمنوں کے سیوک سے، میری نظر میں آپ کی وہی عزت ہے۔ مجھے کب گوارا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ایک بھائی کو دکھ پہونچاؤں۔ مجھے روپیوں کی ضرورت نہیں۔ میں ہرگز آپ کے حکم کے خلاف نہ کروں گا۔

الیاس اسلام پوری

مکتوبات نیاز

عزیز من -

کیا پوچھتے ہو کس حال میں ہوں اور کیا بتاؤں کہ عمر کس طرح بسر ہوتی ہے - جو زمانہ گزر گیا اسکی بربادی کی یاد جو گزر رہا ہے وہ یکسر حسرت آباد - شکوہ کروں بھی تو کس کا اور کس زبان سے !

ہستی بہ تپش رفت و اثر نیست نفس را

فریاد اگزیں قافلہ بردند جرس را

جانتا ہوں کہ چھیڑتے ہو - تاکہ میں کچھ کہوں اور تم منہ پھیر کر ہنسو - جاؤ ہٹو، میں اب اس حال میں نہیں ہوں کہ کسی کو ہنستا دیکھوں اور خوش ہوں -

مجھ سے ہمدردی کی باتیں نہ کرو، ورنہ سچ کہتا ہوں تم سے نفرت ہو جائے گی - تمھارے وہ حزیں و ملول آنکھوں والے دوست کل ملے تھے، تم کو پوچھتے تھے - میں نے کہا بہت برا حال ہے - اس کا جواب انھوں نے کیا دیا، جب آنا تو خود انھیں سے پوچھنا - میرے کہنے کا اعتبار تمھیں کیوں آنے لگا ! تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ جن آنکھوں کو تم نے ہمیشہ سوگوار دیکھا، کل وہ ہنس رہی تھیں - اب یہ خبر نہیں کہ میرے قال پر یا تمھارے حال پر - ابھی تو کہیں باہر جانے کا قصد نہیں ہے - تاہم اپنی آمد کی اطلاع دو دن پہلے دیدینا تاکہ تمھارے جانے کے بعد جو دو دن تک گھر ویران رہیگا اس کی تلافی پہلے ہی ہو جائے -

---

سنو جی، تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سے خفا ہوں - اور جب کوئی کسی سے خفا ہوتا ہے تو بات نہیں کیا کرتا - میں سمجھتا ہوں کہ تم بہت بیتاب ہوگے، لیکن ہوا کرو میری بلا سے، نہ میرے پاس اتنا وقت کہ وہاں جاکر تمھارا پیام کہوں اور نہ شاید انھیں اتنی فرصت کہ اطمینان سے سنیں اور جواب دیں - تم کو اپنی التجا پر ناز ہو یا نہ ہو لیکن انھیں اپنی بے نیازی پر ضرور ہے - مگر تمھیں یقین کیوں آنے لگا ؟ اور ہاں میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں خفا کیوں ہوں اور تم سے باتیں بھی کرنے لگا　　لاحول ولا قوۃ !

قبلۂ محترم - صحیفۂ گرامی عزیزی یوسف کے ذریعہ سے پہونچا۔ آپ کو یاد آرہے یاد آئے لیکن جو احترام حضرت کا میرے دل میں ہے، وہ قطعاً بیان و اظہار سے بے نیاز ہے۔ لفظ احترام میں نے ادباً استعمال کیا ورنہ مجھے محبت کہنا چاہئے تھا۔

آپ نے جس رافت ہمدردی سے، جس محبت و عنایت سے، میری رسوائی پہ آنسو بہائے ہیں، وہ رگ سنگ سے بھی ہو ٹپکا دینے کیلئے کافی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کریں بہرا بھی ہوں اور گونگا بھی۔ نہ اب سوائے ایک دل کی آواز کے نہ کوئی اور صدا کانوں میں آتی ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور بات زبان سے نکلتی ہے۔

عیش داند دلِ سرگشتہ پریشانی را
نا خدا باد بود کشتیِ طوفانی را

آپ کے سامنے نہ دلیل پیش کرنے کا یارا، نہ حجت طلب کرنے کی جرأت۔ آپ جب تک مجھے خوش نصیب سمجھتے رہے، میں خوش نصیب تھا، اب آپ بدقسمت کہتے ہیں تو میں بدقسمت ہوں۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کا حوصلہ کبھی نہ ہوا تو اس کے شکوہ کرنے کی ہمت کہاں سے لاؤں۔

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریبند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے اور مجھے یقیناً اولین فرصت میں حاضر ہونا چاہئے، لیکن ڈرتا ہوں کہ مبادا حضرت کا یہ لطف و کرم بھی ہاتھ سے کھو بیٹھوں۔ کیونکہ جناب کو شاید علم نہیں کہ میں داڑھی منڈا کر اب صورتاً بھی مسخ ہو گیا ہوں۔ خدانخواستہ اگر آپ کی نگاہ کو کوئی گزند پہونچ گیا تو میں کیا کروں گا۔۔۔۔ ایام دولت مستدام!

حقیقت یہ ہے کہ تم سا لغو انسان میں نے تو آج تک نہ دیکھا نہ سُنا بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تخلیق نوعِ انسان کے وقت ذہنِ فطرت میں بھی نہ ہوگا۔ گردن اٹھاؤ، ذرا آنکھ میں آنکھ ڈالکر جواب دو۔ خاکم بدہن، میں نے کب اور کس سے کہا تھا کہ مولانا کو مالیخولیا ہو گیا ہے۔ ذکر عام مولویوں کا تھا کہ ہمارے مولانا کا، جن کا جواب خرابات میں بھی نہیں مل سکتا چہ جائیکہ محراب و منبر!

انھوں نے جس انداز سے شکوہ کیا ہے، اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اپنا سر پھوڑ ڈالوں یا تمھارا۔ تم پر اختیار نہیں اس لئے اپنا ہی سر پھوڑنا پڑے گا۔

میں نے مولانا کو خط لکھا ہے اور جتنی برائیاں میں تمھاری کر سکتا تھا وہ سب کر دی ہیں۔ گالیاں مجھے زیادہ یاد نہیں تاہم جتنی یاد تھیں وہ بھی دے ڈالی ہیں۔ وہ تمھیں میری تحریر دکھائیں گے تو نہیں، لیکن

ممکن ہے باتوں ہی باتوں میں پھر اس ذکر کو چھیڑیں، اس لئے میں تمھیں پہلے سے مطلع کئے دیتا ہوں کہ اگر اس مرتبہ تم نے پھر غلط بیانی سے کام لیا تو سچ کہتا ہوں آکر ذبح کر دوں گا اور سولی پر چڑھ جاؤں گا۔

مرد خدا، کسی وقت تو انسان بن جایا کر، سنجیدگی میں مذاق ہو تو کوئی حرج نہیں، لیکن مذاق میں سنجیدگی حد درجہ خطرناک چیز ہے۔

میرے ہمدم و دمساز ۔ سلامت رہو کہ میری عافیت کے طلبگار اک تمھیں دنیا میں رہ گئے ہو۔ گو اسی کے ساتھ اس کا بھی یقین ہے کہ

شبنم بخیہ نتواں کرد چاکِ دامنِ گل را

دنیا میں مصائب دو قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق خارجی اسباب سے ہے اور دوسرے وہ جو خود اپنے احساس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر اُن کا علاج تو تدبیر سے ممکن ہے، لیکن ان کا مداوا کیونکر ہو۔ آگ لگے تو پانی سے بجھائی جا سکتی ہے، لیکن جب میں پانی کو آگ سمجھنے لگوں تو تم یا کوئی اور کیا کر سکتا ہے۔ سو بھائی میری سوختہ سامانیاں بھی بالکل اسی قسم کی ہیں۔ اور مقدرات کا یہی ایک مفہوم میرے ذہن میں آیا ہے۔ میرے لئے دنیا میں کیا نہ تھا، سب کچھ تھا، مگر صرف ایک "پندار احساس" نے تمام عالم کو ٹھکرا دیا۔

در ہائے فردوس وا بود امروز
از بیدماغی گفتیم، فردا

پھر اب کہ بُرایگی و واماندگی کا مفہوم ہی میرے نزدیک بالکل بدل گیا ہے، اگر تمھارے کہنے پر عمل کروں بھی تو بیکار ہے۔ آشفتگی میں "نقش سویدا" درست کرنے کے معنے صرف یہ ہیں کہ "داغ دل" کے سرمایہ کو اور رسوا کیا جائے۔

محترمہ ۔ آپ کی طویل خاموشی سخت دلخراش تھی، لیکن خلافِ توقع نہ تھی، میں جانتا تھا کہ آپ نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھالی ہے اور میں خود اس کی ابتدا کرتا؟ اس کا امکان صرف اس صورت میں تھا کہ

حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پاتا

شکر ہے کہ آخرکار آپ کو رحم آ ہی گیا اور مجھے کہ اب تنکے کا سہارا بھی ہاتھ سے جا رہا تھا، ڈوبنے سے بچا لیا۔ سانحہ کا حال معلوم کر کے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ آپ کی آغوش سب سے پہلی مرتبہ آباد ہو کر یوں دفعتہً اجڑ جائے! قیامت ہے، قیامت!

شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

آپ نے خطاب کا ذکر کر کے ایسا نشتر چبھویا ہے کہ عمر بھر اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ، اللہ، اڈیٹر نیرنگ خیال مجھے ادیب الملک کا خطاب دے اور آپ اس پر اظہار مسرت کریں! آہ۔ یہ ہے مجھ پر اور میری ادبیت پر! افسوس ہے کہ اتنا زمانہ میرے آپ کے مراسم کو ہوگیا اور پھر بھی آپ نے نیاز کو نہیں پہچانا۔

از برگ و ساز قافلۂ بیخودال مپرس
بے نالہ می رود جرس کاروان ما

کیا آپ دل خون کرنے کی کوئی اور تدبیر اختیار نہ کر سکتی تھیں؟

کفارہ کا روزہ رکھنے میں کیا نقصان ہے۔ کیا وہ قسم سے زیادہ مضبوط چیز ہے۔ جس کو دل توڑنے میں باک نہ ہو، وہ روزہ کے باب میں اتنا پس و پیش کرے، حیرت ہے۔ خدا کرے آپ جلد یہ خبر سنائیں کہ اُجڑی ہوئی آغوش پھر آباد ہوگئی ہے۔

اعتبارات

مصلوب

میں نے لوگوں سے التجا کی کہ "مجھے سولی پر چڑھا دو"

انھوں نے کہا کہ "تیرا خون ہم اپنے سروں پر کیوں لیں"

میں نے کہا۔ "اگر تم دیوانوں کو سولی پر نہیں چڑھاتے تو پھر یہ زعم فراست کیسا؟

انھوں نے میرا کہنا مان لیا اور مجھے سولی پر چڑھا دیا۔ اب میں آسمان و زمین کے درمیان معلق تھا۔

ان میں سے ایک نے تو مجھ سے پوچھا "یہ کس گناہ کا کفارہ تو نے اس طرح ادا کیا ہے"

دوسرے نے کہا۔ "کس چیز نے تجھے اپنے نفس کی قربانی پر مجبور کر دیا"

تیسرے نے پوچھا۔ "اے جاہل کیا تو سمجھتا ہے کہ ایسی ذلیل قیمت ادا کر کے تو کوئی دوامی شہرت حاصل کر سکیگا"

چوتھا بولا۔ اس کے تبسم کو تو دیکھو۔ کیا کوئی شخص اس تکلیف کے عالم میں اس طرح مسکرا سکتا ہے"

میں نے اُن سے کہا کہ "سوائے اس تبسم کے اور کسی بات کو یاد نہ رکھو۔ کیونکہ نہ میں کسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہوں اور نہ کوئی قربانی پیش کر کے شہرت دوام حاصل کرنے کا متمنی ہوں۔ بلکہ میں پیاسا تھا اور میں نے تم سے کہا کہ میرا خون مجھے پینے کے لئے دو، کیونکہ ایک دیوانہ کی پیاس صرف اس کے خون ہی سے بجھ سکتی ہے۔

باب الاستفسار

بعض فارسی اشعار کا مطلب

(جناب سید علیم الدین صاحب۔ ایبٹ آباد)

حسب ذیل اشعار کا مفہوم باوجود کوشش کے معلوم نہیں ہو سکا۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ ذریعہ نگار اس طرف توجہ فرمائیں گے۔ یہاں ایک صاحب کو اسی قسم کے بہت سے اشعار یاد ہیں اور وہ اپنے احباب کے سامنے پڑھ کر ان کی قابلیت کا امتحان لیا کرتے ہیں۔

دلازاری مکن، باری بکن باری زلا زاری   دلازاری نکو نبود نکو باشد دلا زاری

زر بخش حدیث بدرہا کن   زر بخش حدیث بدرہا کن

آں دگر شیر ست کادم میخورد   آں دگر شیر ست کادم میخورد

خوردہ ہماں بہ کہ بہ تنہا خوری   وائے براں خوردہ کہ تنہا خوری

(نگار) ذومعنیین الفاظ کی شاعری کا فارسی میں کسی وقت بہت شوق پایا جاتا تھا، اور امیر خسرو نے سب سے زیادہ اس طرف توجہ کی، چنانچہ ان اشعار میں تین شعر انہیں کے ہیں۔

اگر آپ ادنیٰ تامل سے بھی کام لیتے تو ان کا سمجھنا مشکل نہ تھا۔ پہلے شعر کو یہ لکھئے:۔

(۱) دل آزاری مکن، باری بکن، بکن دلا، زاری   دل آزاری نکو نبود نکو باشد دلا، زاری

یعنی اے دل کسی کا دل نہ دکھا بلکہ کبھی کبھی رو لیا کر کیونکہ دل آزاری نہیں بلکہ زاری اچھی چیز ہے۔

(۲) پہلے مصرعہ میں بدرہا جمع ہے بدرہ کی جس کے معنی کیسۂ پُر از زر" کے ہیں اور دوسرے مصرعہ حدیث بد علٰحدہ ہے اور رہا کن علٰحدہ۔ مطلب یہ ہوا کہ روپیہ دو اور تھیلیوں کی بات کرو۔ روپیہ دو اور بری باتیں کرنا چھوڑ دو۔

(۳) پہلے مصرعہ میں شیر بمعنی ہزبر ضیغم مستعمل ہوا ہے اور دوسرے مصرعہ میں دودھ کے معنی میں۔ مدعا شاعر کا یہ کہنا ہے کہ وہ شیر ہے جو آدمی کھا جاتا ہے اور وہ دودھ ہے جس کو آدمی کھاتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں آدم مفعول ہے میخورد کا اور دوسرے میں آدم فاعل واقع ہوا ہے

(۴) پہلے مصرعہ میں تنہا جمع ہے تن کی اور دوسرے میں تنہا، (اکیلے) کے معنی میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کھانا وہی بہتر ہے کہ لوگوں کے ساتھ بیٹھکر کھایا جائے اور وہ کھانا کچھ نہیں کہ تنہا کھا لیا جائے۔

نگار کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو درج کیجاتی ہے

(سنہ ۲۲ء) ستمبر و اکتوبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۲۳ء) مئی ۴ر — (سنہ ۲۴ء) جنوری فروری، مارچ اپریل، مئی، اگست ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ [illegible]) اپریل مئی، جون ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۰ء) مئی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۱ء) مارچ، جولائی، اگست ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری، مئی، جولائی، اکتوبر، دسمبر ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اکتوبر ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۵ء) فروری، مئی، جون، جولائی، اگست ستمبر، نومبر، دسمبر ۸ر فی پرچہ۔

سنہ ۳۲ء کا پورا فائل ؎ میں معہ محصول

منیجر نگار۔ لکھنؤ

رسالہ ہر مہینے کی ۵ ار تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (للعہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمار (۴)	فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۶ء	جلد (۲۹)

ملاحظات ———— ۲

س ـ ش ـ ص ———— وصی احمد بلگرامی۔ بی۔ اے ———— ۹

چین و جاپان کی مخاصمت ———— عبدالرحیم شبلی ———— ۳۶

بیوہ اور اس کا اکلوتا بیٹا ———— عبدالقدیر خاں۔ میرٹھ کالج۔ میرٹھ ———— ۴۰

ازدواج ———— ابوسعید بزمی ایم۔ اے ———— ۴۸

مکتوبات نیاز ———— ۵۴

عہد حاضر کے سیاسیات میں پٹرول کی اہمیت ———— ۵۶

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعہ کلام ———— ۵۹

باب الاستفسار ———— ۶۹

مطبوعات ———— ۷۲

استبارات ———— ۷۹

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

شمارہ (۴)	اپریل سنہ ۳۶ء	جلد (۲۹)

ملاحظات

خود نمائی خدا شناسیہا ست!

ہمارے علماء ہمارے قائدین ملت، اور ہماری جماعت کے وہ تمام افراد جو محراب و منبر کی بلندی سے صدائے موعظت بلند کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر ان سب کی پند و نصیحت میں کوئی چیز "قدر مشترک" کی حیثیت سے نظر آتی ہے تو صرف یہ تعلیم کہ مسلمان اسوقت تک صحیح مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے نہ ہٹے۔ لیکن یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس سے کیا مقصود ہے۔

ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تلقین کے سلسلہ میں سب سے پہلے "خیر القرون قرنی" کی تصویر ان کے سامنے آتی ہوگی اس کے بعد صحابہ کا دور پیش نظر رہتا ہوگا اور پھر تابعین و تبع تابعین کا۔ لیکن آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ وہ عہد نبوی کو تاریخ انسانی کا کیوں بہترین دور قرار دیتا ہے تو وہ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ بتا سکیگا کہ اسوقت صدائے توحید بلند ہو رہی تھی، معبد کدے ویران کئے جا رہے تھے، لوگ خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور محض رسول اللہ کا دیدار ہی نجات کے لئے کافی تھا

اس کے بعد وہ دورِ صحابہ کی برکات کا ذکر کرے گا، کیونکہ یہ زمانہ عہدِ نبوی سے زیادہ قریب تھا۔ پھر وہ تابعین کے زمانہ کی تعریف کریگا اور صرف اس بنا پر کہ اس عہد کے لوگوں نے صحابہ کو دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا ذکر کریگا کیونکہ انھوں نے تابعین سے فیضِ صحبت حاصل کیا تھا۔ الغرض ایک مولوی کے سامنے وقت و زمانہ کی خوبی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ وہ عہدِ رسول اللہ سے قریب تر واقع ہو، اور اس کے بدترین ہونے کی صورت یہ ہے کہ عہدِ نبوی سے اس کا بہت زیادہ بُعد ہو گیا ہو۔ چنانچہ دنیا جتنی آگے بڑھتی جائے گی اتنی ہی خراب ہوتی جائے گی — پھر حیرت ہے کہ جب ایک زمانہ کی سعادت و عدمِ سعادت صرف اس پر منحصر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان سے قریب واقع ہے یا دور، ہم پیچھے ہٹ کر کیا فایدہ حاصل کر سکتے ہیں جبکہ وہ ہستی کسی طرح واپس نہیں آسکتی اور ہم صرف اس کے دیدار سے دوزخ اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتے۔

میرا مقصود اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے جو تدابیر حامیین مذہب کی طرف سے بتائی جاتی ہیں وہ لفظاً خواہ کتنی ہی شاندار و امید افزا کیوں نہ ہوں لیکن معناً یکسر لغو و مہمل ہیں۔ ایک واعظ صدائے توحید کا ذکر کرتا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو ایک کہدینے سے انسان کو کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔ وہ کفر و بت پرستی کے استیصال کا کارنامہ نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ پتھر کی چند مورتوں کو توڑ دینا کیوں انسانیت کا منتہائے ترقی قرار دیا جائے، وہ نماز و روزہ کی متصوفانہ کیفیت کا فسانہ دہراتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ جنبشِ اعضا کی چند مقررہ صورتیں اور فقر و فاقہ کی تنگی کو کیوں سعادتِ انسانی سمجھا جائے، وہ صرف رسول اللہ کے دیدار کو کافی ذریعۂ نجات قرار دیتا ہے، درانحالیکہ رسول کے دیکھنے والے اگر ایک طرف ابوبکر و علی تھے تو دوسری طرف بوجہل و بولہب بھی پائے جاتے تھے۔ گویہ فرق ضرور تھا کہ جنھوں نے اخروی نجات حاصل کی ان میں شاید جذبۂ صنم پرستی موجود تھا اور جو گمراہ کہلائے وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بہتر زمانہ کونسا تھا تو میں بھی بلا تامل عہدِ نبوی کا نام لے دونگا لیکن اس کا تعلق نہ رسول اللہ کی ذات سے ہوگا نہ اُن کے دیدار سے بلکہ صرف اُس روح سے جو اس انسانِ کامل نے پیدا کی اور اُس عزم و ارادہ سے جس نے ایک پست و جاہل قوم کو دفعۃً قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ ترقی پر پہونچا دیا۔

یقیناً رسول اللہ نے توحید کا درس دیا لیکن اس سے مراد محض خدا کو ایک کہنا یا سمجھنا نہ تھا کیونکہ صرف یہ عقیدہ انسانی ترقی یا فلاح کو مستلزم نہیں بلکہ اس سے مراد ایک عام جذبۂ اتحاد و اخوت کو بیدار کرنا تھا، تمام نوعِ انسانی کو ایک سر رشتۂ اجتماعیت سے وابستہ کرنا تھا اور اُس قوتِ برتر و اعلیٰ میں ضم ہو کر جو یقیناً ہر ہر ذرہ میں کارفرما ہے، ایک ایسی جمیل فضا پیدا کر دینا تھا جہاں خدا سمٹ کر انسان اور انسان پھیل کر خدا بن جاتا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ نے کفر و بُت پرستی کے خلاف پوری جد و جہد سے کام لیا لیکن کفر سے مراد خودی کا انکار تھا انانیتِ کبریٰ سے اعراض تھا اور بُت پرستی نام تھا اس کورانہ تقلید یا جاہلانہ سرنگونی کا جو ایک انسان سے احساسِ انسانیت و برتری چھین لینے والی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ سرکار نبوت سے طاعت و عبادت کی بھی ہدایت کی گئی لیکن اس کا مطمح نظر صرف اس قوت کو سراہنا تھا جو نظام کائنات کو تکمیل و تجمیل کی طرف لیجا رہی ہے اور اس سے کسب فیضان کرکے خود اس قوت کا دست و بازو بن جاتا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سر ٹیک دینے سے نہ خدا کے مرتبہ میں کوئی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس عجز و فروتنی کی اسے ضرورت۔

الغرض یہ بالکل صحیح ہے کہ عہد نبوی بہترین زمانہ تھا لیکن اس کا تعلق نہ صرف روزہ و نماز سے تھا نہ ظاہری مراسم نمایش و عبودیت سے، نہ زبانی تسبیح و تہلیل سے اسے کوئی واسطہ تھا، نہ مسواک و عملی سے بلکہ وہ ایک زمانہ تھا جس نے سوتی ہوئی انسانیت کو جگا دیا، جس نے فطرت کے قوائے کامنہ کو انسان کے لئے بے نقاب کیا اور جس نے نوامیس الٰہیہ کو دسترس انسانی سے قریب تر کرکے عالم کی ذہنیت کا رخ بدل دیا۔

پس یقیناً وہ عہد نہایت مبارک عہد تھا جب آفتاب حقیقت نے اول اول اس طرح طلوع کیا اور لاریب وہ زمانہ سراہے جانے کے قابل ہے جب شاہد مقصود سب سے پہلے برافگندہ نقاب سامنے آیا، لیکن اگر کوئی شخص یہ دعوے کرے کہ اس ابتدا کو کسی انتہا کی ضرورت نہ تھی، یہ آغاز انجام سے بے نیاز تھا، اس آفتاب کا طلوع نصف النہار سے مستغنی تھا، تو یقیناً اس کا دعویٰ غلط ہوگا، کیونکہ دنیا کا کوئی تخم دفعتاً بار آور نہیں ہو سکتا، کوئی تعمیر فوراً استوار نہیں ہوتی اور منزل تک پہونچنے کے لئے قطع سفر ضروری ہے رسول اللہ نے بیشک انسانیت کے دور جدید کی بنیاد قائم کی لیکن اس توقع کے ساتھ کہ آیندہ نوع انسانی اس کو عروج و کمال تک پہونچائے اور خدا کا وہ وعدہ جو "جنات عدن" کی صورت میں کیا گیا تھا پورا ہو کر رہے

پھر اب دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کس قوم نے اس رمز کو سمجھ کر ان مدارج استعلا کو حاصل کیا جو ایک سچے مومن و مسلم کے لئے مخصوص ہیں اور وہ کونسی قوم ہے جو اس تعلیم کو نظر انداز کرکے "هل یهلک الا القوم الفاسقون" کی تعزیر میں مبتلا ہوئی۔

یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ ہم خدائی فیصلوں اور ربانی اصول میں ملک و ملت، رنگ و نسل، کفر و اسلام کی تفریق کو سامنے رکھکر خطا و صواب کا معیار قایم کرتے ہیں۔ جو فطرت مشرق میں جلوہ گر ہے وہی مغرب میں ہے، قدرت کی جو کارفرمائیاں شمال میں نظر آتی ہیں وہی جنوب میں بھی ہیں۔ شاہراہ صرف ایک ہی ہے جس کا دوسرا نام دین فطرت ہے اور یہ سب کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہے یہود و نصاریٰ کافر و مسلمان کی تفریق صرف ہماری بے بصری کا نتیجہ ہے اور یہ نام وہ ہیں جو خدا کی لوح محفوظ یعنے صحیفۂ قدرت کے اوراق میں کسی جگہ نظر نہیں آتے، وہاں ان سب کو صرف ایک ہی نام لفظ "انسان" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے لئے صرف ایک ہی پہچان "کل مولود ولد علی فطرۃ الاسلام" کی بتائی گئی ہے اور یہ فخر صرف بانی اسلام ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی نے اس راز کو ظاہر کیا اور اس طرح اس نے اول اول جملہ افراد نوع انسانی کو ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کی تعلیم دی۔ لیکن ہماری کوتاہ فہمیوں کی یہ داستان کتنی دردناک ہے کہ جس قوم پر سب سے پہلے اس راز کا افشا کیا گیا اسی نے سب سے زیادہ اس کو ٹھکرایا اور انسانیت کو جس جماعت سے سب سے زیادہ "توقع داد پانے" کی تھی وہی سب سے زیادہ "خستۂ تیغ ستم" نکلی۔

اب سے اربوں سال قبل جب کرۂ ارض کی تخلیق ہوئی تھی ہر چند وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اسکے شباب و بلوغ کا زمانہ آ رہا ہے، اس کی تحسین و تجمیل آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے اور اس شراب کے رسا ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ علوم و فنون کے چشمے ہر طرف ابل رہے ہیں، کائنات کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے جا رہے ہیں، قدرت کے جلد ہر کات ہمارے لئے عسیر التحصیل ہوتے جاتے ہیں، عناصرِ عالم نے انسان کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے "استخلاف فی الارض" کا وہ وعدۂ ربانی جو یومِ الست میں کیا گیا تھا بہت جلد پورا ہونے والا ہے اور دنیا ایک زمانہ دراز تک انتظار کے جہنم میں بھٹکنے کے بعد قرب و وصال کی فردوس سے ہم آغوش ہونے والی ہے ۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سعادت و برکت ان کے لئے مقسوم نہیں ہے جنھوں نے دنیا کو "سجن المومن" سمجھ کر اس کو ٹھکرا دیا بلکہ اُن خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس قید خانہ کو اپنے لئے رشکِ فردوس بنا لیا خواہ اس کا نام آپ "جنت الکافر" ہی کیوں نہ قرار دیں۔

انسان اسی دنیا کا ایک جزو ہے اور اسی کو آباد کرنے کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ قدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز، بیکس و مفلس، نادار و ناچار، محتاج و بیار بنکر زندگی بسر کرے۔ دنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو اس نے پھولنے اور پھلنے کے لئے نصب کیا تھا نہ کہ ویران و برباد ہونے کے لئے۔ پھر جن کو چشمِ بصیرت عطا ہوئی ہے وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ موسمِ بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ دورِ خزاں ختم ہو چلا ہے، تازہ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں گلہائے رنگا رنگ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہے ہیں اور بہت جلد خود ذاتِ ربانی اُس کسوتِ نشاط و جمال میں رونما ہونے والی ہے جسے دستِ انسانی نے اپنے خالق کے لئے طیار کیا ہے۔ خدا غنی ہے اور وہ اس کا مہمان نہیں ہو سکتا جو محتاج و مفلس ہے۔ خدا غالب و قدیر ہے اس لئے وہ مغلوب و مفتوح کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ خدا پاکیزہ و طاہر ہے اس لئے وہ کثیف و بدسلیقہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا خدا اجمل و اکمل ہے اس لئے وہ ناقص و بدصورت سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اسے مکمل دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے نقص سے نفرت ہے، بدصورتی سے احتراز ہے، حزن و ملال سے استکراہ ہے۔ اور اس لئے وہ قومیں جو درماندہ و عاجز ہیں، مغموم و ملول ہیں، یقیناً وہی ہیں جن کی طرف سے اس نے اپنا منھ پھیر لیا ہے اور جو قومیں غالب و فاتح ہیں، مسرور و شادکام ہیں، بلاشبہ وہی ہیں جن سے خدا خوش ہے اور جن کو وہ دوست رکھتا ہے۔

اس دنیا میں ایک متشائم (Pessimist) قوم کو زندہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوتِ عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کر کے گدایانہ زندگی بسر کر رہی ہے وہ یقیناً ہلاک ہو کر رہیگی اور اسے ہلاک ہو جانا چاہئے۔ دنیا فطرت کا وہ کارنامہ ہے جس میں اس کی انتہائی تمنائے نشاط صرف ہو رہی ہے اور اس لئے ایک حزین و مایوس ہستی کا اس میں گزر نہیں۔ باغ کے وہ تمام پودے جو بیمار ہو کر مضمحل ہونے لگتے ہیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے صحیح و توانا درخت متاثر نہ ہوں۔ بالکل اسی طرح وہ جماعتیں بھی فنا ہو جائیں گی جن کے قویٰ مضمحل، جن کے دماغ ضعیف اور جن کی ذہنیتیں بیمار ہیں تاکہ خدا کی یہ کھیتی لہلہا اُٹھے اور اس کی زمین تمام خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔

چند دن سرزمین جاورہ میں

مارچ کا زیادہ حصہ سفر میں گزرا اور ہر چند حالات کے لحاظ سے اس کی ابتدا میرے لئے خوشگوار نہ تھی، لیکن اس کی انتہا بعض ایسے حیرت انگیز انکشافات پر ہوئی کہ اگر میں ان چند ایام کو اپنی زندگی کے بہترین حصہ سے تعبیر کروں تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔

سرزمین جاورہ سے میری واقفیت کا آغاز اس زمانہ سے ہوتا ہے جب میں بھوپال میں مقیم تھا۔ صاحبزادہ صفدر علی خانصاحب کا عرصہ سے اصرار تھا کہ میں ایکبار جاورہ جاؤں اور مجھے اسی بنا پر انکار کہ رؤسا و امرا کی محفل میں مجھ ایسے گدائے متکبر کا کیا کام۔ لیکن آخر کار ان کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا اور ۱۹۲۸ء میں مجھے وہاں سب سے پہلے جانے کا اتفاق ہوا۔

ہر چند میرا قیام وہاں چار دن سے زاید نہیں رہا اور وہ بھی مہمان خانہ میں جو شہر سے کافی دور ہے، تاہم قلت زمانی و بعد مکانی کے موانع میری راہ جستجو میں حایل نہ ہو سکے اور میری نگاہ نے بہت جلد یہاں کے اُس تنہا جوہر تابندہ کو پہچان لیا جو اُس وقت بھی سلطنت کا دست راست تھا اور اب بھی ہے۔ خود فرمانروائے جاورہ سے تبادلۂ خیال کا موقعہ تو مجھے نہیں ملا لیکن جو حالات مجھے وہاں معلوم ہوئے اُن سے میں نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ اپنی اہلیت و صلاحیت کے لحاظ سے وہ یقیناً اُن کارفرما ہستیوں میں سے ہیں جن کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

خزانے را بہارے میتوان کرد

اس کے بعد صاحبزادہ صفدر علی خاں صاحب بھی وہاں سے چلے گئے اور میں بھی اپنے مشاغل و افکار میں مبتلا ہو کر اس دلچسپ خواب کو بھول گیا۔ زمانہ گزرتا گیا، سال پر سال ختم ہوتے رہے، یہاں تک کہ میں لکھنؤ چلا آیا اور اس کا امکان بھی باقی نہ رہا کہ میں اس زندگی میں پھر کسی وقت مالوہ کے اس مختصر مگر خوبصورت قطعۂ زمین کو دیکھ سکوں گا۔

لکھنؤ آنے کے بعد نگار نے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو ذہنی انقلاب پیدا کیا اور اصنام مذہبی پر جیسی کاری ضربیں لگائیں وہ اہل ملک سے مخفی نہیں۔ وہ کونسا ہنگامۂ دار و گیر تھا جو برپا نہ ہوا، وہ کونسی لعنت تھی جس کا مستحق مجھے نہ قرار دیا گیا۔ وہ کونسا تیر ملامت تھا جو مجھ پر صرف نہ کیا گیا۔ قدامت پرستوں کی گالیاں، مولویوں کی پھٹکاریں، صوفیوں کی بد دعائیں، مذہبی دیوانوں کی گریباں گیریاں الغرض وہ سب کچھ جس کا مظاہرہ جہل و بطلان کی طرف سے ہمیشہ علم و حقیقت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے میرے مقابلہ میں بھی کیا گیا اور ممکن تھا کہ میں ان باغیان حق و صداقت کے غضبناک انتقام سے جانبر نہ ہو سکتا اگر یہ محسوس نہ کرتا کہ جو آواز میں نے بلند کی ہے اس کے سننے والے بھی دنیا میں موجود ہیں اور جو چنگاری میں نے خرمن جہل میں ڈالی ہے اس کے ہوا دینے والے دامنوں کی بھی یہاں کمی نہیں۔ چنانچہ منجملہ اُن چند ہستیوں کے جنھوں نے میرے اس اقدام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ایک بالغ نظر ہستی جناب صاحبزادہ محمد سرفراز علی خاں[1] کی بھی تھی اور یقیناً میری زندگی میں یہ بالکل پہلا تجربہ تھا کہ ایک قصر امارت میں پرورش پانے والے انسان کو میں نے اس درجہ روشن دماغ و آزاد خیال پایا ہو۔

---

[1] خان بہادر صاحبزادہ محمد سرفراز علی خاں چیف سکرٹری دربار جاورہ۔

اس کے بعد مراسلت کے ذریعہ سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہا، دو دل جو ایک ہی عنصر سے خمیر ہوئے تھے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے، دو روحیں جنھوں نے ایک ہی روشنی میں آنکھ کھولی تھی ایک دوسرے سے قریب ہوتی گئیں، اُدھر بارشِ لطف و کرم تھی اور اِدھر نیایشِ نارسا، اُس طرف میل نسبت و خلوص تھا اور اس طرف اعتراف بے ریا۔ الغرض میرے پاؤں اُکھڑ گئے اور میں بیتابانہ اس آستانِ محبت پر پہونچ گیا، جہاں اس سے قبل ہی مجھے سجدہ ریز ہونا چاہئے تھا۔ اس مرتبہ جاورہ میں میرا قیام غیروں کی طرح مہمان خانہ میں نہیں بلکہ خود صاحبزادہ صاحب کی کوٹھی میں تھا، اور میری پرسشِ حال کے لئے معمولی خدام نہ تھے بلکہ خود معزز میزبان کی نگاہِ لطف و عنایت تھی کہ اگر میں باندازۂ احساس اس گرانباری کرم کا اظہار کرنا بھی چاہوں تو ممکن نہیں۔

صاحبزادہ صاحب موصوف ہر چند اس لحاظ سے بھی کہ وہ وزارت کے عہدہ پر ممتاز ہیں نیز اس حیثیت سے کہ وہ فرمانروا کے بھائی ہیں خاص اعزاز و مرتبہ کے حامل ہیں، لیکن میرے لئے ان کی جو خصوصیت باعث کشش ہے وہ صرف ان کی بلند انسانیت ہے جو دنیا کے ہزاروں ظاہری و مادی امتیازات سے کہیں اشرف و اعلیٰ چیز ہے ۔ میرے قیام کے دوران میں ایک دن شام کو خود ہز ہائنس[1] بھی تشریف لائے اور اس طرح میری وہ تمنا بھی پوری ہو گئی جس کی تکمیل کے لئے اس عالم اسباب میں انتہائی کاوش کیجاتی ہے۔ ہز ہائنس کو میں نے کامل تیرہ سال کے بعد دیکھا لیکن میں نے ان کی صحت و توانائی میں مطلقاً کوئی فرق محسوس نہیں کیا، وہی افغانیوں کا سا پُر شہامت انداز، وہی دلیرانہ وقار، وہی چہرہ کے آثار خوشدلی اور وہی سُرخ و سفید رنگ جو پہلے تھا اب بھی موجود ہے۔ اس وقت ہز ہائنس گالف کے لباس میں تھے اور کھیل سے فارغ ہونے کے بعد سیدھے اسی طرف تشریف لے آئے تھے۔

ہز ہائنس نے جن الفاظ میں میری پذیرائی فرمائی ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور نہ اس نوع کے اسباب افتخار کا اظہار مناسب۔ اس قدر کہدینا غالباً کافی ہوگا کہ یہ ملاقات شاہ و گدا کی نہ تھی بلکہ دو ایسے انسانوں کی تھی جو ایک پاکیزگیٔ اخلاق کا مجسمہ تھا اور دوسرا وہ جو دنیا میں صرف اسی چیز کا پرستار ہے۔

رئیسوں کی جماعت کے متعلق میرے تجربات اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ میں ان کو اس دنیا کی مخلوق سمجھتا ہی نہیں اور مشکل سے کبھی یہ توقع کر سکتا ہوں کہ وہ سطحِ انسانی پر آکر کوئی بات سوچ سکتے ہیں، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ہز ہائنس کی زبان سے وہ الفاظ سنے جو صرف ایک ایسے نقاد کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں جس نے اوروں سے زیادہ اپنی ذات کا مطالعہ کیا ہے۔

رئیسوں کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اُن کی ذمہ داریاں اور ضروریات خود اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ ملک کے مختلف پبلک اداروں کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب جس تہذیب و شائستگی اور صاف گوئی کے ساتھ ملا وہ مجھے سخت حیرت میں ڈالدینے والا تھا۔ ارشاد ہوا کہ "معاف فرمائیے میں آپ سے اس باب میں متفق نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ رئیسوں کی تعلیم اس قدر ناقص ہوتی ہے کہ ان میں نہ احساس فرض شناسی پیدا ہوتا ہے اور نہ امتیاز حسن و قبح اور اپنا وقت صرف کرنے میں وہ قوت تمیز سے کام لے سکتے ہیں نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دولت کا صحیح مصرف کیا ہے"۔ اسی سلسلہ میں نواب صاحب معظم الیہ نے اپنے زمانۂ تعلیم

---

[1] ہز ہائنس میجر فخر الدولہ صولت جنگ نواب محمد افتخار علی خاں بہادر کے سی۔ آئی۔ ای۔

ڈیلی کالج اندور کے بعض نہایت دلچسپ واقعات سنائے اور دیر تک اس امر پر اظہار تاسف فرماتے رہے کہ امراء اپنی حقیقی ذمہ داریوں سے ناواقف رہکر نظام حکومت اور رعایا کے درمیان ایک زبردست خلیج حایل کردیتے ہیں ـــ ہزہائینس جس اُصول پر حکمرانی کر رہے ہیں وہ خود انھیں کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ فرمانے لگے کہ میں نے تین عہد کئے ہیں اور سختی سے میں ان کا پابند ہوں ایک یہ کہ میں کسی کی غیبت نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ کبھی کوئی بات غلط نہیں کہتا اور تیسرے یہ کہ انصاف کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں ـــ"

وہ یہ فرمارہے تھے اور میں ان کا منھ دیکھ رہا تھا حیران تھا کہ یہ میں کیا سن رہا ہوں اور طبقۂ امراء کی وہ کونسی درسگاہ ہے جہاں ایسے پاکیزہ و بلند خیالات ان میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف فطری صلاحیت سے ہوا کرتا ہے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ قدرت نے ان پاکیزہ ہدایا کے ودیعت کرنے میں موجودہ فرمانروائے جاورہ کے ساتھ غیر معمولی فیاضی سے کام لیا۔

ہزہائینس کی وسعت اخلاق کا یہ عالم ہے کہ ملازمین و رعایا میں سے کسی کی دعوت کو رد نہیں فرماتے اور اُن کے رنج و مسرت میں ایک شفیق باپ کی طرح ہر وقت شرکت کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی طرف سے گزر رہے ہوں اور دس پانچ افراد اپنا درد و غم سُنانے کے لئے وہاں موجود نہ ہوں۔ پھر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے دادرسی چاہی ہو اور آپ نے موٹر روک کر اس کی عرضداشت نہ لیلی ہو اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جب آپ کسی معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو فیصلہ وہی ہوتا ہے جو عین مقتضائے انصاف ہے۔

ہزہائینس کو تعلیم کی طرف خاص توجہ ہے، چنانچہ آپ نے ایک عام فرمان جاری کردیا ہے کہ ریاست کے اندر جہاں کہیں طلبہ کی کافی تعداد فراہم ہوسکتی ہے وہاں مدرسہ قایم کردیا جائے اور اگر رعایا میں سے کوئی جماعت خود کوئی تعلیم گاہ قایم کرنا چاہتی ہے تو دربار سے اس کی اعانت کیجائے ـــ تعلیم کے ساتھ ہی ہزہائینس کو تجارت و صنعت کی ترقی کا بھی بڑا خیال ہے، چنانچہ خود جاورہ کے اندر لاکھوں روپیہ کے سرمایہ سے ایک کارخانہ شکرسازی[1] کا قایم کیا گیا ہے اور اس طرح سیکڑوں غرباء کے لئے کسب معاش کا ذریعہ فراہم ہوگیا ہے۔ الغرض ہزہائینس کا وجود جاورہ و اہل جاورہ کے لئے ایسی غیر معمولی سعادت و برکت کا سبب ہے کہ وہ اس پر جتنا فخر بھی کریں کم ہیں ـــ افسوس ہے کہ ولی عہد بہادر برجیس قدر نوابزادہ ناصر علی خاں اسوقت جاورہ سے باہر تشریف فرما ہیں اور اس لئے ان سے تبادلۂ خیال کا موقعہ نہیں ملا تاہم مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ وہ بالکل اپنے والد محترم کے قدم بقدم چل رہے ہیں اور نہایت نیک نفس و پاکیزہ اخلاق رکھنے والے نوجوان ہیں۔ خدا اُن کی عمر میں برکت دے اور اپنے عوش اقبال باپ کے سایۂ عاطفت میں انھیں اپنے اخلاق سنوارنے کی توفیق عطا ہو۔

میرے سفرِ جاورہ کا ذکر ناتمام رہے گا اگر میں اس ہستی کو نظرانداز کردوں جس نے اہل جاورہ کی ذہنیت بدلنے میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ ان کا اسم گرامی مولانا یحییٰ معین اللہ ہے اور اہل علم کے طبقہ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو ان سے واقف نہ ہو۔ آپ صوبہ بہار کے ایک نہایت معزز خاندان کے فرد ہیں اور آپ کی ساری عمر قوم کی دردناک حالت پر روتے ہوئے گزرگئی ہے ـــ آپ کی عمر اسوقت ۶۰ سال سے متجاوز ہے اور تیس سال اُس طرف آپ اُس آزاد خیالی کی بنیاد ڈال چکے تھے جس کا اب ہر اہل نظر دیوانہ نظر آتا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ آپ نے خدائی کا دعوےٰ کیا، نبوت کا ادعا فرمایا، مہدی ہونے کا اعلان کیا اور اس بنا پر آپ کے ساتھ بہت بیدردانہ سلوک کئے گئے لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اُس کیفیت کو نہیں سمجھا جو مولانا پر طاری ہے اور انھوں نے ان کی تصانیف و مادی کی اصل روح تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی۔ وللناس فیما یعشقون مذاہب — واللہ دررا قال:-

شعلۂ آہنگ خونِ منصورے
سازہ سوخت از ترانۂ ما

مولانا نے میرے دورانِ قیام میں جس شفقت و محبت کا سلوک مجھ سے کیا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

---

[1] افسوس ہے کہ ہندوستان میں شکرسازی کا مستقبل بہت تاریک ہے اور اس میں اسوقت تک کامیابی کی توقع نہیں کیجاسکتی جب تک جاوا میں برطانوی سرمایہ دار اس تجارت کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں۔

س ش ص

(مسلسل)

باب سوم در بیان ص

حضرت غالب کے مطبوعہ خطوط میں چودھری عبدالغفور کے نام جو خطوط ہیں روئے سخن اُن کا در اصل حضرت صاحب عالم صاحب بلگرامی سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی طرف ہے چنانچہ ایک خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں:-

"تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض مآب، جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کی فروزندہ شمع، مستغرق مشاہدۂ شاہد ذات، حضرت عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے ۔۔۔۔"

ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں:-

"جناب چودھری صاحب! آؤ ۔ ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں۔ اور اپنی آنکھیں اُن کے کفِ پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام کروں گا ۔ تم معرف ہونا کہ غالب یہی ہے! اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے! میں نے عرض قدمبوسی کیا ۔ پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا۔

فرماتے ہیں۔ غالب! تو اچھا ہے؟ ۔ عرض کرتا ہوں کہ الحمد للہ! حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟ ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔

جناب! یہ ان کی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے ضعف قویٰ و اضمحلال کہتے تاکہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا۔ اُن کی غمخواری اور دردمندی کا دم بھرتا ؎

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن ۔۔۔ اینکہ من نمی میرم ہم زناتوانی ہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستانِ خیال کے دیکھنے کا داغ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقتِ پرواز کہاں کہ بلا سے آکر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اُٹھاؤں۔ حضرت! سچ تو یوں ہے کہ غمہائے

روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے........ ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ناامیدی اُس کی دیکھا چاہئے"

یہ خط دہلی سے مارہرہ گیا تھا۔ مگر اس کو تعلق آرہ سے ہے۔ آرہ میں حضرت صاحب عالم کے نواسہ، اور حضرت غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے بوستانِ خیال کی اٹھارہ جلدوں کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا اور دو جلدیں شایع ہوئیں تو غالب نے مبارکباد دی :۔

نورِ نظر۔ لختِ جگر۔ زبدۂ اولادِ بیجیہ۔ مولوی سید فرزند احمد زاد [illegible] اس درویش گوشہ نشیں کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستان خیال کے ترجمہ کا عزم اور دو جلدوں کا مطبوع ہو جانا مبارک۔ حضرت [illegible] آپ کا احسان عظیم ہے۔ مجھ پر خصوصاً۔ اور بالغ نظرانِ ہند پر عموماً۔

غالب ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ

اسی بوستانِ خیال اُردو کی اور جلدیں صفیر بلگرامی نے [illegible] صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ نے غالب کو دیکھنے کے لئے بھیجیں تو چودھری عبدالغفور کے خط میں [illegible] آیا جو اوپر لکھا گیا۔

صفیر بلگرامی کے بارے میں جوہر شناس کیا کہتے تھے اور کیا کہتے ہیں [illegible] کا بیان قصیدۂ زلفِ لیلیٰ ہے۔ اس قصیدہ کا چہرہ یہ ہے :۔

مفتی سید محمد عباس شوستری :۔ جہان[1] است آتنگ خوش شہریور انوشہ بجوشہ فروزندہ ہور

بھادوں کی جھڑی ہے ہریالی ہے۔ جبھی آسورج مہاراج [illegible] کنیا کے پھیرے میں آگئے !

بیشتم شتاد [illegible] برا سنے خدا

اے اگنی دیوتا کی آنکھوں کے تارے ! تیری [illegible] پاس آتا کیوں نہیں ؟

---

[1] آتنگ = سبزہ زار ۔۔ شہریور = بھادوں کا مہینہ ۔۔ انوشہ [illegible] ۔۔ خوشہ = گیہوں کے کھیت میں ایک کنواری لڑکی ہے، داہنا ہاتھ کندھے تک۔ ہاتھ میں مٹھی بھر گیہوں کی بالیاں۔ [illegible] کہیں ہے اور پڑتا کہیں ہے۔ سرچھم ادھر پاؤں پورب دکھن !

اہلِ نجوم نے آسمان کو بارہ حصوں (بروج) میں تقسیم کیا ہے۔ ان بارہ [illegible] برج کا نام ایران میں سنبلہ رکھا گیا سنبلہ یعنی خوشۂ گندم۔ ہندوستان میں کنیا رکھا گیا۔ کنیا کنواری لڑکی۔ [illegible] مراد سنبلہ یعنی کنیا ہے اس لئے انوشہ بجوشہ فروزندہ ہور کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب برج سنبلہ میں ہے یعنی سورج مہاراج [illegible] کنیا کے پھیرے میں آگئے۔

ہور ــــــ آفتاب

موبد ــــــ جس طرح ہندوؤں میں پنڈت اسی طرح پارسیوں میں موبد

یجشنی ــــــ پارسیوں کی کتاب [illegible]

چہ از بر سرائی نسک[۱] ہائے ژند — ببین و بخواں نامۂ دلپسند

ہم پوچھتے ہیں کہ وہاں بیٹھا ہوا کیا الاپ رہا ہے؟ تیری پوتھی میں آخر لکھا کیا ہے؟ دیکھنا ہو تو ادھر آ۔ پڑھنا ہو تو ادھر آ۔

کہ فرزند احمد ہمایوں نقش — گرامی نژاد و خجستہ روش

فرزند احمد کو دیکھ۔ جس کا سبھاؤ اچھا۔ جس کی پیڑھی اونچی۔ جس کی چال ڈھال اچھی۔

بہشت است زیبا تر از گلستاں — نگر تا دلت شاد گردد از آں

پھلواڑی میں وہ پھول کہاں جو اس کے پاس ہیں؟ آ کر دیکھ لے۔ جھولی بھر لے۔

کہ فرزند احمد دبیر کبیر — جوان است و خوش فکر و بلبل صفیر

فرزند احمد قلم کا دھنی ہے۔ جگت گرو ہے۔ جوان ہے .... بلبل ہے۔ صفیر ہے!

میرزا دبیر لکھنوی (۱) "خطیب منابر فصاحت و نکتہ دانی۔ عندلیب حدائق بلاغت و رنگین بیانی سلمک اللہ تعالیٰ"

(۲) "نمک خوان سخن، محک امتحان طرز سخن، فصاحت سرمایہ، بلاغت پیرایہ، سید فرزند احمد صاحب متخلص بہ صفیر زاد قدرہ۔ بادۂ تمنا در جام وزلال مدعا ہموارہ بکام باد!"

مرزا محمد باقر صحبت شیرازی — از قصیدہ در مدح حضرت صفیر بلگرامی

ہزار مرتبہ گر مدح حضرت تو سرایم — یک از ہزار نگویم چہ منجلی و چہ مبہم

ہم آسمان جلالی۔ ہم آفتاب جمالی — ہم آستان کمالی۔ جلیل قدر و معظم

جناب سید فرزند احمدی و صفیری — ہی ززمرۂ سادات بلگرام مفخم

گرم بلطف بخوانی۔ ورم بقہر برانی — سرانہ رم بکمند تو است۔ وحکم تو محکم

بپائے حمت و فضل ار قدم کنی سوئے صحبت — رسد بزخم درونش زخاک پائے تو مرہم

مرزا حاتم علی مہر لکھنوی :- نہ تنہا عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

الحمد للہ علی احسانہ کہ از صریر خامہ صفیرے بگوش خورد۔ و دلم از دست بردے

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست — کہ ایں مژدہ آسائش جان ماست

مکرمت نامہ دی کہ یکم اگست بود بایک جلد علی بند و حسین بند برائے بندہ، دو دتا برائے برادر عزیزم میرزا عنایت علی ماہ سلمہ اللہ، و نور چشم آغا سخاوت علی ضیا اسسٹنٹ کلکٹر و ڈپوٹی مجسٹریٹ ایں ضلع ایدہ اعلی اللہ درجاتہم معہ یک جلد سفر صفیر و یک جلد تذکرہ تلامذہ بلند فکر خیر الذکر بسبیل ڈاک رسید۔ وایں خمسہ چوں خمسۂ نظامی برحواس خمسہ ام نظام

---

[۱] نسک — سورہ — ژند — صحیفۂ زردشت

تازہ بخشیدہ ماشاء اللہ بہر تصنیف شریف لطفے دارد کہ دل شیدائے سخن می خارد ؎

بانا و آں دوست کو دوستاں را غذائے دل و راحت جاں فرستد

نیز از عالی دودمان و والاشان اعز اعزا امیر بادشاہ علی صاحب بقا میرزا سلامت علی صاحب دبیر مغفور خلف الصدق جناب میر وزیر صاحب مبرور، محامد و مدیح جناب بشیر از بشیتر می شنفت - اکنوں از کلام بلاغت نظام ہر ازاں دریافتم کہ عزیزم میگفت - تعالیٰ شانہ سلامت داشتہ باشد بحق محمد و آل محمد۔ میخواہم کہ گاہ گاہ بخاطر مبارک رسیدہ باشم

زردچہرہ - مہر عفی عنہ

حضرت امیر مینائی :- بلبل شیراز و طوطی ہند لے مصفیر سلامت - سلام مشحون اخلاص و سپاس مشحون - سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی پرستاریوں نے مجھ سے جی بھر کے اُن آسائشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقات احباب سے سفر میں پائی تھیں۔ وہ سرگزشت لکھوں تو خط مرثیہ ہو جائے - کتنے ہی عزیز چل بسے - خدا مغفرت فرمائے۔

اس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے فقیر نام کے امیر کو یہ نہ سمجھیں کہ وطن پہونچکر آپ کی مہربانیوں اور قدر دانیوں کی لذت بھول گیا - نہیں نہیں - سب اُسے یاد ہے۔

امیر اللغات کے اُصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب باصواب کی آرزو ہے - زیادہ حاجت تصدیع نہیں۔

امیر احمد عفی عنہ

ابھی حضرت! جلوۂ خضر کی دوسری جلد چھپنے میں کیا دیر ہے ؟ ضرور لکھئے کہ اب تک شتاقوں کو تڑپایئے گا۔ فقط والسلام بالاکرام - ۹ دسمبر ۱۸۸۹ء۔

اس خط میں جس سفر کا حوالہ ہے اُس سے مراد عظیم آباد ہے - ۱۳۰۵ھ میں حضرت امیر مینائی اپنے شاگرد مہدی حسن خاں شاد آپ رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کے طلبیدہ عظیم آباد تشریف لائے - اور ریاض و کوثر کے ساتھ لال کوٹھی میں ٹھہرے۔

اُردو کا سب سے پہلا لغت سید اوحد الدین بلگرامی نے اور اُسی زمانہ میں میر علی اوسط رشک لکھنوی نے لکھا رشک کا لغت غیر مطبوع رہا - اس کے تقریباً ۳۶ برس کے بعد حضرت امیر مینائی کا یہ خط صفیر بلگرامی کو آیا - آرہ سے اس کا جواب ۲۲ دسمبر کو چالیس صفحوں میں گیا - خط کیا ہے کہ دریائے تحقیق موجیں مار رہا ہے۔ صفیر بلگرامی کا جواب پانے کے چار سال بعد حضرت امیر مینائی نے امیر اللغات کا پہلا حصہ شائع کیا - جلوۂ خضر جس کے بارے میں امیر مینائی لکھتے ہیں کہ مشتاقوں کو کب تک تڑپایئے گا۔ صفیر بلگرامی کی وہ بلند پایہ تالیف ہے جس پر صوبہ بہار ناز کر سکتا ہے - چنانچہ ڈاکٹر بیلی - پروفیسر لندن یونیورسٹی - اپنی کتاب ہسٹری آف اُردو لٹریچر (تاریخ ادب اُردو) مطبوعہ ۱۹۳۲ء ص ۹۲ میں تحریر فرماتے ہیں :-

صفیر بلگرامی ..... زندگی کا زیادہ حصہ ان کا آرہ میں گزرا - نظم میں ان کا کلام بہت کچھ ہے - بالخصوص غزلیات

ان کی مطبوعہ کتابوں میں صلوات خضر بیاضِ اشعار اور صفیر بلبل و خمخانۂ صفیر دو دیوان غزلیات بھی ہیں۔ ایک ناول روح افزا بھی لکھا تھا جو طبع نہیں ہوا۔ مگر ان کی اہم ترین تالیف جلوۂ خضر ہے۔ یہ تاریخ ہے ادب اُردو کی اور مولف کے خیال میں آزاد کی آبِ حیات میں جو غلط بیانیاں تھیں انھیں کی تصحیح کے لئے یہ کتاب لکھی گئی۔

شوق نیموی:— (۱) جناب فیض مآب سخنور نامی گرامی حضرت سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مدفیضکم۔ محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی شاگرد حضرت تسلیم لکھنوی بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ جلال لکھنوی نے ایک رسالہ کار آمد شعرا تانیث و تذکیر میں لکھا ہے۔۔۔۔ ایک روز فخراً کہنے لگے کہ اس رسالہ کا موجد میں ہوں۔ اُس پر حضرت اُستاد نے فرمایا کہ سبحان اللہ صفیر بلگرامی اس قسم کا رسالہ پہلے لکھ چکے ہیں۔۔۔۔ تب جلال کچھ طعن کی باتیں کہنے لگے۔۔۔۔۔ چند روز ہوئے میں حضرت اُستاد کی خدمت میں رامپور گیا تھا۔ اس کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ عرصہ ہوا کہ اصل رسالہ چھپ گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر وہ مل سکے، تو ایک جلد بھیج دینا کہ جلال کو دکھاؤں۔ اس سبب سے التماس ہے کہ اب آپ کے پاس کوئی نسخہ رشحات کا موجود ہے یا نہیں۔۔۔۔۔۔"

(۲) سخنور نامی گرامی۔ چاشنی بخش مایدۂ شیریں کلامی۔ جناب سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مدظلکم اللہ السامی خاکپائے ارباب ذوق محمد ظہیر احسن شوق بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ آپ کا نامہ نامی ورود ہوا۔۔۔۔۔ آپ نے درباب رشحات جو کچھ تحریر فرمایا ہے سب بجا درست ہے۔ میرے ایک عم زاد برادر کے پاس وہ رسالہ ہے میں نے اس کی خوب سیر کی ہے۔ فی الحقیقت آپ اس کے موجد ہیں۔ رشحات اور کار آمد شعرا میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جلال کا دعوےٰ محض بے بنیاد ہے۔ حضرت تسلیم کے پاس تسہیل تانیث و تذکیر تھی۔ میں نے عند التذکرہ اُن سے کہا کہ جس طرح اس میں متقدمین و متاخرین کے اختلاف بیان کئے گئے ہیں اُسی طرح اصل میں بھی ہر اک کی مثالیں بھی اس قسم کی موجود ہیں کہ جن کی بنا قوافی و ردیف پر ہے۔ اُس میں اغلاط کاتب کے گمان کو بھی گنجایش نہیں، اور کار آمد شعرا میں اس کا التزام نہیں ہے۔ یہ سُنکر جناب ممدوح نے آپ کی جانفشانی کی کمال داد دی اور بہت مداح رہے۔۔۔۔۔۔ ہر چند آپ ایسے لائق لوگ کی خدمت میں اپنا کلام بے نظام مورد کلام بھیجنا سراسر گستاخی ہے۔۔۔۔۔ مگر دو غزلیں جو فی الحال کہی ہیں ارسال کرتا ہوں۔۔۔۔ اگر خدا نے چاہا تو اب کے مرتبہ جب وطن کو جاؤں گا تو آرہ ہوتا جاؤں گا۔ ملاقات کی کمال آرزو ہے۔۔۔۔۔"

از شہر لکھنو۔ کشمیری محلہ۔ متصل چاہ حیدر بیگ خاں

رشحات صفیر تانیث و تذکیر کی تحقیق میں صفیر بلگرامی کی ایک دوسری بلند پایہ تالیف ہے۔ اس پایہ کی کتاب اب تک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی۔ حضرت جلال لکھنوی کو دعویٰ تھا کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ حضرت تسلیم لکھنوی اور شوق نیموی نے صفیر بلگرامی کی کتاب اسی دعویٰ کو رد کرنے کے لئے منگائی تھی۔

رشحات صفیر کے بارے میں حضرت غالب کا فیصلہ ملاحظہ ہو:۔

حضرت غالب :۔ سیدی سندی، نور بصر، لخت جگر، قرۃ العین اسد۔ مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت وبقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبدء فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے... سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں..... قوت علم اور حسن فہم اور لطف طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہونچائے ہیں جو مجھے دل سے پسند آئے ہیں۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار رہ کر ہمیشہ منظور انظار اولوالابصار رہے گا.... مولف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر آرہ۔ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں۔ سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی، اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرت کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے ؎

مادح خورشید مداح خود است — کہ دو چشمم روشن و نامرمد است

داد کا طالب غالب

ایک اور خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں:۔

بعلاقۂ مہر و محبت نور چشم و سرور دل۔ اور برعایت سیادت مخدوم و مطاع۔ مولوی سید فرزند احمد.......

اشعار گہربار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سب اچھے ہیں مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں ؎

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا — ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

ورق ہیں جوشش مضمون گریۂ یار دل — بشان ژالہ ہے ہر نقطہ کتاب میں آب

کبھی ہوں گرم کبھی سرد جیسے تیغ وقت — صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ اور موحدانہ مضمون۔ اور بالغانہ الفاظ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک — صحت و لطف طبع روز افزوں

نجات کا طالب غالب ۔ شنبہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ

نواب سید رضا علی خاں عظیم آبادی نبیرۂ جعفر حسن خاں فیض شاگرد مصحفی علیہ الرحمہ:۔

خوشا اے رضا ایں کلامے کہ از دے — بدل ہست قوت وبجاں ہست قوت

بود از تصانیف سحبان دوراں — بلیغ الکلام و کلام البلاغت

گرامی دل و بلگرامی توطن — صفیر سخن سنج عالی طبیعت

برین خان یغما چہ یاراں چہ اعدا — بیابند و گیرند صد گونہ لذت ،

جناب راز عظیم آبادی ۔۔ سید عزیز الدین احمد بلخی راز عظیم آبادی مولف تاریخ شعرائے بہار لکھتے ہیں :۔۔

ادب اُردو کی تاریخ میں صفیر بلگرامی بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم میں غالباً آٹھ دیوان کے قریب ان کے کلام مرتب ہو گئے تھے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

مشق تیری یہ بیالیس برس کی ہے صفیر　　آٹھواں فضل الٰہی سے ہے دیوان تیرا

نثر میں تالیف و تصنیف کی تعداد نظم سے بھی زیادہ ہے۔ فہرست تصانیف حسب ذیل ہے :۔

جناب راز عظیم آبادی کی فہرست نامکمل ہے کیونکہ اس میں صرف بیس کتابوں کا حوالہ ہے۔ حالانکہ ۱۲۹۴ھ تک نظم میں ۵ اور نثر میں ۲۴، اکتابیں تصنیف و تالیف ہو چکی تھیں۔ اور ان ایک سو چوہتر کتابوں میں تین کتابیں مجموعۂ فیض صفیر گلبن موزوں۔ اور بوستان خیال اردو بہتر جلدوں میں تھیں۔

نواب خیال عظیم آبادی ۔ مکتوب نواب نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی بنام سید وصی احمد بلگرامی۔

پرنسپ اسٹریٹ کلکتہ ۔ ۲۴ ر جولائی ۱۹۱۵ء

عزیز محترم ۔ میں مرثیہ گویانِ ہند کا ایک تذکرہ مرتب کرنے کی فکر و کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ جناب غفراں مآب مولوی سید فرزند احمد صاحب مغفور نے بھی مرثئے کہے تھے اس لحاظ سے اُن مرحوم کا ذکر خیر بھی اس تذکرے میں ضرور واجب ہے۔ میں نے کوشش کی مگر اُن جناب کا کوئی مرثیہ مجھے اب تک نہیں مل سکا۔ آپ کا پتہ بھی معلوم نہ تھا جو قبل آپ کو لکھ سکتا۔ کسی طرح آپ کا نشان حاصل کر کے آج اس طرف متوجہ کر سکا ہوں۔ فرمائش ہے کہ اس کام میں خاطر خواہ میری مدد کیجئے اور آپ کے ذریعہ سے اگر پرانے مراثی کہیں مل سکیں تو اُن کے حاصل کرنے کی فکر کیجئے اور اپنے دادا صاحب (صفیر بلگرامی) مرحوم کے مراثی میں سے دو ایک بھی مل سکیں تو مجھے فوراً بھیجئے ....

جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُس کا اقتضا یہ ہے کہ میرے قلم سے اُن کے صحیح و ضروری حالات نکلیں۔ واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔ اور مجھے تو ایسا قلق ہوگا کہ اپنی باقی کل محنت کو رائگاں سمجھوں گا ...... مرحوم نے ایک تذکرہ بھی تالیف کیا تھا جس کا نام ہے جلوۂ خضر۔ مجھے اس کی بیحد ضرورت ہے۔ کسی طرح اس کو بھی فراہم کر کے مجھے بھیجئے۔ ایک فرنچ گارسن دی تاسی تذکرہ نویس خبر دیتا ہے کہ مرحوم نے ۱۸۶۹ء میں گلبن منظوم اور خلاصۂ فیض صفیر دو تالیفیں پٹنہ سے شائع کیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی کسی طرح مل جائیں تو معلومات میں اضافہ ہو سکتا ......"

اس خط میں ایک جملہ غور طلب ہے :۔ جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُس کا اقتضا یہ ہے۔ واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔ یہ تعلقات کیا تھے ؟ ۔۔ جواب یہ ہے کہ نواب خیال کے حقیقی چچا میر جعفر حسین فریاد، اور حقیقی ماموں سید

علی محمد شاد و سید امیر حسن ایجاد کو صفیر بلگرامی کی شاگردی کا (ایک زمانہ میں) فخر حاصل تھا۔

یہاں تک تو دوسروں کا بیان ہوا۔ اب خود صفیر بلگرامی کا بیان اپنے بارے میں یہ ہے:۔

"ہیچمدان۔ ہیچمیرز۔ مقلدِ گزشتگان۔ معتقدِ فصحائے زمان۔ حد غرور سے منزلوں دور۔ شاگردِ خاندانِ ناسخ مغفور فیضیاب خدمت شیخ امان علی سحر و برق و تجر۔ کوچہ گرد شہر شہر۔ زر ربائے خوان فیض غالب و دبیر روشناس برنا و پیر شعرا کا دوست غمخوار یار۔ باوجود ہیچمدانی مشہور دیار و امصار کشتۂ تیغ ستم تلامذہ۔ مورد مراحم اساتذہ۔ بندہ حقیر سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مقیم قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد"

اس بیان میں مرثیہ کا ایک ٹکڑا بھی ہے یعنی "کشتۂ تیغ ستم تلامذہ!" شاگرد اپنے استاد کو ستم کی تیغ سے کیوں ذبح کرتا ہے اُس کو پوچھنا چاہئے افضل الدین خاقانی سے جس نے ابو العلا سے بغاوت کی۔ اور شریف سے جس نے لسانی سے بغاوت کی اور بساطی سے جس نے کمال خجند سے بغاوت کی۔ اور مومن دہلوی سے جس نے شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی اور سکندر شاہجہاں پوری سے جس نے مومن دہلوی سے بغاوت کی۔

(۱) خاقانی کو ابو العلا نے لکھایا پڑھایا۔ بتایا سکھایا جب کسی قابل ہوا تو اُس کو ہاتھ پکڑ کے خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں لے گیا۔ اور خاقان کی رعایت سے خاقانی تخلص بخشا۔ ان احسانوں کا صلہ خاقانی نے یہ دیا کہ ابو العلا کی ہجو کہی اور کہا کہ تو ہوتا کون ہے جو ہمارا اُستاد بنے ہے

مرا دل پیر تعلیم است و من طفل زباں دانش

پھر کہا کہ ؎

بست خیالم کہ ہست ایں خلل از ابو العلا　　　از لگد حادثات سخت شکستہ دلم

آخر ابو العلا کو کہنا پڑا ؎

خاقانیا! اگرچہ سخن نیک دانیا　　　یک نکتہ گویمت۔ بشنو رایگانیا

ہجو کسے مکن کہ ز تو مِہ بود بہ سن　　　شاید ترا پدر بود و تو ندانیا

(۲) اسی طرح شریف نے اپنے اُستاد لسانی سے بغاوت کی تو اُس کے دیوان پر اعتراض کئے اور سہو اللسان؛ کتاب لکھی۔ ان اعتراضوں کا جواب حیدری شاگرد لسانی نے لسان الغیب میں دیا۔

(۳) اسی طرح بساطی شاگرد کمال خجند نے شوخ چشمی کی ؎

غزلہائے بساطی را کمال از خود مداں کمتر　　　کہ پرورد ست چوں خواجہ بآب دیدہ سلمانش

کمال خجند نے جواب دیا ؎

اے خواجہ تو مرد خود فروشی　　　رخت تو دریں دکاں نگنجد

(۴) اسی طرح حکیم مومن خاں دہلوی نے اپنے اُستاد شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی تو شاہ نصیر نے کہا ؎

کمان و تیر نمط ربط تھا مجھے اُس سے　　　جب اُس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

(۵) اسی طرح سکندر خاں سکندر شاہجہانپوری نے اپنے استاد مومن خاں سے بغاوت کی قصہ یہ تھا کہ سکندر اپنی غزل اصلاح کے لئے لایا۔ اس غزل میں ایک شعر تھا ؎

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینہ کا لحاظ   اور یار یہ سمجھتے ہیں۔ مجھ میں ہے دم نہیں

مومن نے کہا یہ شعر بے معنی ہے۔ قابل اصلاح نہیں۔ سکندر نے کہا کہ آئینہ میلا ہوجانے کا خوف تھا۔ اس لحاظ سے ہم نے دم سادھ لیا۔ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اس میں دم ہی نہیں۔ مومن نے کہا کہ آئینہ کا لایا جانا خود بتا رہا ہے کہ اسوقت عالم کیا ہے۔ پھر دم سادھنا کیسا؟ سکندر کو آئینہ پر ناز تھا۔ حجت کرنے لگا۔ بات بڑھی۔ آخر سکندر نے مومن سے کہا کہ آپ کو استاد کس نے بنایا؟ اصلاح کو پوچھئے تو بات اتنی ہے کہ ہم آپ کا کلام دیکھتے تھے۔ آپ ہمارا کلام دیکھتے تھے۔ اس میں استادی اور شاگردی کیسی؟

علامہ تفتازانی اپنے شاگردوں سے اس قدر نالاں تھے کہ پاؤں میں ایک مرتبہ کانٹا گڑ گیا تو علامہ نے آبدیدہ ہو کر پوچھا —"اے کانٹے! سچ سچ بتا۔ کیا تو نے بھی ہم سے کچھ سیکھا تھا؟" پھر حضرت صفیر بلگرامی نے اپنے کو کشتۂ تیغ ستم تلامذہ کہا تو کون سی انوکھی بات کہی؟ بقول مولف آبحیات :-

"شعرائیں اپنے سے خود پسندی اور دوسرے کے لئے ناتواں بینی ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اسے قدرتی عیب کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں۔ بلکہ شاگردوں کو استادوں سے دست و گریباں ہوتے دیکھا تو اکثر اسی فن (شاعری) میں

اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱۲۵۵ھ - جناب شاد الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی پٹنہ سے مرشد آباد گئے۔ قیام تین سال۔

۱۲۵۸ھ - جناب فریاد مرشد آباد سے کلکتہ گئے۔ قیام بیس سال۔

۱۲۶۲ھ - ولادت میر علی محمد شاد عظیم آبادی۔ اسی سال صفیر بلگرامی نے شاعری شروع کی۔

۱۲۷۶ھ - حضرت فریاد صرف چار ماہ کے لئے کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ پھر کلکتہ واپس گئے۔ قیام تین سال۔

حیات فریاد صفحہ ۱۶-۱۷ میں جناب شاد فرماتے ہیں :-

اڑتیس سال اپنی عمر گراں بہا کے حضرت (فریاد) نے مرشد آباد و کلکتہ میں بسر کئے منجملہ جس کے پینتیس سال کلکتہ میں صرف ہوئے۔ اس طویل مدت میں حضرت تین دفعہ عظیم آباد آئے۔ تیسری دفعہ تو آخر دفعہ تھی۔ اور اس کے قبل دو دفعہ تشریف لائے۔ ایک دفعہ تو ۱۸۵۵ء میں غدر کے دو سال قبل۔ جبکہ راقم کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ اور چار ماہ صرف عظیم آباد میں قیام فرمایا۔ راقم اس زمانہ میں شرح مسلم پڑھتا تھا۔ ایک روز ناظر وزیر علی عبرتی مرحوم کے ہاں سے مشاعرہ کی طرح سے "جب سے اس ابرو نے پیدا تیغ عالمگیر کی" آئی اسوقت تک راقم نے کبھی ایک شعر غزل کا نہیں کہا تھا...... حضرت (فریاد) نے والد سے ارشاد فرمایا کہ طرح میں

چند شعر اس لڑکے کو کہنے دو ...... (میں نے) گیارہ شعر کہہ کر حاضر کئے ...... یہی بنیاد راقم کی شاعری اور حضرت (فریاد) کے زمرۂ تلامیذ میں داخل ہونے کی ترقیاتی کی ہے "

تاریخ لکھنے میں جناب شاد سے سہو ہوا ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۵ء میں اُن کی عمر دس سال کی تھی۔ نہ کہ چودہ پندرہ سال کی۔ اور شاعری انھوں نے نہ تو دس سال کی عمر میں شروع کی نہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں۔ جناب شاد کے دست وقلم کی تحریر مورخہ اپریل ۱۹۲۶ء ہمارے پاس موجود ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:- "سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شاعری و تصنیف کا شوق ہوا" اس تحریر کے آٹھ ماہ بعد شاعری کی شمع خموش ہوگئی۔ الغرض حضرت فریاد کلکتہ سے چار ماہ کے لئے جب پٹنہ آئے تھے اسوقت تک جناب شاد نے شاعری شروع نہیں کی تھی۔

۱۲۷۹ھ۔ حضرت فریاد دوسری دفعہ کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ اس سال جناب شاد نے شاعری شروع کی۔ اور اٹھارھویں برس پہلی غزل کہی۔

۱۲۸۰ھ صفیر بلگرامی کا پہلا دیوان ۱۲۷۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ سال ترتیب سے جمع شد مایۂ حیات صفیر۔ اسوقت جناب شاد کو بارھواں سال تھا۔ اس کے سات برس بعد ۱۲۸۰ھ میں دیوان صفیر بلبل پٹنہ سے شائع ہوا تو جناب شاد کو انیسواں سال تھا اور انھوں نے تاریخ طبع دیوان کہی۔

چو ایں دیوانِ رنگیں طبع گردید — پُر از معنی و الفاظ خوش اسلوب
بجستم سال طبعش شاد از طبع — شدہ شیریں سخن تاریخ مرغوب

۱۲۸۱ھ۔ حضرت فریاد عظیم آباد سے کلکتہ گئے۔ وہاں قیام گیارہ سال رہا۔

اسی سال جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین صاحب مظہر رئیس حاجی گنج کے ساتھ میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی کے مکان پر صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لئے حاضر ہوئے اور اُن کی درخواست قبول کرلی گئی

۱۲۸۱ھ سے ۱۲۸۶ھ مسلسل سات برس تک جناب شاد نے صفیر بلگرامی سے اصلاح لی۔

۱۲۸۷ھ صفیر بلگرامی عظیم آباد سے مظفر پور تشریف لے گئے۔ وہاں قیام تین سال رہا۔

۱۲۸۸ھ صفیر بلگرامی کو اُستادی راس نہیں آئی۔ جناب شاد نے شاگردی سے انحراف کیا اور اس انحراف کے بعد حضرت فریاد سے ملنے کے لئے کلکتہ گئے۔ کلکتہ میں صرف دو ماہ قیام رہا۔

۱۲۹۰ھ صفیر بلگرامی مظفر پور سے عظیم آباد واپس آئے۔ آئے تو کیا دیکھا؟ اسکا حال خود صفیر بلگرامی کے قلم سے سنئے :-

"...... غرض ۱۲۸۷ھ ہجری تک جناب شاد کو مجھ سے برابر تلمذ رہا ...... آخر میں طبیعت اُن کی منحرف ہوئی۔ اور میری شان میں کچھ فرمانے لگے۔ اگرچہ واقف کاروں کی روک ٹوک سے کبھی کبھی خاموشی بھی اختیار کرتے تھے۔ مگر ناواقفوں میں اپنی تعلی کی لیتے تھے۔ میں تین برس کے بعد مظفر پور سے آیا۔ جناب شاد کا رنگ ہی اور پایا۔ مگر میرے

سامنے کچھ نہیں کہتے تھے۔ میں نے بھی کچھ نہ چھیڑا۔ آخر کشمیری کوٹھی میں انھیں کی فرمایش سے مشاعرہ شروع ہوا۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ انھوں نے مشاعرہ کی غزل میرے ہوتے۔ بے اصلاحی پڑھی۔ خدا کے کارخانے! غیر طرح میں جناب تجر لکھنوی کے دو چار شعر پڑھ گئے۔ شعرا نے گرفت کی۔ اور یہ غلغلہ تمام پٹنہ میں پھیلا۔ اور دوسرے مشاعرہ میں اسی زمین میں ایک غزل کہہ کر لائے۔ اس پر بھی اعتراض ہوئے۔ مومن خاں کی رباعیاں۔ سحر کے قصیدے کے اشعار پکڑے گئے۔ آخر مشاعرہ کا آنا چھوڑ دیا۔

دو چار مشاعروں کے بعد ایک دن مشاعرہ کے وقت میرے پاس آئے۔ میں ہمراہ جناب نکہت کھانا کھاتا تھا مجھ سے فرمایا کہ آج صبح سے لوگ مجھے دق کرتے ہیں کہ تم نے صفیر سے اصلاح لینے سے انکار کیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ میں انکار کب کرتا ہوں۔ اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ مجھے انکار نہیں ہے۔ میں بیشک آپ کا شاگرد ہوں میں نے کہا۔ "میر علی محمد صاحب! میں بھی سنتا تھا۔ مگر جب آپ کہتے ہیں تو خیر میرا شک نکل گیا۔ بولے اگر فرمایئے تو میں اس مضمون کی رباعی کہہ کر مشاعرہ میں پڑھ دوں۔ میں نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے۔ غرض یہی باتیں کر کے چلے گئے۔ اس کی شہادت جناب نکہت نے اپنے دستخط میں دی ہے۔ اور میں نے بھی اس کی یاد جناب شاد کو نمیقہ محبت وثیقہ میں دلائی ہے غرض یہ کہہ کر جناب شاد مشاعرے میں نہ گئے۔

اب انھوں نے مشاعرہ میں آنا چھوڑا۔ مگر میں اسی طرح اکثر ملاقات کو جایا کرتا۔ وہ اپنی غزلیں پڑھتے تھے۔ سن لیتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ بول بھی دیتا تھا۔ طبیعت تیز تھی۔ اچھا کہنے لگے۔ ۱۲۹۱ھ میں انھوں نے مثنوی نالۂ شاد تصنیف فرمائی۔ اس پر شعرائے عظیم آباد نے اعتراض کئے۔ مگر جناب شاد کو مجھ پر گمان ہوا۔ ایک دن مجھے چھیڑ کر پوچھا۔ میں نے انکار کیا۔ اور کہا بھلا میر علی محمد صاحب! میں آپ پر اعتراض کروں گا؟ یہ البتہ کہتا ہوں کہ جناب شاد میرے شاگرد ہیں۔ یہ سنکر بولے اب میرا دل صاف ہوا۔ لوگوں نے مجھے ناحق بدظن کیا تھا۔ غرض پھر وہ باتیں رفع ہوئیں۔"

۱۲۹۱ھ " اور اب جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد بھی کلکتہ سے پٹنہ تشریف لائے۔ پھر جناب شاد کو وہی سوجھی۔ اور اب برملا کہتے پھرے۔ مشاعرہ میں تو خود نہیں آتے تھے مگر چند شاگرد درست کئے۔ اور میرے پڑھنے میں خلل ڈالنا شروع کیا۔ آخر میں آدمی ہوں۔ یہ ادا ناپسند ہوئی۔ البتہ اشعار مشتمل بر نصائح میں نے پڑھے اور محمد ہاشم (عزیز و شاگرد صفیر بلگرامی و مہتمم مطبع نور الانوار آرہ) سے کہا کہ ایک مجموعہ اسناد شاگردان کا درست کریں اور اسکا نام نشانِ فیض رکھا۔ اس میں جمیع شاگردوں کے اسنادِ دستخطی اور کلام اصلاحی موجود ہیں۔ اور واقف کاران شاگردیٔ جناب شاد کے سامنے پیش کیا کہ حقاً اور ایماناً جو کچھ جانتے ہوں لکھ دیں۔ چنانچہ بیک جلسہ چودہ حضرات نے دستخط بلا اکراہ بے تامل، بدوں میری لجاجت اور سماجت کے اپنے دست مبارک سے فرمائے۔ اور جو کچھ جانتے تھے تحریر کیا۔

یہ خبر جناب شاد کو پہونچی - اکثر اہلِ دستخط کے پاس جاکر فرمایا کہ آپ لوگوں کا ہم وطن ہوں - آپ نے دستخط کیوں کئے ؟ انھوں نے فرمایا کہ ایمان کے باب میں کسی کا پاس نہیں کیا جاتا - جو ہم جانتے تھے لکھ دیا جب انھوں نے دیکھا کہ اب تو دستخط ہو گئے - پھر کشمیری کوٹھی میں آکر جناب نکہت کے سامنے میری شاگردی کا اقرار کیا جس کو جناب نکہت نے اپنے دستخط میں تحریر کیا ہے :-

(۱) العبد سید حامد حسین نکہت - باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد روبروئے من اصلاحے چند از میر صفیر صاحب گرفتہ اند - انکار ازاں انحراف از ایمان است - و اقرار زبانی، بعد انکار ہم، دو دفعہ در غریب خانہ کردہ اند یکبار کہ ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب وقت شب در مشاعرہ کشمیری کوٹھی تشریف آوردہ بودند - دبار دگر وقتیکہ میر فرزند احمد صاحب صفیر ایں استاد و استادی خود دریں شہر شایع کردند، خود نزد حقیر آمدہ گفتند کہ ایں چنیں اصلاح از ناظر عبرتی مرحوم نیز گرفتہ ام پس ازیں چہ حاصل کردم ؟ مگر میدانم کہ اصلاح دادن صفیر سلمہ اللہ القدیر مثل اصلاح ناظر صاحب مرحوم نیست کہ از خطوط کہ نوشتۂ شان است ظاہر است - فقط بقلم خاص نکہت،

(۲) ہمارے علم میں میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر فرزند احمد صاحب کے ہیں - آغا مرزا عفی عنہ،

(۳) العبد علی مرزا عفی عنہ - ہم نے اپنی آنکھوں سے دوبار اصلاح لیتے دیکھا ہے - اور یہ بھی یقینی کہہ سکتے ہیں کہ اکثر اصلاح لی ہے بقلم خاص اور بھی واضح ہو کہ چند رقعات اور غزلیں اور مرثیہ جو دستخط خاص جناب میر علی محمد صاحب شاد سے ہیں ہم بقسم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اصلاح بھی جناب میر فرزند احمد صاحب صفیر کے ہاتھ کی ہے - فقط

اور یہ بھی یاد بہت اچھی طرح ہے کہ جسوقت یہ مرثیہ جو اس کتاب میں موجود ہے، جناب میر علی محمد صاحب، ہمراہ جناب میر فرزند احمد صاحب کے، واسطے اصلاح پاس مرزا دبیر صاحب مرحوم کے لے گئے تھے - ہم بھی حضور میں جناب مرزا دبیر صاحب کے حاضر تھے - فقط"

(۴) ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سید علی محمد صاحب شاد نے ہمارے مکان میں بروز مشاعرہ اکثر اصلاح لی ہے - اور ہمکو اُسوقت شوق غزل گوئی کا نہ تھا - فقط - محمد عسکری خاں عرف حسن نواب صاحب عفی عنہ،

اور جسوقت اس مرثیہ کو جناب میرزا دبیر صاحب کے حضور میں واسطے اصلاح کے سید علی محمد صاحب کو ساتھ میر فرزند احمد صاحب لے گئے تھے، ہم بھی موجود تھے - بلکہ میر بادشاہ علی صاحب بقا نے ہم سے پوچھا کہ یہ مرثیہ میر علی محمد صاحب نے کہا ہے یا میر فرزند احمد نے کہدیا ہے ؟ ہم نے جواب دیا کہ نہیں میر علی محمد صاحب نے کہا ہے - مگر شاید میر فرزند احمد صاحب نے دیکھا ہو تو عجب نہیں - فقط"

(۵) فی الحقیقت ہم واقف ہیں - اکثر غزل دکھاتے ہوئے بچشم خود دیکھا - بلکہ اصلاح اور غیر اصلاح قبل اصلاح اکثر غزلیں میر علی محمد صاحب کی دیکھنے میں آئیں - اور اکثر رقعہ بنام میر فرزند احمد صاحب صفیر تحریر میر علی محمد صاحب دیکھے

اور ہم حرف بھی پہچانتے ہیں - چنانچہ مرثیہ کی تمام وکمال کیفیت سے ہم خوب واقف ہیں۔
بقلم خاص سید محمد حسن خاں عرف منجھلے صاحب فطنتی"
واضح ہو کہ نواب سید محمد حسن خاں فطنتی اور نواب سید محمد حسین خاں ہجرتی دونوں ناظر وزیر علی عبرتی کے شاگرد تھے۔ ہجرتی وہی ہیں جن کے ہاں امتحانِ موج مے کا معرکہ ہوا تھا۔ اور فطنتی وہ ہیں جن کے صاحبزادے نواب سید محمد رضا خاں عرف ننا صاحب موج عظیم آبادی جناب شاد کے شاگرد تھے۔

(۶) "ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے بھی دیکھا۔ اور خوب واقف ہیں۔ اور جلسہ مشاعرہ میں بھی غزل دکھاتے ہوئے میر علی محمد صاحب شاد کو میر فرزند احمد صفیر سے اپنی آنکھوں سے خاص مشاعرہ میں دیکھا ہے۔ الراقم سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب تخلص بہ ہجرتی ۔

اور اُن کے رقعہ وغیرہ بھی لکھے اور مرثیہ وغیرہ بھی اصلاح دیا ہوا دیکھا ہے۔ بقلم خاص سید محمد حسین خاں رضوی عرف چھوٹے صاحب متخلص بہ ہجرتی۔

(۷) میر علی محمد صاحب اور ہم ایک ہی ہفتہ میں جناب اوستادی میر فرزند احمد صاحب قبلہ وکعبہ کے شاگرد ہوئے۔ اور اکثر ہم اور وہ ساتھ اصلاح لیا کئے۔ پانچ سات برس برابر یہی کیفیت رہی۔ سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان میرزا بقلم خاص

(۸) میں نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے حاجی گنج کے مشاعرہ میں دیکھا ہے۔ اور خطوط بھی اُن کے لکھے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ بقلم خاص سید علی اصغر عفی عنہ۔ عرف سید وزیر نواب صاحب عفی عنہ۔
واضح ہو کہ انھیں سید وزیر نواب کے صاحبزادے سید مرتضیٰ نواب مفتون عظیم آبادی جناب شاد کے شاگرد تھے۔

(۹) ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے دیکھا ہے۔ اور رقعہ بھی اُن کا دیکھا ہے اُس میں لفظ اُستادی لکھتے ہیں اور لفظ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد بھی لکھتے ہیں۔ سید مظفر حسین خاں عرف سید نصیر نواب عفی عنہ۔

(۱۰) ہم خوب جانتے ہیں کہ ابتدائے مشاعرات کشمیری کوٹھی ۱۲۸۱ھ تا مشاعرہ حاجی گنج بمکان میر علی محمد صاحب شاد کہ جس میں مولوی وحید صاحب الٰہ آبادی بھی شریک تھے۔ اُسوقت تک میر علی محمد صاحب میر فرزند احمد صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ اور شاگردی میر فرزند احمد صاحب کی اپنا فخر جانتے تھے۔ میر فرزند احمد صاحب مظفر پور تشریف لے گئے اور تین برس تک وہاں بذریعہ چھاپہ خانہ کتب کے وہیں تشریف فرما رہے اسی عرصہ میں میر علی محمد صاحب نے اُنکی شاگردی سے انکار کیا۔ العبد سید عبدالحکیم
واضح ہو کہ یہ وہی عبدالحکیم تمکین قنوجی ہیں جو معرکۂ شاد و احسن کے زمانہ میں سید محبوب شیر کے ہاں جاسوس بنا کر بھیجے گئے تھے۔

(۱۱) العبد یوسف حسین ماہر لکھنوی۔ خوب می دانم کہ جناب میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر صفیر صاحب ہستند چنانچہ

در ۱۲۹۲ھ کو فقیر شریک صحبت مشاعرہ جناب میر حامد حسین صاحب تہمت شد موسی الیہ را اقرار شاگردی جناب میر موصوف کما ینبغی بود۔ تازمانہ ۱۲۸۵ھ کہ با میر عطا حسین صاحب و میر علی حسن صاحب نزاع کلی رو داد فقط۔

واضح ہو کہ مرزا یوسف حسین ماہر لکھنوی کے تین صاحبزادے مرزا الیاس حسین۔ مرزا ممتاز حسین تہرا اور مرزا محمد حسین۔ بڑے نے انتقال کیا۔ دوسرے اور تیسرے بقید حیات ہیں۔

حضرت صفیر بلگرامی فرماتے ہیں :۔" جناب شاد نے دیکھا کہ اب تو میری شاگردی ثابت ہوئی تو ۱۲۹۳ھ میں اور لوگوں کو اُبھارا۔۔۔۔۔" یہ اشارہ خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی کی طرف ہے۔ وہی خواجہ سخن جو آرہ میں ۱۲۷۵ھ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور جن کی تصنیف سروش سخن، اُستاد نے بعد اصلاح حضرت غالب کی خدمت میں بھیجی تھی۔

خواجہ سخن کی دوسری شادی عظیم آباد میں میر نجف علی وکیل کی صاحبزادی سے ہوئی۔ میر نجف علی کے چھوٹے بھائی میر سید علی حضرت فریاد عظیم آبادی کے داماد تھے۔ اور خود میر نجف علی حضرت فریاد کے شاگرد تھے۔ اور جناب شاد و حضرت فریاد میں صرف شاگردی و اُستادی ہی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ عزیزداری بھی تھی۔ چنانچہ جناب شاد کی دادی حضرت فریاد سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اور حضرت فریاد اُن کو باجی صاحبہ کہتے تھے۔ ان تعلقات کی وجہ سے شاد و سخن میں کھچتی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جناب سخن نے جناب شاد کا ساتھ دیا۔ اور اس طرح ساتھ دیا کہ خود بھی شاگردی سے انکار کیا۔

بقول صفیر بلگرامی سے

گھر کیا دل میں جو ان کے تیر نے وہ لگے میرا کلیجا چیرنے !

۱۲۹۵ھ جناب شاد کی تردید میں نواب سید تجمل حسین خاں سلطان عظیم آبادی نے مرقع فیض یعنی تذکرۂ شاگردانِ صفیر بلگرامی لکھا۔ اس سے شاد و سخن کی شاگردی ثابت ہوئی تھی۔ جناب سخن نے تنبیہ صفیر بلگرامی لکھی اور ایک فرضی شخص سردار مرزا کے نام سے شائع کی۔ یہ کتاب عین ۱۰ ذی الحجہ کو مطبع محمدی پٹنہ سے نکلی اور نمازیوں میں تقسیم ہوئی۔ الغرض عید قرباں اسی طرح منائی گئی۔

یہ کتاب کسی طرح بھی جناب خواجہ فخرالدین سخن کے شایانِ شان نہ تھی۔ تفصیل اس کی مناسب نہیں۔ کیونکہ سے اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ۔ انھیں کچھ نہ کہو!۔۔۔۔ مگر اس انحراف و ہجوگوئی سے جناب شاد و سخن کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ کتاب عظیم آباد سے لکھنؤ پہنچی تو لکھنؤ سے جناب شوق نیموی نے صفیر بلگرامی کو لکھا :۔

"تنبیہ وغیرہ جو آپ کے مخالفین نے لکھی ہے اُس کا کچھ جواب آپ نے تحریر کیا یا ازراہِ حلم و تحمل سکوت فرمایا۔ اس سے ضرور اطلاع دیجئے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

ایک کشتۂ تیغ ستم تلامذہ کے دل سے دھواں اُٹھتا ہے اور قلم سے خون کس طرح ٹپکتا ہے، یہ دیکھنا ہو تو مکتوب صفیر بلگرامی

ام شاد عظیم آبادی دیکھئے :۔

عزیز سابق و شفیق حال جناب میر علی محمد صاحب شاد سلمہ اللہ تعالیٰ ۔

صفیر عفی اللہ القدیر بعد سلام مسنون واضح باد - نامۂ لیاقت آما...... ورود نمود - و تعجب بر تعجب افزود ؎

می شنیدم کہ جانِ جانانی   چوں بدیدم ہزار چندانی

ایندم کہ انکار شاگردیٔ من از جانب آنصاحب، کہ اصغا شد از بانی دگراں بود - حالا کہ خود بنوک قلم آوردند چہ گفتہ آید؟ زمانہ تعلیم یاد کنم و ہم خطوط آں ہنگام ڈاکی و غیر ڈاکی با ایں دو خطوط کہ حالیا بمن رسیدہ اندیشیں خود بنہم - و خون گریم - بر بادیٔ نت و مشقت خود - و سیلے زنم بر سر و صورت خود -

حیرت کار و بار خویشتنم   گردش روزگار خویشتنم   زہ برخویش و بینوائی خویش   ارم آے زہرزہ لائی خویش

از تو در گفتگو خطائے رفت   در بگو بیند ماجرائے رفت   من چناں تاچنیں دریغ دریغ!   من ایں خشم و کیں دریغ دریغ!

بجنین رستخیز دمے کہ فگند؟   نمک اندر سبوئی مے کہ فگند؟   تانخست از کہ بود رسم خلاف؟   ہر باناخدائے را انصاف!

زلف گفتار را کہ درہم کرد؟   بزم اشعار را کہ برہم کرد؟

مطلب یہ کہ اب تک ہم دوسروں سے سنا کرتے تھے کہ آپ کو شاگردی سے انکار ہے ۔ آپ کی تحریر نے آج یہ پردہ بھی اٹھا دیا ل کی بات ہے کہ آپ ہم سے تعلیم پاتے تھے ۔ ایک طرف ہمارے سامنے آپ کے شاگردانہ خطوط ہیں - اور دوسری طرف عال کے وہ خطوط ہیں جن میں شاگردی سے انکار ہے - اب آنکھ خون نہ برسائے تو کیا کرے - اور ہاتھ ماتم نہ کرے تو کیا کرے؟ اللہ رے انقلاب زمانہ! آپ اپنے کو دیکھئے ہم کو دیکھئے - اور یہ کینہ پروری دیکھئے - دریغ ! دریغ !

یہ خط بہت بڑا ہے - اس کے چند ٹکڑے یہ ہیں :۔

درمیانِ من و خود خدائے حق پسند را حاضر دانستہ و ایمان را ذریعۂ نجات شمردہ، در یک یک حالت سابق نیک نگرند کہ دقتے کہ در ۱۲۸۱ھ مشاعرہ در کشمیری کوٹھی از طرف میرن صاحب می شد، آں صاحب ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب غزل خود مخصوص نزد من برائے اصلاح نیا وردند؟ و بندہ باں صاحب اصرار نکرد کہ آں صاحب شاہ الفت حسین صاحب را چرا گزاشتند؟ جوابش شنیدم کہ شاہ صاحب رہگرائے کلکتہ می شوند - بازنہ گفتم دریں پٹنہ دگراں ہستند تخصیص من چیست؟ جواب دادند اعتقادِ من در باب تو از ہمہ

آپ کو واسطہ ہے اُس خدا کا جو حاضر و ناظر ہے اور اُس ایمان کا جو ذریعۂ نجات ہے کہ سابق کی کل باتوں کو اچھی طرح یاد کیجئے ۔ ۱۲۸۱ھ میں جب کشمیری کوٹھی میں میرن صاحب کی طرف سے مشاعرے شروع ہوئے تو کیا آپ شاہ حفاظت حسین صاحب کے ساتھ مخصوص ہمارے پاس اپنی غزل اصلاح کے لئے نہیں لائے تھے؟ اور کیا ہم نے بتکرار آپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ آپ تو شاہ اُلفت حسین صاحب کے شاگرد ہیں - پھر اُن کو کیوں چھوڑ دیا؟ آپ نے جواب دیا کہ شاہ صاحب کلکتہ جارہے ہیں - تب کیا ہم نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ پٹنہ میں

مشتر است - بازنہ گفتم کہ اگر چنیں است بسم اللہ اگر یاد دارند کہ اگر امیاناً بعد ازیں کسے از من فاضل تر از لکھنؤ یا دہلی بیاید از من نخواہند برگشت - جواب نقص و عیب کلام شما ذمہ من است . من جواب خواہم داد - آں صاحب اقرار کردند - و ہماں وقت بر غزل ملال ہے - وصال ہے کہ در شگوفہ نکہت مندرج است اصلاح دادم -

و از آں روز آمد رفت روزانہ بخانۂ آں صاحب وا نہ پاسے از روز باقی و تا دہ ساعتِ شب، یا بیش و کم ازاں نزد آں صاحب ماندن بر خود مستحکم کردم - و از طرف آنصاحب روزانہ سواری برائے رفتن من تا کشمیری کوٹھی می یافتم . . . . با من ایں سلوک بود تا دو سہ سال برابر چوں بفضل خدا تعلیم یافتند، بندہ ہم آمد رفت ہر روزہ کم کرد - و لبعد دو چار روز جاری نمود -"

افسوس کہ والد ماجد و عم نامدار آں صاحب رخت بجناں کشیدند - خدا شاں را در جوار خود جا دادہ باشد اگر می بودند ہرگز از شہادت انکار نمی کردند - و ایں وقت ہم می دانم کہ جناب میر جعفر حسین صاحب و جناب میر امیر حسن صاحب و جناب شاہ حفاظت حسین صاحب و دیگر صاحبان حاجی گنج کہ در آں وقت بہ کاشانۂ آں صاحب با جناب محسن صاحب مرحوم صحبت گرم می داشتند زنہار و دریغ نخواہند گفت - چنانکہ صاحبان کشمیری کوٹھی و گزری وغیرہ از شہادت دادن و بدست خود نوشتن پہلو تہی نکردند - - - -"

ہملا ایں قصہ بطول انجامید - می خواہم کہ فیصلۂ ما د آں صاحب بر ہمیں شود کہ قرآن پیش نہادہ رو بروئے عمائد انصاف کیش و جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد

اور لوگ بھی موجود ہیں - یہ ہماری ہی تخصیص کیوں ہے ؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے - آپ سے بڑھ کر کسی کو نہیں سمجھتے - تب ہم نے کیا نہیں کہا تھا کہ اگر ایسا ہی تو بسم اللہ مگر یہ یاد رکھئے کہ لکھنؤ یا دہلی سے اگر کل کوئی شخص ہم سے فاضل تر آگیا تو آپ کو ہم سے انحراف نہیں کرنا ہوگا - باقی رہا آپ کے کلام کا نقص - آپ یہ بوجھ ہماری گردن پر رہا - ہم اس کا جواب دے لیں گے - آپ نے یہ شرط قبول کی - اور تب ہم نے اسی وقت آپ کی غزل پر اصلاح دی - یہ غزل ملال ہے - وصال ہے شگوفہ نکہت میں موجود ہے . . . . اور اس روز سے ہمارا معمول ہوا کہ روزانہ سہ پہر کو آپ کے گھر جایا کرتے اور تقریباً دس بجے شب تک ٹھہرا کرتے اور آپ ہی کی سواری پر کشمیری کوٹھی واپس آیا کرتے . . . . دو تین برس تک یہی معمول تھا جب خدا کے فضل سے آپ تعلیم پا گئے تو ہم نے بھی یہ باقاعدہ ناغہ کر دیا - اور اب دو چار روز پر جانے لگے -

افسوس اسکا ہے کہ آپ کے والد ماجد اور عم نامدار جنت کو سدھارے - خدا اُن لوگوں کو اپنے جوار میں جگہ دے - آج وہ لوگ زندہ ہوتے تو ضرور ہماری تصدیق کرتے اور یقین ہو کہ میر جعفر حسین اور میر امیر حسن اور شاہ حفاظت حسین اور حاجی گنج کے اور لوگوں سے جو آپ کے گھر میں محسن صاحب مرحوم سے ملنے آتے تھے پوچھا جائے تو وہ لوگ ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے جس طرح صاحبان گذری و کشمیری کوٹھی نے اپنے دست قلم سے تحریری شہادت دینے سے دریغ نہ فرمایا (واضح ہو کہ سید امیر حسن ایجاد جناب شاد کے چھوٹے بھائی - اور میر جعفر حسین اُن کے چچیرے بھائی تھے -

یہ قصہ بہت طول ہو گیا ہے - اب تصفیہ یوں ہی ہو سکتا ہے کہ قرآن سامنے رکھا جائے - اور خود جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد اور دیگر عمائدین معتبر کے سامنے آپ حلف لیں کہ یہ

آں خطوط را ملاحظہ فرمائید۔ وقسمیہ گویند کہ از من نیست۔ من قبول بدارم وازاں وقت باز دعویٰ اوستادی نکنم۔" حالانامہ بردعاختم می کنم وازدل می گریم کہ خدایا خدا حق رابرزبان جاری کن۔"

خطوط آپ کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر آپ نے قسم کھالی تو ہم فوراً مان لیں گے اور پھر کبھی یہ دعویٰ نہیں کریں گے کہ آپ ہمارے شاگرد ہیں، (واضح ہو کہ ان خطوط سے مراد وہ خطوط ہیں جو شاگردی کے زمانہ میں جناب شادؔ نے صفیر بلگرامی کو بھیجے تھے۔ اور جن میں اُستادی اور تلمیذ حلقہ بگوشں علی محمد تحریر فرمایا تھا) اب اس خط کو ہم ختم کرتے ہیں اور دل سے دعا مانگتے ہیں کہ خدایا! تو شادؔ کی زبان پر حق جاری فرما۔

۱۲۹۶ھ جناب شادؔ نے اس خط کا یہ جواب دیا کہ اغلاط صفیر نام ایک رسالہ ترتیب دیا۔ اس رسالہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کے کلام پر اعتراض کر کے انتخاب نقص نام ایک رسالہ شایع کیا تھا۔ نساخ کی اس جراءت پر اساتذہ برہم تھے اور ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس آگ سے جناب شادؔ نے فائدہ یہ اٹھایا کہ شعرائے لکھنؤ و کلکتہ و دانا پور کو لکھ بھیجا کہ اگر نساخ پر اعتراض کئے جائیں تو آپ لوگ دستخط کریں گے؟ وہاں سے جواب آیا کہ ضرور۔ اندھا چاہے دو آنکھیں!۔ جب یہ طے پا گیا تو جناب شادؔ نے عظیم آباد سے کھچڑی پکا کر بھیجی یعنی دس بیس شعر نساخ کے۔ باقی صفیر بلگرامی کے نتیجہ یہ ہوا کہ نساخ کے دھوکہ میں صفیر بلگرامی کی گردن ماری گئی۔ یہی مجموعۂ اغلاط صفیر جناب شادؔ نے اپنے شاگرد سید رحیم جان رحیم عظیم آبادی کی طرف سے شائع کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر عظیم آبادی چشم دید گواہوں سے دستخط لے رہے تھے کہ شادؔ شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ چند گواہوں کے نام یہ ہیں :- محمد وجیہ الحق۔ امیر الحسن عرف اُلفت حسین دانا پوری۔ الیاس حسین۔ امداد حسین۔ شیخ فرزند علی۔ شیخ تقی جان۔ سید الطاف حسین۔ سید شفاعت حسین ساکنان حاجی گنج۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناب شادؔ و جناب مطیرؔ میں بول چال بند ہو گئی۔ آخر نواب محمد علی خاں نے صلح کرا دی۔ اس صلح کی خبر آرہ پہونچی تو صفیر بلگرامی نے جناب شادؔ کو یہ خط بھیجا :-

اعزّ الاحبا جناب سید علی محمد صاحب شادؔ زاد لطفہ۔ تسلیم۔ تحریر احباب سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ سے اور جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مطیرؔ سے جو اتفاقیہ ناچاقی ہو گئی تھی وہ بسعی و فہمائش جناب نواب مولوی محمد علی صاحب مدظلہ برطرف ہوئی۔ الحمدللہ والمنة۔ بخدا میرا جی بہت خوش ہوا...... میں نے اس صلح کا قطعۂ تاریخ کہا ہے وہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ وہو ہذا ؎

فتاد صلح میانِ دو مومنِ خوشخو! | زہے بہ گردی سعی امیر ابن امیر
فگند طرحِ ولا با علی محمد شاد | بہ شاہ حفاظت حسین کہ ہست مطیر
بگوش خورد چو ایں مژدۂ مسرت زای | چو گل شگفتہ شد از انبساط قلب صفیر

خیالِ مصرعِ تاریخ داشتم در دل　　سرود ہاتفِ غیبی خلوصِ شادؔ دمطیر
　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۲۹۶ھ

کاش اسی طرح میرے آپ کے بھی صلح ہو جائے تو میں حافظ کا یہ شعر پڑھوں ؎

شکر ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد　　حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

مگر یہ صلح بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ خیر ؎　　بیدل نیم ہنوز۔ ببینم چہ می شود!........"

۱۲۹۷ھ شیخپورہ ضلع مونگیر سے جناب شادؔ کے چھوٹے بھائی سید امیر حسن ایجادؔ نے صفیرؔ بلگرامی کو خط بھیجا کہ بات بڑھ رہی ہے اب صلح ہو جانا چاہئے۔ صفیرؔ بلگرامی نے اس کا مفصل جواب دیا۔ چند سطریں یہ ہیں:-

سعید زمن مولوی امیر حسن ایجاد سلمہ اللہ تعالیٰ.......آپ کا خط مورخہ چہارم محرم ڈاک سے پایا۔ اُس کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے سب سچ ہے۔ اور جو کچھ خیال ہے سب راست ہے۔ افسوس! میں خود ان باتوں سے نادم ہوتا ہوں۔ اور پانی پانی ہوا جاتا ہوں۔ بھائی! میں تو بہت رُکتا ہوں، اور سنبھلتا ہوں۔ مگر کیا کروں؟ بعض باتیں اُدھر سے ایسی ہو جاتی ہیں کہ ناچار جواب دینا پڑتا ہے۔ خدا اس کا علیم ہے کہ میں نے باوجودیکہ برسوں بہت کچھ سُنا۔ اور بے اعتنائی اپنی آنکھوں بھی دیکھی مگر دم بخود رہا۔ کیونکہ مجھ سے تو کوئی نہیں بولتا تھا۔ کیا ضرور کہ میں دخل بیجا کرتا۔ اگر وہ (شادؔ) اپنی تعریف کرتے تھے تو میرے خوش ہونے کا مقام تھا۔ اگر وہ میری توہین کرتے تھے تو شنیدہ را اعتبارے چنداں نیست۔ سمجھ کر ناشنیدہ کر دیتا تھا.......آخر کہاں تک؟ میرا منصب، جو میرے نزدیک کیا بہتوں کے نزدیک بلکہ خدائے عادل کے نزدیک ہے۔ آخر مجھے غیرت میں لایا۔ اور روز روز کی ناشنیدنی سے جی گھبرایا۔ یعنی جب یہ سُنا کہ اُدھر اب انکار صاف ہے تو میں نے اپنی پرانی ردّیوں کو دیکھا بھالا اور جو کچھ زمانۂ شاگردی کا بندھا بندھایا رہ گیا تھا نکالا۔ اور اُس کا ایک مجموعہ درست کر کے شاہدین سے اُس پر دستخط لکھوایا۔ پھر بھی ان کو (شادؔ) کو خیال نہ ہوا۔ ایک بے تہذیب سے مل کر میری تہجین میں کوشش فرمائی........معاذ اللہ مجھے اُن ملاعین سے مثال دی جن کے مقابلہ میں اُن کے اور میرے آبا طاہرین نے صبر کیا تھا.......جناب میر امیر حسن صاحب! حسبتہً للہ فرمائیے کہ ان سب باتوں کا جواب میری طرف سے کیا ہوا؟ خاموشی!.......آپ اگر صفائی چاہتے ہیں تو مجھے محال معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ میرا دعویٰ اسی قدر ہے کہ وہ (شادؔ) بقسم اقرار کر دیں کہ میں صفیرؔ کا شاگرد ہوں... جب تک شاہ صاحب (فریادؔ) کلکتہ سے نہ آئے تھے اُس وقت تک بخدا میرے سوا وہ کسی کو نہ دکھاتے تھے....... اس بات پر فیصلہ اگر ہو، اور وہ بھی علیٰ رؤس الاشہاد ہو (کیونکہ یہ قصہ دور تک پہونچ گیا ہے، اُن لوگوں کو بھی اس سے آگاہ ہونا ضرور ہے) تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ رسوا ہو کر چپکے سے فیصلہ کر لینا غیرت قبول نہیں کرتی......"

۱۲۹۸ھ رحلت حضرت شاہ اُلفت حسین فریادؔ عظیم آبادی۔ مصرعِ تاریخ ؎ " شاہ اُلفت حسین صدرِ جہاں "

حیاتِ فریادؔ صفحہ ۱۸۹ میں مصرعِ تاریخ رحلت۔ شاہ اُلفت حسین فردوسی۔ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۸ عدد زائد ہیں۔

۱۳۰۷ھ رحلت حضرتِ سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی۔ نعش عظیم آباد سے خشکی راستہ آرہ آئی۔ ۱۰ محامیر گنج میں پیوند خاک ہوئی۔ بتاریخ ۲۲ رمضان المبارک وقت شب ؎

اے شاد تم تو روتے تھے نکہت کے واسطے ایلو! عدم کو آج سدھارے صفیر بھی!

یہ وہی نکہت ہیں جن کے گھر میں جناب شاد حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور یہ وہی نکہت ہیں جنھوں نے تصدیق کی تھی کہ :۔ "العبد سید حامد حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد روبروئی من اصلاحے چند از میر صفیر گرفتہ اند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان است ......"

۱۳۲۹ھ اس سال بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ہم حضرت شاد عظیم آبادی کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے حضرت نے پوچھا آپ کون؟ ہم نے کہا کہ ننگِ اسلاف سید وصی احمد بلگرامی۔ حضرت نے پوچھا اسلاف کون؟ ہم نے کہا کہ جدی مرحوم و مغفور حضرت صفیر بلگرامی۔ حضرت کی آنکھوں نے کہا ؎ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری!

حضرت کی زبان نے کیا کہا اس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ مگر حضرت کے قلم نے کیا کہا اس کا مختصر بیان یہ ہے :۔

مکتوباتِ شاد عظیم آبادی بنام سید وصی احمد بلگرامی

(۱)

چشم و جان شاد۔ آپ کا خط مورخہ ۲۵ جولائی مجھ کو ابھی ملا۔ میں خود بھاگلپور اب تک نہیں جا سکا۔ حالت یہ ہے کہ مجھ کو پہلے بخار آیا۔ پھر اسہال و اختلاجِ قلب میں حد سے زیادہ پریشان رہا۔ آپ جانتے ہیں کہ چراغِ سحری کے لئے اندک جھونکا ہوا کا کافی ہوتا ہے اور یہاں تو اس دفعہ سخت جھونکے تھے۔ برابر یہی یقین رہا کہ آج کا دن میری رخصت کا ہے۔ مگر خیر چونکہ اجل موعود میں وقفہ ہے اب کے بچ گیا۔

اور سچ یوں ہے کہ اس بچنے کی چنداں خوشی نہیں ہے۔ زمانہ کے رنگ کو دیکھ کر ایسا کبیدہ خاطر ہو رہا ہوں کہ اب زندگی کو دل نہیں چاہتا جتنے خاندان پرانے اور باوقار تھے سب مٹ گئے۔ ان میں اگر کوئی ہونہار نوجوان بھی باقی رہ گیا ہے تو وہ بزرگوں کے نام و نشان و ملکیت کو اور بھی خاک میں ملائے جاتا ہے۔ ہر چند زمانہ خلاف دستور یہ کام نہیں کرتا۔ لیکن کیا کروں؟ دل کو گوارا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ایسے ایسے خاندان والے اب اُبھر رہے ہیں جنکے باپ دادا تک کو شریف کہتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔ میرے پیارے! بخدا اس نم یزلی میں ان مسرت بھری خبروں کو سنکر اسقدر خوش ہوا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ قرآن میں ہے۔ و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلہم ائمۃ و نجعلہم الوارثین ۔ یہ آیت سورۂ قصص کے آخر یا وسط میں ہے ٹھیک اس کے مصداق آپ ہوئے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ ثم الحمد للہ۔ یہ سید سچے میاں صاحب شفیقی سید اولاد حیدر سلمہٗ کے کون تھے (ہیں)۔ ان تعلقات کو ضرور لکھ بھیجئے۔

ایک نہایت ضروری اور واجب التعمیل بات یہ ہے کہ آپ پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی اُس پر اصلاح ہے۔ مجھ کو قسم ہے اپنے آبا رکرام کی کہ اگر آپ اس کو مجھے دو تین دنوں کے لئے دیں تو میں محض ایک نظر اس کو دیکھ کر فوراً واپس کردوں گا۔ بیٹا! میں اس کو اب کسی ایسی چیز کو اب اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا۔ تم سے زیادہ اُس کا مستحق کون ہے؟ تم خوب جانتے ہو کہ سیاسلہ جس قابل ہیں۔ شاگردوں بھی کوئی ایسا نہیں ہے۔ تم کو خدا نے محض اپنے تفضل سے ہر طرح کی قابلیت دی۔ الحمد للہ۔ پھر میں تم سے اگر کسی چیز کو چھپاؤں تو ہزار لعنت مجھ پر۔ دیکھو! اگر تم نے بواپسی ڈاک نہ بھیجا تو عذر کو بہانہ سمجھ کر سخت رنج ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ انشاء اللہ ڈپٹی ہلکہ میں ... زبان۔ مگر میں پھر کیا کروں؟ کیونکہ بخدا آپ سے زیادہ میری نا چیز تصانیف کا خبر گیر کون ہے؟ ... قابلیت کس میں ہے؟ میری کتاب فکر بلیغ کا مسودہ جوں کا توں پڑا سڑتا ہے۔ اگر یہ کتاب مرتب و شائع ... ہوا۔ اسی پر دار و مدار میری تمام تصانیف کے چھپنے کا ہے۔ مگر ہنوز یہ کتاب حسب خواہ مرتب نک نہیں ہوئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا ہے کہ آپ پاس تھوڑا تھوڑا مسودہ لکھ لکھ بھیجتا رہوں۔ اور آپ اپنے قلم سے میرے سب ... ت کرتے رہئے۔ اور مجھ کو بھیجتے بھی جائیے۔

آخر کتاب میں آپ اپنے حسب خواہ وہ سب باتیں بھی پائیں گے جس کا ... نے اس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اس بارے میں ... میرا دل ہر طرح سے ... سے پاک صاف ہے۔ یہ کتاب اگر میری زندگی میں آپ کی محنت اور توجہ سے چھپ ... تو شاد اس ... خوشی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ انشاء اللہ غزلوں کی ترتیب کا بار بھی آپ ہی ... دوں گا۔ خدا کرے ... سب ... تیں پوری ہو جائیں۔

اگر زندہ رہا تو آیندہ دوشنبہ سہ شنبہ کو بھاگلپور کا قصد ہے۔ وہاں سے ... آرہ آجاؤں گا یا ایک دن کیلئے آپ کو زحمت دوں گا۔ لیکن آپ بلا کسی انتظار کے اول تو وہ مرثیہ بھیج ... قبل اپنے جانے کے دیکھ کر واپس کردوں۔ دوسرے میری کل باتوں کا مفصل جواب دیجیے ...... ہماری تمنا ہی ... خدا و ندا کریم عمر طبیعی کو پہونچا دے۔ دونوں بھائی پھلو پھولو۔ ہر طرح کی ترقی کرو۔ الٰہی آمین۔ تم تینوں ... ہیں۔ تمہارا بڑھا دعا گو

السید علی محمد شاد۔ از پٹنہ سٹی ۱۶ اگست ۱۹۱۸ء

اس اعزاز نامہ میں چند باتیں تشریح طلب ہیں:۔

(۱) شاگردوں میں بھی ایسا کوئی نہیں ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ حضرت شاد کے ایک شاگرد نے ان کے گھر میں آگ لگادی۔ آگ لگانے سے مطلب یہ ہے کہ اور شاگردوں کو استاد کی نظروں سے گرادیا۔ اس فتنہ پرداز میں اتنی بھی صلاحیت نہ تھی کہ میر عنایت حسین امداد عظیم آبادی اور سید علی حیدر رشید عظیم آبادی کی حد کو پہچان سکتا۔ یا پروفیسر

محمد مسلم عظیم آبادی۔ سید شاہ ولی الرحمٰن ولی ڈپٹی کلکٹر۔ سید شاہ خلیل الرحمٰن وفا عظیم آبادی وغیرہ کا کلام سمجھ سکتا۔ مگر اسکی عیاریوں نے کسی کو اُبھرنے نہ دیا۔ یہ شخص مہینوں اُستاد کے سر میں تیل ملتا۔ اُن کے پاؤں داب‌تا اور باور کراتا کہ اور جتنے شاگرد ہیں سب آپ کے دشمن ہیں۔ یہ دروغ مجسم اسی غلامی کے ذریعہ بادشاہت کرتا تھا۔ یعنی کہنہ مشقوں کو ذلیل کرنے کے لئے خود حضرت شادؔ کی غزلیں مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھتا تھا۔ مگر بقول حضرت امیر مینائی ؎

ستارے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں یہ سب گیند اُن کے اُچھالے ہوئے ہیں

حیات فریاد صفحہ ۱۶۴ میں حضرت شادؔ فرماتے ہیں: "فی زمانناجو حرکات تلامذہ کے اپنے اُستادوں کے ساتھ ہیں کیا بیان کئے جائیں؟ دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم! ۔انشاء اللہ اگر موقع ملا تو اس بیان کو تفصیل وار کسی جگہ لکھ جاؤں گا تاکہ ناظرین کو حیرت و عبرت ہو" ——— اس فتنہ پرداز شاگرد کے ایک سو ستر ہاتھ تھے۔ ان میں دو ہاتھوں کا کرشمہ یہ تھا کہ ایک ہاتھ سے حضرت شادؔ کو ان کے اور شاگردوں سے لڑا دیا اور دوسرے ہاتھ سے شعرائے عظیم آباد و آرہ کو خود حضرت شادؔ سے لڑا دیا۔ یہ جنگ برسوں رہی۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۲۳ء میں میدانِ جنگ کا نقشہ کیا تھا ملاحظہ ہو:۔

۷۸۶

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مشاعرہ کا منشاء یہ ہے کہ سخنگو اپنے کلام سنا کر محنت کی داد پائے اور حاضرین کو غیر جانبداری کا یقین آئے۔ سارے سخن گو بلائے جائیں۔ سب کا کلام سنا جائے۔ اور سب کی محنت کی داد دیجائے خود نمائی آئی۔ پھر مشاعرہ مشاعرہ نہ رہا۔ انھیں باتوں کو ملحوظ رکھ کر ایک صحبت مشاعرہ بتاریخ ۱۰ نومبر بوقت ۱۰ بجے شب بمقام بخشی محلہ پٹنہ قرار پائی ہے۔ اُمید کہ آپ بتاریخ و وقت معینہ پر تشریف لاکر ملتمسین کو رہین منت فرمائینگے۔

مصرع طرح :۔ ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے۔

قافیہ:۔ جدا۔ فدا۔ حنا۔ خدا وغیرہ ——— ردیف :۔ ہے

الملتمسین :۔ نظیر حسن شائق۔ ابوالقاسم دارثی مذکور نجم الدین نجم۔ ضی الدین حسن دہلوی خواجہ۔ عین الہدیٰ قمر عزیز الدین بلخی رازؔ

۷۸۶

الحمد للہ کہ مشاعرہ کا حقیقی منشا عملی طور پر پچھلے مشاعرہ میں جو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام پایا۔ کل حضرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ شہر کے تمام اہل کمال اور ماہرینِ فن اور سخن سنج شریکِ بزم ہوئے۔ خلوص اور غیر جانبداری کے اعتبار سے یہ جلسہ جسقدر کامیاب ہوا اسکے متعلق بس یہی عرض کر دینا کافی ہوگا کہ شہر کے ہر حلقہ کے سخنگو بلا استثنا شریک تھے اور کسی کو الحمد للہ کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہوئی۔ ہاں بعض مخالفین نے اس بزم کو مفسدانہ جلسہ اور تو تو میں میں کے لفظ سے تعبیر کرنے میں تامل نہ کیا۔ اور ایک نئی جوا نگہ کی طرح ڈالی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے ناموں کو ترکِ فہرست کرکے عام دعوت دیجاتی ہے کہ کل حضرات جنکو شعر و سخن سے دلچسپی ہو بتاریخ ۸ دسمبر ۱۹۲۳ء روز شنبہ بوقت دس بجے شب بمکان مولوی سید عزیز الدین بلخی صاحب بخشی محلہ پٹنہ سٹی تشریف لاکر زینتِ بزم ہوں اور ملتمسین کو رہینِ منت فرمائیں۔

مصرع طرح :۔ بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے۔

قافیہ :۔ ضرورت۔ محبت۔ وغیرہ ——— ردیف :۔ ہے

الملتمسین :۔ عین الہدیٰ قمر۔ سید محسن سید۔ نظیر حسین شائق

یہ مشاعرے بخشی محلہ عظیم آباد میں ہوئے تھے۔ مصرع طرح کا روئے سخن حضرت شاد کی طرف تھا ؎

"ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے"۔ یعنی بزم شاد میں صرف شاد و شاگردانِ شاد کو داد ملتی ہے۔ اور خود نمائی کا تماشہ ہوتا ہے "بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے"۔ یعنی بزم شاد میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ملتمسین کی فہرست میں دو نام خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ اول نظیر حسین شائق شاگرد حضرت شاد۔ اور دوم عین الہدیٰ ثمر شاگرد مولانا بدر آروی۔ اب دیکھئے کہ زمانہ حضرت صفیر بلگرامی کا انتقام حضرت شاد سے کس طرح لیتا ہے۔ شاد نے ۱۲۸۰ھ ہجری میں صفیر بلگرامی سے انحراف کیا تھا۔ اب پچپن برس کے بعد خود حضرت شاد کا شاگرد شائق عظیم آبادی اُن سے ٹوٹ کر ملتا کس سے ہے شاگرد شاگرد صفیر بلگرامی یعنی حافظ سید عین الہدیٰ ثمر آروی سے۔ بہرکیف ان دونوں مشاعروں کے رقعے ہمکو بکسر ضلع شاہ آباد میں ملے۔ مشاعرہ میں ہم خود شریک نہ ہو سکے۔ مگر ایک غزل بھیج دی جس میں یہ دو شعر بھی تھے ؎

جو داد کے قابل نہیں اس کو بھی ملی داد | "ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے"
نالیؔ متعصب نہیں جو شاد سے روٹھے | شاگرد صفیر حق تو تاج الشعرا ہے

مشاعرے میں جب یہ دو شعر پڑھے گئے تو ایک شخص حضرت شاد کے پاس دوڑا گیا۔ اور کہا کہ دیکھئے صفیر بلگرامی کے پوتے نے اس مقطع میں پھر آپ کی شاگردی کا فسانہ چھیڑ دیا۔ مگر اس غریب کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس سے پہلے ہی ہم حضرت شاد کو براہ راست لکھ چکے تھے کہ اب آپ کو خود فرمانا چاہئے کہ انحراف کا بوجھ اپنے اوپر اٹھانا آپ کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اسی سوال کا جواب حضرت شاد نے ہم کو دیا تھا کہ:-

"آخر کتاب (فکر بلیغ) میں آپ اپنے حسب خواہ وہ سب باتیں بھی پائیں گے جس کا آپ نے اس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اس بارے میں میں کہہ بھی چکا تھا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش سے پاک صاف ہے ..... "

اس جملہ میں میر قوت علی صاحب سے مراد حضرت میرا می بلگرامی کے خلف میر قوت علی بلگرامی، شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ مرزا اوج لکھنوی (خلف میرزا دبیر) اور حضرت شاد اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں سے حضرت شاد نے اقرار کیا تھا کہ صفیر بلگرامی کی شاگردی سے ہمارا انحراف دراصل عالم شباب کا ایک شعبدہ تھا۔ یہی مطلب ہے اس فقرہ کا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش (یعنی کدورت و خیانت) سے پاک صاف ہے۔ حضرت شاد کا یہ خط ہم کو ۱۹۱۸ء میں آیا تھا۔ اس کے آٹھ سال بعد ہم ایک مرتبہ حضرت شاد کی زیارت کے لئے اُن کے درِ دولت پر حاضر ہوئے تو حضرت شاد نے اپنے صاحبزادے سید حسن خاں سے فرمایا کہ مطبوعہ اوراق جو اس کمرے میں رکھے ہیں ذرا وصی احمد کو دکھلا دو۔ وہ اوراق آئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک قطعہ میں حضرت شاد نے اپنے اُستادوں کو یاد کیا ہے اور اس فہرست میں صفیر بلگرامی بھی ہیں۔ مگر ایک بیت کے مصرع ثانی میں مطبوعہ الفاظ یہ ہیں:-

"........ صفیر اُستادِ فن بود"

اس فقرہ کا پڑھنا تھا کہ ہم کو حضرت ناسخ کا مصرع یاد آ گیا ؎ خط وہ لکھتا ہے پہ لکھنے نہیں دیتے ہیں رقیب | سب لیے

حضرت شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی کا اقرار کرنا چاہا بھی تو رقیبوں نے یہ ذلت گوارا نہ کی - اور ایک نقطہ سے اپنا کام نکال لیا - ہم نے حضرت شاد سے کہا کہ ذرا ان الفاظ کو ملاحظہ فرمایا جائے - حضرت نے چشمہ طلب فرمایا اور اُس بیت کو پڑھ کر فرمایا کہ یہ غلط ہے - الفاظ یہ تھے - "صفیر اُستاد من بود" ہم نے کہا کہ اپنے دست مبارک سے تصحیح فرما دی جائے تب حضرت نے قلم دوات منگا کر حاشیہ پر یہ ثبت فرمایا :- "ایں جا فن نیست - من است - السید علی محمد شاد"

حضرت شاد سے یہ دستاویز لیکر ہم اُسی وقت بانکی پور گئے - اور بھائی صاحب مدظلہ العالی حاجی سید عنایت احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ لیجئے حضرت شاد نے قرض بیباق کر دیا - بھائی صاحب مدظلہ العالی نے فرمایا کہ اس دستاویز کو خدا بخش خاں صاحب کے کتب خانہ میں رہنا چاہئے - ہم نے کہا کہ ضرور - چنانچہ دوسرے دن حضرت شاد کا وہ نوشتہ جناب مولوی ولی الدین خدا بخش خاں سکریٹری اورینٹل لائبریری بانکی پور کو سپرد کر دیا گیا -

(۲) "آپ پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی اس پر اصلاح ہے" یہ مرثیہ وہی ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے - حضرت شاد کا یہ سب سے پہلا مرثیہ ہے - اور اس پر صفیر بلگرامی اور مرزا دبیر کی اصلاحیں ہیں - حضرت شاد کو اس کی زیارت ستر برس کے بعد نصیب ہوئی - یعنی یہ خط پاکر ہم مرثیہ لئے ہوئے پٹنہ گئے اور حضرت شاد کو سپرد کر آئے - چند ماہ کے بعد دوبارہ پٹنہ گئے اور مرثیہ لے آئے - یہ تبرک ہمارے پاس اب تک محفوظ ہے -

(۲)

برخوردار نور چشم فضائل مآب سلمکم اللہ تعالیٰ -

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد مجھ کو زیر ناف سخت درد پیدا ہو گیا - رات تڑپ کر کٹی - تھوڑی دیر سے کچھ افاقہ ہے - جس میموریل کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے اُس کا ایک انگریزی مسودہ اور کچھ مضمون اس پر زیادہ کیا ہے - اردو میں وہ مضمون جاتا ہے - پوری امید ہے کہ آپ ان مضامین کو اپنے طور پر انگریزی میں لکھ دیجئے - اور صاف کرکے اس دوشنبہ کے قبل میرے پاس روانہ کر دیجئے - دوشنبہ کے دن کمشنر صاحب کو دکھا کر چھپوانے کا ارادہ ہے - اور اگر آپ کی عنایت ہو گی تو انشاء اللہ ۱۸ نومبر کو داخل کیا جائے گا ...... اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں ترقی عطا کرے - آمین!

رقیمتہ الدعا السید علی محمد شاد - ۱۷ نومبر ۱۸ء پٹنہ

(۳)

برخوردار نور چشم - بہتر از جان - طال عمرہ و اقبالہ -

بعد دعائے ترقی درجات کے واضح خدمت ہو - آپ جس دن سے مجھ کو دیکھ کر گئے ہیں میں سخت ضعیف و ناتواں ہو گیا ہوں - ظاہر از کام تھا - مگر تپاک قلب اور تبخیر نے ایسا پریشان کر دیا ہے کہ چار سطریں غور کرکے لکھنا محال ہے - وقت گزر جاتا ہے - اگر میں جلد مر گیا اور غالباً وہ وقت قریب ہے تو ان ننھے بچوں کا کوئی کفیل نظر نہیں آتا -

آخر دل اسقدر گھبرا گیا کہ بغیر ترتیب دئے اور صاف کئے موریل کے نوٹوں کو آپ کی خدمت میں بھیجنا پڑا۔ میرے عزیزوں اور شاگردوں کی تعداد سیکڑوں سے زیادہ ہے۔ مگر آج ایک بھی مددگار نظر نہیں آتا۔ خدا آپ کو ترقی عمر و اقبال دے محض آپ پر ہر قسم کا بھروسہ ہے۔

میں نے جب جب جس جس قدر نوٹ سکے ہیں سب کو بھیج دیتا ہوں۔ سب کو ملاحظہ کر کے مسودہ جلد درست فرمائیے اور لڈھم صاحب مارچ تک چلے جائیں گے۔ اس سے زیادہ آپ سے کیا گزارش کروں ...... اب آپ خود سمجھ لیجئے مجھ بوڑھے بیمار کو تکلیف نہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ تم کو سلامت رکھے۔ دعا گو السید علی محمد شاد - ۴ جنوری ۱۹سنہ ء

(۴)

برخوردار سعادت اطوار۔ والا دودمان سلمکم اللہ تعالیٰ

بعد سلام شوق و ترقی عمر و اقبال واضح خدمت ہو۔ چند روز ہوئے کہ میرے غمخوار دل نواز شفیق بے ریا مولوی بدر صاحب نے مشاعرہ کا اشتہار میرے پاس بھجوایا۔ اس کو دیکھ کر کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہو گئی۔ گھر بیٹھے کا ل گزر گئے کہ اس عارضہ قدیمہ یعنی وحشت و اختلاج قلب نے کیسی حالت بنا دی۔ اور راور باتیں ایک طرف۔ لکھنا پڑھنا۔ دروازہ سے باہر نکلنا سب چھوٹ گیا۔

علاوہ اس کے میں مدتوں سے ترک مشاعرہ کر چکا۔ نہ میں قابل مشاعرہ ہوں نہ مشاعروں کی حالت ایسی ہے کہ شرفا شریک ہونا گوارا کریں۔ مگر ساتھ اس کے اللہ اکبر آرہ! اور پھر مولوی صاحب سلمہٗ کا اس محبت سے بلانا۔ اور میرا نہ جانا بھی کچھ کم میرے لئے باعث صدمۂ عظیم نہیں ہے۔

آپ یہ ملاحظہ کریں کہ میرے پاس مدتوں سے ایک ٹوٹا پریس پڑا تھا۔ اس کی مرمت کر کے ڈپٹی صاحب کلکٹر سے اجازت مانگی۔ انھوں نے بلا ضمانت اجازت تو دی مگر یہ کہا کہ میں قانون سے مجبور ہوں۔ حسب قاعدہ ڈکلریشن کے لئے وہ آکر خود افیڈفٹ کر جائیں۔ مگر اس کمبخت عارضہ کے سبب سے میں جا ہی نہ سکا۔

یہاں ایک تاجر بڑے نامی ہیں۔ منت خاں۔ اُن کے بھتیجے چھنگے خاں نے سخت اصرار کر کے چاہا کہ اپنے خرچ سے کل میری تصانیف چھپوا دیں اور کوئی دقیقہ اصرار کا اٹھا نہ رکھا۔ میں نے مجبور ہو کر اقرار بھی کر لیا۔ پہلے انھوں نے یہ خبر نہیں دی تھی کہ کس مطبع میں چھاپیں گے لیکن چونکہ ان کے بہت روپے آرہ کے مطبع "۔۔۔" کے ذمہ باقی ہیں وہیں بات چیت طے کر لی تھی جب مجھ کو یہ معلوم ہوا۔۔۔۔۔۔ تو مجھ کو اُس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا — چھنگے خاں کو تو اپنے روپئے وصول کرنے تھے۔ خاموش ہو بیٹھے۔ اور مجھ سے بہت لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیوں ایسی کد ہے مجھ کو یہ بھی گوارا نہ ہو سکا کہ پرانا قصہ لے بیٹھوں۔ صرف یہی جواب دیا کہ وہ نہایت وعدہ خلاف شخص ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کوئی مفت چھاپے مگر میں وہاں ہرگز نہ چھپواؤں گا۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔

اب پھر مشاعرہ کا ذکر کرتا ہوں۔ چند دن سے میں جیسا ہوں اگر ایسا ہی رہا تو آنکھوں سے حاضر ہوں گا۔ اور اگر خدا ناکردہ دل قابو میں نہ رہا تو ریل پر دو گھنٹہ گھٹ کر رہنا ہی ستم ہے۔ ورنہ پٹنہ اور آرہ میرے لئے دونوں برابر ہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ بصورت حاضری میرے پڑھنے کے لئے ایک مجلس عزا کا ہونا ضرور ہے۔ پندرہ برس اُدھر اگر میں کسی جگہ مشاعرہ میں گیا ہوں تو پہلے ہی یہی پیغام کرلی ہے۔ اگرچہ اب میری حالت ایسی نہیں ہے کہ حسب خواہ مجلس پڑھ سکوں مگر اس کو سعادت اور برکت جانتا ہوں اور یہ کل آمد جب ہی باعث دلچسپی ہوں گے جب آپ آرہ میں تشریف رکھتے ہوں گے۔ ابھی تک میں نے مولوی بدر صاحب کو خط تک نہیں لکھا ہے۔ آپ کا خط پانے کے بعد البتہ جواب لکھوں گا۔ والسلام۔ دعاگوئے شما السید علی محمد شاد۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء پٹنہ سٹی

اس خط میں دو فقرے تشریح چاہتے ہیں مگر تشریح کا موقعہ نہیں :۔

(۱) "اللہ اکبر آرہ" اس فقرہ پر مولانا جامی علیہ الرحمہ کا ایک شعر بے اختیار یاد آگیا ؎

مرا کشتی و تکبیرے نگفتی — چہ سنگیں دل کسی۔ اللہ اکبر!

تو نے ہم کو ذبح کیا اور تکبیر تک نہ کہی۔ تو بھی کتنا سنگدل ہے۔ اللہ اکبر!

(۲) "مجھ کو اُس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا" نمک حرامی ایک شخص نے دراصل حضرت صفیر بلگرامی کے ساتھ کی تھی۔ اس لئے شاگرد کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ جس نے اُستاد کے ساتھ نمک حرامی کی اُس کے مطبع میں اپنا کلام طبع کرائے۔

(۵)

جان و دلِ شاد بقربان شما۔ ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا کہ آپ کا گرامی نامہ باعث قوت دل حسرت منزل ہوا تھا کتابوں کی نسبت کیا عرض کروں۔ ایک ہفتہ سے یہی ہو رہا ہے کہ کل چاروں کا ایک ایک جزو طیار ہو جائے گا۔ مگر کوئی نہ کوئی بکھیڑا نکل آتا ہے۔ شاید اب اتوار تک طیار ہو کر آپ پاس روانہ ہو جائے ..... بھائی! اس عمر اور دھڑکن اور ضعف نے مجھ کو مار ڈالا ہے۔ اس پر مسودہ دیکھنا۔ کاپی دیکھنا۔ پروف دیکھنا۔ اور پھر مختلف مضامین پر نظر رکھنا۔ خدا اہلِ علم و فن میں عزت رکھے ..... اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور درجۂ اعلیٰ پر پہونچائے کہ دیکھکر اور بھی دل خوش ہو۔ میں تو اسوقت بھی فخر کرتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ تمہارے پاؤں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگایا کروں۔ تمہارا خاکسار السید علی محمد شاد۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۰ء

اس خط میں چار کتابوں سے مراد ریاضِ عمر۔ چشم بصیرت۔ فکرِ بلیغ۔ اور آئینۂ انقلاب ہیں — ریاض عمر دیوانِ غزلیات۔ چشم بصیرت کلیات مولود و مراثی۔ فکرِ بلیغ تذکرہ مرثیہ گویاں۔ آئینۂ انقلاب تاریخ صوبہ بہار اشتہار کی سرخی یہ تھی ؎ آزمالیویں بھی اس گرتے ہوئے بازار کو — شاد دیکھو توڑ کر ان موتیوں کے ہار کو

موتیوں کے ہار توڑ کر اس طرح بکے کہ ایک ایک جز و چاروں کتابوں کے بیک وقت شائع ہوئے۔ افسوس کہ حضرت شاد کی مجبوریوں اور زمانہ کی ناقدری نے یہ سلسلہ بھی موقوف کر دیا۔ ورنہ ریاض عمر کا سرنامہ بالکل بجا و درست تھا۔ سرنامہ یہ تھا۔

تن دیدہ اند از من و جانم ندیدہ اند — نامم شنیدہ اند و نشانم ندیدہ اند
آنہا کہ آورند مرا در نظر حقیر — بر آستان میکدہ شانم ندیدہ اند
آناں کہ سرکشند ز نخوت بر آسماں — بیچارگاں بکوئے مغانم ندیدہ اند

حضرت شاد کا دیوان جو شائع ہوا ہے وہ بالکل ناقص ہے۔ یہی حال فکر بلیغ کے اس حصہ کا ہے جو رحلت حضرت شاد کے بعد شائع ہوا۔ مجروح کو ترکو دیکھنا ہو تو ان دونوں کتابوں کو دیکھئے۔

(۲)

نور چشم سراپا قابلیت۔ سراپا احسان۔ مولوی سید وصی احمد صاحب سلمہ عمرہ و اقبالہ۔ بعد سلام شوق و دعائے مخلصانہ ترقیات التماس یہ ہے کہ ہر چند آپ کو تکلیف دیتے ہوئے سخت حجاب آتا ہے۔ مگر الغرض مجنوں۔ کیا کروں؟

حالت یہ ہے کہ اس دفعہ حسب ایمائے سر فخر الدین صاحب ایک میموریل میں نے بہار گورنمنٹ میں دیا تھا۔ کمشنر نیا تھا۔ اس نے میرے بیان کی تحقیقات کی۔ کلکٹر نے سب ڈپٹی مجسٹریٹ کے پاس بھیجا۔ سب ڈپٹی مجسٹریٹ نے نہایت حسب خواہ رپورٹ کیا۔ مگر اتنا کہہ دیا کہ سات سو سالانہ جمعبندی کا ایک گاؤں بھی ہے جس کی آمدنی بسبب دفعہ ۱۴۴ اور اسامیوں کے جھگڑے کے چار برس سے بند ہے اور قرض سودی اس پر پانچ ہزار ہے۔ کلکٹر نے یہ رپورٹ دیکھا (ازبسکہ شریر النفس مشہور ہے) برخلاف لکھا۔ مگر پھر کمشنر نے اپنی رپورٹ میں سفارش لکھ دی۔ سر فخر الدین نے شاید اس انگریزی ممبر سے جو ایسے کاغذات دیکھتا ہے سفارش بھی کی۔ مگر اس کلکٹر نے بقول ان کے کچھ زبانی جا کر ایسا کہا کہ ناکامیابی ہوئی۔

بجز تحقیقاتی رپورٹ کے اور کاغذوں کی نقل آپ کی خدمت میں جا رہی ہے۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اگر کوئی صورت لڑکوں کے لئے وظیفہ کی نہ نکلی تو ان کی تعلیم دشوار ہے۔ سر فخر الدین نے کہا کہ اس دفعہ صرف لڑکوں کی تعلیم میں معقول مدد ملنے کی استدعا کیجئے۔ چونکہ اس کو ایجوکیشن سے تعلق ہے شاید حکم آخر کے لئے میرے پاس آئے گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا میموریل کس سے لکھوایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یاد آتا ہے کہ مولوی سید وصی احمد صاحب سے آپ نے ایک میموریل لکھوایا تھا۔ وہ سب سے بہتر تھا۔ انھیں سے لکھوائیے۔

میں نے اس پیری و نابینائی میں کئی مسودے کئے۔ پھر استخارہ کیا۔ تو واجب یہی آتا ہے کہ آپ لکھئے۔ اور ضرور لکھئے اور پھر ٹائپ کروا کر ہر طرح مرتب کر کے، جلد بھیج دیجئے۔ سر فخر الدین اوائل مئی میں رانچی چلے جائیں گے

سپردم بتو مایۂ خویش را

مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ میموریل بھی کمشنر کے ذریعہ سے جائے گا یا اور کسی راہ سے۔ بہر حال یہ کام آخر عمر کا جلد کر دیجئے

دست بستہ گزارش ہے کہ جلد مرتب کر دیجئے۔ اگر ضرورت لڑکوں کے نام کی ہو تو ذیل میں لکھتا ہوں :-

سید سلطان احمد خاں - عمر ۹ سال - جارج ام - ای - اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھتا ہے -

سید نقی احمد خاں - عمر ساڑھے سات .. ..

دعا گو السید علی محمد شاد - پٹنہ سٹی - ۲۳ اپریل ۲۶ء

اس خط میں سر فخر الدین کی زبانی جس موریل کا حوالہ ہے اُس میں ہم نے حضرت شاد کی طرف سے لکھا تھا کہ گورنمنٹ سال میں لاکھوں روپئے آثار قدیمہ پر صرف کرتی ہے، کیا تعجب ہے کہ گورنمنٹ نے آثار قدیمہ کی فہرست میں اب تک شاد عظیم آبادی کا نام درج نہیں کیا۔ یہ موریل پہونچا تو گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ حضرت شاد کے لئے عطا فرمایا۔ یہ وظیفہ نو سال تک جاری رہا۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں موقوف ہوا، جب حضرت شاد نے رحلت فرمائی، اور شمع شاعری ہمیشہ کے لئے خموش ہوگئی ؎

سکھی! اسنیو میری کہانی   میں تو بھئی ہوں برباد دیوانی

وصی احمد بلگرامی - بی - اے

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

چین وجاپان کی مخاصمت

چین کی مدافعانہ کارروائی

گزشتہ مضمون میں میں بیان کر چکا ہوں کہ جاپان آہستہ آہستہ اپنے قدم منچوریا میں مستحکم کر رہا ہے۔ لیکن اُدھر قومیت پسند چینیوں نے بھی ایک پروگرام بنایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ منچوریا کو تمام خارجی موثرات سے پاک وصاف کر دیا جائے۔ اُن کا یہ پروگرام پہلے تو صرف انگریزوں کے خلاف بنایا گیا تھا لیکن بعد میں جاپانیوں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ اس مقصد کے لئے اُن کے دو ہتھیار اقتصادی مقاطعہ اور عالمگیر پروپگنڈا ہیں اور وہ اپنی رہنمائی کے لئے زیادہ تر روسیوں کے مرہونِ منت ہیں۔ پہلے تو حکومتِ جاپان نے چاہا کہ صلح وصفائی سے معاملہ کا تصفیہ کر لیا جائے۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ حالات کسی طرح درست نہیں ہوتے تو اُس نے نوٹس دیدیا کہ اگر چینی اپنی حرکات سے باز نہ آئے گا تو وہ جارحانہ اقدام کرے گا۔ چین کا خیال تھا کہ "اقتصادی مقاطعہ" اُس کے پاس ایسا ہتھیار ہے جس کے رعب سے جاپان اپنے تمام حقوق چھوڑنے پر تیار ہو جائے گا لیکن اُس کو خیال نہ رہا کہ جاپان میں ایک ایسی پارٹی بھی موجود ہے جو اپنے اقتصادی اقتدار کو سیاسی مفاد کی خاطر قربان کر سکتی ہے۔ چیف منچوریا کے چینی ڈکٹیٹر کا خیال تھا کہ اگر مکڈن کے مقام پر ایک بارودخانہ بنا لیا جائے تو صرف دو لاکھ آدمیوں کی امداد سے جاپان کو منچوریا کے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُسوقت منچوریا میں جاپان کی فوج صرف گیارہ ہزار تھی۔ لیکن ۱۸۹۴ء کی طرح ۱۹۳۱ء میں بھی چینیوں کی تجاویز کاغذی پیراہن سے باہر نہ نکل سکیں اور جاپان نے اس دفعہ بھی ابتدا کی۔ جاپان کی بے چینی اس وجہ سے بھی بڑھ گئی کہ ۱۹۲۹ء میں چینی فوجوں نے مشرقی چینی ریلوے کو اپنے قبضہ میں کر لیا جس کو بچانے کے لئے روسی فوج کو مداخلت کرنی پڑی۔ اُسوقت تو معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن اُس کے بعد روس وچین کے درمیان سیاسی گفت وشنید شروع ہوئی جو دسمبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہی۔ قدرتی طور پر اس سے جاپان کو خطرہ پیدا ہوا اور وہ منچوریا میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ متفکر نظر آنے لگا۔

ریل گاڑیوں کے جھگڑے

چین اور جاپان کی باہمی مخاصمت ۱۹۳۱ء کا سبب زیادہ تر وہ ریل گاڑیاں ہیں جو کوریا اور منچوریا وغیرہ میں موجود ہیں۔ دونوں حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ یہ

ریل گاڑیاں کلی طور پر اُن کے قبضہ میں آجائیں تاکہ سیاسی اور اقتصادی طور پر اُن کا اقتدار ہو جائے۔ معاہدات ۱۹۱۵ء کی رو سے علاقہ کوان ٹنگ کے ٹھیکہ کی توسیع ۱۹۹۰ء تک جنوبی منچورین ریلوے کی ۲۰۰۲ء تک اور این ٹنگ مکڈن ریلوے کی ۲۰۰۳ء تک کردی گئی تھی لیکن چینیوں کا خیال ہے کہ یہ معاہدے بالکل ناجائز تھے کیونکہ ان کی اجازت نہ تو پارلیمنٹ چین سے لی گئی اور نہ یہ طرفین کی رضامندی سے معرضِ عمل میں آئے۔ گر جاپان ان دونوں دلائل کی تردید اس طرح کرتا ہے کہ بین الاقوامی قانون کی رو سے ایسا معاہدہ جو دھمکی سے کسی حکومت کے ساتھ کیا جائے، بالکل جائز ہے۔ اگر تمام معاہدات سیاسی گفت و شنید ہی کے ذریعہ سے طے پائیں تو شاید کوئی معاہدہ بھی جایز نہ ہو۔

پھر بعض ریلیں منچوریا میں ایسی ہیں جو بنائی تو جاپانیوں نے اپنے خرچ پر ہیں لیکن اُن کا نظم و نسق اب تمام چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جاپانیوں کی شکایت ہے کہ چینیوں نے وہ روپیہ واپس نہیں کیا جو ریلوے لائنوں کے بنانے میں صرف ہوا اور اس لئے وہ اُن کے انتظام میں رخنہ ڈالتے ہیں۔

پھر چینیوں نے بعض اپنی ریلوے لائنیں بھی بنائی ہیں جو ساؤتھ منچورین ریلوے اور اُس کی شاخوں کا براہِ راست مقابلہ کرتی ہیں۔ اگر یہ اسکیم پوری طرح مکمل ہو جائے تو جاپانی ریلوں کی تجارت چینی ریلوں کی طرف منتقل ہو جائیگی اور اس کا اثر بند۔گاہ ڈیرن کی تجارت پر بھی پڑے گا۔ جاپان نے اس اسکیم کے خلاف متواتر آواز اُٹھائی لیکن بے اثر رہی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو ساؤتھ منچورین ریلوے پر ایک بم پھینکا گیا۔ جس کو چین وجاپان کی باہمی آویزش کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ اُسی طرح ہے جس طرح آرک ڈیوک فرڈیننڈ کے قتل کو جنگ عظیم کی بنیاد کہا جائے۔ دراصل اس مخاصمت کی اصل وجہ وہی ریلوں کا جھگڑا ہے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اور منچورین لاین پر بم نہ بھی پھینکا جاتا تو کوئی اور حادثہ یہ فتنہ اُٹھانے کے لئے کافی تھا۔

لیگ آف نیشنز کی مداخلت

ان حالات کی وجہ سے جمعیت الاقوام کی مداخلت ضروری ہو گئی اور اُسنے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا جس کو لٹن کمشن کہتے ہیں۔ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں جاپان کی کارروائی سراسر جارحانہ تھی اور اس لئے جاپان کو لازم ہے کہ وہ اپنی فوجیں منچوریا سے سوائے ریلوے کے علاقہ کے فوراً ہٹالے اور نیز قرار دیا کہ منچوکو جو چین کے خلاف منچوریا میں ایک ریاست بن گئی تھی۔ محض جاپانی فوج کی "ساختہ کٹ پتلی" ہے اور اس لئے اُس کو کوئی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ امریکہ متحدہ نے جو لیگ کا ممبر نہیں ہے، اس رپورٹ کی حمایت کی۔ لیکن اس کے برخلاف جاپانیوں کا تنازعہ تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے کیا صرف مدافعت کی بنا پر تھا اور اس لئے اُنھوں نے معاہدہ لیگ یا عہدنامۂ پیرس کی

خلاف ورزی نہیں کی۔ اُن کا یہ بھی اصرار تھا کہ منچوکو باشندگان منچوریا کی اپنی تحریک آزادی کے ماتحت مترتب ہوئی ہے اس لئے اُسے حکومتِ جاپان کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پھر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جاپان نے چین کے سیاسی وقار کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ صرف اُن حالات کی طرف توجہ کی ہے جو منچوریا کے بعض اشرار نے پیدا کر دئے تھے۔ ہر چند یہ سچ ہے کہ منچوکو بغیر جاپانی افواج کی امداد کے معرضِ ظہور میں نہیں آسکتی تھی مگر یہ بھی غلط نہیں کہ منچوریا کے اکثر لوگ جو چینی رؤسا کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے جاپان کے طرفدار تھے۔ جب جمعیت اقوام نے جاپان کی دلائل کی کوئی پرواہ نہ کی تو وہ اُس سے مستعفی ہو گیا۔

اس عرصہ میں جاپانیوں نے مخالفین منچوکو کی کئی فوجوں کو پسپا کیا اور جھول کے علاقہ کو فتح کر لیا اور بالآخر چینیوں کو ایک عارضی صلحنامہ کرنا پڑا۔ اب جاپان اپنے نئے علاقہ کو فروغ دے رہا ہے اُس نے وہاں کی ریلوں کا نظم و نسق درست کیا ہے۔ منچوریا کے مالیات کو سنبھالا ہے اور رہزنوں کے پے در پے حملوں کا خاطر خواہ بند و بست کیا ہے۔

روس کا رویہ

۱۹۳۱ء سے روس کے رویّہ کے متعلق بہت کچھ قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ مشرقی چینی ریلوے اور ولاڈی وو سٹک وغیرہ کو خطرہ میں دیکھ کر جاپانیوں کا شمالی منچوریا پر قبضہ برداشت نہیں کرے گا مگر حیرت ہے کہ وہ اب تک خاموش رہا بلکہ اُس نے منچوکو کی حیثیت کو بھی تسلیم کر لیا اور مشرقی چینی ریلوے میں اپنے بہت سے حقوق سے بھی دستبردار ہو گیا ہے۔ اس کے اسباب غالباً یہ معلوم ہوتے ہیں کہ روس کو اپنی اندرونی مشکلات اسقدر درپیش تھیں کہ وہ کوئی عملی کارروائی کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ دوسرے اُس کا خیال ہے کہ اگر "سرمایہ دار حکومتوں" میں لڑائی شروع ہو جائے تو سویٹ یا کمیونزم کو بالآخر فائدہ ہوگا۔ بدقسمتی سے اس اندازہ کے درست ثابت ہونے کا احتمال بھی ہے کیونکہ اگر لیگ جاپان کے خلاف اقتصادی مقاطعہ کا اعلان کر دے تو قدرتی طور پر وہ اس کا مقابلہ چین کے خلاف بحری رکاوٹوں سے کرے گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہوگا۔ امریکہ اور جاپان کے تعلقات پہلے ہی بگڑ رہے ہیں کیونکہ امریکہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ "کھلے دروازے" کی پالیسی کے سوا کچھ برداشت نہیں کرے گا نیز اُس نے جاپان کو تنبہ کیا کہ معاہدۂ واشنگٹن کی رو سے وہ بحرالکاہل میں ایک خاص نسبت سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا۔

مشرقِ اقصیٰ کی نازک حالت

الغرض جاپان کو نہ صرف چین اور منچوریا کے مسائل درپیش ہیں بلکہ اُسے بحری طاقت کا سوال بھی حل کرنا ہے اور اسی وجہ سے جاپان کی حالت نازک ہو رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو سال کے بعد جب لیگ سے جاپان کی علحدگی قانونی طور پر پختہ ہو جائے گی تو بحرالکاہل کے جزائر جن پر آج کل فوجی اقتدار ہے کسی اور حکومت کے سپرد کر دئے جائیں گے۔

لیکن جاپان اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ ان جزائر کو سنہ ۱۹۱۷ء کے عہدنامہ کی روسے اپنے اقتدار میں رکھ سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں اُس نے وہاں اپنے ارادوں کی مضبوطی دکھانے کے لئے فوجی نمائش بھی کی۔ اور پھر جنیوا کو ایک نوٹس بھی بھیجا کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب "بحری عہدنامۂ لندن" ختم ہو گا تو وہ اپنی بحری فوج زیادہ کر دے گا بلکہ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ برطانیہ عظمیٰ اور ریاستہائے متحدہ کے مقابلہ میں اپنی بحری فوج کو اُن کے برابر کر لے۔ اس اثنا میں اُس نے باوجود اقتصادی اور مالی مشکلات کے بحری اور فوجی اخراجات بھی زیادہ کر دئے ہیں۔ پریزیڈنٹ امریکہ ابھی اپنے اقتصادی بہتری کے پروگرام میں مصروف ہے اس لئے اُس نے مشرق اقصیٰ میں اپنی پالیسی کے متعلق کچھ اعلان نہیں کیا۔ مگر یہ کہہ دیا تھا کہ امریکہ کا بحری بیڑہ عہدنامہ کی مقررہ نسبت تک پورے طور پر بڑھا دیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جو صورت حال مشرق اقصیٰ میں اسوقت پیدا ہو رہی ہے اُس کے شگون اچھے نہیں ہیں۔ اور اگر حالات یہی رہے یعنی لیگ منچوکو کو حیثیت دینے سے انکار کرتی رہی اور جاپان منچوکو کی حمایت کرتا رہا۔ یا اگر بحری طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف مسلح ہوتی رہیں تو ایک خطرناک جنگ کا روکنا سخت دشوار ہو جائے گا۔ ظرفیہ کہ اس جنگ سے بین الاقوامی کسی طاقت کو فائدہ نہیں ہو گا بلکہ اگر ہو گا تو صرف سویٹ روس کو۔

عبدالرحیم شبلی

نگار کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو درج کی جاتی ہیں:۔
(سنہ ۲۲ء) ستمبر و اکتوبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۲۳ء) مئی ۴ر — (سنہ ۲۴ء) جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی،
اگست ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۲۷ء) اپریل، مئی، جون ۴ر فی پرچہ
(سنہ ۳۰ء) مئی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۱ء) مارچ، جولائی، اگست ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری،
جولائی، اکتوبر، دسمبر ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، اکتوبر ۶ر فی پرچہ
(سنہ ۳۵ء) فروری، مئی، جون، جولائی، اگست دسمبر ۸ر فی پرچہ —
سنہ ۳۲ء جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ

مینجر نگار۔ لکھنؤ

بیوہ اور اُس کا اِکلوتا بیٹا

ایک انگریزی آبادی میں اتوار کے دن کے سکون آمیز تعطل و خموشی کو اُن لوگوں نے ضرور محسوس کیا ہوگا جو اپنے گرد وپیش کے حالات و واقعات کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے عادی ہیں، کارخانوں و فیکٹریوں کا شور و ہنگامہ چکیوں کی پُر شور مسلسل آواز، لوہار کے ہتھوڑے کی کرخت کھٹ کھٹ، کسانوں کا مست و بیخود کرنے والا ترنم، بیل گاڑی کے چلنے کی لامتناہی "رٹ رٹ" اور اسی قسم کی اور دوسری آوازیں جن کا تعلق دیہقانی زندگی یا کاشت و مزدوری سے ہے بالکل غائب ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کھیتوں کے رکھوالے کتّے بھی نسبتاً کم بھونکتے ہیں کیونکہ مسافروں کی چہل پہل اُن کے آرام میں مخل نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر میں نے ہواؤں تک کو خاموش محسوس کیا ہے اور اُس نورانی فضا کو جس کی تازہ و شاداب سبزی آہستہ آہستہ نیلگوں دھندلکے میں تحلیل ہوجاتی ہے، ایسے موقعہ پر غایت درجہ سکون آفریں پایا ہے۔

دراصل نہایت مبارک تھا یہ فیصلہ کہ عبادت کا دن تعطیل کا دن بھی ہونا چاہیے، وہ پاک و مقدس سکون جو اتوار کے دن تمام فضا پر محیط ہوتا ہے اپنا ایک مخصوص اخلاقی و روحانی اثر رکھتا ہے۔ ہماری ہر بے چین آرزو مسرت و سکون میں تبدیل ہوجاتی ہے اور ہم اپنے قلب و روح پر ایک خاص قسم کے فطری مذہب کا اثر محسوس کرتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جو احساسات لطیف مجھ پر گاؤں کے ایک گرجا میں جہاں حسین فطرت اپنا آغوش وا کئے تمام فضا کو ایک مستقل سکون میں تبدیل کردیتی ہے، طاری ہوتے ہیں کسی دوسری جگہ نہیں ہوتے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتوار کے دن اگر میں زیادہ مذہبی نہیں ہوجاتا تو کم از کم اور دوسرے دنوں کے مقابلہ میں ایک بہتر انسان ضرور بن جاتا ہوں۔

حال ہی میں جبکہ میں گاؤں کی پُرلطف زندگی بسر کر رہا تھا، میں اکثر ایک قدیم گرجا میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ گرجا کے تنگ و تاریک بغلی راستوں اور اُس کی شکستہ دیواروں پر دھندلے نقش و نگار نے گرجا کی ہر شے میں ایک ایسی تقدس آمیز بزرگی پیدا کردی تھی لیکن چونکہ یہ عمارت ایسے پڑوس میں واقع ہوئی تھی جہاں ریاست و امارت اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر تھی، اس لئے تصنع اور شانِ امارت اس عبادت گاہ کے ذرے ذرے میں سرایت کرگئی تھی۔ بلکہ جب کبھی میری نظر عبادت گزاروں کے مجمع پر پڑتی اور اُن کے بے جا تصنع اور تزئین کا خیال آتا تو

دیر تک دنیا اور متعلقاتِ دنیا میری نظروں کے سامنے چکر لگاتے رہتے۔ گرجا کے اس تمام اجتماع میں اگر کوئی ذات تھی جو ایک سچے عیسائی کی طرح اس روحانی تقدس کو محسوس کرتی نظر آتی تھی تو وہ ایک بڑھیا کی ذات تھی جس کی کمر ضعف و ناتوانی سے قریب قریب دوہری ہو گئی تھی۔ بلاشبہ بڑھیا غریب تھی لیکن اس کے چہرہ میں ایک عجیب طرح کی بے فکری تھی، ایک خاص قسم کا استغنا تھا۔ اس کے سراپا میں ایک انوکھی کشش تھی اور وہ عہدِ رفتہ کے جاہ و جلال کے نہ مٹنے والے کچھ نقوش اب بھی اپنے اندر رکھتی تھی، اس میں ایک ادا تھی، پُر وقار۔ ایک کشش تھی، جاذبِ نظر۔ اور ایک خودداری تھی، قابلِ پرستش۔ اُس کا لباس اگرچہ معمولی تھا لیکن تھا صاف ستھرا۔ اس کے علاوہ گاؤں میں وہ ایک خاص عزت کی مستحق بھی سمجھی جاتی تھی کیونکہ گرجا میں اُس کی نشست عام لوگوں کی صف کے بجائے، قربان گاہ کے نزدیک، سب سے الگ تھی۔ اُس کے سراپا سے ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا میں اب اس کے لئے کوئی آرزو باقی نہیں ہے بجز ایک بہشت کی آرزو کے جب میں نے اس کو طاعت و بندگی کے لئے کھڑے ہوتے، جھکتے اور کتابِ مقدس کے صفحات کی ہر ہر سطر کو بغیر چھوئے بغیر دیکھے اس طرح پڑھتے دیکھا، گویا کہ وہ اس کو بالکل حفظ تھا۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس غریب بڑھیا کی آہ از راہب کی دعا اور گرجا کے نغمات بندگی سے بہت پہلے بارگاہ ایزدی میں پہونچ جاتی ہے۔

مجھے گاؤں کے گرجاؤں میں حاضر ہونے کا بہت شوق ہے اور یہ گرجا کچھ ایسی جگہ واقع ہوا تھا کہ اس نے اکثر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، گرجا ایک چٹان کی چوٹی پر واقع تھا جس کے دامن کو ایک مختصر ندی چھوتی ہوئی ایک سرسبز و شاداب وادی کی طرف چلی جاتی تھی۔ شاہ بلوط کے درخت جو گرجا کے ہم عمر نظر آتے تھے چاروں طرف سے اس کا احاطہ کئے تھے۔ اور گرجا کا بلند گنبد جو گوتھک فنِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ تھا، درختوں کے کنج سے آسمانی فضا کو چھوتا ہوا زاغ و زغن کے لئے ہوائی طواف کا کام دیتا تھا۔ ایک نورانی صبح میں وہاں بیٹھا ہوا دو مزدوروں کو جو ایک قبر کھودنے میں مشغول تھے، دیکھ رہا تھا۔ قبر کے لئے گرجا کے ایک دور افتادہ بیکار گوشہ کا انتخاب کیا گیا تھا جہاں لاتعداد قبروں کی موجودگی اس امر کا اظہار کر رہی تھی کہ محض لاوارث و غریب ہی اس جگہ سپردِ خاک کئے جاتے ہونگے مجھے بتایا گیا کہ یہ نئی قبر ایک غریب بیوہ کے اکلوتے بیٹے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس حالت میں جبکہ میں اس دنیا میں فرقِ مراتب کے لغو امتیازات پر غور کر رہا تھا، جن کی حکومت نہ صرف حیاتِ دنیا بلکہ خاک کے اس آخری مرکز تک وسیع تھی، گرجا کے گھنٹے کی آواز نے کسی جنازہ کی آمد کا اعلان کیا۔ یہ تجہیز و تکفین غربت و ناداری کی تجہیز و تکفین تھی جس میں امارت کو قطعاً دخل نہ تھا۔ ایک سادہ تابوت کو جس پر کوئی چادر بھی نہ تھی چند دہقانی لئے ہوئے تھے۔ آگے آگے پادری انتہائی بے پروائی کے ساتھ جا رہا تھا۔ عام دستور کے مطابق نوحہ گروں کی بھی کوئی جماعت ساتھ نہ تھی، لیکن ایک حقیقی نوحہ گر، ایک سچا سوگوار ضرور موجود تھا جو جنازے کے پیچھے پیچھے تھا۔

سیڑھیوں پر بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ وہی غریب بیوہ جس کو میں قربان گاہ کی یہ مرنے والے کی بڑھیا ماں تھی ——— اس کی ایک غریب پڑوسن اس کو سہارا دئے ہوئے تھی اور اپنے طور پر صبر و شکر کی تلقین کر کرکے اس کی غمگساری کررہی تھی، کچھ ہمسائے شریک جنازہ تھے اور ان کے بچے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ تھے جو کبھی تو اپنے بے خبر جوش مسرت میں چیخنے لگتے تھے، اور کبھی رُک رُک کر ایک انداز معصومانہ کے ساتھ نوحہ گر کے حزن و ملال کو بغور دیکھنے لگتے تھے، جونہی جنازہ قبر کے نزدیک پہونچا گرجا کا راہب اپنے مخصوص لباس سے آراستہ ہوکر، دعا کی کتاب ہاتھ میں لئے، گرجا سے نکلا۔ رسم دعا کی ادائی کے لئے کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔ کیونکہ مرنے والا خود صاحب مقدرت نہ تھا اور اس کے پس ماندہ بیحد مفلس و نادار، اس لئے رسمی طور پر دعا تو ضرور کی گئی لیکن نہایت بے پروائی سے۔ بحیم و تحیم راہب گرجا کے دروازہ سے صرف چند قدم ہی آگے بڑھا تھا۔ اس کی آواز مشکل ہی سے قبر تک پہونچی تھی، اور اس کا اس دعائے آخری کی رسم کو ادا کرنا جس سے زیادہ اثر انگیز اور دل دوز رسم شاید ہی کوئی اور ہو ——— یہ معلوم ہوتا تھا کہ چند نہایت ہی سرد و بے اثر الفاظ کو دعا کے طور پر پڑھ دیا گیا ہے۔ میں نے کبھی دعائے آخری کو اس درجہ سرد و بے اثر محسوس نہیں کیا۔

میں قبر کے نزدیک پہونچا۔ تابوت زمین پر رکھ دیا گیا۔ اس پر مرحوم کا نام اور اس کی عمر کندہ تھی ———

"جارج سامر نام عمر ۲۶ سال ———"

غریب ماں کسی کا سہارا لیکر تابوت کی طرف جھکی۔ اس کے مضمحل ہاتھ ایک دوسرے سے ملے جیسے کہ وہ دعا کرنے کو ہو، لیکن اس کے جسم سے ہلکے سے ارتعاش اور اس کے لبوں کی جنبش سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ اُن تمام جذبات شفقت و محبت کو جو اس دنیا میں صرف ایک ماں ہی کا حصہ ہو سکتے ہیں، لئے ہوئے اسوقت اپنے لخت جگر کے آخری دیدار میں مصروف تھی

تابوت کو سپرد خاک کرنے کے لئے تمام سامان طیار ہو چکے ہیں اور اب اس آخری طیاری کی وہ اوسان خطا کردینے والی آواز جو جذبات محبت و غم کے لئے حد درجہ صبر آزما ہوتی ہے، پیدا ہوئی۔ ہدایات کا وہ سلسلہ جو خشک و دل سوز کاروباری انداز میں ادا کیا جاتا ہے، شروع ہوا۔ آہ! ایسے موقعوں پر کھدال و پھاوڑہ کا قبر کی ریگ اور پتھر سے رگڑ رگڑ کر مختلف آوازیں پیدا کرنا دنیا میں سب سے زیادہ دل دوز منظر ہوتا ہے۔ اور پھر ان آوازوں کا ایک ایسی قبر سے پیدا ہونا جس میں سونے والا ہمارا عزیز ترین محبوب، ہمارا قریب ترین عزیز ہو، اور بھی روح فرسا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ دردانگیز منظر شاید ہی کوئی اور ہو۔

چاروں طرف کے شور و ہنگامہ سے بڑھیا اس طرح چونکی گویا کہ وہ کوئی نہایت ہی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنی نیم بیدار آنکھیں اوپر اُٹھائیں اور کچھ وحشیانہ انداز میں اپنے گرد و پیش جائزہ لیا۔ اور

ادھر لوگوں نے تابوت قبر میں اُتارنا شروع کیا، اُدھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ملے اور رنج سے بے قابو ہو کر فرش زمین پر گر گئی۔ اُس کی پڑوسن نے جو اس کی تنہا ہمدرد و غمگسار تھی سہارا دیکر اس کو زمین سے اُٹھایا اور کچھ تسکین آمیز الفاظ کہے:- "نابہن، نا! اپنے تئیں یوں مارے ڈالتی ہو" لیکن جواب میں اس نے صرف سر ہلادیا اور ہاتھ ملتی رہی گویا کہ تسکین غم اب اُس کی قسمت میں تھا ہی نہیں۔ لوگ تابوت قبر میں اُتار رہے تھے اور اُن کے اس عمل سے جو حرکت پیدا ہوتی تھی وہ اُس کے اضطراب اور بے چینی میں ایک اور وحشتناک اضافہ کا باعث تھی، یہی نہیں بلکہ جب کسی اتفاقی حادثہ کے باعث تابوت کو کوئی صدمہ پہونچتا تو اسکے مادرانہ جذبات کو ایک ٹھیس سی لگتی، وہ فرطِ غم سے تڑپنے لگتی اور ایک ایسا کرب محسوس کرتی گویا کہ اس کے بچے کو جواب تمام دنیوی رنج و غم کی دستبرد سے بلند ہوچکا تھا، واقعی ضرب پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ میں اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ میرا کلیجہ منھ کو آنے لگا۔ اور میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہاں کھڑا ہونے اور مادرانہ شفقت کے اس دردانگیز منظر کو دیکھنے میں اپنی انتہائی بربریت کا مظاہرہ کررہا ہوں۔ میں گرجا کے ایک دوسرے گوشہ میں چلا گیا اور وہیں رہا اُس وقت تک کہ اہلِ جنازہ کی یہ جماعت یہاں سے رخصت نہ ہوگئی۔

میں نے جب ماں کو انتہائی حزن و ملال کے عالم میں آہستہ آہستہ قبر سے رخصت ہوتے اور اُس شخص کے تمام آثار کو جو دنیا میں اس کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھا پیچھے چھوڑتا ہوا دیکھا تو میرا دل اس کے لئے تڑپنے لگا۔

مجھے خیال آیا کہ دولتمندوں کے لئے تکلیف و ایذا اور مصیبت و غم کیا معنیٰ رکھتے ہیں جبکہ اُنکو تسکین غم کے لئے احباب و اعزہ کا ایک حلقہ اور سکون اضطراب کے لئے ہر قسم کا سامانِ عیش و مسرت میسر ہے، وہ اگر دل بہلانا چاہیں تو ایک دنیا حاضر اور غم غلط کرنا چاہیں تو ایک جہان موجود۔ نوجوانوں کے لئے سوگ و ماتم کا کیا مفہوم ہے جبکہ اُن کی نوخیزی عمر ہر زخم کے درد کو ان کے دل سے محو کردیتی ہے، اُن کی روحانی لچک ہر غم تازہ کی یاد اُن کے دل سے بھلا دیتی ہے اور جبکہ ان کا روحانی تلطف بہت جلد اپنے لئے ایک نیا مرکزِ لطف تلاش کرلیتا ہے۔ لیکن ایک غریب کے رنج و ماتم کو دیکھو جس کے پاس تسکین غم کے لئے کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ ایک بڑھیا کے رنج و غم پر نظر ڈالو جس کے نزدیک زندگی کا مفہوم ایک سرد و خشک دن سے زیادہ نہ ہو، اور جو اپنے لئے کسی آیندہ امید کی توقع نہ رکھتی ہو۔ ہاں! ایک بیکس بیوہ کے غم و اندوہ پر اپنا دل دکھاؤ، جو اپنے اکلوتے بیٹے کی قبر پر ——— جس کے دم سے اس کی زندگی کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں، جو اسکی زندگی کا آخری سہارا، آخری تسکین اور آخری اُمید تھا ——— آنسوؤں کی آخری نذر چڑھا رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے

کہ اسی قسم کے سوگ کو دیکھ کر ہمیں صبر و تسکین کی بے چارگی کا قایل ہونا پڑتا ہے۔

گرجا سے واپس ہونے کے کچھ دیر بعد مجھے وہ عورت ملی جو اس غریب بیوہ کی پڑوسن اور تنہا غمگسار تھی۔ میں نے اس دل دوز واقعہ کے متعلق کچھ مزید تفصیلات اُس سے حاصل کیں۔

مرنے والے کے والدین ایک زمانۂ نامعلوم سے اس گاؤں میں آباد تھے۔ ایک صاف ستھرے مکان میں رہتے اور کچھ مزدوری اور کچھ باغ کی آمدنی سے اپنی گزر کر لیا کرتے تھے۔ اُن کی زندگی بے فکری سے گزرتی تھی گاؤں میں انھوں نے کبھی کسی کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اُن کے ایک بیٹا تھا جو جوان تھا اور اُن کے بڑھاپے کا تنہا سہارا۔

"ہاں صاحب!" اُس خاتون نے کہا: "میں بیان نہیں کر سکتی مرحوم کن خوبیوں کا آدمی تھا۔ وہ اُس کا حسن و شباب، وہ اس کے اخلاق و عادات، اور وہ اس کی سعادت مندی اور اطاعت گزاری ـــ حقیقت یہ ہے کہ وہ اخلاق و شرافت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اتوار کے دن خصوصیت سے اس کو دیکھ لینا مزید مسرت کا باعث ہوتا تھا جبکہ وہ اپنا بہترین لباس زیب تن کئے، تندرست و توانا، خوش و خرم، ایک انداز خاص کے ساتھ اپنی بڑھیا ماں کو گرجا پہونچانے جاتا۔ اُس کی بڑھیا ماں بھی اس پر فخر کرتی تھی کیونکہ پورے گاؤں میں شاید ہی کوئی لڑکا ایسا سعادتمند، اور ان خوبیوں کا حامل موجود ہو۔

بدقسمتی سے ایک سال نہایت سخت قحط پڑا اور ضعیف والدین کے اس اکلوتے بیٹے کو بھی گاؤں چھوڑنا پڑا اُس نے ایک کارخانے میں جو قریب ہی ایک دریا پر واقع تھا۔ ملازمت اختیار کر لی۔ اس نئی ملازمت کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ ایک جبریہ بھرتی کرنے والی جماعت کے جال میں پھنس گیا اور اس طرح جبری فوج میں داخل ہو گیا۔ والدین کو اس کی اچانک گرفتاری کی خبر تو پہونچی لیکن اس کے بعد کوئی اطلاع نہیں ملی اور اس طرح یہ غریب والدین اپنے اس آخری سہارے سے بھی محروم ہو گئے۔ اُس کا باپ ہمیشہ کا ضعیف و ناتواں تھا اس صدمہ نے اس کا دل توڑ دیا۔ وہ کچھ نیم دیوانہ سا ہو گیا اور آخر آغوش لحد میں جا سویا۔ بیوہ اب لاوارث و تنہا رہ گئی تھی یہاں تک مجبوری بڑھی کہ روٹیوں سے محتاج ہو گئی اور آخرکار اس کو گرجا کے خیراتی ٹکڑوں کا سہارا لینا پڑا۔ گاؤں کے لوگوں کی ہمدردی اب بھی اس کو حاصل تھی۔ اب بھی اس کو گاؤں کا ایک قدیم باشندہ ہونے کی حیثیت سے خاص عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ اس کا قیام ابھی اپنے قدیم مکان ہی میں تھا جہاں وہ اپنی خاموش زندگی گزار رہی تھی اُس کی محدود ضروریات زندگی کے لئے باغیچہ کی مختصر پیداوار ـــ جہاں گاؤں کے نیک باشندے کبھی کبھی بطور ہمدردی اُس کی خاطر کاشت کر دیا کرتے تھے ـــ کافی ہوتی تھی۔"

اس واقعہ کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا - بلکہ اس کے کچھ ہی دن پہلے کہ مجھے اس افسانے کی تفصیلات حاصل ہوئیں، سنا گیا ہے کہ بڑھیا ایک روز اپنے باغیچہ میں کچھ ترکاری چُن رہی تھی کہ یکایک مکان کا دروازہ کھلا - اور ایک اجنبی سامنے سے آیا - وہ گرد وپیش پر نہایت دہشتناک انداز میں متجسسانہ نظریں ڈالنے لگا - وہ جہازیوں کے لباس میں تھا - دبلا پتلا - چھریرے بدن کا آدمی، چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی ـــ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بیمار ہے اور مصیبت کا مارا ہوا ہے - غرض اس زندہ کی حالت مردوں سے بدتر تھی - اس نے بڑھیا کو دیکھا - اس کی طرف بڑھا اس کے قدم مشکل سے اُٹھتے تھے اور اُٹھتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے - وہ بڑھیا کے قدموں پر جھک گیا اور بچوں کی طرح آنسو بہانے لگا - بڑھیا حیران تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی -

"میری پیاری ماں! کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں، کیا تم اپنے لڑکے، اپنے بدبخت لڑکے جارج کو بھول گئیں"

ہاں! اسی بدبخت لڑکے کی یہ "زندہ لاش" تھی، اُسی کم نصیب کے یہ شکستہ آثار تھے جو کبھی اُسکی آنکھوں کا تارہ، شکستہ اُمیدوں کا سہارا تھا اور جس نے اب پھر دنیا میں ٹھوکریں کھا کر، قید وبند کی مصیبت کاٹ کر، زخموں سے چور، درد سے رنجور، گھر کا رخ کیا تھا تاکہ اپنی شکستہ روح کو پھر اُسی گھر کے متعارف ماحول میں آسودہ کر سکے

میں اس اچانک ملاقات، اس درد انگیز واپسی کی تمام تفصیلات کو جس میں حسرت و یاس اور مسرت و انبساط کا ایک عجیب وغریب امتزاج مہیا تھا بیان نہیں کروں گا - وہ ابھی زندہ وحیات تھا - گھر واپس پہونچ چکا تھا - اُس کے زندہ رہنے اور اپنی ماں کا آخری سہارا ہونے کی امیدیں بھی ابھی باقی تھیں - بظاہر سب کچھ تھا - لیکن دوسری طرف قدرت اپنا سب کام ختم کر چکی تھی اور اگر کوئی کمی اس کی قسمت کا لکھا پورا ہونے میں باقی تھی تو اس کو اُس کے آبائی مکان کی ویرانی نے پورا کر دیا - وہ اپنی ماں کے بستر پر جس پر اُس نے نہ معلوم کتنی بے چین راتیں آنکھوں میں گزاری تھیں، لیٹ گیا، اور پھر کبھی اس کو اس بستر سے اُٹھنا نصیب نہیں ہوا -

---

گاؤں میں جب جارج سامر کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو دنیا اس کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی - ان میں سے ہر شخص نے جہاں تک اُن کی ناداری اجازت دے سکتی تھی، امداد واعانت سے دریغ نہیں کیا - اضمحلال دکمزوری نے یہاں تک مجبور کر دیا تھا کہ وہ زبان سے لوگوں کا شکریہ تک ادا نہ کر سکا لیکن اس کا چہرہ اُس کے اظہار تشکر کا گواہ تھا - ماں اُس کی تنہا تیمار دار ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتی تھی کیونکہ کسی دوسرے ہاتھ کی مدد اُس کو منظور نہ تھی -

دکھ درد اور بیماری میں خدا جانے وہ کونسی قوت ہے جو سخت سے سخت انسان کے جوش وہمت کیلئے پیام موت بن جاتی ہے - جو سخت سے سخت دل کو موم اور سنگدل سے سنگدل انسان کو پانی کر دیتی ہے ـــ

یہ اُسی قوت پنہاں کا کرشمہ ہے کہ ایک سنگدل انسان کو بھی شیرخوار بچہ سے زیادہ معصوم بنا دیتی ہے۔ ایک ایسے انسان کی بیماری کا تصور کرو جو جوانی میں بچپن سے زیادہ کمزور تھا۔ جو غریب الوطنی میں بستر علالت پر پڑا ایڑیاں رگڑ چکا تھا۔ اس حال میں کہ کوئی غمگسار پاس تھا، نہ تیمار دار۔ جو اکثر اس عالم میں ماں کا تصور کر لیتا تھا اُس ماں کا جو عالم طفولیت میں اس کی نگراں تھی، آسائش کی ذمہ دار تھی، اور اب اس بیماری اور عالم بے چارگی میں اسکی تیمار داری اور غمگساری کر رہی تھی۔

آہ محبت! وہ محبت جو ایک ماں کو بیٹے سے ہوتی ہے یقیناً اپنے اندر ایک روحانی شفقت، ایک ملکوتی تپش رکھتی ہے۔ اور تمام محبتوں پر اگر سبقت ہے تو اسی کو اور اگر سب پر فوقیت ہے تو یہی۔ بیٹے کی خود غرضیاں اس آگ کو سرد نہیں کر سکتیں۔ دنیا بھر کے خطرے اس رشتہ میں تفرقہ پیدا نہیں کر سکتے۔ بیٹے کی نالائقیاں اس گرمیٔ محبت کو کم نہیں کر سکتیں اور اُس کی احسان فراموشیاں اس رشتہ و تعلق میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتیں۔ ماں بیٹے کی خاطر اپنے آرام کو قربان کر سکتی ہے۔ وہ اس کے لئے اپنے تئیں دنیا کے عیش سے محروم کر سکتی ہے۔ وہ بیٹے کے آرام و تفریح کے لئے اپنے اوپر ہر شے حرام کر سکتی ہے۔ بیٹے کی ترقی و بہبودی اسکی جان ہے اور اس کی شہرت و خوشحالی ماں کا ایمان۔ وہ قسمت کے ہر نشیب و فراز میں اس کی شریک ہے۔ اگر بدحالی اس کی قسمت میں لکھی ہے تو ماں کی نظر میں وہ اور زیادہ مستحق محبت ہے۔ اور اگر دنیا کی نظر میں وہ شخص ذلت و رسوائی کا مستحق رہ گیا ہے تو ماں کے لئے اُس کی یہ ذلت و رسوائی ہی مزید محبت کا سبب بن جائے گی۔ اور اگر تمام دنیا اس کو اپنی نظروں سے گرا دے تو اب یہ ماں ہی اس کے لئے "تمام دنیا" ہو جائے گی۔ غرض مادرانہ محبت ہر حال میں اس کی شریک ہے۔ اگر بیٹے کی ترقی و بلندی اس کے لئے باعث فخر و مسرت ہے تو اُس کی ذلت و رسوائی موجب لطف و محبت۔

جان تمام اس تلخ حقیقت کو محسوس کرتا تھا کہ پردیس میں کسی کا بیمار پڑنا اور تیمار دار کا پاس نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ اس چیز سے آشنا تھا کہ قید و بند میں زندگی گزارنا اور وہاں کسی یار و غمگسار کا آکر نہ پوچھنا کیا مفہوم رکھتا ہے۔ چنانچہ اب کہ وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا مشکل ہی سے کسی وقت ماں کو اپنی نظروں سے غائب ہونے دیتا تھا۔ وہ اگر کسی کام سے اٹھکر جاتی تو اس کی نظریں اس کا تعاقب کرتیں۔ بڑھیا گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھی اس کی صورت دیکھا کرتی جبکہ وہ سوتا ہوتا تھا۔ اکثر اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا، ماں کی تلاش میں نظریں دوڑاتا، اس وقت تک کہ وہ اس کو اپنے سرہانے جھکی ہوئی نظر نہ آ جاتی۔ وہ ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا، سینہ پر رکھتا اور پھر اس سکون کے ساتھ جو ایک شیرخوار کو آغوش مادر میں حاصل ہوتا ہے سو جاتا۔ اسی طرح اُس نے جان دی تھی۔

یہ دل ہلا دینے والا افسانہ سنکر پہلا خیال جو مجھے پیدا ہوا یہ تھا کہ میں اس بیوہ کو جاکر دیکھوں اور کچھ مالی امداد پیش کروں، اور اگر ممکن ہو تو اس کے لئے کچھ آیندہ سہولتیں بہم پہونچاؤں۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ گاؤں کے دیندار لوگوں نے ہر ممکن انتظام اس کے لئے کر دیا تھا میں نے بھی اس اصول کی پابندی کرتے ہوئے کہ — غربا آپس میں ایک دوسرے کے دکھ درد کا علاج بہتر جانتے ہیں — اُن کے معاملات میں دخل دینے کی جرأت نہیں کی۔

دوسرے اتوار کو گرجا میں، میں نے بڑھیا کو اپنی مقررہ نشست گاہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بھی اپنے بیٹے کے ماتم میں رسمی سوگ کے اظہار کی کوشش کی تھی۔ جیسا کہ اس کے ماتمی لباس سے ظاہر ہوتا تھا۔ مادرانہ شفقت اور مفلسانہ مجبوری کی کشمکش کا یہ منظر بھی نہایت ہی رقت انگیز تھا۔

ایک سیاہ معمولی فیتہ، ایک ہلکے رنگ کا سیاہ رومال اور اسی قسم کی اور دوسری چیزیں — یہ تھا اس کا کل ماتمی لباس جس کے ذریعہ اُس نے سوگ و ماتم کی مقررہ رسم کو ادا کرنا چاہا تھا۔

میں نے جب اپنے چاروں طرف کی دو منزلہ عمارتوں، شاہانہ گنبدوں، اور مرمریں یادگاروں کو دیکھا جو زبان حال سے اپنے گزشتہ جاہ و جلال کا ماتم کر رہی تھیں — اور پھر میری نظر اس غریب بیوہ کے غم واندوہ پر پڑی جس کو غموں نے چور کر دیا تھا — اور جو باوجود ان تمام روحانی ایذاؤں کے اپنے خدا کے حضور میں حاضر ہونے سے غافل نہ تھی، تو میں نے محسوس کیا کہ ان قدیم یادگاروں کے سوگ و ماتم سے اس حقیقی یادگار کا رنج و ملال کہیں زیادہ افضل تھا۔

میں نے اس بیوہ کی درد بھری کہانی گاؤں کے کچھ متمول اور پرہیزگار لوگوں کو سُنائی جو اس سے کافی متاثر ہوئے، چنانچہ بڑھیا کو آرام و سہولتیں پہونچانے کی ہر ممکن کوشش اُن کی طرف سے کی گئی، لیکن اب کہ وہ خود آغوش لحد سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی، یہ کوششیں بیکار تھیں۔

اس واقعہ کو دو ہفتے بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ گرجا کی وہ نشست جو بڑھیا کے لئے مخصوص تھی خالی نظر آنے لگی، اور مجھے وہاں سے واپس ہونے کے قبل یہ اطلاع ملی، جو میرے لئے ایک حد تک اطمینان کا باعث تھی، کہ بڑھیا نے نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ اپنی آخری سانس پوری کردی اور اپنے پیاروں میں شریک ہونے کے لئے اُس دنیا کا سفر اختیار کرلیا جہاں دوست کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور جہاں غم و الم کو کوئی نہیں جانتا۔

(واشنگٹن اروِنگ)

عبدالقدیر خاں - میرٹھ کالج - میرٹھ

ازدواج

چھوٹے چھوٹے تاریک مکانوں میں روتے، بلبلاتے اور بسورتے بچے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے چہرے پر گرد و غبار ہے۔ اور اُن کی آنکھوں میں حلقے پڑے ہیں۔ میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے اُن کے نحیف گلوں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے پر اُن کی نظر ہے۔ بازار میں ہر میوہ کو دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ محلہ میں وہ دوسروں کا کام کرتے ہیں۔ گھر میں گھر والوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اُستاد اُن پر غرّاتا ہے۔ اعزّا انھیں نالائق بتاتے ہیں۔ دن بھر یونہیں اندر باہر دوڑتے گزرتا ہے۔ رات کو ایک کثیف آب و ہوا والے مکان کی کوٹھری میں حشرات الارض کی طرح پڑے خرّاٹے لیتے رہتے ہیں۔ ماں باپ دن بھر اپنی فکروں میں مبتلا، دنیا اُن کی نظروں میں اندھیر۔ زمین سے آسمان تک ساری فضا تاریک۔ خون پسینہ کر کے دن گزرا۔ اور آہیں بھر کر رات کاٹی صبح اُٹھے تو پھر کولھو کا بیل جہاں تھا وہیں ہے ......

یہ ہیں ہماری ننانوے فیصدی ازدواجی زندگیاں!

میں مانتا ہوں کہ ازدواج فطری ہے۔ اور یہ بھی مانتا ہوں کہ ازدواج کا فطری نتیجہ اولاد ہے۔ لیکن جب ہماری زندگی ہی فطرت کے خلاف ایک مستقل بغاوت ہے۔ ایک ان تھک جنگ ہے اور ایک مسلسل جہاد ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس مسئلہ میں بھی "فطرت" کو اپنی "ضرورت" کے مطابق نہ بنا لیں۔

جب پہاڑوں کے غاروں کو انسانی "ضرورتوں" نے "چہار دیواریوں" میں تبدیل کر دیا۔ فطرت کی کھلی نعمتیں بازاروں میں بکنے لگیں۔ امیر و غریب، بادشاہ و وزیر اور مزدور و سرمایہ دار کا امتیاز پیدا ہو گیا —— یہ سب "ضرورت" کے ماتحت، تو پھر کیوں نہ ہمارے ازدواج بھی ضرورت کے آہنی شکنجہ میں کسے جائیں؟

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ازدواج کی واحد غرض بقائے نسل ہے۔ اور اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ کمزور، و ناتواں اور ضعیف و نزار لوگوں کو فطری اعتبار سے کونسا حق پہونچتا ہے کہ وہ اپنے جیسے بلکہ اپنے سے بھی بدتر نفوس کو دنیا میں لا کر سوسائٹی کے کندھوں پر اُن کو مستقل بوجھ بنا دیں؟

آپ خفا ہوں گے کہ ماشاء اللہ! یہ کیا نیا فلسفہ!! کیا ہم کمزور ہیں تو شادی سے بھی گئے گزرے ہوئے؟

دنیا کی یہ راحت بھی ہم سے چھن گئی ؟

میں پوچھتا ہوں، آخر آپ کے ازدواج کا مقصد؟ بقائے نسل تو آپ سے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جو کچھ آپ لائیں گے اُن کو اگر موت نے چھوڑ بھی دیا تو وہ جہد للحیات کی نذر ہوجائیں گے۔ اگر آپ کی رگوں میں خون کے بجائے پانی دوڑ رہا ہے تو اُن کی رگوں میں سیسہ دوڑے گا۔ آپ میں سیمابیت نہیں، حرکت وحیات نہیں جوش و اُمنگ نہیں۔ اور پھر بقائے نسل کا دعویٰ!

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!!

ہاں، آپ کا ایک حربہ اور ہے۔ جذبات ردیہ کا سکون؟ لیکن کیوں نہ آپ اس کی اصلاح کریں ؟

جس طرح آپ نفس کی بیا پے خواہشوں کے باوجود اور سیکڑوں معصیتوں سے مجتنب رہتے ہیں اسی طرح اس سے بھی کنارہ کش رہیں؟ لیکن اگر آپ یہ نہیں کرسکتے تو پھر آخر "قوتِ ملکی" کا مقصد؟

شاید آپ مجھے قنوطیت پسند کہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ازدواج عام انسانوں کے حق میں سم قاتل ہے۔

آپ مجھے ملامت کریں گے۔ کیجئے۔ لیکن چند منٹ میری گزارشوں پر غور کر لیجئے۔

اگر سرسری طور پر سوسائٹی کے افراد کی تقسیم کی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اُس میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ امیر و غریب۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امرائے کے لئے ازدواج ہر صورت میں رحمت ہونا چاہئے۔ لیکن واقعہ اسکے خلاف ہے۔ دنیا میں انسان کی گرانمایہ ترین نعمت اُس کی قوتِ مفکرہ ہے۔ لیکن ازدواج کے بعد آدمی کی تمامتر توجہات "خانہ داری" میں کچھ اس طرح گم ہوجاتی ہیں کہ اُس کو سوچنے کا موقعہ بہت کم ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اُس کے قوائے عقلیہ ماند پڑتے جاتے ہیں۔ ذہنی طاقتیں شل ہوتی جاتی ہیں۔ اور وہ ہر کام میں... اپنی انفرادیت کو کھو کر صرف جماعت کے رسمی قوانین کی کورانہ تقلید کرنے لگتا ہے۔ نہ اُس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے فیصلوں پر غور کرے۔ اور نہ اُس کی خود پیدا کردہ "مادی دلچسپیاں" اُس کو اس قسم کے ٹھوس مسائل پر فکر کرنے دیتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اُس کی حالت گلہ کی اُس بھیڑ کے مانند ہو جاتی ہے جو بلا سوچے سمجھے سارے گلہ کے ساتھ ساتھ کان دبائے چلی جاتی ہے۔ خود اُس کو اپنی ذات پر کوئی اعتماد نہیں ہوتا۔

انسان کی فطرت بہت بلند ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اُس کے سامنے سرنگوں ہوسکتی ہے۔ کل کائنات بھی اُس کی طاقتوں کے مظاہرے کے لئے ناکافی ہے۔ لیکن یہ اُسی وقت جب اُس کے قوائے ذہنیہ

آزاد ہوں - اور اپنی پوری قوت کے ساتھ مصروفِ عمل - لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ دنیا میں حقیر ترین چڑیا سے بھی زیادہ پست و ذلیل ہے جو دن بھر درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر گاتی ہے اور رات کسی گھنے درخت کے پتوں میں چھپ کر گزار دیتی ہے -

---

قوت منفکرہ کے ضعف کے بعد آپ کے عزائم اور حوصلوں کی پستی یقینی ہے - اس لئے کہ معاشی کشاکش سے جو وقت بچے گا وہ خانگی بدوقتیوں میں صرف ہوگا - "رنگینیوں" میں صرف ہوگا "نیائش و سجود" میں صرف ہوگا - اسوقت آپ کی نظروں میں دنیا کی مسرتوں کے تمام دروازے آپ پر کھلے ہوں گے اور آپ گلابی فضا میں اپنی روح کو تحلیل کر رہے ہوں گے ....

پھر اگر حوصلہ ہوگا بھی تو طلب زر کا تاکہ جسمانی آسائشوں کے زیادہ سے زیادہ سامان فراہم ہوسکیں - گھر کا فرنیچر اپنے ہمچشموں کے مقابلہ میں بہتر ہو - کپڑے زیادہ قیمتی ہوں - موٹر کا ماڈل ہر سال نیا ہو، اعزہ و اقربا کی نظروں میں دھاک بیٹھی ہو ---- اور یہی وہ چیز ہے جس کے بعد انسان تنگ نظری اور دوں ہمتی کا شکار ہو کر روز بروز پست سے پست تر ہوتا جاتا ہے - حتیٰ کہ گو اُس کے بدن پر سلک و سرج کا سوٹ ہو لیکن اُس کی روح کائنات کی کثیف ترین چیز ہو جاتی ہے - وہ ایک ایک پیسہ کو سینت کر رکھتا ہے - خود غرضی اُسکی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے ایثار کی بے لوث اسپرٹ اُس سے چھن جاتی ہے - بظاہر وہ بہت خلیق نظر آتا ہے لیکن حقیقتہً وہ دوسروں سے قطعاً بے پرواہ ہوتا ہے - اعزہ اور احباب اُس کے نزدیک کسی نوعیت سے قابل اعتنا نہیں ہوتے - اس کی ساری زندگی خود غرضی و فریب کا ایک دام ہوتی ہے - ایک خوفناک دام!

ازدواج کے بعد انسانی تعلقات کچھ اس قسم کے ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو اپنے کیرکٹر میں تصنع سے کام لینا پڑتا ہے - اُس کو بتلانا ہوتا ہے کہ وہ بیوی کے خاندان کے ہر فرد کے ساتھ اُتنا ہی خلوص رکھتا ہے جتنا اُسے اپنے خاندان کے افراد سے ہے - اُسے تمام رسمی مواقع پر اُن کی آؤ بھگت کرنا ہوتی ہے - اُن کے ابرو کی خفیف سے خفیف شکن کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے - کوشش ہوتی ہے کہ اُنھیں کسی صورت سے شکایت کا موقع نہ ملے اس کا نتیجہ ہوتا ہے ریا، فریب اور ظاہر داری -

سالے کے بچہ کے ختنہ ہیں - آپ کا اُس کے لئے جوڑا بنوانا ضروری - اُس کے یہاں مبارکباد کیلئے جانا لازمی - ورنہ آپ کا گھر ایک مستقل عذاب!

آپ کہیں چلے جاتے ہیں اور اپنے دوست سے نہیں ملتے - اُس کو خط بھی نہیں بھیجتے - واپسی پر وہ آپ سے اس کی وجہ پوچھتا ہے - آپ کہہ دیتے ہیں "بھول گیا تھا" - یا "غیر ضروری سمجھا" - دیکھئے، چونکہ آپ کو

اُس کی ناراضی یا رضامندی سے کوئی خوف یا لالچ وابستہ نہیں ہے۔ اس لئے آپ کے الفاظ میں صداقت ہے۔
لیکن اگر آپ اپنے خسر سے ایسا کہدیں تو دنیا میں جینا حرام ہو جائے۔
شاید حافظ نے انھیں باتوں کو دیکھ کر کہا ہوگا:۔

من از بیگانگاں ہرگز ننالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

لیکن ازدواج کے یہ تمام تاریک پہلو کسی حد تک قابل برداشت ہو سکتے ہیں اگر آدمی فارغ البال ہو اور زندگی کی ضروری آسانیاں اُسے حاصل ہوں۔ مگر دنیا کی عام آبادی کی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر اسوقت صرف ہندوستان پر نظر رکھی جائے تو ماننا پڑے گا کہ ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے بدقسمتی سے ایسے نہیں ہیں جو اس شرط کو پورا کرتے ہوں۔ وہ خون پسینہ ایک کرنے کے بعد بھی زندگی کی وہ سہولتیں فراہم نہیں کرسکتے جو بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں ــــ اُن کا گھر ایک جھونپڑی ہوتا ہے۔ اُن کا بستر ایک پھٹی ہوئی دری۔ اور اُن کا تکیہ صرف خدا ــــ یہ وہ لوگ ہیں جو دن بھر پتھر پھوڑتے ہیں۔ اور شام کو پیٹ سے پتھر باندھ کر سوجاتے ہیں۔ جن کے خون نے دوڑنا چھوڑ دیا ہے۔ اور جن کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو چکے ہیں۔ جن کو کانگریس صرف "والنٹیر" بناتی ہے۔ اور گورنمنٹ سپاہی یا چوکیدار ــــ یہی وہ طبقہ ہے جس کے لئے ازدواج ایک موت ہے۔ ذلت و گمنامی کی موت !!

پھر اُن تمام باتوں کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئیں ان کا ازدواج اُن چند لقموں کو بھی ان کے منہ سے چھین لیتا ہے جن کو کھا کر یہ چین سے سوجاتے تھے۔ کمھلائے ہوئے اور پتلے دُبلے۔ بچے جن کو نہ ستھرا لباس نصیب ہوتا ہے اور نہ شام کی تفریح اُن کے لئے ہر وقت سوہان روح بنے رہتے ہیں۔ مسرت اُن کے چہروں سے مفقود ہوتی ہے۔ اُن کے ہر ہر بُن مو سے حسرت و یاس کے چشمے اُبلتے ہیں۔ بیوی اور بچے سب کے چہرے حزن و ملال کی ایک مستقل داستان ہوتے ہیں۔ تندرستی کے تمام وسائل معدوم ہوتے ہیں۔ نہ اُن کو وٹامن اے ملتا ہے نہ وٹامن بی۔ چھوٹے بڑے سب سیکڑوں آلام کا شکار رہتے ہیں مگر شکایت کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ مبادا اُن کی یہ شکایت لوگوں کو اور زیادہ اُن سے متنفر نہ بنا دے۔

ان تمام حالات کے ماتحت دھیرے دھیرے اُن کے اخلاق میں گھن لگتا جاتا ہے۔ اُن کی طبیعت سے غنا، سیرچشمی، بلند نظری اور عالی حوصلگی کے جذبات فنا ہوتے جاتے ہیں۔ حُسن معاشرت کے تمام چشمے ایک ایک کرکے خشک ہو جاتے ہیں۔ گھر بے اطمینانی و بے سکونی کا ایک مستقل مرکز بن جاتا ہے۔ جس میں کبھی شوہر زوجہ

باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں اور کبھی شوہر و زوجہ ایک طرف اور کنبہ کے اور اعزا دوسری طرف،
غریب شوہر دنیا بھر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا گھر آیا۔ اُس کا پیٹ خالی ہے اُس کے ہونٹ خشک ہیں۔ اور
اُس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک چکا ہے۔ اتفاق سے کھانے میں نمک تیز ہو
اُس کا خون اونٹنے لگتا ہے۔ وہ بیوی سے کہتا ہے:-

"یہ آج تم نے کھانے میں نمک کتنا ڈال دیا تم ہر وقت ایسا ہی کرتی ہو"

جملہ بظاہر کچھ زیادہ سخت نہیں ہے۔ لیکن زندگی کی سختی و نرمی تو آپ کی قلبی کیفیت پر منحصر ہے۔ بیوی خود بچوں کی یاس انگیز نظروں۔ آئے دن کے جھگڑوں اور گھر کی کس مپرسانہ حالت سے سر سے پیر تک ایک کراہ بن چکی ہے۔ چنانچہ اس کے جواب میں بھی کسی حد تک تلخی ہوتی ہے ــــ نتیجہ سوء معاشرت!

بچے اسی فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ ماں باپ کا اخلاق فطرتاً ان میں جگہ پکڑتا جاتا ہے۔ والدین انکی تربیت سے معذور۔ بچے اس فضا کا اثر قبول کرنے پر مجبور۔ بالآخر یہی بچے جب ہوش و خرد کو پہنچتے ہیں تو ان کے جسم سوکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں دھنسی ہوئی۔ ان کے دماغ کمزور۔ ان کے حوصلے پست، اُن کے مزاج چڑچڑے اور اُن کے اخلاق قابل نفرت۔

ضعف صحت اُن کے تمام شجاعانہ جذبات کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ دنیا کو مکر و فریب کا ایک طلسم پاتے ہیں۔ وہ لامعلوم طور پر دنیا اور دنیا والوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اور اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے دوسرے کی ہڈیوں کا پل بنانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اُن کو اپنے بازوؤں پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اپنی حقیقی طاقتوں کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ وہ لونڈیوں اور غلاموں کی ایک جماعت ہوتی ہے جن کے خون سے "سرمایہ" کھیلتا ہے۔ اور وہ خود اپنے خون سے۔

یہ ہیں وہ بچے جو ہماری قوم کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن جو ذمہ داریوں کا بوجھ اپنی گردن پر اٹھانے کے بجائے خود اپنا بار جماعت کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ ایسے افراد ہیں جو "مزدور" کے گھر میں بیمار بن کر آئے ہیں۔ جو اُس کو امداد دینے کے بجائے، خود اُس کی امداد کے خواہاں ہیں۔ اور اس لئے "غریب مزدور" اگر دن میں تین پیسے کماتا تھا تو اب ان کی تیمارداری میں کچھ وقت صرف کرنے کے بعد اُسے دو پیسے ہی ملتے ہیں۔ اور پھر ان کی کفالت اس پر مستزاد!

یہ ایک ایسا بوجھ ہوتے ہیں جو قوم کی گاڑی کی رفتار کو تیز کرنے کے بجائے اُس کی رہی سہی رفتار کو بھی ختم کر کے رکھ دیتے ہیں۔

افراد سے جماعت بنتی ہے۔ یہی افراد رفتہ رفتہ ساری قوم پر چھا جاتے ہیں۔ بلکہ چھائے ہوئے ہیں۔ اور ساری قوم کی ذہنیت غلامانہ ہو جاتی ہے۔ اُن کے اعضا تھک تھک کر گر پڑے ہیں۔ اُن کو محنت سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ اور دنیا کی کوئی ذلت بھی اُن کی حمیت و غیرت پر تازیانے لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آپ اُن کے سامنے لاکھ تقریریں کیجئے۔ خطبے پڑھئے۔ مضامین پیش کیجئے۔ مگر جیسے دیوار سے باتیں کر رہے ہوں۔ بھینس کے آگے بین بجا رہے ہوں۔

پھر گھر کے اندر جائیے تو ہر عورت آپ کو کئی کئی امراض نسوانی کا بیک وقت شکار نظر آئے گی۔ اس لئے کہ "ولادت" سے پہلے اور اُس کے بعد اُن غریبوں کی نہ تو مناسب احتیاط ہو سکتی ہے۔ اور نہ ضروری غذا اُن کو ملتی ہے۔ اپنے شہر کے محکمہ حفظانِ صحت کی رپورٹ دیکھئے۔ اور معلوم کیجئے کہ عورتوں میں امراض کا اوسط کیا ہے۔ اور یہ کہ ہر ہفتہ کتنی موتیں صرف "ولادت" سے واقع ہوتی ہیں۔

گاندھی جی کہتے ہیں:۔ "ہمیں جانباز سپاہیوں کی ضرورت ہے اس لئے "ضبط تولید" ہمارے لئے مضر ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک ہندوستان نے چار کروڑ "جانبازوں" کا اضافہ کیا۔ مگر نتیجہ؟ انڈیا بل؟

آپ کہیں گے انسانی فطرت کا گلا کیسے گھونٹیں۔ نوجوان لڑکیوں کو کہاں بٹھائیں۔ میں کہتا ہوں گلا تو آپ نے اب گھونٹ رکھا ہے۔ آپ کا ازدواج صرف یتیم بچے بنانے کی مشین ہے۔ بیوائیں پیدا کرنے کا آلہ ہے بے یار و مددگار بچوں کی آہ ہے اور سوسائٹی کے خون کا فوارہ!

جب آپ نے فطرت سے بغاوت کی ہے۔ جب آپ چڑیوں کی طرح نہیں رہ سکتے جنگلی جانوروں کی طرح بسر نہیں کر سکتے تو پھر اُسی طرح رہنے کی کوشش کیجئے جس طرح آپ کی "ضرورتیں" آپ کو مجبور کرتی ہیں۔ بار بار فطرت کا نام لے کر اپنے سر پر آرا کیوں چلاتے ہیں؟

پھر میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرے سے ازدواج ہی کو ختم کر دیا جائے۔ جن لوگوں میں صحت و توانائی ہے اور جو زندگی کی ضروری آسانیوں کے اعتبار سے اس کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ "بقائے نسل" کرتے رہیں۔ مگر یہ حشرات الارض کی طرح صرف تعداد اموات بڑھانے والے کیڑوں کی ضرورت نہیں۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایک روز سارا ہندوستان "گورغریباں" نہ بن جائے۔

ابوسعید بزمی ایم۔ اے

مکتوبات نیاز

۲۷
۲

آپ وہ باتیں کیوں لکھا کرتی ہیں جن کے جواب میں سوائے "احساس نارسائی" کے اظہار کے اور کچھ نہ کہہ سکوں

بحرت آمدی وزخم لبہ ام نوشد
بحیرتم کہ نمک بود گفتگوئے ترا

آپ نے جس جرأت و جسارت سے ان کو جواب دیا ہے وہ اس سے زیادہ داد کا مستحق تھا جو آپ کو ملی۔ ممکن ہے آپ چھپاتی ہوں ــــ آہ!

غزل میں اتنا شدید جذبہ سپردگی و وارفتگی اور کچھ اس پر آپ کہتی ہیں کہ شاعری سے آج تک محبت کی ہی نہیں، حیرت ہے

کفارہ کے سلسلہ میں آپ روزے بھی رکھیں گی اور مسکینوں کو کھانا بھی کھلائیں گی، خیر روزہ رکھنے میں تو کوئی حرج نہیں، اچھا ہے کہ رنگ کھلتا جائے گا جتنا کہ اتر جائے گا لیکن دوسری بات بہت خطرناک ہے آپ نے ہندی کا دوہا نہیں سنا کہ "غربا کو غلہ تقسیم کرنے کی خدمت بجوسا ہے" کیونکہ اس خیال سے کہ اس کے اتھ چھوٹے ہیں خرچ کم ہوگا، لیکن وہاں ساری دنیا بھکاری بنکر جمع ہوگئی ــــ یہاں تو مجھ سے زیادہ مسکین کوئی نہیں ہے، مگر مستحق بھی ہوں یا نہیں اس کا علم آپ کو ہوگا۔

اختر ریحانہ اور تصویر بدایونی سے میں واقف تک نہیں، خط و کتابت کی خوب کہی ـــ ایک آپ ہی کی مہربانی ستم ڈھانے کے لئے کیا کم ہے کہ کسی اور کی جستجو ہو۔

زنیرنگِ فسوں پردازی الفت چہ می پرسی
تو در آغوشی و من کشتہ از دوری دید نہا

۲۷
۲

خط کا جواب ذرا تعویق سے جا رہا ہے، معافی چاہتا ہوں، آپ سے نہیں اُن سے جن کو ہر چند میں نے آپ کی وساطت سے جانا ہے لیکن معذرت براہ راست انھیں سے کرنا چاہتا ہوں آپ کے اشعار سے آپ کا زورِ طبیعت

آپ کی بلند تخیل ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن غزل کے لئے جس جذبات سپردگی کی ضرورت ہے وہ ایک عورت کے کلام میں قدرتاً زیادہ قوی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہے۔ ان سے کہدیجئے

اچھا ہے آپ قصیدہ خوانی کیجئے اور عزیزہ بانو پر مہربانی۔ آپ دونوں خدمتیں انجام دینے پر اصرار نہ کیجئے ورنہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آپ کچھ نہیں کرنا چاہتے

ہائے ان کا اور آپ کا یہ تعلق کہ

بیداد تو یار [illegible] گرفتی [illegible]

کس قدر قابل رشک ہے۔ خوش رہئے

۴

آپ عید کی مبارکباد دیتی ہیں حالانکہ

عید را درشہر ما رسم مبارکباد نیست

لفافہ کے اندر ایک چیز اور بھی تھی۔ بہتر ہے

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

میں جانتا ہوں کہ آپ سے دل آزاری ممکن نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ "شیوۂ دلداری" کبھی خود ایک مستقل آزار ہو جاتا ہے۔ ان کے لئے نہیں جو ہر وقت آپ کے ساتھ میں اور اس کے خوگر ہو چلے ہیں، بلکہ ان کے لئے جو آزادی سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں" — تو خود حدیث مفصل بخوان ازیں مجمل

عزیز گرامی۔ آپ نے خوب کیا کہ جواب میں اتنے غیر محدود سکوت سے کام لیا۔ نعمت غیر متوقعہ طور پر حاصل ہو تو زیادہ لطف آتا ہے۔

اس دوران میں آپ جن ذہنی حوادث سے دوچار ہوئے ہیں ان کا ہر چند مجھے علم حاصل نہیں اور نہ شاید پوچھنے کا حق۔ لیکن ان پر اظہار مسرت سے میں باز نہیں رہ سکتا کیونکہ غالباً بصورت دیگر آپ کی یہ خاموشی اور زیادہ طویل ہوتی — اللہ، اللہ جب تک آپ صرف پھول ہی پھول تھے اس وقت تک میرے سے صرف ایک "ناشگفتہ عدم" بنے رہے اور اب کہ آپ کو کانٹوں میں کانٹا بنکر پہونچنا بھی آگیا ہے مجھے اپنی شگفتگی کی خبر دیتی ہیں۔ آہ

چہ فتنہ کردیم یارب گر نبودے نارسیدنہا

ہاں عید قربان گزر گئی اور شکر ہے کہ میرے دامن کو خون سے آلودہ کئے بغیر گزر گئی۔ میں غالباً ۳ اور ۱۲ کے درمیان کسی تاریخ میں آگرہ پہونچوں گا، آپ کا پتہ یادداشت کی کتاب میں درج کر لیا ہے۔ انشاء اللہ حاضر ہوں گا اور صرف وہ ایک چیز نذر میں طلب کرنے کے لئے جو "ماورائے کفر و ایماں" آپ کے پاس موجود ہے —

عہد حاضر کے سیاسیات میں پٹرول کی اہمیت

جب گزشتہ جنگ اپنے شباب پر تھی اور فرانس پٹرول کی کمی کی وجہ سے نزع کے عالم میں تھا تو صدر جمہوریہ فرانس (کلیمنسو) نے نہایت الحاح و زاری اور حد درجہ عالمِ اضطرار و اضطراب میں ولسن (پریسیڈنٹ امریکہ) کو تار بھیجا کہ "فرانس اس وقت صرف پٹرول کی ... دچاہتا ہے، جس کا ایک ایک قطرہ یہاں انسانی خون کے قطرہ سے زیادہ قیمتی ہے"۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پٹرول کتنی اہم چیز ہے اور حکومتوں کی زندگی کس حد تک اس تلخ و متعفن "آب حیات" پر منحصر ہے۔ پھر یہ اہمیت صرف جنگ ہی کے زمانہ میں محسوس نہیں کی جاتی بلکہ امن و سکون کے وقت بھی بدستور قایم رہتی ہے، کیونکہ تجارت و صناعت دونوں اسی کے سہارے سے چل رہی ہیں۔ اسوقت سب سے قوی حکومت وہی ہے، جو سب سے زیادہ معدنیات پٹرول پر قابض ہے، اور سب سے بڑی تجارتی کمپنی وہی ہے جو پٹرول کے معدنیات میں کام کر رہی ہے۔ یورپ کی ہر حکومت ہر وقت اس تاک میں لگی رہتی ہے کہ کہاں اُن کو پٹرول نظر آئے اور کب وہ اس پر جا کر قبضہ کریں۔ اس کے لئے دھوکے دئے جاتے ہیں، جھوٹ بولے جاتے ہیں، خوشامد کی جاتی ہے، دھمکیاں دی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اخلاق و انسانیت کے تمام اُصول بالائے طاق رکھدئے جاتے ہیں اور اس "اکسیر حیات" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔

سال گزشتہ میکزیکو میں جو بدامنی و بغاوت رونما ہوئی تھی اسکا حال اخباروں میں لوگوں نے پڑھا ہوگا، لیکن یہ بہت کم افراد کو معلوم ہوگا کہ اس کا سبب صرف پٹرول تھا۔ میکزیکو امریکہ کا وہ حصہ ہے جہاں پٹرول کی معدنیات بہ کثرت پائی جاتی ہیں اور یوروپ و امریکہ کی بڑی بڑی کمپنیاں رقیبانہ طور پر اس امر کی کوشش کر رہی ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ جائیں۔ لیکن چونکہ وہ اس میں بغیر حکومت کی مدد کے کامیاب نہیں ہو سکتیں، اس لئے اُن میں سے ہر ایک بیدریغ دولت اس کوشش میں صرف کر رہی ہے کہ حکومت اس کی طرفدار ہو جائے اور جب کوئی فریق اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دوسرا بدامنی پیدا کر دیتا ہے اور حکومت پھر مجبوراً اسی کی طرف مایل ہو جاتی ہے۔ یہ تھا اصل سبب میکزیکو کی بدامنی کا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پٹرول کے لئے حکومتیں کیوں جان دیتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی مختصراً سمجھ لیجئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کی تمام تمدنی ترقیاں منحصر ہیں مشینوں پر اور ان کے چلانے کے لئے پٹرول سے زیادہ ارزاں، کارآمد اور محفوظ ایندھن کوئی نہیں۔

اس کا معدن سے نکالنا آسان، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اس سے زیادہ آسان۔ کمپنیوں کو صرف یہ کرنا پڑتا ہے کہ تیل کے کنوؤں میں پائپ لگا کر اس کو کھینچ لیتے ہیں اور پائپ ہی کے ذریعہ سے بندرگاہوں تک پہونچا دیتے ہیں۔ الغرض پٹرول کے نکالنے، صاف کرنے اور منتقل کرنے میں مصارف بھی بہت کم ہوتے ہیں اور آسانی بھی ہے۔ اس پر لطف یہ کہ اس سے جو قوت و حرارت پیدا ہوتی ہے وہ کوئلہ سے دوچند ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب پٹرول کے چشموں میں کام کرنے والے بائیکاٹ کر دیتے ہیں تو تمام دنیا میں بے چینی پھیل جاتی ہے۔

پٹرول کا استعمال بھی روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے، جنگی و تجارتی جہازوں کے علاوہ ریلوں اور مشینوں کو بھی اس کے ذریعہ سے حرکت دیا جانا زیادہ پسند کیا جاتا ہے، موٹروں اور طیاروں کا حال سبھی کو معلوم ہے کہ پٹرول نہ ہو تو بیکار ہیں۔ امریکہ میں اکثر کارخانے اب صرف پٹرول کی قوت سے چل رہے ہیں اور ریلوں میں بھی بجائے کوئلہ کے اس کا استعمال بڑھتا جاتا ہے۔ روس کا بھی یہی حال ہے۔

تجارتی و جنگی جہازوں میں پٹرول سے جو بچت ہوتی ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ بیک وقت پٹرول اور کوئلہ سے چلنے والے دو جہاز علیحدہ علیحدہ لیجئے اور پھر دیکھئے کہ سہولت و مصارف میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ یہ دونوں جہاز ۱۲ ہزار گھوڑوں کی قوت کے ہیں۔ تو سب سے پہلا نمایاں فرق دونوں کے وزن میں ہوگا کیونکہ دخانی جہاز اتنی قوت پیدا کرنے والا کم از کم ۳۴۰۰ ٹن کا ہوگا اور پٹرول سے چلنے والا صرف ایک ہزار ٹن کا۔ اسی طرح اب مصارف کے تفاوت کو دیکھئے کہ اول الذکر کو روزانہ ۳۶۰ ٹن کوئلہ جلانا پڑیگا اور دوسرے کو ۱۰۰ ٹن پٹرول۔ اگر یہ دونوں پندرہ یوم کے سفر پر روانہ ہوں تو دخانی جہاز کے لئے ضروری ہوگا کہ ۵۴۰۰ ٹن کوئلہ اپنے ساتھ رکھے جس کے لئے سات ہزار مکعب میٹر جگہ درکار ہوگی لیکن دوسرے کو صرف ۱۵۰۰ ٹن پٹرول کی ضرورت ہوگی جو ۱۷۰۰ مکعب میٹر جگہ میں آ سکتا ہے۔ اس لئے دخانی جہاز مجبور ہے کہ پندرہ دن کے بعد کسی جگہ ٹھہر کر کوئلہ بار کرے اس کے بعد چلے، لیکن دوسرا جہاز مسلسل ۲۷ دن تک چل سکتا ہے۔

جنگی جہازوں میں ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ دخانی جہازوں کا ان کے دھوئیں کی وجہ سے ۱۵ کلومیٹر کے فاصلہ سے پتہ چل جاتا ہے اور پٹرول سے چلنے والے جہازوں کا پتہ دشمن کو اتنی دور سے نہیں چل سکتا کیونکہ اس سے دھواں بلند نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ چونکہ کوئلہ کا وزن زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ سست رفتار ہوتے ہیں، برخلاف پٹرول والے جہاز کے کہ وہ وزن کم ہونے کی وجہ سے زیادہ تیز چل سکتا ہے۔ علاوہ بریں ایک فرق

یہ بھی ہے کہ اول الذکر جہاز کو حرکت دینے میں گھنٹوں درکار ہوتے ہیں، کیونکہ کوئلہ کا مشتعل ہونا، پانی کا کھولنا اور اس سے اتنی اسٹیم پیدا ہونا کہ سلنڈروں کو حرکت دے سکے کافی وقت چاہتا ہے، برخلاف دوسرے جہاز کے کہ وہ آدھ گھنٹے کے اندر روانگی کے لئے طیار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مزید آدھ گھنٹے کے اندر اپنی پوری رفتار حاصل کر لیتا ہے۔

اب دوسری آسانی کو دیکھئے کہ دخانی جہاز کو کوئلہ سے بار کرنے کے لئے ۵۰۰ آدمی پانچ دن تک درکار ہوتے ہوتے ہیں لیکن پٹرول بھرنے کے لئے صرف ۱۲ گھنٹے اور بارہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوران سفر میں سمندر کے درمیان بھی جہازوں کو پٹرول سے بھر سکتے ہیں، لیکن دخانی جہاز اپنے ایندھن کے لئے کسی نہ کسی اسٹیشن تک پہونچنے پر مجبور ہیں۔

یہی سبب تھا کہ انگلستان و امریکہ نے ۱۹۱۲ء ہی سے اپنے اکثر جہازوں میں پٹرول کا استعمال شروع کر دیا اور اب روس، فرانس و جرمنی ہر جگہ پٹرول ہی کی مدد سے جہازرانی ہوتی ہے۔

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام

سرودِ زندگی

(مسلسل)

دیکھنے والے فروغِ رخِ زیبا دیکھیں پردۂ حسن پہ خود حسن کا پردہ دیکھیں

دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ اول تو "پردۂ حسن" کے استعمال کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی،
در مصرعۂ اولیٰ میں کوئی بات ایسی ظاہر نہیں کی گئی جس سے "پردۂ حسن" کا تعلق ہوتا اور اگر ہم تھوڑی دیر
لے لئے تسلیم کر لیں کہ یہاں "حسنِ زیرِ نقاب" ہی کا ذکر ہے تو پھر حسن کا پردہ کیا چیز قرار پائے گی جبکہ فروغِ رخِ زیبا
مصرعۂ اول میں کھلم کھلا اس کے منافی واقع ہے اگر "حسن کا پردہ" کے بجائے "حسن کا جلوہ" لکھا جاتا تو خیر
پھر نہ کچھ مفہوم پیدا ہو جاتا —— غالب کا شعر ہے :-

منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منھ پر کھلا

معلوم ہوتا ہے اصغر صاحب نے اسی شعر کو سامنے رکھکر فکر فرمائی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ غالب کے شعر کا ایک ایک
لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے اور اصغر صاحب نے "حسن کا پردہ" کہکر اس کو مہمل بنا دیا۔

جنونِ عشق میں ہستیٔ عالم پر نظر کیسی رخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

پہلے مصرعہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جنونِ عشق میں دنیا کی "ہستی" کا خیال بھی نہیں رہتا۔ بالکل درست ہی
لیکن دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق۔ اگر ہستیِ عالم کا جواب دوسرے مصرعہ میں رخِ لیلیٰ اور جنونِ عشق کا
جواب نظارۂ محمل واقع ہوا ہے تو مفہوم کے لحاظ سے اس کا اہمال ظاہر ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا :-

وفورِ شوق ہو تو پردہ پھر کیسا کر رکھتے ہیں رخِ لیلیٰ نظر میں اپنی، محمل دیکھنے والے

تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا میں انکا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

اس شعر میں نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا تماشہ دکھایا گیا ہے۔ اور اس تماشہ کا ذکر دوسرے مصرعہ میں ہے جو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کس چیز کو شاعر ان کا دل سمجھتا ہے اور وہ کس چیز کو شاعر کا دل سمجھتے ہیں اس کا اظہار کہیں نہیں کیا گیا۔ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں محبوب کے دل کو زخمی سمجھتا ہوں اور وہ میرے دل کو، لیکن اسکو وہ ظاہر نہ کر سکے۔

کائنات دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

اول تو قضا کے سامنے زندگی کے مسکرانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ شعر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مسکراہٹ استسلام و سپردگی کی تھی یا جود و انکار کی، دوسرے روح الامیں کے بیہوش ہونے کا کیا موقعہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جسوقت روح الامیں پیام خداوندی شاعر کے سامنے لائے اس وقت اتفاق سے قضا بھی آگئی اس لئے ادھر شاعر کی زندگی مسکرا اٹھی اور اُدھر روح الامیں غش کھا کر گر پڑے۔

کائنات دہر کی ترکیب بھی عجیب ہے۔ صرف کائنات کہدینا کافی تھا۔

رشکِ صد ایماں ہوا اصغر مرا طرزِ کافری میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اگر "میں" اور بت دونوں خدا کے سامنے ہیں تو اس میں "رشکِ صد ایماں" ہونے کی کونسی بات ہے۔ اور وہ طرزِ کافری کیا تھا جس کی داد چاہی جاتی ہے۔

جلوہ ترا ابتک ہے نہاں چشم بشر سے ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

پہلے مصرعہ میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ چشم بشر ابتک تیرا جلوہ نہیں دیکھ سکی اور دوسرے مصرعہ میں یہ خبر سنائی جاتی ہے کہ ہر ایک نے تجھے اپنی نظر سے دیکھا ہے۔ اس لئے اگر مصرعہ اول کا دعوے صحیح ہے تو معنے یہ ہوں گے کہ دوسرے مصرعہ میں جن دیکھنے والوں کا ذکر ہے وہ انسان نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر وہ انسان ہوتے تو ظاہر ہے کہ چشم انسانی ہی سے دیکھتے!

مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے یہ راز ہے تو ذرا حُسنِ راز رہنے دے

پہلے مصرعہ میں اک خواہش و التجا کا اظہار ہے، کسی واقعہ کا ذکر نہیں، اس لئے مصرعۂ دوم میں لفظ یہ کا اشارہ بالکل بے محل ہے کیونکہ مشار الیہ نہ کوئی موجود ہے نہ اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ (یہ) کا اشارہ حقیقت کی طرف ہے تو پھر حُسن راز کا اس سے کیا تعلق۔ راز کا حُسن یہی ہے کہ وہ راز رہے اور یہاں حقیقت کو مجاز سے متعلق کر کے اس کا اخفا چاہا جاتا ہے جس کو حُسن سے کوئی واسطہ نہیں۔

حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے

دوسرے مصرعہ میں لفظ (یہ) بالکل زاید استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اس کو حذف کرنے کے بعد بھی معنے پورے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے مصرعہ میں لفظ تازہ بالکل بیکار رہے۔ محض حیات کہدینا کافی تھا۔ علاوہ اس کے مرحلہ کا دراز ہونا بھی کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شعر یوں ہو سکتا تھا:-

حیاتِ عشق ہے قائم اسی فسانہ پر فسانۂ غمِ اُلفت دراز رہنے دے

فسانہ کی تکرار اور زیادہ لطف پیدا کر دیتی۔

عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں

یہ شعر بھی منجملہ اُن بہت سے "تصوف زدہ" اشعار کے ہے جن کا لطف کسی ولی اللہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

معشوق سے کہا جاتا ہے کہ میں جو تجھ کو دیکھ کر آئینۂ حیرت ہو گیا ہوں تو تیری صورت میری صورت ہو گئی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ عاشق و معشوق دونوں کا ہمشکل ہو کر "توام نزاد" نظر آنا واقعہ امکانی ہے تو اس کا غزل یا محبت سے کیا تعلق؟ اگر اس مسئلہ سے کسی کو دلچسپی ہو سکتی ہے تو کسی ماہر جنسیات کو یا عالم نیرنجات کو۔

ہو گئی جمع متاعِ غمِ حرماں کیونکر میں سمجھتا تھا کوئی پردۂ غفلت میں نہیں

یہاں غفلت سے مراد محبوب کی غفلت و بے پروائی ہے اس لئے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ پردۂ غفلت میں کوئی نہیں ہے۔ علاوہ اس کے لفظ (کوئی) سے متاعِ غم کا یوں بھی کوئی تعلق نہیں۔ اگر (کوئی) کی جگہ (کچھ) کہا جاتا تو خیر پہلے مصرعہ سے یک گونہ ربط پیدا ہو جاتا۔

تصوف کا ایک اور مسخ شدہ شعر ملاحظہ ہو:-

عشق کی فطرتِ ازل سے حسن کی منزل میں ہے قیس بھی محمل میں ہے لیلیٰ اگر محمل میں ہے

وہاں تو غریب قیس کی ساری عمر گزر گئی اور پردۂ محمل تک پہونچنا نصیب نہ ہوا اور یہاں اصغر صاحب اس کو بالکل محمل کے اندر ہی لیلیٰ کے ساتھ ہم آغوش دیکھ رہے ہیں۔

عشق کی فطرت کا حسن کی منزل میں ہونا بھی عجیب بات ہے۔ منزل کی جگہ بھی فطرت لکھنا چاہیئے تھا، لیکن شاید مطلع بنانے کے لئے شعر کو مہمل کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو   پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

تصوف کی شاعری اول تو یونہی لغو و مہمل ہوتی ہے لیکن جب کھلم کھلا اس میں "مذہبیات" کی اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو اس کا اہمال سخت نفرت انگیز ہو جاتا ہے۔ عرش ایک ایسا لفظ ہے جس کے صرف ایک ہی معنی لئے جا سکتے ہیں اور وہ معنی وہی ہیں جس کا تعلق مفروضہ عقاید مذہب سے ہے۔ اس لئے جو صوفی شعراء زیادہ پاکیزہ ذوق کے ہیں وہ ہمیشہ ایسے الفاظ سے احتراز کرتے ہیں اور زیادہ تر کنایہ سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اصغر صاحب جو لاہوت ایسا مکروہ و ثقیل لفظ استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتے ان پر عرش کا بار کیا ہو سکتا ہے۔

معنی کے لحاظ سے جس حد تک یہ شعر بیگانۂ تغزل ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ عشق کا اپنے ساتھ حسن کو لیجانا اور وہ بھی عرش کی منزل تک مجذوبوں کی دنیا کی بات ہے اور جب تک خود کوئی اسی حد تک بیگانۂ عقل و حواس نہ ہو جائے اس کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

اب انداز بیان کا نقص ملاحظہ کیجئے۔ پہلے مصرعہ میں تو یہ خبر دی گئی کہ عشق اپنے ساتھ حسن کو عرش تک لے گیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ ذہن سامع و ناظر کی جستجو اسی کے متعلق پیدا ہوگی کہ وہ عرش کے بعد کہاں گیا۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں ذکر کیا جاتا ہے عشق کی منزل کا۔ یہی راستہ ہے۔ یہ شعر یوں ہوتا تو اتنے تقاضوں کا نہ پائے جاتے:-

عرش تک تو ساتھ تھے دونوں مگر اب کیا خبر   حسن کی منزل ہے کیا اور عشق کس منزل میں ہے

اسی طرح کے اور چند عجیب و غریب اشعار ملاحظہ ہوں:-

حسن بنکر خود کو عالم آشکارا کیجئے   پھر مجھے پردہ بناکر مجھ سے پردہ کیجئے
دیکھتا ہوں میں کہ انساں کشتیِ دریائے وجود   خود حباب و موج بنکر اب تماشہ کیجئے

دے مسرت مجھے اور عین مسرت مجھ کو   چاہیئے غم بھی بہ اندازۂ راحت مجھ کو

یہ آنا جلوہ بنکر اور پھر میری نظر ہونا   یہی ہے رمز تو خود دید بھی اک فتنہ گر ہونا
جمال یار کی زینت بڑھادی رنگ و صورت نے   قیامت ہے قیامت میرا پابند نظر ہونا
طلسم رنگ و بو کو جس نے سمجھا مٹ گیا اصغر   نظر کے لطف کا برباد ہونا ہے نظر ہونا

ذرہ ذرہ ہے یہاں کا رہرو راہ فنا   سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں

رقص مستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے   سامنے لاکر تجھے اپنا تماشا دیکھتے
اس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہ شوق میں   جلوہ خود بیتاب ہو جاتا وہ پردہ دیکھتے

ترے قربان ساقی اب یہ کیا حالت ہو مستوں کی ۔۔۔ کبھی عالم تو ہوتا ہے، کبھی عالم نہیں ہوتا

یہ اقرار خودی ہے دعوئ ایمان و دیں کیسا ۔۔۔ ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

بہار جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے ۔۔۔ نظر کے سامنے حسن نظر مجسم ہے

جسم کو اپنا سا کر کے لے اُڑی افلاک پر ۔۔۔ اللہ اللہ یہ کمال روح جولاں دیکھئے

ایک میرا ہی فسانہ ز ازل تا بہ ابد ۔۔۔ یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھ کو

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغر ۔۔۔ کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

حوصلے عشق کے پامال ہوئے جاتے ہیں ۔۔۔ اب یہ بیداد کہیں حُسن پہ بیداد نہ ہو

اب نہ یہ میری ذات ہے اب نہ یہ کائنات ہو ۔۔۔ میں نے نوائے عشق کو ساز سے یوں ملا دیا

عکس جمال یار کا آئینہ خودی میں ہے ۔۔۔ بہ غم ہجر کیا دیا مجھ سے تجھے چھپا دیا

یہ تمام اشعار نہ صرف یہ کہ تغزل سے خالی ہیں بلکہ مفہوم سے بھی یکسر بیگانہ ہیں۔ چند مفروضات پر ان کی بنیاد قائم ہے اور اس دنیا کے محسوسات و تاثرات سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ دعویٰ خواہ کتنا ہی لغو کیوں نہ ہو لیکن اگر شاعر اپنی تخیل کے زور سے اس کو ثابت کر دے تو شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اصغر صاحب نے کبھی اس کی زحمت گوارا نہیں کی اور یہ شاید ان سے ممکن بھی نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کا کمال یہی ہے کہ چند خوبصورت الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دے، نہ اس کو محل استعمال سے بحث ہونا چاہئے اور نہ اس سے کہ اُن سے کوئی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر چونکہ فلسفہ و تصوف کی شاعری میں اس کی کافی گنجایش ہے اس لئے اصغر صاحب جو اپنی فطرت کے لحاظ سے "گونگو" قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں بالطبع اسکی طرف مایل ہیں، لیکن چونکہ تخیل ان کی خود اپنی نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ فن شعر و بیان و معانی سے ناواقف ہیں اس لئے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ محض لایعنی دعوے پیش کر دینا ہی کمال شاعری ہے، ثبوت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی کی اس متصوفانہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے جو حضرت احمد جام ژندہ پیل اور شاہ نیاز احمد بریلوی کے لئے مخصوص ہے اور اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ انھیں کبھی نہیں ہوا۔ فارسی میں اس رنگ کا سب سے زیادہ دقیق کہنے والا بیدل گزرا ہے اور ایسی ایسی باتیں اس نے لکھی ہیں جو بظاہر بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ اس کا سارا کلیات چھان ڈالئے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہ نکلے گا جس میں اس نے کوئی دعوے بغیر ثبوت کے کیا ہو۔

آئینہ ۔ خودی ۔ حجاب ۔ دریا ۔ حباب ۔ ساز ۔ پردہ ۔ وغیرہ نہایت عام الفاظ ہیں جن پر تصوف کی شاعری کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اصغر صاحب نے بھی تقلیداً انھیں سے کام لیا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ

بیدل نے اُن کے متعلق جو مضامین پیش کئے ہیں وہ خود اس کے ذاتی ہیں اور اصغر نے جو کچھ لکھا ہے وہ تقلید ہے، اسی لئے اس کے یہاں وسعت مفہوم و شگفتگی ہے اور یہاں اہمال و خبط۔

دوسرا حصہ اصغر صاحب کے کلام کا وہ ہے جس میں کوئی مفہوم تو ہے لیکن کوئی نہ کوئی نقص اس میں ضرور پایا جاتا ہے مثلاً:-

سازِ دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہو جب جانِ مضطرب بنکر تو بھی لب کشا ہو جا

اس شعر میں ساز، پردہ اور اس کو چھیڑنے والا سب مجازی معنے میں استعمال ہوئے ہیں اس لئے جانِ مضطرب کی جگہ اضطراب جاں زیادہ موزوں تھا۔

یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے لباسِ زہد کو جس نے کیا شراب آلود

پہلے مصرعہ میں بیان کی تعقید و تشویش ظاہر ہے۔ لفظ (وہ) بالکل زاید مستعمل ہوا ہے اور (انقلاب کرنا) محاورہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح لفظ (یہی) سراسر بے محل آیا ہے اس کی جگہ (تری) ہونا چاہئے تھا۔ یہ مصرعہ یوں ہوسکتا تھا:-

تری نگاہ جو فتنہ کرے بپا، کم ہے

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

دوسرے مصرعہ میں بجائے (جس کو) کے حرف (کہ) استعمال ہوا ہے جو درست نہیں۔ یہ مصرعہ یوں درست ہوسکتا ہے:-

ہے اپنا طرزِ نظر جس کو دیکھتا ہوں میں

حسن کرشمہ ساز کا بزم میں فیض عام ہے جانِ بلاکشاں بھی آج غرق ہے موجِ نور میں

موجِ نور کے استعمال کا کوئی قرینہ شعر سے ظاہر نہیں۔ پہلے مصرعہ میں حسن کرشمہ ساز لکھا ہے اور موجِ نور کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح فیض عام کے زیر اثر جان بلاکشاں کو موج سرور و مسرت میں غرق ہونا چاہئے نہ کہ موج نور میں (آج) کا (ج) بھی تقطیع سے گرتا ہے۔ بجائے اس کے (ب) ہونا چاہئے۔

موجوں کا عکس ہے خطِ جام شراب میں یا خوں اچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں

خطِ جام ایک فرضی خط ہے اور اگر فرضی نہ ہو تو بھی اس میں موجوں کا عکس نمایاں نہیں ہوسکتا۔ دوسرے

مصرعہ میں جام شراب کو (ماہتاب) کہا ہے حالانکہ (آفتاب) کہنا زیادہ مناسب تھا۔

اس دن بھی میری روح تھی محو نشاط دید — موسیٰ اُلجھ گئے تھے سوال و جواب میں

پہلے مصرعہ کے انداز بیان کے لحاظ سے دوسرے مصرعہ کے الفاظ یوں ہونا چاہئے تھے۔ جب موسیٰ سوال و جواب میں اُلجھے ہوئے تھے لفظ (جب) کا اظہار ضروری تھا اور (الجھ گئے تھے) بھی بے محل استعمال ہوا ہے۔ یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے :-

اس دن بھی میری روح تھی محو جمال، جب
موسیٰ اُلجھ رہے تھے سوال و جواب میں

میں اضطراب شوق کہوں یا جمال دوست — اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

تھوڑی سی تبدیلی کے بعد یہ شعر اس سے بہتر ہو سکتا تھا :-

میں اس کو فرط شوق کہوں یا جمال دوست
اک برق سی جو کوند رہی ہے نقاب میں

میخانۂ ازل میں جہان خراب میں — ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

پہلے مصرعہ میں لفظ (نہ) دونوں ٹکڑوں کے درمیان لانا مناسب تھا اور دوسرے مصرعہ میں (ایک جگہ) کی بجائے (کسی جگہ) ہونا چاہئے تھا۔ دوسرا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے :-

ٹھہرا گیا نہ مجھ سے کہیں اضطراب میں

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کس کو گلستاں بنا دیا؟ سوائے (کلیوں) کے اور کسی کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا اور (کلیوں) کو گلستاں بنا دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے لب کشائی کا نتیجہ (گلستاں بنا دینا) بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ (غزلخواں) ہوتا تو خیر تعلق پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ نقص پھر بھی باقی رہتا کہ کس کو غزلخواں بنا دیا۔

ہم اس نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگ جاں بنا دیا

پہلے مصرعہ میں (اس) بالکل غیر ضروری ہے۔

بلبل بہ آہ و نالہ، گل مست رنگ و بو مجھ کو تمہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

پہلے مصرعہ کے دونوں ٹکڑے ترکیب کے لحاظ سے غیر متوازن ہیں۔ علاوہ اس کے (بلبل بہ آہ و نالہ) کی ترکیب بھی اس موقعہ پر صحیح نہیں ہے۔ بجائے اس کے (بلبل رہینِ نالہ) کہہ سکتے تھے۔

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

اگر امتحان و آزمائش میں عاشق رونے لگا تو اس سے خود معشوق کا اپنے آپ کو آزما بیٹھنا کیونکر ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس سے معشوق کی آزمائش کیا ہوئی۔ یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو
کیا ملا انھیں آخر مجھ کو آزمانے سے

زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اٹھاتا ہوں تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

زخم لینا خلاف محاورہ ہے۔ (زخم آپ کھاتا ہوں) ہونا چاہئے۔

سرو بھی جو بہار بھی لالہ و گل بہ بہار بھی جس سے چمن بنا کہ وہ دشت پہ نہیں

پہلے مصرعہ میں ٹکڑوں کی تقسیم غلط ہے (گل) کے بعد (بھی) ہونا ضروری تھا اور اس کے نہ ہونے سے (گل) بہار کے ساتھ ملکر گلبہار ہو جاتا ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی سست ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے:۔

سرو بھی جو بہار بھی گل بھی ہے اور بہار بھی
جس سے کہ چمن بنا اک وہی دشت پر نہیں

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرز نظر ہے

شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جینے مرنے کا ہوش کسے نہیں ہے۔ محبوب کو یا عاشق کو۔ اس لئے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے

جینے کا مجھے ہوش نہ مرنے کی خبر ہے

ہے تابشِ انوار سے عالم تہ و بالا جلوہ وہ ابھی تک تہِ دامانِ نظر ہے

نہ تابشِ انوار سے عالم تہ و بالا ہو سکتا ہے اور نہ جلوہ کا دامانِ نظر سے کوئی تعلق ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ "وہ جلوہ

ابھی تک زیرِ نقاب ہے" تو البتہ درست ہو سکتا تھا۔

ذرہ ذرہ پھر بنے گا اک جہانِ رنگ و بو　　چپکے چپکے ہو رہا ہے عہد و پیمانِ بہار

عہد و پیمانِ بہار کس سے ہو رہا ہے یا کون بہار سے عہد و پیمان کر رہا ہے اس کا ذکر کسی جگہ نہیں ہے حالانکہ ضروری تھا

در پہ جو تیرے آگیا اب نہ کہیں مجھے اُٹھا　　گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

پہلا مصرعہ ترکیب نظم کے لحاظ سے بہت سست ہے علاوہ اس کے گردشِ مہر و ماہ کا ذکر بھی بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ اصغر صاحب نے جو مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے اس کے لحاظ سے شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

بات نصیب کی ہے یہ در ترا مجھ کو مل گیا　　گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھی ہے ورنہ راہ میں

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریبِ رنگ و بو　　یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

دوسرے مصرعہ میں لفظ (لیکن) کا استعمال صحیح نہیں ہوا اس جگہ (ورنہ) ہونا چاہئے۔

بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا　　اب قفس بھی ہم اسیرِ دل کو پرِ پرواز ہے

ذوقِ رہائی اور رہائی میں بڑا فرق ہے اس لئے جب تک پہلے مصرعہ میں واقعتاً رہائی نہ دکھائی جائے، دوسرے مصرعہ میں یہ دعوے کرنا کہ قفس بھی پر پرواز ہوگیا ہے درست نہیں ہو سکتا۔

عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا ظرف دید　　میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

پہلے مصرعہ میں لفظ عام کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی بجائے اس کے (ایک) کا لفظ زیادہ برمحل ہے۔

دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے　　جیسے صہبا کے لئے پردہ مینا ہونا

پہلے مصرعہ میں لفظ (سے) نمایاں کے ساتھ تو استعمال ہو سکتا ہے لیکن پنہاں کے لئے (میں) چاہئے۔ اس لئے یہ مصرعہ اس طرح ہونا چاہئے تھا:۔

دہر ہی سے وہ نمایاں ہے، اسی میں پنہاں

دوسرے مصرعہ کی ردیف بالکل بیکار ہے کیونکہ (ہونا) کو حذف کر دینے کے بعد بھی معنی پورے ہو جاتے ہیں۔

جلوۂ ذوقِ پرستش، گرمیٔ حسنِ نیاز ۔۔۔ ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

اس شعر میں بھی (ردیف) بیکار ہے اور (ہے) حذف کرنے سے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ علاوہ اس کے معنوی نقص یہ ہے کہ کعبہ کے لئے جلوۂ ذوقِ پرستش لائے ہیں اور بتخانہ کے لئے گرمیٔ حسنِ نیاز، حالانکہ نیاز و پرستش میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے جو کعبہ و بتخانہ ایسی دو متضاد چیزوں کے امتیاز کو ظاہر کر سکے۔
اسی کے ساتھ لفظ حُسن کا استعمال بھی ذوق کے مقابلہ میں درست نہیں حسب ذیل تغیر سے یہ شعر بلند ہو سکتا ہے:-

ذوقِ خالص ہے یہاں، واں ذوق کی صنعتگری
ورنہ کچھ کعبہ میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

ہے تقاضا ترے جلوہ کی فراوانی کا ۔۔۔ ہمہ تن دیدہ نہیں تجھ کو سراپا دیکھیں

دوسرے مصرعہ کا کوئی ایک سا ٹکڑا مفہوم پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دونوں میں ربط اس لئے نہیں ہے کہ سراپا دیکھنے کے لئے ہمہ تن دیدہ بنجانا بالکل غیر ضروری ہے۔ علاوہ اس کے جلوہ کی فراوانی تو اس امر کی مقتضی ہے کہ ہمہ تن دیدہ بننے کے بعد بھی تکمیل نظارہ نہ ہو سکے۔ لفظ تقاضا بھی بے محل استعمال کیا گیا ہے۔
میرا مشورہ اس شعر کے متعلق یہ ہے:-

ہے یہ عالم ترے جلوہ کی فراوانی کا
ہمہ تن دیدہ ہوں پھر بھی نہ سراپا دیکھیں

ساقیا جام بکف پھر ہو ذرا گرم نوا ۔۔۔ حُسن پھر معجزِ دم عیسیٰ ید بیضا دیکھیں

پہلے مصرعہ میں ساقی سے خطاب کرکے دو باتوں کی فرمائش کی جاتی ہے ایک یہ کہ جام بکف ہو اور دوسرے یہ کہ گرم نوا ہو حالانکہ لفظ (ہو) صرف ایک جگہ واقع ہے خواہ اس کو جام بکف سے متعلق کیجئے یا گرم نوا سے، جام بکف ساقی کی صفت ہو نہیں سکتی کیونکہ حرفِ ندا اس کے بعد موجود ہے۔ اگر ساقی جام بکف کہا جاتا تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

عبث ہے دعوئے عشق و محبت خامکاروں کو ۔۔۔ یہ غم دیتے ہیں جسکو جوہر قابل سمجھتے ہیں

دوسرا مصرعہ مفہوم کے لحاظ سے ناقص ہے کیونکہ (یہ غم) کے بعد جب تک (اُسے) کا اضافہ نہ کیا جائے معنی پورے نہیں ہوتے۔

(باقی)

باب الاستفسار

آدم اور شجرۂ ممنوعہ

(جناب خلیق طہری - کوئٹہ)

میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا اگر میرے اس استفسار کا جواب آپ مارچ کی اشاعت میں مرحمت فرمائیں گے۔

حضرت آدم کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ انھوں نے گیہوں کھایا اور اس کی پاداش میں جنّت سے نکالدئے گئے۔ قرآن کریم میں جہاں تک میرا خیال ہے اس قصہ کے متعلق صرف اتنا ذکر ہے:۔

"وقلنا یآدم اسکن انت وزوجک الجنۃ وکلا منہا رغداً حیث شئتما ولا تقربا ہذہ الشجرۃ فتکونا من الظٰلمین ۝ فازلہما الشیطٰن عنہا فاخرجہما مما کان فیہ وقلنا اھبطو بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاعٌ الیٰ حین"۔

کیا جناب اس مسئلہ پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا اور شجرۂ گندم کس روایت سے شہرت پاگیا۔ دیگر یہ کہ وہ کونسی جنّت تھی جہاں سے آدم کا اخراج ہوا۔ اگر وہ جنّت اس کرۂ ارض سے علحدہ تھی تو "لکم فی الارض مستقر ومتاعٌ الیٰ حین" کی تخصیص کیسی۔

(نگار) اگر نگار آپ کے مطالعہ میں رہتا ہے تو آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ کلام مجید کے باب میں ہمیشہ میں نے دو باتوں پر زور دیا ہے۔ ایک یہ کہ اس کو خود اسی سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے اور دوسرے یہ کہ اگر تفاسیر و احادیث کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں کیا جائے تو عقل و درایت کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہئے کیونکہ یہ بھی بہرحال دماغ انسانی ہی کی پیداوار ہیں اور سہو ونسیان، لغزش و غلطی بلکہ تحریف و خدع سے بھی پاک نہیں ہوسکتیں۔

اسلام اور تعلیمات اسلام کی سادگی و پاکیزگی کو جس چیز نے تباہ کیا ہے وہ صرف مجموعۂ احادیث ہے، کیونکہ

تفاسیر کی بنیاد دیگر حدیثوں ہی پر قائم ہے اور تفسیروں ہی کو دیکھ کر لوگ قرآن پاک سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔
آدم کے متعلق جو فسانہ اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اس کے خاص خاص ٹکڑے یہ ہیں :-

۱- آدم نام اس مخصوص فرد نوع انسانی کا ہے جو سب سے پہلے مٹی سے تعمیر کیا گیا اور جنت میں رکھا گیا۔
۲- ان کے پہلو سے حوا ان کی بیوی پیدا کی گئیں
۳- تمام ملائکہ نے انھیں سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہیں کیا اور اسی لئے وہ جنت سے نکالا گیا۔
۴- شیطان سانپ اور طاؤس کی مدد سے چھپ کر جنت میں پہونچا اور حوا کو بہکایا کہ آدم کو گیہوں کھانے پر آمادہ کریں۔
۵- آدم نے گیہوں کھایا اور اس جرم میں وہ مع حوا کے جنت سے نکال کر نیچے زمین پر پھینک دئے گئے

یہ تمام باتیں جو عام طور پر مشہور ہیں صرف ان غلط روایات کا نتیجہ ہیں جنھیں احادیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کو کلام مجید سے زیادہ اعتماد حاصل ہے۔ ورنہ خود کلام پاک میں کسی جگہ ان لغویات کا ذکر نہیں ہے۔
قرآن میں آدم کا قصہ آٹھ جگہ بیان ہوا ہے اور ان تمام آیات کے مطالعہ سے صرف حسب ذیل باتیں محقق ہوتی ہیں :-

۱- خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ یا آدم پیدا کرنا چاہا۔
۲- ملائکہ نے مخالفت کی کہ وہ سوائے خونریزی کے اور کچھ نہ کرے گا
۳- خدا نے آدم کو علم اسمار سکھایا اور ملائکہ اپنے تئیں اس باب میں عاجز پاکر سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا
۴- آدم اور ان کی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم ملا اور شجرۂ ممنوعہ کے پاس جانے کی ممانعت کر دی گئی
۵- لیکن شیطان نے انھیں بہکایا اور وہ جنت سے نکالدئے گئے

اس بحث میں چند امور قابل غور ہیں :- آدم سے مراد کیا ہے — ملائکہ اور ابلیس کا کیا مفہوم ہے — شجرۂ ممنوعہ سے کس چیز کو تعبیر کیا گیا ہے اور جنت سے نکالدئے جانے کا کیا مطلب ہے۔
جن لوگوں نے آدم سے کوئی خاص شخص مراد لیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے، کیونکہ خود کلام مجید ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم سے مراد نوع انسانی ہے ملاحظہ ہو سورۂ ص ارشاد ہوتا ہے :-

اذ قال ربک للملائکۃ انی خالق بشراً من طین فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین۔
یہاں بھی وہی خلق آدم کا قصہ بیان ہوا ہے لیکن بجائے لفظ (آدم) کے (البشر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔
اس لئے اگر تفسیر قرآن بالقرآن کو پیش نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ آدم سے مراد کوئی مخصوص ہستی نہیں ہے۔

بلکہ ساری نوع انسانی مقصود ہے۔ جب یہ امر متحقق ہوگیا تو اب اس افسانہ کا رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں ملائکہ کا سوال و جواب، شیطان کا وجود و انکار، آدم کا شجرۂ ممنوعہ کے پاس جانا اور جنت سے نکالا جانا سب بیان و استعارہ و کنایہ میں داخل سمجھا جائے گا۔ اس لئے اب دریافت طلب امر صرف یہ رہجاتا ہے کہ اس انداز بیان سے فی الحقیقت کیا ظاہر کرنا مقصود ہے۔

جن لوگوں نے ملائکہ سے کوئی خاص مخلوق (نوری، پردار) سمجھی ہے انھوں نے صرف عہد جاہلیت کے عقاید کا تتبع کیا ہے، کیونکہ ظہور اسلام سے قبل عام طور پر فرشتوں کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک خاص قسم کی مخلوق ہے جو آسمان سے زمین تک تگ و دو میں مصروف رہتی ہے اور دیویوں اور دیوتاؤں کی کارکن جماعت ہے۔ حالانکہ ملائکہ سے صرف وہ قوتیں مراد ہیں جو کائنات میں بروئے کار نظر آتی ہیں اور بعض اکابر اسلام نے نہایت وضاحت سے اس کو ظاہر کیا ہے۔ اس لئے جب ملائکہ سے مراد صرف قوا رعالم ہیں تو ظاہر ہے کہ ابلیس عبارت ہو گا صرف اس قوت سے جو بدی کی طرف مایل کرتی ہے اور لفظ شجر استعارہ ہو گا عدوان و بغاوت یا شر و فساد سے کیونکہ جس طرح ایک درخت کی شاخیں پھوٹتی ہیں اسی طرح بدی کے اثرات بھی وسیع ہوتے ہیں۔

خود کلام مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شجر سے مراد شجر معصیت ہے۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں آدم کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

"فوسوس الیہ الشیطان قال یا آدم ہل ادلک علی شجرۃ الخلد و ملک لا یبلیٰ"۔

اس میں معصیت کو شجرۃ الخلد اور لازوال مملکت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے ان آیات میں صرف فطرت انسانی سے بحث کی ہے اور تنبیہ کی ہے کہ اگر انسان نے اپنی قوت تمیز سے کام نہ لیا تو اس کا گمراہ ہو کر برکات فطرت سے محروم ہو جانا یقینی ہے۔

خدا کا آدم کو علم اسماء سکھانا اور ملائکہ کا سجدہ میں گر پڑنا اشارہ ہے اس طرف کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان تمام قوا رعالم کو اپنے قابو میں لے آسکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ابلیس کا ذکر کرکے گویا یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ باوجود ان تمام اقتدارات کے انسان کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو سخت نقصان پہونچا لیتا ہے۔

اسلامی لٹریچر میں جو تمام حشو و زواید نظر آتے ہیں وہ یہودیوں کی روایات سے ماخوذ ہیں۔ کیونکہ توریت میں بھی آفرینش آدم کا قصہ تقریباً اسی انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن یہود نے اس کو بھی مسخ کرکے پیش کیا اور چونکہ وہ لوگ اس کو حقیقتاً ایک واقعہ سمجھتے تھے اس لئے مسلمان راویوں نے بھی انھیں کی پیروی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اب یہ خیال اسقدر سختی کے ساتھ دلنشیں ہوگیا ہے کہ اس کا دور کرنا آسان نہیں۔

مطبوعات موصولہ

صحیفۂ ادب | جناب شیخ عبدالرحمان طارق منشی فاضل کی تصنیف ہے جو مشتمل ہے فن شاعری کی حقیقت پر اور ایک بسیط مقدمہ پر جس میں میرزا غالب کے دیوان اُردو پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پہلا عرض حال کے سلسلہ میں اس تصنیف کے اسباب تخلیق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جا بجا بالکل بلاضرورت عربی مقولے اور آیات قرآنی استعمال کرکے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف عربی زبان سے بھی واقف ہے۔ جا بجا اشعار کا صرف بھی آورد و تصنع سے خالی نہیں ہے اور انداز تحریر میں ایک خامکارانہ پندار پایا جاتا ہے جو نہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے نہ ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ باب اول میں شاعری کی حقیقت پر تقریباً تمام ان مسایل کو لے لیا گیا ہے جو ایک سرسری نگاہ کے تحت میں آسکتے ہیں اور جن پر اس سے قبل بارہا خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ گفتگو کے دوران میں اساتذہ کے اشعار بھی مثال و سند کے طور پر پیش کئے ہیں جو چنداں اقتضاء محل کے خلاف تو نہیں ہیں لیکن ضرورت سے زیادہ یقیناً ہیں۔

اس کے بعد دوسرے باب میں مرزا کی اُردو شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور عشق و تصوف، اخلاق و فلسفہ، شوخی و محاکات، موسیقی و ترنم اور صنائع و بدائع سبھی کچھ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن زیادہ تر رجحان جیسا کہ انھوں نے خود ہی ابتدا میں ظاہر کیا ہے اس فیصلہ کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ:-

"غالب مشرق کا ایک نہایت ہی بلند پایہ فلسفی اور ماہر نفسیات ہے" مدعا یہ کہ وہ غزل کہنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو لیکن فلسفہ ضرور جانتا ہے۔

غزل میں فلسفہ و تصوف کی بدعت کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن اس کو تغزل کا صحیح معیار قرار دینا یہ حال ہی کی ذہنیت ہے جو مغرب کی ناقص تعلیم سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوئی ہے۔ نفسیات داں ہونا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے جو غالب یا کسی اور کے لئے طرۂ امتیاز قرار دیجائے، بچہ جو ماں کی گود میں کھیلتا ہے وہ بھی نفسیات سے واقف ہوتا ہے اور ایک فاتر العقل دیوانہ بھی اس سے نابلد نہیں ہوتا۔ رہ گیا فلسفہ سو اسکی حقیقت بھی اس سے زاید نہیں ہے کہ وہ "کسی چیز کی نسبت کچھ نہ جاننے" کا دوسرا نام ہے نہ حقایق و مسلمات

سے اسے کوئی واسطہ، نہ حرکت و عمل سے اسے کوئی تعلق۔ اس لئے اگر ایسی بیکار چیزوں سے منسوب کرکے غالب کا مرتبہ بلند کیا جاتا ہے تو بالکل "مالا یرضی بہ الشاعر" کی قبیل کی چیز ہے۔

غالب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کوئی فلسفی تھا اس کی حد درجہ توہین ہے اور نفسیات دانی اس سے متعلق کرنا اس کو احمق بنانا ہے۔ وہ شاعر تھا اور نہایت اچھا شاعر تھا لیکن صرف اس لئے کہ اسے معشوق سے وہ باتیں کرنا آتی تھیں جو ایک عاشق کے لئے موزوں ہیں نہ اس لئے کہ وہ معمائے حیات یا عقدۂ کائنات کا حل کرنے والا تھا۔ جب وہ کسی محبوب سے ملنے کی دعا کرتا تھا تو شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں دونوں کے اظہار کی تمنا دل میں رکھتا تھا اور پوری شاعرانہ تغزل ادا کرتا تھا لیکن جب وہ "وصل قطرہ و دریا" "وحدت شاہد و مشہود" کا نظریہ بیان کرنے لگتا تھا تو وہ مرتبۂ شاعری سے باہر ہو جاتا تھا۔ اس لئے میرے نزدیک غالب کے کلام پر فلسفہ و تصوف کے نقطۂ نظر سے بحث کرنا، اس کی "رندی و شاہد بازی" پر جو غزل کی صحیح محرک ہے ناقابل برداشت اتہام لگانا ہے۔

البتہ طارق صاحب نے اس عنوان و خیال سے ہٹ کر جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے ضرور اتفاق ہے اور میں غالب کو اس سے زیادہ تعریف کا مستحق سمجھتا ہوں جو انھوں نے کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں کافی محنت سے کام لیا ہے، لیکن چونکہ ان کی بالکل پہلی کوشش ہے اس لئے [illegible] سے پاک نہیں اور [illegible] ان کے ساتھ ایک ایسا تصنع اپنے اندر رکھتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لکھنے والا غالب سے زیادہ اپنی قابلیت لوگوں سے تسلیم کرانا چاہتا ہے۔

طباعت و کتابت کے لحاظ سے کتاب بہت پسندیدہ ہے اور ایک روپیہ آٹھ آنے میں دار التالیف ہندیکی دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

انبساطِ روح مجموعہ ہے جناب حاجی محمد عبد الغفور صاحب کے کلام کا جو شفیق و شوقی دو تخلص رکھتے ہیں ابتدا میں چند قصاید حمد و نعت و منقبت کے ہیں اور اس کے بعد چند نظمیں تصوف کے رنگ کی ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سرورِ جہل میں عرفان و علم ہیں مفقود ۔۔۔ بردنِ کیف ہے اندازۂ فریب شہود

ہے ذرہ ذرۂ دار فنا جہانِ فنا ۔۔۔ کہ ہر وجود میں ہے عالمِ عدم موجود

مناظرِ نظری یا مکاشفِ جگری ۔۔۔ تمام جلوے نیاز جمالِ بے خبری

میں نے دنیا کو کیا نورِ یقیں سے روشن ۔۔۔ خالقِ پردۂ ظلماتِ توہم ہوں میں

ممکن ہے اربابِ نظر ان اشعار کو نہایت بلند سمجھتے ہوں، لیکن میں ان کو بالکل لغو و مہمل کہتا ہوں۔

غزلیات میں بھی یہی رنگ غالب ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

یہ رازِ نہاں بھی دمِ سجدہ نظر آیا   حیرت ہے عجب شان سے بندہ نظر آیا
چھایا ہوا ہر سمت مرا کیف نظر تھا   پردہ جو اُٹھایا ہی تو پردہ نظر آیا
ہے خلوتِ دل میں بھی وہی شانِ حیا کی   پردہ میں بھی آخر مجھے پردہ نظر آیا
کیا دیکھئے بے حجاب ترا جلوۂ جمال   اُٹھتا نہیں ہے آنکھ سے پردہ نگاہ کا
چشمِ بد دور ہے کیا خاک شدہ دل میرا   رکھتے ہیں اہلِ نظر آنکھ میں حاصل میرا
اس حُسن پہ چھایا ہے مرا حُسنِ نظر بھی   معلوم نہیں ہے کہ نہیں تم کو خبر بھی

یہ صاحب اس وقت الہ آباد ہی میں موجود ہیں جہاں اصغر صاحب کا قیام ہے اور ہر چند انھوں نے اپنی شاگردی کے متعلق کچھ نہیں لکھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح اصغر صاحب ہی سے لیتے ہیں، ورنہ یہ اندازِ بیان اور مسائلِ تصوف پر اتنا عبور حاصل ہونا یوں ممکن نہ تھا۔

یہ عجیب و غریب مجموعۂ نظم غیر مجلد ایک روپیہ میں مہدی علی خاں کتب فروش چوک الہ آباد سے مل سکتا ہے۔

مختصر تاریخ ادبِ اُردو اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ چونکہ اس کے مصنف سید اعجاز حسین صاحب ایم۔اے خود الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے لکچرر ہیں اس لئے جو کچھ لکھا گیا ہے "بہ شیوۂ کار آگہاں" لکھا گیا ہے "کار آگہی" اس لحاظ سے بھی کہ جس شخص کی نسبت جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر لکھا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ جو کچھ نہیں لکھا وہ بھی سوچ سمجھ کر نہیں لکھا۔

ہر چند ایک نقاد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ نکتہ چینی بھی ضرور کرے لیکن خلافِ حقیقت کسی کی مدح سرائی بھی اس کا فرض نہیں ہے۔ سید سلیمان ندوی کی شگفتگیٔ تحریر و علمی تحقیق کا ذکر کرنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے لیکن اسی کے ساتھ یہ لکھنے پر کس نے مجبور کیا کہ وہ کورانہ تقلید سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اصغر صاحب کے کلام میں حقائق و معارف کا ذکر کرسکتے تھے لیکن یہ فیصلہ کرنا کیا ضرور تھا کہ ان سے اردو ادب کے ذخیرہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اعجاز صاحب نے اچھا کیا کہ اس کتاب میں کسی کا ذکر برائی سے نہیں کیا، اور نہ کسی جگہ خشونت کا اظہار کیا الا صاحب گل رعنا کے خلاف کہ انھوں نے کیوں آبحیات پر نکتہ چینی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر طلبہ کو اسی روداد پر فیصلہ کرنے کے لئے مجبور کیا گیا تو ان میں صحیح ذوقِ نقد کیونکر پیدا ہو سکے گا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک شعراء کے لئے مخصوص ہے اور دوسرا نثر نگاروں کے لئے۔ شاعروں میں انھوں نے خسرو سے لیکر ظریف تک سب کو لے لیا ہے اور نثر نگاروں میں میرامن سے لیکر علی عباس حسینی

تک کسی کو نہیں چھوڑا۔

حالات کے استقصار میں بھی انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا ہے اور جس حد تک مناسب سمجھا ہے نمونۂ کلام بھی پیش کر دیا ہے۔

یہ کتاب اعجاز صاحب نے صرف طلبہ کے لئے لکھی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس کی قیمت عہ ہے اور مصنف یا انڈین پریس الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

حدیث حسن جناب فطرت واسطی کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو مختلف رسایل میں شایع ہوئی ہیں۔ ابتدا میں اقبال احمد سہیل کا مقدمہ ہے اور اس کے بعد چند اہل نظر کی رائیں ہیں، جن میں ایک بے بصر حضرات میں ہی ہوں۔ فطرت کے کلام سے قارئین نگار ناواقف نہیں اس لئے اس پر نہ زیادہ کہنے کی گنجایش نہ ضرورت۔

فطرت کی شاعری میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے کہ انھیں معارف و حقایق لکھنے کا شوق نہیں ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے تاثرات کے تحت میں لکھتے ہیں اور آسمان و زمین کے قلابے ملانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے یہاں ندرت بھی کافی پائی جاتی ہے اور سلاست و حلاوت بھی۔ یہ مجموعہ ایک روپیہ میں شاہکار بک ڈپو گورکھپور سے ملتا ہے۔

الہامی افسانے اس کتاب کے مصنف جناب مرتضیٰ احمد خاں صاحب ہیں۔ اور اشاعت اس کی تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کی ہے جو خاص سلیقہ کے ساتھ کتابیں شایع کرنے میں بہت مشہور ہے۔

اس کتاب کا موضوع صرف ان واقعات کو پیش کرنا ہے جن کا ذکر تفصیلی یا اجمالی کلام مجید میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے حصہ میں ہابیل و قابیل، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت یونس کا حال بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں ان حوادث کا ذکر ہے جو گمراہ قوموں پر عذاب کی صورت سے نازل کئے گئے۔ چنانچہ طوفان نوح، آل فرعون کی غرقابی، اصحاب فیل کی تباہی وغیرہ کا ذکر اس حصہ میں پایا جاتا ہے۔

قطع نظر اس سے کہ ان قصص و حکایات کی حقیقت کیا ہے اور تفتیش و تحقیق کا فیصلہ ان کی صحت و عدم صحت کے باب میں کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخلاقی نصائح کی ان میں کمی نہیں اور اسی لئے ان کا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں۔

فاضل مولف نے جس زبان میں جس انداز سے ان کو بیان کیا ہے وہ اسقدر دلکش، اس درجہ لطیف و موثر ہے کہ ان کو پڑھکر واقعی افسانہ کا سا لطف آنے لگتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ الفاظ اکثر ثقیل و دقیق استعمال کئے گئے ہیں لیکن چونکہ مقصود یہی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اس کتاب کا مطالعہ کریں اس لئے چنداں حرج بھی نہیں ہے۔ کتاب کی قیمت کسی جگہ درج نہیں ہے لیکن ڈیڑھ دو روپیہ سے کیا کم ہوگی۔

نکہت رائگاں

مسٹر لطیفی لودھیانوی بی۔ اے کے چند چھوٹے چھوٹے ادبی مقالات کا مجموعہ ہے جنمیں سے بعض ترجمہ ہیں اور بعض طبعزاد۔ لطیفی صاحب ادبائے جہد و یت کے سلسلہ میں (جس سے انھیں خدا جانے کیوں انکار ہے) کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بہت ذہین واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے لئے ایک الگ جگہ بنالی ہے اور مجھے امید ہے کہ جب وہ جوانی کے طوفان سے گزر کر سن و قوت تک پہونچیں گے تو وہ خود اپنے رنگ سخن میں اتنی تبدیلی پیدا کرلیں گے کہ نہ مجھے لکھنے کی ضرورت ہوگی نہ کسی اور کو۔

قیمت [illegible] درج نہیں [illegible] جو حضرات اس کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ ادارہ مطبوعات شاطر و یکفیلڈ گنج لودھیانہ سے طلب کر سکتے ہیں۔

ذکر نبی

اس کے مؤلف جناب بسیر الدین صاحب ہاشمی ہیں [illegible] انھوں نے مختصراً رسول اللہ کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جنھوں نے ان کو ایک انسان اعظم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ کتاب کی زبان صاف و سلیس ہے اور سیچے جوش سے لبریز۔ بارہ آنے میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

موازنۂ صلیب و ہلال

تالیف ہے [illegible] میں عہد حاضر کے [illegible] کے لحاظ سے از بس مفید و کارآمد ہے۔ یہ کتاب [illegible] و حصارت [illegible] ہے جس میں ایک ترقی کرنے والی یا ترقی یافتہ قوم کے جملہ اکتسابات، واقدامات کو پیش نظر رکھ کر [illegible] گئی ہے۔

مسلمانوں نے اپنے عہد [illegible] میں علوم و فنون کی جتنی خدمت کی ہے وہ [illegible] تاریخ سے پوشیدہ نہیں شاید اس کا تفصیلی علم بہت کم حضرات کو حاصل ہوگا کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو جس یوروپین تمدن و سیاست سے واسطہ پڑا وہ کیا تھا اور مشرق و مغرب کے اس اتصال تہذیب سے کون کسدرجہ متاثر ہوا۔ نکہت صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس پہلو کو سامنے رکھکر لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خوب لکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر وہ شخص جسکو

تاریخ سے دلچسپی ہے اس کا مطالعہ کرے۔ اس کی قیمت ۱۲؍ ہے اور فاضل مولف سے بہ وساطت انجمن اسلام ہارنبائی روڈ فورٹ بمبئی مل سکتی ہے۔

عروس ادب مجموعہ ہے جناب ظریف دہلوی کے چودہ افسانوں کا جو مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ ظرافت صاحب منجملہ اُن چند افسانہ نگاروں کے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے پلاٹ کی وضع و ترکیب سے قصے کہانیوں میں بھی واقعاتی رنگ بھر دیتے ہیں اور اسی لئے پبلک میں بہت مقبول ہیں۔ جیسا کہ شاہد صاحب نے اپنے تعارف میں ظاہر کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے اور کسی ایک فسانہ کا پڑھ لینا گویا ساری کتاب کو ختم کر دینے پر مجبور ہو جانا ہے۔ وہ لوگ جو واقعی لائٹ لٹریچر (تفریحی ادب) کے شایق ہیں، ان کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

گنجینۂ معرفت منظوم ترجمہ ہے بھگوت گیتا کا جسے راج کشور صاحب احقر جالسی نے مرتب کیا ہے۔ بھگوت گیتا دنیا کے اُن چند مخصوص صحایف میں سے ہے جو اپنے قبول و شہرت کے لحاظ سے الہامی کہے جاتے ہیں اور اس لئے اس کا مطالعہ بین الاقوامی تعلقات استوار کرنے کے لئے ضروری ہے۔

یوں تو اس کا ترجمہ اس سے پہلے بھی اُردو میں ہو چکا ہے لیکن مثنوی کے انداز سے لکھنے کی کوشش کسی نے نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ نظم کا میدان ترجمہ کی دقتوں کو دیکھتے ہوئے بہت محدود ہے لیکن احقر صاحب نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ اصل کتاب کے مطالب کا احاطہ کر لیں۔ فن شعر یا نظم کے لحاظ سے نہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہ گنجایش کیونکہ ایسی کتابیں نہ فنی حیثیت سے پیش کی جاتی ہیں نہ اس نقطۂ نظر سے ان پر تبصرہ مناسب ہے۔ یہ کتاب ایک روپیہ میں مترجم سے مڈل اسکول تیلوئی (اودھ) سے مل سکتی ہے جہاں وہ ہیڈ ماسٹری کی خدمت پر مامور ہیں۔

مکتوبات امجد سید احمد حسین صاحب امجد کے چند مکتوبات ہیں جنھیں ان کے شاگرد مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے شایع کیا ہے۔ جناب امجد حیدرآباد کے مخصوص سخنوروں میں شمار ہوتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ سادہ رباعیاں لکھنے میں بہت مشہور ہیں۔

ان کی نثر نگاری کا کوئی خاص کارنامہ ہمارے سامنے نہیں آیا تھا۔ اب ان خطوط نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ خطوں کا انداز بھی سادگی کے لحاظ سے بالکل ان کی رباعیوں کی طرح ہے اور کوئی خاص بات قابل اعتنا ان میں نہیں پائی جاتی۔ یہ کتاب ۸؍ میں شمس المطابع عثمان گنج حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

محمد مصطفٰے دو جزو کا چھوٹی تقطیع پر نہایت ہی مختصر رسالہ ہے جو آنسہ زہرا بیگم دختر محمد حسن صاحب انجنیئر اٹاوہ نے مرتب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۳۲ صفحات میں اس موضوع پر کیا لکھا جا سکتا ہے تاہم اس

لحاظ سے کہ ایک خاتون نے غزل اور افسانوں سے ہٹ کر ایک کام کی بات پر وقت صرف کیا ہے، قابل قدر ہے۔ بچوں اور عورتوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا اور شاید انھیں کے لئے یہ رسالہ لکھا بھی گیا ہے۔ قیمت ۲ روپے اور

ملنے کا پتہ :- بچوں کا کتب خانہ ۵ کلا یورو ڈنی دہلی۔

مثنویات تصنیف ہے جناب محمد امیر احمد صاحب علوی بی اے کی موضوع نام سے ظاہر ہے۔ فاضل مصنف کا ایک مضمون اس موضوع پر نگار کی جنوری ۳۵ء کی اشاعت میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اب اسی مضمون کو زیادہ بسط کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ اردو کی مثنویوں میں ایسا جامع مضمون اس سے قبل میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ اور اگر ہو بھی تو وہ زبان اس میں نہ ہوگی جو جناب امیر علوی کی انشار کی خصوصیت ہے۔ یہ کتاب ۱۲ر میں امیر محل لائبریری کاکوری (لکھنؤ) سے ملسکتی ہے۔

مطالعۂ حدیث یہ تالیف جناب سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے کی ہے اور تکمیل ہے اس مضمون کی جو نگار میں شایع ہو رہا تھا اور جس پر ملک میں کافی ہنگامہ میرے اور ان کے خلاف برپا کیا گیا۔ ابتدا میں مولانا اسلم جیراجپوری نے ترتیب احادیث اور ان کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے جو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہے اس کے بعد اصل تالیف شروع ہوتی ہے جس میں تدوین احادیث پر نظر ڈالتے ہوئے اسرائیلیات، زندیقیت، دجال، معراج، قتل مرتد، غلامی، اوقات نماز، ایام صیام اور زکوۃ کے متعلق تمام احادیث پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ بات اب راز نہیں رہی کہ اسلام کو جس چیز نے غارت و برباد کیا ہے وہ صرف مجموعۂ احادیث ہے جس نے مسلمانوں سے درایت کی اہلیت چھین کر ذہنی غلامی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لئے اس نوع کی تصانیف کا رواج یاناحقیقتاً مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے ــــ ہر چند مجھے بعض مقامات پر مصنف علام کی تحقیق سے اختلاف ہے لیکن ان کی نیت کی صداقت مجھے ہر جگہ تسلیم ہے ــ یہ کتاب ۸ہ میں دفتر بلاغ امرت سر سے ملسکتی ہے۔

تنقید الاحادیث تالیف ہے جناب محمد عباس صاحب طالب صفوی کی جو صرف خاندان کے لحاظ سے شیعہ ہیں لیکن مذہب کی حیثیت سے یکسر آزاد خیال۔ جمع احادیث کے باب میں جو بے راہ روی اہل تسنن کے یہاں اختیار کی گئی وہی حضرات شیعہ کے یہاں بھی پائی جاتی ہے اور اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسی کی طرف توجہ کی ہے۔

اس میں تقیہ، مسایل حلال و حرام، نکاح و طلاق، خلع و متعہ وغیرہ متعدد مسایل پر شیعی احادیث کو سامنے رکھ کر ایسی بے لاگ و منصفانہ رائے دی ہے کہ اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ وہ حضرات جو مقبول احمد صاحب کی تصنیف مطالعۂ احادیث کو دیکھیں ان کے لئے اس کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے۔

یہ کتاب فاضل مولف سے شمس آباد (فرخ آباد) کے پتہ پر ملسکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

اعتبارات

انار

ایک بار انار کے قلب میں مجھے رہنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے سنا کہ اس کا ایک دانہ کہہ رہا ہے " ایک دن آنے والا ہے کہ میں زبردست درخت ہوں گا، ہوائیں میری شاخوں کے اندر سے گزر رہی ہوں گی، آفتاب کی کرنیں میرے پتوں پر چمک رہی ہوں گی اور میں فرط مسرت سے جھوم رہا ہوں گا"

دوسرے دانہ نے جواب دیا " یہ سب تمھارا خیال ہی خیال ہے، جب میں تمھاری طرح بچہ تھا تو میں بھی یہی خواب دیکھا کرتا تھا، لیکن جب میں ہر چیز کو اس کے صحیح مقیاس و معیار سے سمجھنے کے قابل ہوا تو پتہ چلا کہ یہ تمام تمنائیں لغو و دور از کار تھیں"

تیسرا دانہ بولا۔ " یقیناً کسی مستقبل عظیم کی توقع بیکار ہے"

چوتھے دانہ نے کہا۔ " اگر ہمارا مستقبل اتنا حقیر و تاریک ہے تو ہماری موجودہ زندگی بیکار ہے"

پانچواں دانہ بولا۔ " مستقبل کے متعلق یہ نزاع بالکل بیکار ہے جبکہ ہم کو اپنے حال ہی کی خبر نہیں"

چھٹا دانہ بولا۔ " میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم ہمیشہ یوں ہی رہیں گے جو اس وقت ہیں"

ساتویں دانہ نے کہا۔ " میرے ذہن میں تو مستقبل کی صورت واضح ہے لیکن افسوس ہے کہ میں اسے الفاظ سے ظاہر نہیں کر سکتا"

اس کے بعد آٹھویں، نویں اور دسویں دانے نے کچھ کہا اور پھر تمام دانوں نے ملکر ایک ایسا ہنگامۂ گفتگو پیدا کر دیا کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

میں نے انار کی سکونت اسی دن ترک کر دی اور سیب کے اندر رہنے لگا، اور چونکہ اس میں گنتی کے چند دانے تھے اس لئے میں زیادہ سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔

رات اور مجنون

مجنون۔ " اے رات میں بھی تیری ہی طرح تاریک و عریاں ہوں۔ میں ایک آتشین راستہ پر چل رہا ہوں جس کے اوپر میرے دن کے خواب چھائے ہوئے ہیں، اور جب میرے پاؤں زمین کو چھوتے ہیں تو وہاں سے ایک زبردست و

توی شاہ بلوط نمودار ہو جاتا ہے

رات ۔ "نہیں، اے مجنون، تو میری طرح نہیں ہے، کیونکہ تو ریگ زار پر اپنے نشانات قدم اب بھی دیکھنا چاہتا ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح خاموش و عمیق ہوں۔ میرے قلب میں ایک دیوی بستی ہے اور وہ ایک ایسے مولودِ سماوی کو اپنے بطن میں لئے ہوئے ہے جس میں دوزخ و جنت دونوں کا اقتران ہے۔"

رات ۔ "نہیں، اے مجنون تو میری طرح نہیں ہے، تو اب بھی آلام و مصائب کے سامنے کانپ اٹھتا ہے اور ہاویہ کی آواز سے تجھے لرزہ براندام کر دیتی ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح ابدی و صاحب جبروت ہوں میرے کانوں میں غلام قوموں کی آہ و بکا گونج رہی ہے اور ویران ممالک پر میرا ذیل حسرتوں سے لبریز ہے۔"

رات ۔ "نہیں، اے مجنون، تو میری طرح نہیں ہے کیونکہ تو ہنوز اپنی چھوٹی سی ہستی کو اپنا وفادار رفیق بنائے ہوئے ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات، میں بھی تیری ہی طرح ظالم و متکبر ہوں۔ میرا قلب بھی اسوقت تک خوش نہیں ہوتا جب تک سمندروں میں آتش زدہ جہازوں کے شعلوں کو نہ دیکھوں اور میرے ہونٹوں کے لئے اگر کوئی لذت ہے تو صرف ان بہادروں کے خون میں جو میدانِ جنگ میں تڑپ رہے ہوں۔"

رات ۔ "نہیں، تو ہرگز میری طرح نہیں ہے۔ کیونکہ تجھے تیرا شوق مسلط ہے اور وہ تجھے جہاں چاہتا ہے لیجاتا ہے، خود تیرے نفس نے کوئی القا تیرے لئے پیدا نہیں کی۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح عیش و طرب کا دلدادہ ہوں، جو شخص میرے ساتھ رہتا ہے وہ ہر وقت نشہ میں سرشار رہتا ہے اور ہر وہ عورت جو میری رفیق ہوتی ہے گناہ کرنے کے بعد مسرور نظر آتی ہے۔"

رات ۔ "نہیں تو میری طرح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تیری روح تہ بہ تہ بہت سے پردوں میں چھپی ہوئی ہے اور تیرا قلب تیری ہتیلی پر نہیں ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح ملول و حزیں ہوں میرے سینہ میں بھی بہت سے مخلص لوگوں کی یاد مدفون ہے۔"

رات ۔ "کیا واقعی تو میری طرح ہے۔ کیا تو بجلی کی تلوار ہاتھ میں لیکر آندھیوں کو اپنا مرکب بنا سکتا ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں تیری ہی طرح ہوں، تیری ہی طرح قدرت رکھتا ہوں، اور جب زمانہ میرے سامنے سے گزرتا ہے تو میرے دامن کو بوسہ دیتا ہوا گزرتا ہے۔"

رات ۔ "کیا تو میری طرح ہے۔ اے میرے سیاہ و تاریک قلب سے پیدا ہونے والی ہستی، کیا تو واقعی میری ہی طرح ہے کیا تجھے میرے ناقابلِ احاطہ افکار کا علم ہے اور کیا تو میری وسیع زبان میں گفتگو کر سکتا ہے؟"

مجنون ۔ "ہاں، اے رات، ہم تم دونوں توام بھائی بہن ہیں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ تو لانہایت کے رازوں کی مفسر ہے اور میں اپنے نفس کے رازوں کا شارح۔"

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمار (۵)	فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۳۶ء	جلد (۲۹)

ملاحظات ———— ۲
کیا مذہب کوئی فطری چیز ہے؟ ———— ۹
اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام ———— ۱۵
دلوں کی آگ ———— محمد ذوالفقار کیفی منشی فاضل ———— ۲۵
خودکشی ———— ۳۴
تاریخ کا ایک ورق مجہول ———— ۴۳
جاپانِ جدید ———— عبدالرحیم شبلی بی کام ———— ۴۸
بابُ الاستفسار ———— ۵۵
بابُ المراسلۃ ———— ۶۱
مکتوباتِ نیاز ———— ۶۸
منظومات ———— ذوقی ـ فطرت ـ نبی احمد ـ میکش ـ ماہر القادری ـ اختر ـ فضل اثر ———— ۷۱

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۵	مئی سنہ ۳۶ء	جلد ۲۹

ملاحظات

کانگرس اور اشتراکیت (سوشلزم)

امسال کانگرس کا انعقاد لکھنؤ میں ہوا اور چونکہ سال آیندہ ہندوستان میں ایک ایسے جدید دستور کا نفاذ ہونے والا ہے جس کے قبول کرنے پر یہاں کی آبادی راضی نہیں ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ بہت اہم تھا، پھر اسی کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو کا صدارت کے لئے منتخب ہونا ایک اور امر اضافی تھا جس نے کانگرس کو غیر معمولی اہمیت دیدی تھی۔

کانگرس میں صدر کی حیثیت، کابینہ کے وزیر اعظم کی سی ہوا کرتی ہے اور اکثر و بیشتر اسی کی پالیسی اور اسی کی ہدایت پر کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ پھر چونکہ کانگرس کا صدر اپنی پالیسی کا اعلان ہمیشہ اپنے خطبہ صدارت میں کردیا کرتا ہے اس لئے دنیا پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارتی تقریر سننے کی بیتابی سے منتظر تھی اور

س میں شک نہیں کہ اس خطبہ میں وہی سب کچھ تھا جسکو ایک فریق کی تمنا اور دوسرے فریق کے اندیشہ سے
تعبیر کرنا ناموزوں نہ ہوگا۔

پنڈت جی نے اپنے ذہن میں ہندوستان کے مستقبل کا جو خاکہ طیار کر رکھا ہے اور جس کے اعلان
و اظہار میں انھوں نے ہمیشہ غیر معمولی جرأت سے کام لیا ہے، کسی سے مخفی نہیں۔ وہ فطرتاً نہایت آزاد خیال
واقع ہوئے ہیں اور جب اس آزادی خیال کے ساتھ کسی ملک کی خود اختیاری کی تمنا کی جاتی ہے تو اسکے
معنے صرف ایک ہی ہوا کرتے ہیں یعنی - امارت و ملوکیت کا استیصال اور اشتراکیت (سوشلزم) کی اشاعت

قبل اس کے کہ میں پنڈت جی کی پالیسی پر تبصرہ کروں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اشتراکیت کا
مفہوم مختصر الفاظ میں سمجھا دوں۔

اشتراکیت کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ متاعِ عالم تمام افراد انسانی میں مشترک قرار دیجائے اور وہ سب
یکساں طور پر اس سے فائدہ اُٹھائیں - اس کی دو قسمیں ہیں ایک "اشتراکیت محض" دوسرے "اشتراکیت
تعاونی" اول الذکر کا مفہوم ابھی ظاہر کیا جا چکا ہے، موخرالذکر سے مراد یہ ہے کہ افراد انسانی تقسیم عمل کے
ماتحت خدمات انجام دیں اور نفع یا نتیجہ میں سب کا حصہ مساوی ہو۔ اگر کوئی فرد مجبوراً اپنا فرض ادا کرنے
سے قاصر ہو تو ہیئت اجتماعی (سوسائٹی) اس کی اعانت کرے - الغرض اشتراکیت کا مقصد یہ ہے کہ
سرمایہ داری اور جماعت عاملہ کے درمیان جو عدم توازن پایا جاتا ہے اس کو مٹا دیا جائے اور جمہور کی مدد
سے ایسا نظام حکومت قایم کیا جائے جس میں تمام افراد انسانی مساوی حیثیت رکھیں اور صرف دولت کو قوتِ
کاسبہ قرار دیکر مزدوروں کے حقوق مساوات کو پامال نہ کیا جائے۔ یہی وہ نصب العین ہے جس کے ماتحت اشتراکیین
عالم کے موجودہ نظام حکومت کو اُلٹ دینا چاہتے ہیں۔

اشتراکیت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا وجود اسی وقت سے پایا جاتا ہے جب سے دنیا میں
ملوکیت کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یونان قدیم میں والیاس نے جو قانون مرتب کیا وہ اسی اصول کا
حامی تھا، افلاطون نے یونانی جمہوریت کو قایم کیا تو اشتراکیت کو پیش نظر رکھ کر جس میں زمین، عورت اور غلام
کو مشترک ملکیت قرار دیا گیا تھا۔

دوسری صدی قبل مسیح میں بحر مُردہ کے ساحل پر رہنے والی جماعت جو فرقہ اسینیہ (essenes)
کے نام سے موسوم تھی اُصول اشتراکیت پر عامل تھی - دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ آڈمیٹا کے نام
سے نمودار ہوا اور یہ بھی اشتراک و مساوات پر عامل تھا۔ ہالینڈ میں متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قایم
ہوئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور وہ تھی جسے ۱۳۷۵ء میں جرار گروٹ نے قائم کیا تھا۔

عہد وسطیٰ کے جرمنی میں جو خونریز جنگ زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان ہوئی وہ بھی اشتراکیت کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی میں فرانس کے اندر سان سیموں، شارل دوریا اور برودُن نے اسی کی تبلیغ کی، انگلستان میں رابرٹ اوین نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی اور جرمنی کا کارل مارکس اس کا جتنا زبردست علمبردار تھا وہ تو سبھی کو معلوم ہے۔ اور زمانۂ حال میں سوویٹ حکومت اسکا زندہ نمونہ موجود رہی ہے۔ الغرض اشتراکیت کوئی نئی چیز نہیں ہے جس کا نام سنکر لوگ گھبرا اٹھیں، اسوقت بھی شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں اشتراکی جماعتیں نہ پائی جاتی ہوں اور اُن کی بے چینی سے حکومت متاثر نہ ہوتی ہو، چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی ایک اچھی خاصی جماعت اس خیال کی پیدا ہوگئی ہے جس کے ایک سربرآوردہ رُکن پنڈت جواہر لال نہرو بھی ہیں۔

کسی گزشتہ ماہ کے نگار میں 'کانگرس' پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ پنڈت جی چونکہ اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کا پروگرام بھی ویسا ہی ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ ایک جماعت اپنی ہمخیال پیدا کرکے کانگرس میں اکثریت حاصل کرلیں۔ لیکن اس پیشین گوئی کا ایک حصہ صحیح نکلا اور دوسرا غلط۔ یعنی ان کا خطبۂ صدارت تو بیشک اشتراکیت سے لبریز تھا، لیکن کانگرس میں وہ اشتراکی پروگرام کو کامیاب نہ بناسکے۔

پنڈت جی کے خطبۂ صدارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے موجودہ سرمایہ دارانہ اصول اور اس کی استعمارانہ ملوکیت کے سخت مخالف ہیں، اور ان کا نصب العین تقریبًا وہی ہے جو سوویٹ حکومت کے پیش نظر ہے، یعنی وہ ہندوستان کو انگلستان سے بالکل علحدہ کرکے بالکل آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسی قومی حکومت کے متمنی ہیں جو اعلیٰ طبقہ کو گراکر اور ادنیٰ طبقہ کو اُبھار کر تمام آبادی کو متوسط طبقہ کے معیار پر لے آئے۔ پھر قطع نظر اس سے کہ یہ تحریک ہندوستان کے لئے مفید ہے یا مضرت رساں برمحل ہے یا قبل از وقت، غور طلب امر صرف یہ ہے کہ آیا اس آرزو کی تکمیل یہاں ممکن بھی ہے یا نہیں۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ "ممکن نہیں ہے" اور اسی حقیقت کے اظہار کے لئے میں نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہے۔

دنیا میں علاوہ اشتراکیت کے اور بھی چند ڈراونی چیزیں حکومت کے لئے موجود ہیں جنھیں فوضویت (Anarchism) مشایقہ (Communism) اور عدمیت (Nihlism) کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ سب ایک ہی جذبہ کے مختلف مظاہر ہیں، لیکن سوائے اس کے کبھی کبھی اور کہیں کہیں ان تحریکوں نے وقتی ہنگامہ تو ضرور پیدا کردیا، کوئی پایدار کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس لئے ان لوگوں کو جو اس خیال کے حامی ہیں سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ اس ناکامی کا کیا سبب تھا

ور کیا وہ موانع جو اس سے قبل ان تحریکوں کی کامیابی میں حایل ہوئے ہیں اب یا کبھی دور ہو سکتے ہیں۔

اشتراکیت کا مفہوم و مدعا اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، کمیونزم بھی بالکل وہی چیز ہے، انارکزم و اس تحریک کی دوسری منزل سمجھئے جب حکومت سے کھلم کھلا بغاوت اختیار کی جائے اور نہلزم تیسری نزل جب حکومت کا کوئی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ان تمام منازل کو طے کرنے اور اصل مقصود تک پہونچنے میں تصادم و تضارب، ہنگامہ و فساد، قتل و خونریزی ضروری ہے، لیکن چونکہ نفس مدعا دنیا میں حقیقی مساوات پیدا کرنا اور سوسائٹی سے ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز کو اٹھا دینا ہے، اس لئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا ناکامیاب رہنا سخت ظلم ہے اور اگر آج نہیں تو کل، کل نہیں تو برسوں ضرور اس کو کامیابی حاصل ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید فطرت کو خود یہ منظور نہیں ہے کہ دنیا میں کبھی وہ مساوات پیدا ہو سکے جو اشتراکیین کے پیش نظر ہے اور انسان کی ذہنی افتاد اور اسکی دماغی ساخت مشکل ہی سے امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ کے مٹا دینے پر راضی ہو سکتی ہے۔

ایک انسان کی کوششیں صرف اس صورت میں بارآور ہو سکتی ہیں کہ وہ قانون قدرت کے ساتھ ساتھ چلے، چنانچہ عہد حاضر کے تمام ایجادات و اختراعات صرف نوامیس فطرت کے سمجھنے کے بعد ہی عالم ظہور میں آئے ہیں، اور ان میں سے کوئی ایک ایجاد بھی ایسی نہیں ہے جو قانون فطرت سے روگردانی کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہو۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم اشتراکیت کی کامیابی کا خواب دیکھیں خود فطرت انسانی پر غور کر لینا ضروری ہے۔ کائنات کا نظام صرف اضداد کے ظہور و تصادم پر قائم ہے، رات دن سیاہ و سفید، قوی و ضعیف، ادنیٰ و اعلیٰ، موت و حیات یہ وہ تمام مناظر و مظاہر ہیں جن سے دنیا کی ترتیب ہوئی ہے اور انھیں مختلف قوتوں کے تصادم پر ہنگامۂ زیست بلکہ دنیا کی رونق قائم ہے۔ قوی و ضعیف کی باہمی جنگ نباتات و حیوانات بلکہ تمام عالم حیات میں جاری ہے اور حقیقتاً زندگی عبارت ہے اسی فتح و شکست پر، اس لئے کوئی کوشش اس فطری اقتضار منافست کو مٹا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ انسان اگر عبارت ہے قوت عقل و شعور سے تو اس کے افراد میں عدم مساوات کا ہونا ظاہر ہے، اور ایک عقلمند کا بیوقوف کی حماقتوں سے فایدہ اٹھانا یقینی۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کی خودغرضی، نفس پرستی، اور غلبہ و انتقام کی خواہش کبھی محو نہیں ہو سکتی اور اسی جذبۂ تفوق و برتری کی بدولت دنیا نے اتنی ترقی کی ہے۔ اس لئے اصولاً کوئی وجہ نہیں کہ اشتراکیت اپنے صحیح معنے میں اب یا کسی وقت کامیاب ہو سکے لیکن اگر اس سے مراد کوئی ایسی آئینی حکومت ہے جو افراد کے باہمی فرق و امتیاز کو علی حالہٖ قائم رکھتے ہوئے، دولت و سرمایہ داری کی طمع کو اس حد تک مٹا دے کہ مزدوروں کے جایز حقوق پامال نہ ہونے

پائیں اور ایک انسان صرف اس لئے بھوکا نہ مرے کہ اس کے لئے دنیا میں کوئی کام نہیں ہے، یقیناً نہایت مبارک خیال ہے اور دنیا کا ہر وہ شخص جو درد دُکھ سے متاثر ہونے والا دل رکھتا ہے اس کی تائید کرے گا۔ حکومت برطانیہ تو خیر پارلیمنٹری حکومت ہے جس میں پبلک کی آواز کو کافی درخور حاصل ہے۔ اگر آپ دنیا کی کسی مستبد ترین شخصی حکومت سے سوال کریں گے تو وہ بھی اپنا نصب العین یہی ظاہر کرے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری زیادہ تر کس پر عاید ہوتی ہے۔ پبلک پر یا حکومت پر؟ یعنی اگر حکومت کوئی ایسا دستور مرتب کرے بھی تو کیا وہ مفید ہوسکتا ہے اگر خود ملک کی آبادی اس احساس مساوات کے ساتھ اسپر عمل کرنے کے لئے طیار نہ ہو۔

آپ دنیا کے بہتر سے بہتر دستور کو لے لیجئے لیکن وہ کبھی مفید نہیں ہوسکتا اگر اس پر عمل کرنے کے لئے خود ملک کی آبادی میں کامل اتحاد و تعاون کا جذبہ موجود نہ ہو۔ کیونکہ بہر حال حکومت کے ہاتھ پاؤں ملک ہی کے افراد ہوا کرتے ہیں اور جب انھیں میں احساس مساوات نہ ہوگا تو دستور و آئین کیا کرے گا اور ملک و قوم کو اس سے کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔

اشتراکیت کی ناکامی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مستبد حکومتوں نے ہمیشہ اسے بزور شمشیر مغلوب کیا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل سبب وہ ذہنی اختلاف تھا جو ملک کی جماعتوں میں پایا جاتا تھا اور اگر آج ہندوستان میں کوئی وجہ اس کی ناکامی کی ہوسکتی ہے تو صرف یہی۔ بلکہ یہاں تو اس کی عدم کامیابی کے اور زیادہ قوی اسباب موجود ہیں، کیونکہ اول تو یہاں کی آبادی زیادہ ہے کہ اس کو یا اس کی اکثریت کو کسی ایک مرکز پر جمع کرنا یونہی سخت دشوار ہے چہ جائیکہ اسوقت جبکہ ذہنی و معاشرتی اختلافات کی بنا پر سیکڑوں کیا ہزاروں جماعتیں ملک کے اندر پائی جاتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت خالص اقتصادی تحریک ہے اور جس حد تک معاشی دشواریوں کا تعلق ہے ہندوستان کی اکثر آبادی کو اس پر متفق ہو جانا چاہئے، لیکن اس کا کیا علاج کہ معاشیات سے کہیں زیادہ یہاں روایتی تہذیب و زندگی کو اہمیت دیجاتی ہے اور یہ اختلافات اتنا زبردست ہے کہ اس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہوسکتی۔ مغرب میں اشتراکیت کی مخالفت کرنے والے وہی ہیں جو صرف سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے ہیں ورنہ یوں معاشرت و تہذیب، ذہنی میلان و عواطف کے لحاظ سے وہ سب ایک ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے ہندوستان میں ایک سے زاید مخالف قوتیں اشتراکیت کی راہ میں حایل ہیں۔ اگر یہاں سوال صرف سرمایہ داری کا ہوتا تو توقع کی جاسکتی تھی کہ شاید کسی وقت اسکو مجبور کیا جاسکے، اگر سوال صرف اقتصادی دشواری کا ہوتا تو بھی ممکن تھا۔ تمام افراد ایک دوسرے سے

مد ہونے پر کسی وقت مجبور ہو جائیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ یہاں کے انسان کو فاقہ کرنا منظور ہے،
دام رہکر جینا گوارا ہے، لیکن وہ یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ بنارس کے گنگو گھاٹ پر ایک ہی وقت میں اذان بھی
رہی ہو اور ناقوس بھی بج رہا ہو۔

پھر جس ملک کی آبادی اس درجہ ذلیل ذہنیت رکھتی ہو، جس کی زندگی عبارت ہو صرف روایات
پرستش سے، جس نے حیات کا مقصود صرف پوجا پاٹ یا طاعت و عبادت قرار دے رکھا ہو، جو اپنے
م اعمال و افعال کے نتائج کو حیات بعد الموت پر اٹھا رکھے، جہاں انسانیت کا معیار انسان ہونا نہیں بلکہ
سلمان یا کافر ہونا ہو، جو ایک گائے کے لئے انسان کا خون بہا دینا جایز سمجھتی ہو، جو ناقوس بجانے کے جرم
ں انسانوں کے گھر پھونکدینے میں تامل نہ کرے اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اشتراکیت کے اصول کو قبول
رسکتی ہے، حد درجہ غیر دانشمندانہ فیصلہ ہے ــــ اصل چیز جو تمدنی و عمرانی نظام کو دسیع و پر امن بنانے والی ہے
وہ انفرادی و اجتماعی طور پر قلب و ضمیر کی صفائی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام آبادی کسی ایک
مذہب کو اختیار کرے یا پھر یہ کہ سرے سے مذہب ہی کو فنا کر دیا جائے۔ اس لئے اگر پنڈت جواہر لال نہرو
ان دونوں میں سے کسی ایک صورت کو کامیاب بنانے پر قادر نہیں ہیں، تو اشتراکیت کا پرچار بھی کوئی معنی
نہیں رکھتا اور اپنا سر کھپانا ایک ایسی ہی غیر مشکور سعی جس پر ان جیسے ذہین و قوت عمل رکھنے والے انسان کو کبھی راضی نہ ہونا چاہئے۔
ٹھیک اسی وقت جبکہ لکھنؤ میں پنڈت جواہر لال نہرو اصول اشتراکیت کو کامیاب بنانے کیلئے دستور جدید کے رد کر دینے اور افراد حکومت
سے کٹ جانیکا درس دے رہے تھے، یہیں لکھنؤ کا ایک معزز فرد بمبئی میں مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر بیٹھا ہوا یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں دستور جدید
کی پذیرائی نہایت خوشدلی سے کرنا چاہئے اور حکومت سے مل کر جو کچھ حاصل کر سکتے ہوں اُسے ہاتھ سے نہ دینا
چاہئے ــــ ادھر کانگرس کے خطبہ صدارت کی آواز (جو اشتراکیت یا بالفاظ دیگر کامل اتحاد و مساوات کی آواز ہے)
ہنوز فضا میں گونج رہی تھی اور ادھر پونا کے ہندو مسلمان آپس ہی میں لڑ کر سیکڑوں کی تعداد میں ہلاک و مجروح
نظر آ رہے تھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیا تماشہ ہے، یہ کس نوع کا کھیل ہے، یہ کیسی سیاسی رہنمائی ہے اور وہ کون
ہے جو اس تاریک مذہبی ذہنیت کے ماحول میں آزادی و اتحاد کی مشعل روشن کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے خطبہ صدارت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہم کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں پڑ کر
بڑے کاموں کو پس پشت نہ ڈال دینا چاہئے، انھوں نے چھوٹے کاموں کی فہرست میں فرقہ وارانہ اختلاف کو رکھا ہے اور
بڑے کاموں میں دستور جدید کو کامیاب نہ ہونے دینا، حالانکہ اسوقت سب سے زیادہ اہم اور سب سے بڑا کام اگر کوئی
ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ فرقہ بندی کے جذبات کو محو کیا جائے اور آئے دن کی لڑائیاں ہندو مسلمانوں کی ختم ہو جائیں
اگر اس میں کامیابی حاصل ہو جائے تو دستور جدید کو ناکامیاب بنانیکا بڑا کام نہایت معمولی کام رہجاتا ہے۔ دستور جدید کے

وضع کرنے والے یقیناً اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستان جو مذہبیت کی بلا میں گرفتار ہے کبھی کوئی متفقہ محاذ پیدا نہیں کرسکتا اور اس لئے وہ جو دستور بھی بنائیں گے اسکو بزورِ مشت نافذ بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ خود ہمارے ہندوستان کے رہنے والے قاید و رہنما ابتک اس سے بیخبر ہیں کہ آزادی کی راہ میں جو چیز حایل ہے وہ نہ برطانیہ کی مستعمرانہ پالیسی ہے، نہ اسکی مستبدانہ ملوکیت، بلکہ وہ ہمارا جہل ہے، ہماری قدامت پرستی ہے، ہماری روایتی زندگی کی بندشیں ہیں، ہمارے مذہبی معتقدات کی زنجیریں ہیں اور ہمارا یہ یقین کہ فلاں ملیچھ ہے اور فلاں کافر۔

ہندو مسلمانوں کی زندگی کے جس پہلو پر نگاہ ڈالئے اس سے اختلاف و عناد مترشح ہے۔ ان کی وضع و قطع، ان کا ملبوس، ان کی رفتار و گفتار، ان کی غذا، ان کی معاشرت، ان کا ذوق، ان کی زبان، غرضکہ زندگی کی ہر ہر چیز میں ایک دوسرے سے اختلاف پایا جاتا ہے اور اختلاف بھی اتنا شدید کہ اس سے نفرت و استکراہ کی کیفیت پیدا ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جواہر لال نہرو کس دل سے اس مسئلہ کو غیر اہم قرار دیتے ہیں اور اس کو حل کئے بغیر ان کو آگے قدم بڑھانے کی جرأت کیونکر ہوسکتی ہے۔ یقیناً اس میں کوئی راز پنہاں ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہ کرنا چاہیے کہ یہ راز سوائے اسکے اور کوئی نہیں کہ ہندو قوم اب مسلمانوں سے بے نیاز ہوکر منزل تک پہونچنا چاہتی ہے اور اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر مسلمان اس کی راہ میں حایل ہوئے بھی تو وہ ان کو پامال کرکے گزر جائے گی ـــ "ہندوستان! ہندو راج! ہندو معاشرت! ہندو زبان!" یہ ہے اُن تمام ہندو تمناؤں کا ماحصل جس پر کانگرس اور تمام ہندو جماعتوں کے جد و جہد کی بنیاد قایم ہے۔ ہندو جانتے ہیں اور یہ جاننا ان کا غلط نہیں ہے کہ ملک میں ان کی اکثریت ہے (اور اگر مہاتما گاندھی کی تحریک چھوت ادھار کی کامیاب ہوگئی تو اس اکثریت کی قوت کا اور زیادہ بڑھ جانا لازم۔) اسی کے ساتھ وہ اس راز سے بھی آگاہ ہیں کہ برطانوی حکومت ہمیشہ اکثریت کے سامنے جھکا جایا کرتی ہے، اس لئے اگر ان میں ہندو راج قائم کرنے کا جذبہ پایا جائے تو بے محل نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی حکومت ایسی قایم ہو بھی گئی تو کیا وہ حقیقی معنی میں ملک و وطن کی آزاد حکومت ہوگی اور کیا مسلمانوں کی آٹھ نو کرور کی آبادی کوئی ایسی معمولی چیز ہے جسکو نظر انداز کرنے کے بعد وہ غیر ملکی عناصر سے ملک کو بالکل پاک کرسکیں گے۔ پھر یہ ہوسکتا ہے کہ ہندو، نظام حکومت پر چھا کر مسلمانوں کو ملازمتوں سے محروم کردیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اس سے زیادہ اقتصادی دشواریوں میں مبتلا کردیں، لیکن جس چیز کا نام ملک و وطن کی آزادی ہے وہ اسوقت تک کبھی حاصل نہیں ہوسکتی جب تک یہاں دو کا جھگڑا طے کرنے کے لئے تیسرے کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

میرا سفر گرما قصد ہے کہ مئی کے پہلے ہفتہ میں لکھنؤ کے جہنم زار کو چھوڑ کر چند دن کہیں اور بسر کروں جن میں سب سے پہلے ڈیرہ اسماعیل خاں میں اپنے عزیز دوست جناب اخوند فیض محمد صاحب فاروقی کے پاس قیام کا ارادہ کر رہا ہوں، وہاں سے میراں شاہ (وزیرستان) اپنے مخلص کرمفرما خان بہادر سردار محمد نواز خاں صاحب اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کے پاس جاؤں گا اور انھیں کی معیت میں بنوں اور کوہاٹ وغیرہ ہوتا ہوا چند دن رزمک میں رہوں گا جو بقول اخوند صاحب کے اپنے موسم کے لحاظ سے شملہ اور رونق کے لحاظ سے مختصر سا کلکتہ ہے۔ امید ہے کہ اس دوران میں برشگالی ہوائیں چلنے لگیں گی اور جس وقت لکھنؤ واپس آؤں گا تو بادِ سموم کے جھونکے (جنھیں میں "[illegible]" کہتا ہوں) ختم ہو چکے ہوں گے۔ جو احباب اس زمانہ میں مجھ سے خطاب کرنا چاہیں وہ دفتر نگار ہی کے پتہ سے خط و کتابت فرمائیں، کیونکہ یہاں سے میرے نام کی ڈاک روز روانہ ہوتی رہے گی۔ علاوہ اس کے ممکن ہے کہ آخر وقت میں کچھ اسباب ایسے پیدا ہو جائیں کہ میں یہ سفر اختیار ہی نہ کرسکوں۔

کیا مذہب کوئی فطری چیز ہے؟

ایک زمانہ اس عاقل و ذیہوش انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب مذہب سے الگ تو خیر بڑی چیز ہے اسکی حقیقت پر غور کرنا بھی معصیت خیال کیا جاتا تھا اور اس قسم کی بحث گویا توہین خداوندی کے مترادف تھی چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک اس مذہبی گرفت اور ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ کائنات کو انسان نے خدا اور شیطان کے درمیان تقسیم کر رکھا تھا یعنی تمام اچھی باتیں خدا سے منسوب کی جاتی تھیں اور بری باتیں شیطان سے۔ گویا انسان ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا آلہ تھا جو خود نہ کوئی بات کرسکتا تھا اور نہ وہ کسی امر کا ذمہ دار قرار پاسکتا تھا۔

لیکن اب کہ دنیا کی ہر چیز ہر کیفیت پر علمی و تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے اور ایک ایک ذرہ سے لیکر پہاڑوں کی سربفلک چوٹیوں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو مطالعۂ علم و تحقیق سے باہر ہو، مذہب کا بچنا دشوار تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ علم کی دراز دستی سے محفوظ رہ سکتا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علم یا سائنس کا تعلق صرف مادی چیزوں سے ہے اور مذہب چونکہ روحانی چیز ہے اس لئے سائنس کی رسائی وہاں ممکن نہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ سائنس کا تعلق جس طرح مادی چیزوں سے ہے اسی طرح غیر مادی اشیاء سے بھی ہے۔ اگر وہ کمیت سے بحث کرتا ہے تو کیفیت بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ چنانچہ نفسیات جس کا تعلق نفس سے ہے، وجدانیات یا جمالیات جس کا تعلق حسن و جمال سے ہے، اخلاقیات جو انسان کے اخلاق سے متعلق ہے اور اسی طرح کے دیگر علوم سب غیر مادی چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

سائنس فی الحقیقت نام ہے ایک صحیح اور بے لاگ انتقادی مطالعہ کا خواہ اس کا موضوع کوئی مادی چیز ہو یا غیر مادی اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب جو ہزاروں سال سے انسانی رجحانات پر حکمرانی کرتا چلا آرہا ہے محض اس لئے کہ اس کا تعلق روح و روحانیات سے ظاہر کیا جاتا ہے تحقیق علمی کے حدود سے باہر رکھا جائے۔ چنانچہ آج کی صحبت میں ہم اس موضوع پر خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کرکے دیکھیں گے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور وہ انسانیت کیلئے ضروری ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ آیا مذہب واقعی کوئی الہامی چیز ہے یعنی کیا خدا کی طرف سے اس کی پابندی انسان پر عاید کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ اگر الہامی نہیں ہے تو اس کے وجود کے اسباب کیا تھے۔

اگر ہم اس کو تسلیم کر لیں کہ مذہب کا مقصود نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے تو ہمکو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا نے انسان کی آفرینش کے ساتھ ہی ساتھ مذہب بھی الہام کیا ہوگا ورنہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا نے اول اول تو ہدایت کو ضروری خیال نہ کیا تھا لیکن بعد کو اس کی ضرورت اس نے محسوس کی جو یقیناً شان خداوندی کے منافی ہے۔ اگر خدا کا مقصود انسان کی آفرینش سے کوئی بے معنی کھیل نہ تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اولین عہد کے انسان کی پرواہ نہ کرتا اور زمانہ مابعد کے انسانوں کو قابل توجہ سمجھتا جبکہ اُس زمانہ کے انسان کو حقیقتاً زیادہ تنبیہ و ہدایت کی ضرورت تھی۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ عہد ابعد کے تمام ترقی یافتہ مذاہب جن میں اسلام اور عیسویت کو زیادہ نمایاں درجہ حاصل ہے صرف اپنے ہی کو الہامی مذہب قرار دیتے ہیں اور قرون ماضیہ کو عہد تاریک، دور جاہلیت، زمانہ وحشت و بربریت کے ناموں سے یاد کر کے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ بالکل گمراہ تھے اور وہ کسی مذہب کے پابند نہ تھے۔ پھر اس اعتراض کا جواب کہ خدا نے کیوں ایک طویل زمانہ تک انسان کو گمراہ رکھا اور کیوں نہ ان میں کوئی نبی یا پیغمبر بھیجکر صراط مستقیم سے آشنا کیا، ہم پر عاید نہیں ہوتا بلکہ انھیں جماعتوں پر عاید ہوتا ہے جو اپنے آپ کو الہامی مذاہب کا پابند بتاتی ہیں۔

وہ حضرات جو اثریات سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ انسان کے عہد حجری کی جو چیزیں (لاکھوں سال قبل کی) اسوقت تک زمین سے برآمد ہوئی ہیں وہ مشتمل ہیں صرف چند مخصوص آلات و اوزار پر اور ان کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ خدا یا مذہب کے وجود کا بھی قایل تھا۔ البتہ اب سے ۲۰ ہزار سال قبل کی چیزوں میں ضرور ہاتھی دانت یا پتھر کے ایسے نقوش یا بت دریافت ہوئے ہیں جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مذہبی خیالات کے زیر اثر بنائے گئے ہوں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے وجود کے ساتھ مذہب کا وجود ظہور میں نہیں آیا اور اس لئے یہ دعوے کرنا کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے یا یہ کہ اس کا تعلق الہام خداوندی سے ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

علوم جدیدہ کے مسایل میں، مذہب کو سب سے زیادہ نقصان جس مسئلہ نے پہونچایا ہے وہ مسئلہ ارتقا ہے کیونکہ اس نے ثابت کردیا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ مادہ سے متعلق ہو یا نفس سے ماحول کے زیر اثر تدریجاً آگے بڑھتی ہے اور پھر چونکہ مذہب کا خیال، غذا یا پوشش کی طرح فطری مجبوری کا نتیجہ نہ تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا وجود اسباب معیشت و ماحول کے زیر اثر ظہور میں آیا ہوگا، اور ایک قوم پر جو زمانہ جس حال میں بسر ہوا ہوگا اسی کے ماتحت اس کے مذہبی خیال میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی۔ قیام مذہب کی بنیاد، وجود خدا کے عقیدہ پر قایم ہے اور خدا کا تصور جس جس طرح مختلف اوقات میں انسان نے کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا خالق کہنا شاید اتنا موزوں نہیں ہے جتنا انسان کو خدا کا خالق کہنا۔

علم الانسان اور تاریخ مذہب کے ماہرین اس باب میں مختلف الخیال ہیں کہ خدا کا وجود ذہن انسانی میں سب سے پہلے کب اور کیونکر آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا قوائے فطرت یا فطری اشیاء کے مطالعہ سے ہوئی ہے یعنی آسمان و زمین میں جو چیز یا جو قوت انسان کو مفید یا عجیب نظر آئی اسی کو وہ پوجنے لگا، چنانچہ، درخت، پتھر، پہاڑ، ستارے، چاند سورج وغیرہ مختلف مظاہر فطرت کو انسان نے خدا سمجھا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ بعض کے نزدیک اس کا تعلق قبایل کے سرداروں اور اسلاف کی یاد سے ہے یعنی قبایل کے جن لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے اور آباؤ اجداد میں سے جو افراد مرگئے احتراماً ان کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔

قدیم روما و یونان میں بھی ایک جماعت متشککین و قائلین ارتقاء کی پائی جاتی تھی اور انھوں نے بھی قیاس آرائیوں سے کام لیکر عقیدۂ خدا کے متعلق مختلف نظرئے قایم کئے تھے، چنانچہ انھیں میں سے ایک شاعر لکریٹیس کہتا ہے کہ:-
"سب سے پہلے جس چیز نے زمین پر خدا کو پیدا کیا وہ انسان کا جذبۂ خوف و ہراس تھا۔ بجلی کی کڑک، طوفانوں کے شور، سمندروں کے تلاطم، آتش فشاں پہاڑوں کے خوفناک مناظر وغیرہ یہ تمام وہ چیزیں تھیں جن سے ڈر کر انسان کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے بڑھکر کوئی اور قوت بھی موجود ہے۔

ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ یہ ہے کہ "انسان اول اول سمجھتا تھا کہ انسان کا سایہ یا ہمزاد اس کے مرنے کے بعد بھی قایم رہتا ہے، اس لئے اگر کوئی سردار مرگیا ہے تو اس کا ہمزاد ضرور باقی ہے، اور یہیں سے دیوتا کا وجود اس کے ذہن میں آیا"۔ الغرض خدا یا دیوتاؤں کا وجود خود انسان کا پیدا کیا ہوا ہے جس کو اس نے اپنے جغرافی و معاشرتی ماحول کے لحاظ سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیش کیا۔ چنانچہ اسپنسر کہتا ہے کہ اگر "مثلث کا کوئی خدا ہوتا تو وہ اسے مثلثی شکل کا تصور کرتا"۔ اس امر کا ثبوت کہ خدا کے تصور میں خود انسان کا ذوق کس حد تک کارفرما ہے مختلف قوموں کے دیوتاؤں اور بتوں کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

حبشیوں کے دیوتا کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ناک چپٹی، اہل تھریس کا دیوتا نیلگوں آنکھیں رکھتا ہے اور سرخ بال۔ اور ہومر و ہیسیڈ کا خدا تمام وہ معائب رکھتا ہے جو خود اس عہد کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ مغرب میں زیادہ ارتقائی درجہ کا خدا دیکھنا ہو تو عہد عتیق کے خدا (Jehovah) کو دیکھئے جس نے دنیا کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر تھک کر آرام کرنے پر مجبور ہوا۔ آدمیوں ہی کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں ہیں اور انسان ہی کی طرح وہ جذبات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس نے آدم کے لئے جانوروں میں سے رفیق زندگی پیدا کیا، آدم و حوا کے لئے کھال کا ملبوس طیار کیا، برج بابل دیکھنے کے لئے وہ خود زمین پر اتر آیا، وہ ظالم و خونخوار ہے، رشک و حسد کرتا ہے انسانی قربانیاں چاہتا ہے اور اپنے کئے پر پچھتاتا بھی ہے۔

الغرض خدا کا مفہوم ہمیشہ انسانی حالات کے ماتحت بدلتا رہا ہے۔ استبداد و ملوکیت کے دور میں اگر وہ ایک

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام تعبیرات کا واقعی کوئی مفہوم ہے، کیا کوئی شخص ان تعبیرات سے خدا کے مفہوم کو متعین کرسکتا ہے۔ کیا ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نے خدا کی حقیقت کو سمجھ لیا۔

اس سے قبل جب انسان جاہل تھا اور اس کا ذہن زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اس نے خدا کو مادی ومرئی چیزوں کی صورت میں پیش کیا جو ہر چند قابل قبول نہ تھا لیکن قابل تصور وقیاس تو تھا۔ مگر اب اس دور علم وترقی میں تو اس کو اسقدر مبہم بنا دیا گیا ہے کہ صاف ذہنی مالیخولیا ہے کہ ہم کسی اور چیز سے تعبیر کر ہی نہیں سکتے۔ یہ جو بیانات ابھی پیش کئے گئے ہیں آپ ان سے [illegible] مرتبہ کر دیجئے لیکن آپ کسی متعین مفہوم تک پہونچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ صرف الفاظ وتراکیب ہیں جو مفہوم سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان پر غور کرنا سوائے لایعنی ذہنی کشمکش کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ الغرض خدا صرف ذہن انسانی کی پیداوار ہے اور اختلافات ذہن کے ساتھ اس کا مفہوم بھی ہمیشہ بدلا ہے۔ جب انسان کی نگاہ مادی چیزوں سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں جا سکتی تھی تو اس نے درختوں، جانوروں، پہاڑوں، دریاؤں، اور انسانی بتوں کی صورت میں خدا کو سمجھنا چاہا اور اب کہ عقول انسانی نے ترقی کرکے خالص کیفیات کی تحلیل شروع کر دی ہے۔ خدا نام رہ گیا ہے صرف ان لغو ومہمل تاویلات کا جو دماغ کو اور زیادہ تشویش میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔

مذہب یا خدا کے وجود کا خیال الہامی چیز ہے اس کی تردید خود الہامی مذاہب کے بیانات سے ہوتی ہے کیونکہ وہ عہد وحشت کے لوگوں کو گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کی بت پرستی کو خلاف منشاء خداوندی قرار دیتے ہیں۔ اب رہ گیا یہ امر کہ وہ کوئی فطری چیز ہے اور انسان نے پیدا ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ خدا کا وجود ضروری ہے، سو میرے نزدیک اہل مذاہب اس کا ثبوت بھی پیش نہیں کرسکتے۔

اس مسئلہ کی چھان بین کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود وحشی اقوام کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام کے زمانہ کو ہم زمانۂ قبل تاریخ سے موسوم کرتے ہیں اور اس لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے کا نہیں ہے، لیکن چونکہ دنیا اس وقت بھی ان قوموں سے خالی نہیں ہے اس لئے ان کی موجودہ حالت سے ان کی گزشتہ حالت کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔

اس وقت انتہائی پست درجہ کی قومیں ٹراڈل فگو، برازیل، لنکا، جزائر انڈمان، جزائر فلپائن، جزیرہ نمائے ملایا، اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان میں قبایلی زندگی کا بھی کوئی نظام نہیں پایا جاتا اور دماغی پستی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ گنتی بھی انھیں نہیں آتی اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آگ کیونکر پیدا کی جاتی ہے۔

ٹراڈل فگو کی وحشی قوم یہگان کے متعلق کامل دو سال تک فرانسیسی علماء نے تحقیق کرکے جو رپورٹ شایع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ خدا کے وجود کے قایل ہیں، نہ ان کے نزدیک خیر وشر کا کوئی مفہوم ہے۔ امید وخوف کا بھی کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا اور موت کے بعد وہ کسی اور عالم کے قایل نہیں ہیں۔

وسط برازیل کی وحشی اقوام کے عقاید میں بھی کوئی مذہبی جھلک نظر نہیں آتی، سوائے اس کے کہ وہ سورج کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاند کو برا۔ جس کا سبب غالباً صرف یہ ہو سکتا ہے کہ چاند کا تعلق رات سے ہے جب درندے جنگل سے باہر نکل آتے ہیں اور سورج کا دن سے جب درندوں کا خوف نہیں رہتا۔ یہ کسی کی پوجا نہیں کرتے اور نہ ان کا کوئی بت ہے۔ لنکا کی قدیم وحشی جماعتوں میں بھی کسی مذہبی پرستش کا وجود نہیں پایا جاتا اور ان کی زندگی کے کسی شعبہ سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خدا یا دیوتا کے قایل ہیں۔

تسمانیا کے صحرائی قبایل کے متعلق ڈاکٹر ڈکسن لکھتا ہے کہ ان میں کسی مذہبی رسم کا پتہ نہیں چلتا اور یہ اپنے خیالات کے لحاظ سے بھی اتنے پست ہیں کہ ان کی زبان زیادہ تر اشارات پر مشتمل ہے چنانچہ رات کے وقت تو یہ آپس میں باتیں کر ہی نہیں سکتے۔

جزائر انڈمان کے وحشی قبایل ہر چند دوسری قوموں سے بہت کچھ متاثر ہو چکے ہیں تاہم مذہب یا عقیدۂ خدا کا وجود ان کے یہاں بھی نہیں پایا جاتا۔ جزائر فلپائن میں جن سیاحوں کو جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے بھی کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ الغرض تمام وہ وحشی قومیں جو دوسری قوموں کی تہذیب سے متاثر نہیں ہوئی ہیں اب بھی خدا یا مذہب کی قایل نہیں ہیں اور اگر کسی قوم میں یہ خیال پیدا ہوا ہے تو وہ صرف دوسری قوموں سے ملنے جلنے کے بعد۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا خیال انسانی فطرت میں داخل ہے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اب رہا یہ امر کہ ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ کس کس رنگ میں یہ عقیدہ ظاہر ہوا سو اس بحث میں ہم کو ہر ملک و قوم کے جغرافی ماحول کو پیش نظر رکھنا ضرور ہوگا اور بنابراں یہ بحث کسی الہامی حقیقت سے متعلق نہ ہوگی بلکہ ماحول و اسباب ظاہری کی تاریخ سے تعلق رکھے گی اور اس صورت میں یہ مسئلہ کوئی خدائی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ صرف ترقی تمدن کے تاریخ کا مسئلہ رہجاتا ہے۔

چونکہ خدا اور مذہب صرف عقل انسانی کی پیداوار ہے اور عقل انسانی مختلف حالات کے ماتحت ہمیشہ مختلف رہی ہے اس لئے اگر آج عقاید مذہبی میں تمام افراد نوع انسانی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں تو تعجب نہ کرنا چاہئے البتہ اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ مذہب کا وجود انسانی زندگی کے لئے ضروری نہیں ہے اور ہم خدا کو مانے بغیر بھی اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بیشک یہ ایک ایسے نقطہ کی طرف قدم بڑھانا ہوگا جو عقاید مذہبی کے تمام لغو اختلافات کو دور کر کے مرکزی حیثیت اختیار کر سکتا

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام

سرودِ زندگی

(مسلسل)

اصغر صاحب کا شعر ہے :-

وہ ازل سے تا ابد ہنگامۂ محشر بپا ۔۔۔ میں ادھر خاموش اک آفت ادا کے سامنے

شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی خاص وقت کا منظر پیش کر رہا ہے جس کی تصدیق (ہنگامۂ محشر) سے بھی ہوتی ہے لیکن پہلے مصرعہ میں " ازل سے تا ابد" لکھکر اس تعیین کو مٹا دیا گیا ہے، گویا مقصود محشر کا بیان نہیں ہے بلکہ ازل سے ابد تک کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس لئے دونوں صورتوں میں انداز بیان بدلنا ضروری ہے۔

کامیابِ شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے ۔۔۔ حرفِ مطلب محو ہے جوشِ دعا کے سامنے

پہلے مصرعہ میں دو حالتیں ظاہر کی گئی ہیں ایک " شوق کی کامیابی " اور اسی کے ساتھ اس کی " ناکامی " اور اس لئے اصولاً دوسرے مصرعہ میں ان دونوں باتوں کو ثابت کرنا چاہئے تھا۔ دوسرے مصرعہ میں دو چیزیں پیش کی ہیں " حرفِ مطلب کا محو ہو جانا " اور " جوشِ دعا " لیکن پہلے مصرعہ سے ان کا تعلق ظاہر نہیں ہوتا اور شوق کی کامیابی کے ساتھ ہی اس کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ حرفِ مطلب ادا ہونے سے پہلے ہی " جوشِ دعا " شروع ہو گیا اور دل کی بات زبان سے ظاہر نہ ہو سکی۔

نمودِ جلوۂ بیرنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں ۔۔۔ کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

پہلے مصرعہ میں " جلوۂ بیرنگ " کا اقتضاء یہ تھا کہ " صورت " کا وجود ہی سرے سے غائب ہو جاتا، حالانکہ دوسرے مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ " صورت " تو سامنے موجود ہے لیکن پہچان نہیں سکتے۔ اس لئے اگر بجائے " جلوۂ بیرنگ " کے " جلوۂ نیرنگ " کہتے تو زیادہ موزوں تھا۔ اس طرح معنی یہ ہوتے کہ " نیرنگیٔ جمال کا یہ عالم ہو کہ وہی صورت جس کو کسی وقت پہچانتے تھے اب شناخت

نہیں ہو سکتی۔

یہ عارضِ پُرنور، یہ زلفیں ہیں پریشاں　　کمبخت نکل گر ہی شام و سحر سے

پہلے مصرعہ میں لفظ (ہیں) بالکل بے محل استعمال ہوا ہے اور اس نے مصرعہ کو مہمل کر دیا ہے۔ (یہ عارضِ پُرنور) کے مقابلہ میں صرف (یہ زلفِ پریشاں) کہنا چاہئے تھا تاکہ ترکیب کے لحاظ سے دونوں ٹکڑوں میں توازن پیدا ہو جاتا لیکن مصرعہ پورا کرنے کے لئے لفظ (ہیں) بڑھا کر مصرعہ تباہ کر دیا گیا۔

مے دافعِ آلام ہے تریاق ہے لیکن　　کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

پہلے مصرعہ میں (دافعِ آلام) اور (تریاق) دونوں زبانِ تغزل سے علٰحدہ ہیں، ان کا استعمال صرف ایک طبیب ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے لفظ (لیکن) یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں مے کے دافعِ آلام و تریاق ہونے کی تردید کی جا رہی ہے حالانکہ مقصود اس کی ترقی ہے۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں (کچھ اور ہی) کے بعد جب تک لفظ (چیز) نہ بڑھایا جائے مفہوم پورا نہیں ہو سکتا۔

نظارۂ پُرشوق کا اک نام ہے جینا　　مرنا اسے کہئے کہ گزرتے ہیں ادھر سے

پہلے مصرعہ میں لفظ (اک) بالکل زائد ہے۔ دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان ناقص ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ۔ "زندگی نام ہے صرف نظارۂ پُرشوق کا اس لئے جب ہم ختمِ نظارہ کے بعد ادھر سے گزر جائیں تو اسے مرنا کہنا چاہئے" دوسرے مصرعہ میں (گزرتے ہیں) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزرنا ختم نہیں ہوا اس لئے مرنا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ بجائے (گزرتے ہیں) کے (گزر جائیں) کہنا چاہئے تھا۔

ذرا سی آس ملنا چاہئے دردِ محبت کی　　کہ خود بے چین ہے ذوقِ نوا سے بزمِ فطرت کی

اس شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ دردِ محبت کی تمنا کس کو ہے شاعر کو یا خود بزمِ فطرت کو جو "ذوقِ نوا" سے بے چین ہے۔ اس بجائے (ملنا چاہئے) کے (مجھ کو چاہئے) نظم کرنا چاہئے تھا۔ تعیین بھی ہو جاتی اور (ملنا چاہئے) کا ثقل بھی دور ہو جاتا۔

نقابِ رخ الٹ کر آج کیوں گرمِ تبسم ہو　　شعاعیں مجھ پہ کیوں پڑتی ہیں خورشیدِ قیامت کی

بجائے (گرمِ تبسم) کے (سرگرمِ تبسم) ہونا چاہئے تھا۔

یہ سب ناآشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید　　اسیر دل میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

یہ شعر بالکل مفہوم سے بیگانہ ہے۔ اگر اسیر شکوۂ صیاد کرتے ہیں تو اس سے انکا ناآشنائے لذتِ پرواز ہونا کیونکر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں (ابھی تک) سے کیا مراد ہے؟ اس کو شاعر ظاہر نہ کر سکا۔

مجاز کیسا، کہاں حقیقت، ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے　　یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے

پہلے مصرعہ میں بجائے (کہاں) کے (کیسی) زیادہ مناسب تھا۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (سحر) بالکل بے محل استعمال ہوا ہے۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ "یہ سب خواب کی سی حالت ہے بیداری و حقیقت نہیں ہے" اور یہ لفظ (سحر) سے ظاہر نہیں ہوتا۔

یہ مجھ سے سن کے تو راز پنہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں　　کہاں سے رہروِ زندگی ہو کہ راہ جب پر خطر نہیں ہے

دوسرے مصرعہ میں لفظ (کہ) زاید استعمال ہوا ہے صرف وزن پورا کرنے کے لئے ہے۔

ہوا کو موجِ شراب کر دے، فضا کو مستِ خراب کر دے　　یہ زندگی کو شباب کر دے، نظر تمہاری نظر نہیں ہے

نظر نہیں ہے تو کیا ہے جو یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کا ذکر اشارتاً و کنایتاً بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔

دولتِ قرب کو خاصانِ محبت جانیں　　چند اشکوں کے سوا کچھ مری قسمت میں نہیں

جب تک دوسرے مصرعہ میں لفظ (ہر چند) یا (گو) نہ لایا جائے مفہوم تشنہ رہتا ہے۔

لوگ مرتے بھی ہیں، جیتے بھی ہیں، بیتاب بھی ہیں　　کونسا سحر تری چشمِ عنایت میں نہیں

یہ شعر ہندی کے اس مشہور دوہے سے ماخوذ ہے:۔

امی ہلاہل مدھ بھرے سویت سیام رتنار　　جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت اک بار

لیکن مفہوم کے لحاظ سے بجائے ترقی کے تنزل پایا جاتا ہے۔

سب سے اک طرز جدا سب سے اک آہنگ جدا　　رنگ محفل میں ترا جو ہے وہ خلوت میں نہیں

شاعر کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرے محبوب کا جو رنگ جلوت میں ہوتا ہے وہ خلوت میں نہیں ہوتا۔ پہلے مصرعہ کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر یہ صفت صرف اپنے ہی محبوب میں پاتا ہے حالانکہ "جلوت و خلوت" میں

کیفیات کا بدل جانا نفسیاتی طور پر ہر شخص کے لئے ثابت ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں بہتر ہوتا:-

رنگ محفل میں جو تیرا ہے وہ خلوت میں نہیں

اس طرح (رنگ محفل) کے بجائے (تیرا) پر زور ہو جاتا اور مفہوم سے قریب تر۔

نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے　　کون ذرہ ہے کہ سرشار محبت میں نہیں

چونکہ پہلے مصرعہ میں یہ کہا تھا کہ "نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے" تو دوسرے مصرعہ میں یوں کہنا چاہئے تھا کہ "کونسی چیز ہے جو محبت میں سرشار نہیں" یا "ذرہ ذرہ سرشار محبت ہے"

لالہ و گل تم نہیں ہو، ماہ و انجم تم نہیں　　رنگ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے

لالہ و گل کا تعلق تو رنگِ محفل سے ہے لیکن ماہ و انجم کو رنگ سے کیا تعلق ہے۔ محفل کے ساتھ تو کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے جو مصرعۂ اول کی رعایت سے لالہ و گل اور ماہ و انجم دونوں سے تعلق رکھتا۔ اس لئے بجائے رنگ کے (تاب) زیادہ مناسب تھا۔

ہو کے راز عشق افشا بن گیا اک راز اور　　سب زباں پر آ گیا ہو سب ابھی تک دل میں ہے

راز عشق کا افشا ہو کر راز ہو جانا اور زبان پر آنے کے بعد بھی اس کا بالکل ناگفتہ حالت میں رہنا، اک ایسا معمہ ہے جس کا حل کرنا آسان نہیں۔ یہ شعر بھی تصوف کے ان اشعار میں سے ہے جہاں جمع اضداد ہی انتہائے کمال خیال کیا جاتا ہے

حسن بنکر خود کو عالم آشکارا کیجئے　　پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردہ کیجئے

ایں ہم منجملۂ مفروضات لغویۂ تصوف ہست، کہ شاعران کم سواد تغزل را پریشاں سازی کنند و تراکیب حاملۂ اضداد را حسن شاعری می نامند!

دیکھتا ہوں میں کہ انساں کُش ہے دریا کا وجود　　خود حباب و موج بنکر اب تماشہ کیجئے

اگر دریا کا وجود انساں کُش ہے تو حباب و موج بنکر تماشہ دیکھنے سے کیا فائدہ مرتب ہو سکتا ہے۔ اگر مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب دریا کے وجود خود فنا کر دینے والا ہے تو پھر کیوں نہ ایسی چیز بنکر تماشہ کیا جائے جو خود بہت جلد فنا ہو جانے والی ہے تو اس کے لئے (حباب) بنکر تماشہ کرنا تو صحیح ہو سکتا ہے مگر موج سے اسے کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ موج کا وجود دریا سے علیحدہ نہیں ہے اور نہ وہ حباب کی طرح فنا ہو جانے والی۔

حُسن کی بیگانگی و بے نیازی سب بجا		اُس پہ چھپ کر پردۂ گل سے اشارہ کیجئے

شاعر اپنے مفہوم کو ظاہر نہیں کر سکا مقصود یہ کہنا ہے کہ اگر حُسن بے نیاز ہے تو وہ چھپ کر پردہ گل سے کیوں اشارہ کرتا ہے، دوسرا مصرعہ یوں ہوتا تو ابہام دور ہو جاتا:-

چھپ کے پھر کیوں پردۂ گل سے اشارہ کیجئے

کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے		نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

اس شعر میں بھی (کہ) بالکل بیکار ہے۔ اصغر صاحب وزن پورا کرنے کے لئے " یہ - کہ - کچھ " کے الفاظ اکثر و بیشتر استعمال کرتے ہیں، جس سے ان کی بے مشقی ظاہر ہوتی ہے۔ پہلا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا:-

کوئی ایسا نہیں یارب جو اس کے درد کو سمجھے

دے مسرت مجھے اور عین مسرت مجھ کو		چاہیئے غم بھی بہ اندازِ راحت مجھ کو

مسرت اور عین مسرت میں "غم و راحت" کا ما تقابل بیان ... بالکل بے معنی ہے۔ اول تو مسرت و عین مسرت کو علیحدہ علیحدہ دو چیز قرار دینا ہی لغو سی بات ہے چہ جائیکہ عین مسرت کو غم سے تعبیر کرنا! علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ غم کا مقابل راحت سے نہیں ہوا کرتا بلکہ مسرت سے ہوا کرتا ہے۔

خود میں اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے		دیکھنا ہے کسی عنوان تری صورت مجھ کو

یہ شعر بیان و معنی دونوں حیثیت سے ناقص ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کا انداز بیان یوں ہونا چاہیئے تھا کہ "میں خود ہی کیوں نہ اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے" اسی طرح دوسرے مصرعہ میں جب تک "عنوان" کے بعد لفظ (سے) نہ لایا جائے مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ "کسی عنوان دیکھنا" خلافِ محاورہ ہے۔ عنواں کا اعلان (نون) اور اس کے بعد (سے) لانا ضروری ہے۔

معنأ یہ نقص ہے کہ خود اُٹھ جانا اور پردۂ ہستی اُٹھ جانا ایک ہی چیز ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے امتیازات ممکن ہے تصوف کی لایعقل دنیا میں کوئی مفہوم رکھتے ہوں لیکن تغزل سے انھیں کوئی تعلق نہیں

آگئی سامنے اک جلوۂ رنگیں کی بہار		عشق نے آج دکھا دی مری صورت مجھ کو

اس شعر میں بھی تصوف کا وہی فرسودہ و پامال، اور لغو و مہمل نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ "یہ جو صورت ہے مری صورتِ جاناں ہی تو ہے"

نگہ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کا انداز بیان بالکل غلط ہے۔ اگر دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) برقرار رکھا جائے تو پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے:۔

نگہ ناز کو وہ بھی تو گوارا نہ ہوئی

اور اگر پہلا مصرعہ اپنے حال پر قائم رہے تو دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے:۔

اک ذرا درد میں مل جاتی تھی راحت مجھ کو

خوشا وہ دن کہ حسن یار سے جب عقل خیرہ تھی یہ سب محرومیاں ہیں آج ہم جتنا سمجھتے ہیں

مفہوم کے لحاظ سے دوسرا مصرعہ بہت الجھا ہوا ہے اور مدعا ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "وہ دن اچھے تھے جب پرتو حسن نے عقل کو خیرہ کر رکھا تھا لیکن اب ہم جتنا سمجھنے لگے ہیں اتنی ہی محرومیاں بڑھتی جاتی ہیں"

نظر بھی آشنا ہو نشۂ بے نقش و صورت سے ہم اہل راز بے رنگینیٔ مینا سمجھتے ہیں

نشہ ایک کیفیت ہے جو نقش و صورت سے ہمیشہ بے نیاز رہتی ہے اس لئے یہ تخصیص بیکار ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں رنگینی مینا کا ذکر موجود ہے جو مرئی چیز ہے اس لئے اسے نشۂ بے نقش و صورت کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

عجب اعجاز فطرت ہے اسیروں کو بھی حیرت ہے وہ موج بوئے گل کا خود تڑپ کر بال و پر ہونا

دوسرے مصرعہ میں "موج بوئے گل" کا بال و پر ہونا ظاہر کیا ہے درانحالیکہ اس کا کوئی ثبوت شعر میں موجود نہیں ہے۔ شاعری میں اس نوع کا ادعا عام چیز ہے اور خیال کو ممکن کہہ دینا کوئی نئی بات نہیں لیکن اگر اس کی کوئی توجیہ و تاویل شعر میں موجود نہ ہو تو اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔

ابھی وہ طرز مستی تجھ سے سیکھیں میکدے والے نظر کو جنبش موجوں پہ جا کر بے خبر ہونا

پہلے مصرعہ کا لفظ (ابھی) بالکل زاید استعمال ہوا ہے اور دوسرے مصرعہ میں ردیف غلط ہے کیونکہ مفہوم کے لحاظ سے (ہونا) کی جگہ (ہو جانا) چاہئے۔

یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے باخبر ہونا

اس شعر کی ردیف بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ہونا بجائے (رہنا) کے استعمال کیا گیا ہے۔

پھر وہی واماندگی ہے پھر وہی بیچارگی　　ایک موجِ بوئے گل کو بال و پر سمجھا تھا میں

دونوں مصرعے غیر مربوط ہیں۔ (پھر) کا لفظ مقتضی ہے اس مفہوم کا کہ اس سے قبل واماندگی و بیچارگی عارضی طور پر غائب ہو گئی تھی، حالانکہ دوسرے مصرعہ میں موجِ بوئے گل کو بال و پر سمجھنے کی غلطی کا اعتراف ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجِ بوئے گل نے کبھی بال و پر کا کام نہیں دیا اس لئے واماندگی دور ہونے کی کوئی صورت بھی علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں لفظ (ایک) بیکار استعمال کیا گیا ہے۔

یہ تو شب کو سر بہ سجدہ ساکن و مدہوش تھے　　ماہ و انجم کو تو سرگرمِ سفر سمجھا تھا میں

پہلے مصرعہ میں ماہ و انجم کی تین حالتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے "ساکت" کو تو خیر غلط نہیں کہہ سکتے کیونکہ رات کے وقت ان کی حالت بظاہر ایسی ہی معلوم ہوتی ہے، لیکن مدہوش کہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور سر بہ سجدہ کہنا تو بالکل غلط ہو رہ گیا مفہوم سو وہ بالکل مبہم ہے۔ کیونکہ جب تک یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ ماہ و انجم کے سکوت کا کیا سبب تھا، شعر حدودِ تغزل سے باہر رہتا ہے۔

رہزنی نے مجھ پہ کھولی راہ بے پایانِ عشق　　راہبر کو اک فریبِ رہگزر سمجھا تھا میں

اگر راہبر کو فریبِ رہگزر سمجھنا غلطی تھی تو اس کا تعلق رہزنی سے کیا اور اس کا "راہِ بے پایانِ عشق" کی طرف ہدایت کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ شاعر اپنا مدعا ظاہر کرنے میں بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ رہزن اور راہبر کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے تو یہ اور زیادہ لغو تاویل ہوگی۔

اسی زمین کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:-

تا طلوعِ جلوۂ خورشید پھر آنکھیں ہیں بند　　تجھ کو اے موجِ فنا نورِ سحر سمجھا تھا میں
مست و بیخود ہیں یہ ماہ و انجم زمین و آسماں　　یہ تری محفل تھی جس کو رہگزر سمجھا تھا میں
جانے ہے محوِ تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند　　حُسن کو حُسنِ بیاں حُسنِ نظر سمجھا تھا میں

پہلے شعر میں موجِ فنا کا نورِ سحر سے کوئی تعلق نہیں۔ "موجِ تاریک فنا" یا "شبِ تاریک فنا" کہنا چاہئے تھا۔
دوسرا شعر بالکل بے معنی ہے۔ تیسرے میں مثنوی مولانا روم کے اس شعر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

چشم بند و لب ببند و گوش بند　　گر نہ بینی سرِّ حق بر ما بخند

دوسرے مصرعہ کے انداز بیان کو دیکھتے ہوئے خیر چشم و لب کا بند ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن گوش کا ذکر بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔

روزِ روشن، یا شبِ مہتاب، یا صبحِ چمن — ہم یہاں سے چاہتے وہ روئے زیبا دیکھتے

اول تو پہلے مصرع میں لفظ (سے) بالکل بیکار ہے۔ صحیح اندازِ بیان یہ ہونا چاہئے تھا کہ

چاہتے جس چیز میں ہم اُس روئے زیبا دیکھتے

دوسری معنوی غلطی ردیف سے پیدا ہوئی ہے۔ جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ شاعر نے "وہ روئے زیبا" کسی چیز میں نہیں دیکھا اور اس کا جلوہ کسی چیز میں اس کو نظر نہ آیا، حالانکہ ایک عاشق ہر جگہ معشوق کا جلوہ دیکھ سکتا اور دیکھتا ہے۔

صد زمان و صد مکان و ایں جہاں و آں جہاں — تم نہ آجاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے

پہلا مصرعہ بالکل بدل دینے کے قابل ہے اور نیز حدودِ تغزل سے باہر۔

میکدے میں زندگی ہے شورِ نوشا نوش سے — مٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ میکدے میں آثارِ زندگی صرف اس کیفیت سے پیدا ہیں کہ وہاں شورِ نوشا نوش پایا جاتا ہے۔ اگر جام و مینا میسر آجاتا یعنی شراب پی لیتے تو یہ زندگی نہ پائی جاتی۔ لیکن اصغر صاحب چونکہ فارسی ادب پر عبور نہیں رکھتے اس لئے انھوں نے نوشا نوش کے معنی صرف "ہنگامۂ طلبِ بادہ" کے سمجھے ہیں حالانکہ نوشا نوش کے معنی ہی ہیں "پے در پے پینے" کے۔ اور اس لئے شعر مہمل ہو گیا۔

مذاقِ زندگی سے آشنا چرخِ بریں ہوتا — مہ و انجم سے بہتر ایک جامِ آتشیں ہوتا

چرخِ بریں میں ایک ایسی چیز آفتاب موجود ہے جسے "جامِ آتشیں" کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ "جامِ آتشیں" استعارتاً "جام" کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس لئے بجائے مہ و انجم کے "آفتاب" ہی کا ذکر مناسب تھا نہ کہ "مہ و انجم" کا۔

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے — کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں دو نقص ہیں ایک یہ کہ بجائے (وہی) کے (وہ) استعمال کیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ لفظ (پھر) نہیں لایا گیا حالانکہ بغیر اس کے مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ اصل میں عبارت اس طرح ہونا چاہئے تھی کہ:۔

"اے بلبلِ رنگیں نوا وہی نغمہ پھر اک بار ہو جائے"

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو — جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں لفظ (اب) بیکار ہے ۔ اس کو یوں دور کیا جا سکتا تھا:۔

تم اُس کافرکے ذوقِ بندگی کو پوچھتے کیا ہو

نظر اس حُسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں " نظر نہ ٹھہر سکنے " کا ذکر ہے اور اس لئے مصرعۂ ثانی میں کسی نہ کسی ایسی چیز کا بیان ضروری تھا جس پر واقعی نظر نہیں ٹھہر سکتی ۔ درانحالیکہ پھول اور رخسار دونوں چیزیں ایسی نہیں جن پر نگاہ نہ ٹھہر سکے ۔ میری رائے میں اگر بجائے پھول کے (برق) کر دیا جائے تو یہ نقص دور ہو سکتا ہے ۔

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں کوئی اک جام پیکر جس طرح سرشار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں تعقید ہے کیونکہ (دیکھ کر) (بہارِ عالمِ امکاں) سے دور پڑ گیا ہے ۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (اک) نے معنوی نقص پیدا کر دیا ہے، کیونکہ سرشاری کا اقتضاء یہ نہیں تھا کہ صرف اک جام پینے کا ذکر کیا جائے، بلکہ " پیاپے جام پینے " کا اظہار ہونا چاہئے تھا ۔

میری سرشک خوں میں ہے رنگینیِ حیات یارب فضائے حُسن، ابد تک جواں رہے

فضا کا جوان رہنا بالکل مہمل بات ہے ۔

اسے مجاز کہو یا اسے حجاب کہو نگاہِ شوق پہ اک اضطراب پیہم ہے

دوسرے مصرعہ کے اندازِ بیان کو لفظ (پہ) نے بہت گرا دیا ۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا:۔

نگاہِ شوق ہے اور اضطراب پیہم ہے

نوائے شعلہ طراز و بہارِ حُسنِ بتاں کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

اس شعر کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے لفظ (تری) کا مخاطب تلاش کرنا ضروری ہے ۔ اگر مخاطب یہی دنیاوی معشوق ہے تو مصرعۂ اول میں حُسن کے ساتھ (بتاں) کی تخصیص بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں تمام دنیا کے بتوں یا معشوقوں کا ذکر بے محل ہے، صرف مخاطب ہی کے حُسن کا بیان ہونا چاہئے ۔ لیکن اگر مخاطب خدا ہے تو پھر " نوائے شعلہ طراز " کے ساتھ کسی ایسے لفظ کا اضافہ ضروری تھا جو " حُسنِ بتاں " کی کوئی تخصیص رکھتا، مثلاً:۔

فروغِ نغمۂ بلبل، طرازِ حسنِ چمن کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

لیکن اگر مخاطب اسی دنیا کی کوئی ہستی ہے تو پہلا مصرعہ بدلکر شعر یوں بنایا جا سکتا ہے۔

وہ مجھ سے پھیر کے منھ تیرا مسکرا دینا کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

مگر اصغر صاحب اسے کیوں پسند کرنے لگے کیونکہ اس اصلاح سے یہ شعر صحیح تغزل کے حدود میں آجاتا ہے۔

کہاں زمان و مکاں پھر کہاں یہ ارض و سما جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

اگر لفظ (پھر) استعمال کیا تھا تو (زمان و مکان) کے ساتھ بھی اس کو لانا چاہئے تھا ورنہ کہیں نہیں۔ بجائے پھر کے (اور) لا سکتے تھے۔

عشق کا ارشاد پہلو میں ہو بلبل کا جگر عقل کہتی ہے رگِ گل میں گلستاں دیکھئے

تیزگامی سخت کوشی عشق کا فرمان ہے علم کا اصرار ذرہ میں بیاباں دیکھئے

ان دونوں شعروں میں عشق و عقل کا استعمال غلط ہوا ہے۔ جہاں عشق ہے وہاں عقل کا لفظ ہونا چاہئے اور جہاں عقل ہے وہاں عشق۔

قالبِ بیجاں میں جاگ اٹھا شرارِ زندگی دیکھئے بوئے قمیصِ ماہِ کنعاں دیکھئے

(بو) دیکھی نہیں جاتی۔

ایک مدت سے تری بزم سے محروم ہوں میں کاش وہ چشمِ عنایت بھی تری یاد نہ ہو

پہلے مصرعہ میں (سے) کی تکرار ناگوار ہے۔ دوسرے مصرعہ میں (یاد نہ آئے) کی جگہ (یاد نہ ہو) استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ردیف کی مجبوری نہ ہوتی میں اس شعر کو اس طرح کر دیتا:۔

ایک مدت سے ہوں محرومِ تماشا، اے کاش وہ تری چشمِ عنایت بھی مجھے یاد نہ آئے

حسن کو وسعتیں جو دیں عشق کو حوصلہ دیا جو نہ ملے نہ مٹ سکے وہ مجھے مدعا دیا

اس شعر کے مصرعے باہدگر مربوط نہیں ہیں اور دوسرا مصرعہ پہلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر حسن کو وسعتیں ملی ہیں تو عشق کو بھی اسی انداز سے حوصلہ عطا ہوا ہے اور یہ مفہوم پہلے مصرعہ سے ادا ہو گیا لیکن اگر مراد یہ ہے کہ عشق کا حوصلہ حقیقتاً وہی مدعا ہے جو نہ پورا ہو سکتا ہے نہ دل سے نکل سکتا ہے تو یہ تعبیر غلط ہے "حوصلۂ عشق" کا اقتضاء اول تو یہی کہ وہ مدعا سے یکسر بے نیاز ہو لیکن اگر کسی مدعا کا ہونا ضروری قرار پائے تو بھی اسے تکمیل و عدمِ تکمیل کی خواہش سے مستغنی ہونا چاہئے۔ الغرض دوسرا مصرعہ پہلے کوئی خاص ربط نہیں رکھتا۔ یہ تو معنوی نقص ہوا۔ اب نقصِ بیان کو دیکھئے کہ اگر مصرعۂ ثانی کی نثر کیجائے تو عبارت یوں ہوگی: "مجھے وہ مدعا دیا جو نہ ملے نہ مٹ سکے" حالانکہ مدعا بہ لحاظ زبان نہ ملتا ہے نہ مٹ سکتا ہے۔ محاورہ۔ مدعا پورا ہونا یا نہ ہونا۔ مدعا پانا یا نہ پانا۔ مدعا حاصل ہونا یا نہ ہونا ہے۔

(باقی)

دلوں کی آگ

احمد یار خاں کا عقیدہ تھا کہ "روپیہ حاصل کرو خواہ وہ ایمانداری سے حاصل ہو یا بے ایمانی سے" جب وہ پہلی مرتبہ قصبہ جوسی میں آئے تو ان کا کل سرمایہ کپڑوں کی ایک گٹھری تھا لیکن قصبہ کا ماحول ان کے لئے اسقدر موافق ثابت ہوا کہ چند مہینے میں کپڑوں کی دوکان کے مالک ہوگئے۔ بعض اوقات جب روپیہ جمع ہونا شروع ہوتا ہے تو اس قدر تیزی سے کہ خود جمع کرنے والے کو اس پر حیرت ہونے لگتی ہے۔ یا تو خانصاحب کی یہ حالت تھی کہ دن بھر گاؤں کا پھیری کرکے جو کچھ کماتے تھے وہ شام کو صرف ہو جاتا تھا اور دن بھر کی محنت میں وہ چند گز سے زیادہ کپڑا نہ فروخت کر سکتے یا اب یہ حالت تھی کہ ان کی دوکان پر خریداروں کی کثرت سے جگہ نہ ملتی تھی کیونکہ وہ نقد کے علاوہ اُدھار بھی کپڑا دیا کرتے تھے اور فصل پر ۵ فیصدی سود کے حساب سے دام وصول کیا کرتے تھے۔ چند سال میں خانصاحب کا کاروبار اتنا بڑھا کہ ان کو منیب اور کارندے رکھنا پڑے اور اب وہ کپڑوں کے علاوہ نقد روپیہ کا بھی لین دین کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انکی مالی حالت گاؤں میں سب سے اچھی ہوگئی اور کچھ جائداد بھی خانصاحب نے خرید لی۔ وصولی کا یہ انداز تھا کہ جو رقم منیب وغیرہ سے نہ وصول ہوتی، خانصاحب لٹھ لیکر وصول کرلاتے۔ سختی خانصاحب کی فطرت تھی وہ کچہری دربار نہیں جانتے تھے انھوں نے یہ سب طاقتیں اپنے لٹھ میں جمع کر دی تھیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ اسی کے ذریعہ سے اپنا روپیہ وصول کرتے تھے اور رحم ان کے نزدیک بے معنی لفظ تھا۔ انھوں نے روتے ہوئے بچوں اور پریشان عورتوں پر بھی کبھی رحم نہ کیا اور اپنے سامنے گائے بھینسیں کھلوا کرلے گئے۔

چودہ پندرہ برس میں خانصاحب کا کاروبار جوسی کے علاوہ ملحقہ گاؤں میں بھی پھیل گیا اور اس جوار میں تقریباً ہر شخص خانصاحب سے مرعوب تھا جو قرضدار تھے وہ قرضہ کے دباؤ سے سر نہ اُٹھا سکتے تھے اور جو قرضدار نہ تھے وہ خانصاحب کی شورہ پشتی سے مرعوب تھے کیونکہ وہ قرضداروں کی بےعزتی آئے دن دیکھتے رہتے تھے۔

خانصاحب کا ذریعہ آمدنی یہی کاروبار نہ تھا بلکہ چوری کا مال بھی خفیہ طور پر خرید کرکے بیچتے تھے اور افیون کی تجارت بھی کرتے تھے۔

خانصاحب سے زیادہ تکلیف دہ وجود ان کے نوکروں کا تھا، بات بات پر لوگوں کو ذلیل کرنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا اہل قصبہ خانصاحب کے خوف سے ان سے بھی ڈرتے تھے، خانصاحب اپنی کارروائیوں کو جائز و برقرار

رکھنے کے لیے بندوبست کر اسی قدر رقم دیا تے تھے جتنی تنخواہ اس ریاست سے ملتی تھی گاؤں والوں نے ان کے نوکروں سے تنگ آکر کئی درخواستیں حکام بالا کی خدمت میں بھیجیں لیکن جب کوئی شنوائی نہیں ہوئی تو انہوں نے درخواست دینے والوں کی توہین کی گئی اور دھمکیاں دی گئیں اس سے غریبوں نے مجبور ہو کر شکایات کرنا چھوڑ دیا لیکن ان کے دلوں میں خانصاحب کی طرف سے آگ بھری ہوئی تھی ایک موقعہ تو ایسا آگیا کہ اگر خانصاحب دانشمندی کا ثبوت نہ دیتے تو نہ معلوم کیا ہو جاتا ان کے نوکر نے ایک عورت کو سر بازار چھیڑ دیا اس پر سارا بازار مشتعل ہو گیا لیکن بعض نے سمجھا کر لوگوں کو روکا اور خانصاحب سے اس کی شکایت کی خانصاحب نے موقعہ کی نزاکت کا خیال کر کے نوکر کو مار کر نکال دیا گاؤں والے اس پر مطمئن ہو کر چلے گئے اگرچہ یہ فعل نمائشی تھا۔

خانصاحب اپنی چیرہ دستیوں کے ساتھ سخت مذہبی آدمی بھی تھے گاؤں میں جو مسجد ویران پڑی تھی وہ خانصاحب کے دم سے آباد ہوئی خود پنجوقتہ نماز باجماعت ادا کرتے اور دوسروں کو مجبور کر کے نماز پڑھاتے یہاں تک کہ بعض آدمیوں کو قرض خانصاحب نے صرف اس وجہ سے دیا کہ وہ نماز میں پنجوقتہ شریک ہوتے تھے ۔ خانصاحب کی بیرونی زندگی جسقدر پریشان کن تھی اس سے زیادہ تباہ کن خانگی زندگی تھی ۔ جسوقت وہ گھر میں خوفناک انداز سے داخل ہوتے ہر شخص لرزہ براندام ہو جاتا کہ دیکھئے کس کی شامت آتی ہے، ہر ہر بات پر اعتراض کرتے اور آخر میں ان تمام بدانتظامیوں کی ذمہ دار انکی بیوی قرار پاتیں اور ان کو ناحق صلواتیں سننا پڑتیں، نوکر تو ان کی طبیعت پہچان گئے تھے اس لئے وہ پہلے ہی غائب ہو جاتے تھے اور ان تمام باتوں کی جواب دہی کے لیے صرف گھر والے رہ جاتے تھے اور پھر اس پر قیامت یہ کہ کوئی عذر قابل قبول نہیں کوئی جواب قابل پذیرائی نہیں۔

(۲)

محمد حسن خانصاحب کا بڑا لڑکا خانصاحب کا نقش ثانی تھا کیونکہ دوسروں پر سختی کرنے میں خانصاحب سے کم نہ تھا، ممکن تھا کہ محمد حسن اپنے باپ جیسا نہ ہوتا لیکن چونکہ انسان ماحول سے بنتا اور بگڑتا ہے اس لئے اس کی لغزشیں قابل درگزر تھیں۔ دنیا میں بداطوار دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو برے ماحول کو اچھا سمجھ کر اس کے اثرات سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور تباہ ہوتے ہیں دوسرے وہ جن کو زمانہ ٹھوکریں دے دیکر راہ راست سے برگشتہ کر دیتا ہے اور وہ زندگی کے کسی حصہ میں کامیاب نہ ہو کر اپنی ناکامی کا انتقام دوسروں سے لیتے ہیں۔ پہلی صورت صرف افسوسناک ہے اور دوسری تباہ کن اور غارت گر بھی۔ اس لئے محمد حسن کی زندگی کا وہی انداز تھا جو اس کے باپ کا۔ وہی خشونت وہی ظلم و تعدی جو اس کے باپ کی خصوصیات تھیں رفتہ رفتہ اس کی فطرت ثانیہ بنتی جاتی تھیں، مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ اپنے باپ کی طرح جذبات لطیف سے محروم نہ تھا وہ ظلم کو ظلم جان کر کرتا تھا نہ کہ حق، اس کے علاوہ اس کا چال چلن صاف تھا اور اس معاملہ میں اپنے باپ کی طرح بدنام نہ تھا۔

محمد حسن کی شادی بہت قبل ہو چکی ہوتی مگر خانصاحب چونکہ قصبہ میں کسی کو اپنے برابر نہ جانتے تھے اس لیے اس کی نوبت نہ آئی تاہم وہ چیز جسے شباب کہتے ہیں ان رسمی قیود سے بالاتر ہے۔ خانصاحب کا خواہ کچھ ہی خیال ہو لیکن محمد حسن اپنے دل میں ایک تصویر قایم کئے ہوئے تھا یہ تصویر اب کی نہیں بلکہ اب سے برسوں پہلے دل میں جگہ پا چکی تھی جبکہ محمد حسن جمنا کے گھڑے میں غلے مارا کرتا تھا اور جمنا کوسا کرتی تھی۔

امتداد زمانہ کے ساتھ محمد حسن کے دل میں جمنا کی جس قدر محبت بڑھتی رہی اسی قدر تکلف بھی زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ چند سال سے دونوں گویا ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔

محبت کی زندگی کبھی یکساں نہیں رہتی، محمد حسن نے پہلے تو کافی زمانہ راضی بہ رضا نہایت صبر و سکون سے گزار دیا لیکن جب رد عمل شروع ہوا تو اس نے کوئی جایز ذریعہ حصول مقصد کے لئے نہ چھوڑا مگر اس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ محمد حسن خود شیر افگن تھا اور شیر گیر کا لڑکا بھی اور اثر کا یہ عالم کہ گاؤں کا کوئی فرد نہ تھا جو اس سے لرزہ براندام نہ ہو۔ مور مارنے کی سزا جو دہ سال قید مقرر تھی لیکن وہ روزانہ شکار کرتا تھا مندر و مسجد پر سے کبوتر مار لینا تو معمولی بات تھی مگر خدا جانے جمنا میں وہ کونسی طاقت تھی کہ محمد حسن جیسا شخص اس کو دیکھ کر ایسا کھو جاتا تھا کہ جمنا کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ گاؤں کے پہلو میں سیر ندی بہتی تھی اور یہی گاؤں والوں کے لئے ذریعۂ حیات تھی، صبح شام گاؤں کی عورتیں پانی بھرنے اس کے کنارے جمع ہوتی تھیں اور اپنے گھڑے بھرنے سے پہلے آپس میں خوب باتیں کرتیں، گاؤں بھر کے قضیئے زیر بحث آتے فصل پر رائے زنی ہوتی۔ زیور کی کثرت اور قلت پر تنقید ہوتی پانی اچھالا جاتا اور لمبی لمبی تانوں سے گایا جاتا۔

محمد حسن گو جانتا تھا کہ وہ جمنا کو ندی کے کنارے دیکھ سکتا ہے لیکن اس خوف سے کہ مبادا جمنا کو برا معلوم ہو وہ کبھی ندی کے کنارے نہیں گیا۔ چند دن تک تو یہی حالت رہی لیکن محمد حسن بہت روز صبر نہ کر سکا اور اس کا معمول ہو گیا کہ وہ جھاڑیوں میں چھپ کر جمنا کو دیکھنے لگا جس وقت وہ جمنا کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیل میں مصروف دیکھتا تو اس کا بے اختیار جی چاہتا کہ خود ان کے کھیل میں شریک ہو جائے یا جمنا کے سوا سب کو گولی مار دے، کئی مرتبہ اس کے دل میں یہ آرزو بھی پیدا ہوئی کہ اے کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں جب چاہتا عورت اور جب چاہتا مرد بن جاتا۔

زمانہ گزرتا رہا اور محمد حسن نے کوئی بات اپنی طرف سے ایسی نہ ہونے دی کہ جمنا کو کوئی شکایت پیدا ہو لیکن جب کبھی راہ میں جمنا کا سامنا ہو جاتا تو ایک نظر کے بعد کوئی کسی کو دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔

برسات کا زمانہ تھا گاؤں میں ندی بھری تھی۔ پانی روزانہ برس رہا تھا [illegible] اپنے دونوں کناروں سے اُبلی ہوئی تھی، برسات میں ملہار اور ساون کی تانیں فرائض مذہبی میں داخل ہیں گاؤں کی عورتیں دریا پر آتے جاتے برابر گایا کرتیں۔

ایک دن شام کو کچھ جھٹ پٹا سا ہو رہا تھا کہ جمنا چند لڑکیوں کے ساتھ ندی پر آئی سب نے اپنے اپنے گگرے بھرے جمنا نے جس وقت گگرا ندی میں ڈالا ساتھ والی لڑکی نے اس سے کچھ کہا وہ اس طرف متوجہ ہوئی ادھر گگرا ہاتھ سے چھوٹ گیا، جمنا یہ سمجھ کر کہ پانی تھوڑا ہے آگے بڑھی آگے قدم بڑھانا تھا کہ فوراً پانی میں غرق ہوگئی، جمنا نے اُبھر کر سنبھلنا چاہا کہ ایک بڑی موج نے کنارے سے اس کو دور پھینک دیا لڑکیوں میں کھلبلی مچ گئی اور "بچاؤ بچاؤ" کا شور بلند ہوا محمد حسن نے اپنا معمول نہ چھوڑا تھا جھاڑی سے نکل کر مع کپڑوں کے ندی میں کود پڑا جمنا اب تک دو غوطے کھا چکی تھی تیسری مرتبہ وہ اُبھری تھی کہ محمد حسن پہونچ گیا اور بے جان لاش کی طرح پیٹھ پر لاد کر کنارے ڈال دیا جمنا بالکل بے ہوش تھی وہ اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے چل دیا۔

(۳)

جب خانصاحب کو جمنا کے ڈوبنے اور محمد حسن کے بچانے کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو اچھا نہ سمجھا کیونکہ جب مذہبی تقشف حدود سے متجاوز ہو جائے تو انسان اپنے عقاید کے خلاف کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ مذہبی آدمیوں میں جذبات رحم و کرم نہیں رہتے۔ آج پہلا موقعہ تھا کہ گاؤں والوں نے باوجود اپنی بیزاری کے محمد حسن کی جرأت و ہمت کی تعریف کی۔ بلدیو جمنا کے بوڑھے باپ کی زبان دعائیں دیتے دیتے خشک ہو رہی تھی جب وہ محمد حسن کے پاس شکریہ ادا کرنے آیا تو جوش تشکر نے اس کی زبان بند کر دی تھی، ہزار خوشامدیں کر کے اپنے گھر لے گیا اپنی حیثیت کے مطابق خدمت کی جمنا آج دوڑ دوڑ کر کام کر رہی تھی جب بلدیو نے یہ کہا کہ "بھیا یہ آج سے آپ کی بہن ہے میں تو غلام ہوں جو چاہو خدمت لو"، تو محمد حسن کی یہ حالت تھی کہ دل اندر سے اُمنڈا آتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ بلدیو کے قدموں میں گر کر اپنا حال کہدے لیکن اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

آہستہ آہستہ محمد حسن کی آمد و رفت بلدیو کے گھر بہت بڑھ گئی لیکن جمنا سے گفتگو کا اس کو کبھی موقعہ نہ ملا، ممکن ہے خود اُس نے کبھی ایسا موقعہ نہ آنے دیا ہو لیکن بے تاب نظریں اور تڑپنے والا دل ایسی چیزیں نہیں کہ ان کا اثر نہ ہو دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور دل ہی دل میں گھٹتے رہتے تھے۔

دل کی آگ جب مشتعل ہو جاتی ہے تو ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح پھونک دیتی ہے چنانچہ محمد حسن بہت جلد اس زندگی سے بیزار ہو گیا کیونکہ وہ جمنا کے سامنے بے اختیار ہو جاتا تھا اور وہ بے اختیار ہونا چاہتا نہ تھا۔ محبت میں خود اعتمادی کا خیال ہمیشہ غلط ہوتا ہے اور انسان بہت جلد اپنی غلطی محسوس کر لیتا ہے محمد حسن نے اُکتا کر اور یہ خیال کر کے کہ جب پاس رہنے میں بھی وہی اذیت ہے جو دور رہنے میں ہے، جمنا کے گھر جانا بند کر دیا، اس کا خیال تھا کہ اس طرح سکون حاصل ہو جائے گا لیکن بہت جلد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اپنے فیصلہ پر افسوس کرنے لگا وہ کام میں مصروف ہو گیا کہ جمنا کا خیال اس کو نہ ستائے مگر وہ جسقدر اس کے خیال کو دور کرتا تھا اسی قدر جمنا اسکے دل و دماغ

زیادہ مستولی ہوتی جاتی تھی، اس کا دل چاہتا تھا کہ پھر وہی ہنستی ہوئی آنکھیں اور روشن چہرہ سامنے ہو لیکن یہ منظر اب کہاں اگرچہ بلدیو نے کئی مرتبہ خود آکر وجہ پوچھی اور سے جانا چاہا مگر محمد حسن نے انکار کر دیا کیونکہ وہ اس میں اپنی سبکی محسوس کرتا تھا کہ وہ چند روز بھی اپنے عزم پر قائم نہ رہ سکے۔

جمنا اپنے دل میں اس تغیر پر حیران تھی اس کا جی چاہتا تھا کہ خود محمد حسن کے گھر جا کر اس سے وجہ دریافت کرے۔ لیکن خانصاحب کے خوف سے وہ ایسا نہ کر سکی۔

جب تک محمد حسن کی آمدورفت جمنا کے گھر رہی، جمنا اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایک مبہم مسرت کے سوا کچھ اور نہ محسوس کر سکی مگر جب محمد حسن نے آنا بند کر دیا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کی زندگی سے کوئی لطیف شئے نکال لی گئی ہے اور اس نے زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا ہے۔

ایک دن جمنا پانی بھرے گھر واپس جا رہی تھی کہ راستہ میں محمد حسن کا سامنا ہو گیا۔ محمد حسن نے تو آنکھ بچا کر گزر جانا چاہا مگر جمنا راستہ روک کر سامنے کھڑی ہو گئی کچھ دیر تو دونوں طرف خاموشی رہی، جمنا اس وقت مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھی لیکن دماغی اضطراب کی وجہ سے خیالات کہیں سے کہیں لئے جا رہے تھے آخر اس نے جی کڑا کر کے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا کہ "آپ نے آنا کیوں بند کر دیا"، محمد حسن کا سانس پھول رہا تھا اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا وجود فضا میں تحلیل ہو چکا ہے اور جمنا کی آواز دنیا کے کسی بعید گوشہ سے اس کے کان میں آ رہی ہے جب جمنا نے کئی مرتبہ اپنا سوال دہرایا تو اس کو ہوش آیا گھبرا کر کہدیا کہ "آج کل کام زیادہ ہے اس لئے نہ آسکا"۔ اس پر جمنا نے کہا کہ "یہ بات نہیں میں تو سچی بات پوچھتی ہوں" محمد حسن کا جی چاہتا تھا کہ آج وہ سب کچھ کہدے جس کے کہنے کی تمنا پر وہ زندہ تھا چنانچہ اس نے کافی تردد کے بعد یہ کہہ ہی دیا کہ جمنا اگر تمہارے پاس آنکھیں ہوتیں اگر تمہارے پاس دل ہوتا تو میں یقین کر لیتا کہ تم بے خبر ہو لیکن جب ایسا نہیں ہے تو بتاؤ کہ اپنے نہ آنے کی کیا وجہ بیان کروں اگر میں یہ کہوں کہ تم مجھ کو خود آنے سے روکتی ہو تو تم یقین نہ کرو گی لیکن یہ واقعہ ہے میں نے بہت چاہا کہ اپنی حالت کو تم پر ظاہر نہ کروں مگر جب تم خود دریافت کرو تو پھر بتاؤ کہ میں کیا کروں اگر کسی کو عزیز رکھنا جرم ہے تو میں مجرم ہوں لیکن دنیا والے کبھی رحم نہیں کرتے پھر کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میرا جنون تم کو بدنام کر دے اس لئے میں کبھی نہ آؤں گا اگر خدا نے مجھ کو ہمت دی" یہ کہکر محمد حسن نظروں سے غائب ہو گیا جمنا نے گگرے کو ایک پتھر پر رکھ دیا تھا خود بھی اسی پر بیٹھ کر غور کرنے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک لمبا سانس لیکر اٹھی اور گگرا لیکر اپنے گھر روانہ ہو گئی۔

(۴)

محبت میں ناکامی انسان کو اکثر دو طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگر اتفاقی ناکامی ہوئی ہے تو خودکشی کا خیال آتا ہے ورنہ ترک سکونت کا چنانچہ محمد حسن کے دماغ میں بھی یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اگر مجھے سکون نصیب ہو سکتا ہے تو جمنا سے دور رہ کر چنانچہ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ جامعہ ملیہ جا کر پڑھنا چاہئے۔ لیکن جب اس نے اس کی اطلاع والدین کو دی

تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جب اللہ کے فضل سے گھر میں کھانے کو موجود ہے تو پھر علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر محمد حسن اپنی بات پر ایسا اڑا کہ مجبوراً اجازت دینا ہی پڑی۔

جانے سے کچھ دیر پہلے محمد حسن جمنا کے ہاں گیا اتفاق سے بلدیو کھیت پر گیا ہوا تھا محمد حسن نے لوٹ آنے کا ارادہ کیا تھا کہ جمنا نے روک لیا اس نے اپنے جانے کی اطلاع دی جمنا پریشان ہوئی اور ایسی گھبرائی کہ محمد حسن بیتاب ہو گیا اس نے کہا "جمنا تم پریشان کیوں ہوتی ہو میں نہ معلوم کس طرح اب تک یہاں رہا اب برداشت کی طاقت نہیں دل و دماغ جھلس ہو گئے، مجھے اپنی پرواہ نہیں لیکن نہ معلوم میں اپنی دیوانگی میں کیا کر گزروں اور تمھارے لئے میری دیوانگی باعث بدنامی ہو کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے اس لئے میں نے یہی مناسب جانا کہ کچھ روز کے لئے یہاں سے چلا جاؤں تم افسوس نہ کرنا میں جلد آنے کی کوشش کروں گا"

اس اتفاقی ملاقات کے بعد محمد حسن کا دل نہ چاہتا تھا کہ بستی سے باہر جائے لیکن وہ جو عزم کر چکا تھا اُس سے پھرنے میں بھی اُس کو اپنی ذلت محسوس ہوتی تھی آخر جس طرح بنا وہ دہلی روانہ ہو گیا۔

(۵)

محمد حسن کو دہلی گئے چھ برس ہو گئے اس دوران میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بستی نہیں آیا خانصاحب پریشان تھے اور برابر اس کو بلاتے رہتے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا تھا۔ اس دوران میں خانصاحب کا کاروبار بہت ترقی کر گیا اب ان کا ایک روئی کا کارخانہ اور ایک آٹے کی چکی چل رہی تھی اور اردگرد کا کوئی ایسا گاؤں نہیں تھا جو ان کا مقروض نہ ہو قرضہ میں بہت سی جائدادیں خانصاحب کے قبضہ میں آگئیں گیہوں کی فصل کا زمانہ ہے بستی اور متعلقہ گاؤں میں کہرام مچا ہوا ہے کھڑی فصلیں قرق ہو رہی ہیں کھلیانوں سے غلہ خانصاحب کے کوٹھوں میں جمع ہو رہا ہے جنھوں نے سال بھر محنت کی وہ آج سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہے ہیں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ دو چار گاؤں والے رقم کی عدم ادائی پر جوتے نہ کھاتے ہوں نہایت سخت جذبۂ نفرت خانصاحب کے خلاف پھیلا ہوا ہے لیکن کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ خانصاحب کا مقابلہ کرے بہت سے گھر بار چھوڑ کر علاقہ غیر میں جا بسے جو باقی ہیں وہ فاقوں مر رہے ہیں تمام علاقہ میں تباہی پھیلی ہوئی ہے یوں دیکھا جائے تو اب کے بستی میں اس وقت کی بستی سے بہت فرق ہے دو ملوں نے کاروبار کو بہت ترقی دیدی ہے مگر ایک چیز ایسی پیدا ہو گئی ہے جو اس وقت نہ تھی اس وقت بستی میں کوئی مزدور نہ تھا اور آج سوائے مزدور کے کوئی کاشتکار نہیں غریبوں کے گھر بھی سود در سود کی نذر ہو چکے ہیں اور کرایہ پر رہتے پھرتے ہیں۔

دولت کی ترقی کے ساتھ خانصاحب کا مذہبی انہماک بھی ترقی کر گیا۔ پہلے صرف نماز پڑھنے کا شوق تھا اور اب نماز پڑھانے میں ان کو بہت مزہ آنے لگا ہے نہایت قرأت کے ساتھ لمبی لمبی صورتیں نماز میں پڑھتے ہیں اور بعد نماز حقوق العباد خدا کے رحم و کرم اور آنحضور کے جذبۂ رافت و نرمی پر وعظ فرماتے ہیں صبح کو گھر پر تلاوت قرآن کے ساتھ اپنے مقروضوں کو

گالیاں بھی اسی زور شور کے ساتھ دیتے جاتے ہیں اکثر جاہلوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اس میں اپنے بیٹے کا ذکر نہایت فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔

جمنا کی شادی کو تین برس ہونے کو آئے اب وہ یہاں سے بہت دور اپنی سسرال میں رہتی ہے اور جب کبھی اپنے میکے آتی ہے تو محمد حسن کے متعلق ضرور دریافت کرتی ہے۔ جمنا کی شادی کے وقت بلدیو نے جو روپیہ خانصاحب سے قرض لیا تھا وہ کسی طرح ادا نہ ہوا اگرچہ سود میں اصل رقم کے برابر وہ روپیہ ادا کر چکا ہے۔ جب خانصاحب کے تقاضے اور گالیوں کے باوجود بلدیو رقم ادا نہ کر سکا تو خانصاحب نے ڈگری جاری کرا کے مکان اور بیل نیلام کرا لئے روپیہ کی قلت اور ضعف کی وجہ سے اس نے خانصاحب کی نوکری اختیار کر لی اور اپنے کھیتوں پر خانصاحب کے ملازم کے طور پر کام کرنے لگا جب وہ اپنے کھیتوں پر ملازم کی حیثیت سے کام کرنے جاتا تو پہلے مینڈ پر بیٹھ کر روتا اور محمد حسن کو یاد کرتا، اس کا خیال تھا کہ وہ اگر یہاں موجود ہوتے تو ضرور اس کی مدد کرتے اگر کسی دن کام میں کوئی خرابی ہو جاتی تو وہ خانصاحب کی گالیاں اور ان کے ملازموں کی مار برداشت کرتا بلدیو اس وقت زبان سے کچھ نہ کہتا لیکن پرماتما کے انصاف پر ضرور مسکرا دیتا۔

فصل کا زمانہ وصولی کا ہوتا ہے۔ اتفاقاً مصری پور کا زمیندار جو کسی زمانہ میں خوش حال تھا لیکن اب خانصاحب کے قرض سے اس کا بال بال جکڑا ہوا تھا جو بستی میں رات کو ایک شادی میں آیا خانصاحب کے ملازم بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھے انھوں نے خانصاحب کو اس کی اطلاع دی، وہ کچھ آدمیوں کو لیکر شادی میں پہونچے زمیندار کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے سیکڑوں گالیاں دیں اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ لگاؤ اس کے جوتے، لوگوں نے خوشامد بھی کی لیکن خانصاحب نے ایک نہ سنی اور زمیندار کو خوب ذلیل کر کے اور روپیہ کی ضمانت لیکر لوٹے، زمیندار اپنی یہ ذلت دیکھ کر دبتا ہوا بارات سے رخصت ہو گیا اس واقعہ کے پندرہ روز بعد رات کو بارہ بجے کے قریب قصبہ میں شور ہوا کہ خانصاحب کے مکان میں آگ لگی ہے اگرچہ خطرہ تھا کہ آگ کہیں سارے گاؤں کو نہ پھونکدے لیکن اہل قصبہ کو جو قلبی تنفر خانصاحب سے تھا اس نے کسی کو خانصاحب کی مدد پر آمادہ نہ کیا بلکہ لوگ گھروں سے بھی نہ نکلے آگ نے بہت جلد خوفناک صورت اختیار کر لی اور خانصاحب کا مکان شعلہ زار بن گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکان کے چاروں طرف بیک وقت آگ لگی ہے خانصاحب نے بیدار ہو کر باہر بھاگنا چاہا لیکن دروازہ پر پہونچکر معلوم ہوا کہ باہر سے زنجیر بند ہے سیکڑوں آوازیں دیں لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا باہر جانے کا صرف ایک ذریعہ رہگیا تھا مکان کے تینوں طرف عمارت تھی اور ایک طرف بہت اونچی دیوار تھی، خانصاحب کوئی مفر نہ دیکھ کر دیوار پر چڑھ گئے اور مدد کے لئے آوازیں دیں لیکن صدائے برنخواست اگرچہ نیچے کودنا موت کے منھ میں جانا تھا لیکن اس کے سوا اور چارہ بھی نہ تھا دوسرے خانصاحب کے دماغ کو عورتوں اور بچوں کی چیخوں نے اس قدر

از خود رفتہ کر دیا کہ دیوار سے کود پڑے، تیس فٹ کی بلندی سے پتھر کی ایک چٹان پر گرے اور دماغ پاش پاش ہو گیا۔
بلدیو خانصاحب کی دوکان پر سو رہا تھا جب اس نے شور و غل کی آوازیں سنیں تو بھاگا ہوا مکان پر پہونچا اندر کہرام مچا ہوا تھا اس نے چاہا کہ مکان کا دروازہ کھولدے زنجیر کو ہاتھ لگایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس زور سے لٹھ مارا کہ بلدیو بے ہوش ہو کر گر پڑا لیکن وہ زنجیر کھول چکا تھا، زنجیر کھلتے ہی عورتیں اور بچے باہر آ گئے لیکن ان کے جسم جھلسے ہوئے تھے اور باہر آتے ہی اکثر ان میں سے بے ہوش ہو گئے۔ صبح کو پولیس نے تحقیقات شروع کی اور مجروحین کو قریب کے شفاخانہ بھیجا دوکان پر قفل ڈالدیا اور محمد حسن کو تار دیا۔

(۶)

ان واقعات کو دو سال کا زمانہ گزر گیا ہے محمد حسن کا کاروبار اب سود پر نہیں چلتا، جن پر خانصاحب کا قرض تھا ان سے سود معاف کر کے اصل رقم لی اور جو سود میں کچھ رقم دے چکے تھے اس کو اصل میں شامل کر کے بقیہ رقم وصول کی، یا تو یہ حالت تھی کہ گاؤں والے اس گھر سے پناہ مانگتے تھے یا محمد حسن کے طرز عمل سے ایسے خوش ہوئے کہ گاؤں کے تمام جھگڑے اسی کے ذریعہ سے طے ہونے لگے جسوقت دیکھو گاؤں والے اس کے گرد جمع ہیں جب وہ کسی راستہ سے نکل جاتا تو لوگ کھڑے ہو کر سلام کرتے اور جب کہیں جاتے تو اس کی بھلائی کی تعریفیں اپنے ساتھ لئے جاتے۔ وہ قرض اب بھی دیتا تھا لیکن اس کی وصولی کے لئے کبھی اس کو گالیوں اور لٹھ کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، نماز وہ بھی پڑھتا تھا اور بڑی جماعت کے ساتھ مگر کبھی اس کو نماز میں آنے کے لئے دھمکانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ بلدیو اب محمد حسن کا نوکر نہیں بلکہ معتمد خاص تھا گھر کا سارا کاروبار اسی کے ہاتھ میں تھا اس کا مکان اس کو واپس مل چکا تھا اور وہ ہر طرح خوش تھا جمنا کئی برس سے میکے نہیں آئی تھی بلدیو اکثر چاہتا تھا کہ جا کر لائے لیکن کوئی نہ کوئی کام ایسا نکل آتا کہ اس کا جانا ملتوی ہو جاتا محمد حسن باوجود اس مصروفیت اور سکون کے کچھ کھویا سا رہتا ماں نے کئی بار شادی کرنے کو کہا لیکن اس نے ٹال دیا اسی طرح زمانہ گزرتا رہا، سردی کا موسم تھا بلدیو کو کھیت پر سردی لگ گئی اور گھر پہونچتے پہونچتے اچھا خاصا بخار ہو گیا رات بھر بے ہوش رہا صبح محمد حسن کو خبر ہوئی وہ فوراً پہونچا اور علاج کی فکر کی، بیماری کے ۱۵-۲۰ دن بعد بخار ہلکا ہونا شروع ہوا اب سب کو یقین ہونے لگا کہ بلدیو اچھا ہو جائے گا۔ ایک روز صبح کو محمد حسن بلدیو کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ بلدیو کے نام جمنا کی سسرال سے ایک خط آیا محمد حسن نے پڑھا تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، جب بلدیو کو اس کی خبر کی کہ جمنا رانڈ ہو گئی ہے تو وہ فرطِ غم سے بے ہوش ہو گیا، بہت دیر بعد جب اسکو ہوش آیا تو اس کی حالت پھر متغیر ہو گئی اور بیماری عود کر آئی محمد حسن نے اس کو سکون دینے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا اضطراب بڑھتا ہی گیا وہ بار بار کہتا کہ میاں جمنا کو بلوا لو وہاں نہ معلوم اس کا کیا حال ہو گا مجبور ہو کر محمد حسن نے اپنے بڈھے منیب کو جمنا کے لینے کے لئے روانہ کیا۔ چھٹے دن جب جمنا پہونچی تو محمد حسن خود گاڑی لیکر اسٹیشن پہونچا

جب جمنا کی نظر محمد حسن پر پڑی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے محمد حسن کی حالت اسوقت خود خراب تھی لیکن جس طرح ممکن ہوا اپنی بھرائی ہوئی آواز میں تسکین دی۔

جب محمد حسن اور جمنا بلدیو کے پاس پہونچے تو وہ بے چینی سے جمنا کا انتظار کر رہا تھا جمنا کو دیکھ کر وہ اسقدر رویا کہ اس کی حالت خراب ہو گئی جب کچھ سکون ہوا تو اس نے ایک نظر دونوں پر ڈالی اور غمگین آواز میں کہا کہ:-

" میاں آپ نے ایک بار جمنا کو مرنے سے بچایا تھا آج پھر یہ ڈوبنے کے قریب ہے میری زندگی اب چند گھنٹے سے زیادہ نہیں۔ آپ پریشان نہوں میں اپنی حالت خوب جانتا ہوں۔ اس کا اب آپ کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ آپ ہی دنیا میں اس کا سہارا ہیں۔ اگر میرے بعد اس کو تکلیف پہونچی تو مجھ کو مر کر بھی چین نہ ملیگا۔ لایئے میں آپ کے ہاتھ میں جمنا کا ہاتھ دے جاؤں تاکہ میں سکون سے مر سکوں " یہ کہہ کر جمنا کا ہاتھ بلدیو نے محمد حسن کے ہاتھ میں دیدیا اور ایسی آنکھیں بند کیں کہ پھر نہ کھولیں۔

محمد ذوالفقار کیفی منشی فاضل

خودکشی

(نفسیاتی روشنی میں)

متمدن ممالک میں اعداد و شمار فراہم کرنے اور ان کو دیکھ کر کسی خاص نتیجہ تک پہونچنے کی بڑی کاوش کی جاتی ہے چنانچہ وہاں واقعات خودکشی کی فہرست بھی وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہتی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ خاص سبب کیا ہے جو تمام خودکشی کرنے والوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

بیمہ کمپنی والوں نے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر اسباب کو دیکھ کر کبھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک شخص خودکشی کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ خودکشی کرنے والوں میں جتنی تعداد مفلس و بیمار، ناکام و مایوس لوگوں کی پائی جاتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ امیر و تندرست، کامیاب و خوشحال لوگوں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ فہرست اعداد و شمار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جنگ سے زیادہ زمانۂ امن میں، بیماری سے زیادہ صحت کی حالت میں اور غریبوں سے زیادہ خوشحال لوگوں میں خودکشی کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسکا تعلق جہل و وحشت سے ہے تو بھی درست نہ ہوگا کیونکہ خودکشی کے واقعات شایستہ ممالک اور تعلیم یافتہ لوگوں میں بہ نسبت غیر مہذب ممالک اور جاہل انسانوں کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

تحقیق کرنے والوں نے ہر چند جسمانی حالات کے لحاظ سے خودکشی کے اسباب پر غور کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جذبہ کا تعلق ایک خاص دماغی ردّ عمل سے ہے جس پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے غور کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے اس امر کا ثبوت کہ یہ کسی خاص اندرونی جذبہ سے متعلق ہے اس سے بھی مل سکتا ہے کہ وہ لوگ جو مذہب کے سختی سے پابند ہیں ان میں خودکشی کے واقعات بہت کم پائے جاتے ہیں، کیونکہ مذہب اس کو گناہ قرار دیتا ہے جس کی سزا مرنے کے بعد بھی ملے گی اور سزا کا خیال یا محض احکام مذہبی کی پابندی کا احساس اس جذبہ یا نفسیاتی کیفیت کو ضعیف کر دیتا ہے جو خودکشی کا سبب ہوا کرتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جذبۂ خودکشی ایک نوع کا جنون ہے، دیوانگی ہے لیکن ایسا کہنا درست نہیں

کیونکہ یہ صحیح ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ پاگل خانوں میں خودکشی کے واقعات زیادہ پائے جائیں، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ عورتوں اور مردوں کی نسبت کے لحاظ سے اس مسئلہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دیوانگی یا جنون کے باب میں مرد و عورت کی نسبت برابر کی ہے لیکن پاگل عورتوں کی بہ نسبت پاگل مردوں میں خودکشی کے واقعات چہار چند زیادہ پائے جاتے ہیں۔ الغرض جنون و دیوانگی کو خودکشی کا سبب قرار دینا کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا۔

اب افلاس و غربت کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ کروروں انسان دنیا میں اس وقت ایسے موجود ہیں جو حد درجہ تنگی و عسرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن شاید ہی ہزار دو ہزار میں کسی کو خودکشی کا خیال پیدا ہوتا ہو اگر افلاس ہی اس کا داعی سبب ہو سکتا ہے تو چاہیئے کہ مریضوں میں سے اکثر لوگ خودکشی کر لیا کریں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا اور اسپتالوں میں خودکشی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ جنگ بھی ایک سبب خودکشی کا ہوا کرتی ہے لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران میں بہت کم واقعات خودکشی کے رونما ہوتے ہیں، چنانچہ امریکہ کے دو سال جنگ کے زمانہ میں خودکشی کی تعداد پچھلے پانچ سال سے بھی کم تھی۔

ماہرین نے یہ بھی غور کیا ہے کہ کیا سیاسی استبداد خودکشی کا باعث ہو سکتا ہے لیکن نتیجہ یہی نکلا کہ اس کا تعلق بھی اس مسئلہ سے نہیں ہے، کیونکہ اب مغرب میں بہ نسبت پہلے کے زیادہ سیاسی آزادی پائی جاتی ہے لیکن خودکشی کے واقعات بھی اسی کے ساتھ بڑھ گئے ہیں۔

اب رہ گیا سوال موسم کا، سو یہ بھی بالکل غیر متعلق نظر آتا ہے، کیونکہ ممالک مغرب میں جہاں مئی و جون کا زمانہ موسم بہار سمجھا جاتا ہے خودکشی کے واقعات بہ نسبت ایام سرما کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ الغرض جنون، بیماری، افلاس و خرابی موسم وغیرہ سے جذبۂ خودکشی بالکل غیر متعلق معلوم ہوتا ہے اور یقیناً اس کا تعلق ایک خاص میلانِ نفسی سے ہے جسے جذبۂ انانیت[1] (Egoism) کہتے ہیں۔ ایک خاص پندار و عزم کے ساتھ کسی مقصد کے حصول کی کوشش کرنا اور پھر اس میں ناکام رہنا یا کامیابی کے بعد اس پر قائم نہ رہ سکنا بعض جذبۂ انانیت رکھنے والوں کو حد درجہ متاثر کرتا ہے اور وہ شکست کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خودکشی کرنے والا اپنی جان دیکر ایک طرح اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک جذبۂ فتحمندی بھی رکھتا ہے یعنی یہ کہ اس نے اپنے دشمنوں کو عرصہ تک اپنی ذلت و ناکامی پر مسرور رہنے کا موقع نہیں دیا۔ خودکشی کرنے والے کی نگاہ میں ساری دنیا اور خصوصیت کے ساتھ اس کا وہ حصہ جو اس کی ذلت و ناکامی کا

---

[1] اردو میں یہ لفظ بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں "خود پرستی" کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے

ذمہ دار ہے، اس کا دشمن ہوتا ہے اور اس لئے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا دشمن اس کی مغلوبیت پر خوش ہو، چنانچہ وہ خودکشی کرکے اپنے نزدیک خود ایک نوع کی فتح اپنے دشمن پر حاصل کرلیتا ہے۔

اعداد و شمار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں زیادہ تعداد میں خودکشی کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو کاروبار میں ایک دفعہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد دفعتاً ناکام ہوجاتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے سامنے سوال فقر و فاقہ کا نہیں ہوتا بلکہ اُس غرورِ نفس کے ٹوٹنے کا ہوتا ہے جو سوسائٹی میں انھیں سربلند رکھتا تھا اور اس سے ان کے دل و دماغ کو اتنا صدمہ پہونچتا ہے کہ وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتے اور صرف اس لئے کہ دشمن عرصہ تک ان کو مغلوب حالت میں دیکھ کر مسرور نہ ہوسکیں وہ اپنی جان کھو دیتے ہیں۔

رسل فرنزیر نے خودکشی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ:۔ مغرب کے کسی چھوٹے سے شہر میں ایک شخص نے آہستہ آہستہ غیر معمولی تجارتی کامیابی حاصل کرلی اور اسی کے ساتھ اس کا اقتدار بہت بڑھ گیا یہاں تک کہ ہر شخص اس کو اپنا حاکم و سردار سمجھنے لگا، اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک اور تاجر پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ اس کو شکست دینا شروع کی اور حالات بالکل بدل گئے یعنی تمام وہ عزت جو کسی وقت اس کو حاصل تھی، اس نئے نوجوان تاجر نے چھین لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوب تاجر نے خودکشی کرلی۔ آپ سمجھے کہ وہ کونسا نفسیاتی ردِّ عمل تھا جو اس کا محرک ہوا۔

اس نے سوچا ہوگا کہ میری تمام عمر کی محنت و جانفشانی کا نتیجہ جو یوں خاک میں مل رہا ہے، تو اب دو ہی صورتیں ہیں، یا یہ کہ میں اپنی اس شکست کو تسلیم کرکے ذلیل زندگی بسر کرنا منظور کروں اور دشمن کی فتحمندی کے مناظر دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ پیتا رہوں یا یہ کہ خودکشی کرکے اس تمام جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کردوں۔ چنانچہ اس نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور اپنی جان دیدی۔

ایک غیور شخص کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر کوئی نہیں کہ وہ فریق ثانی سے مغلوب ہونے کے بعد اپنی مغلوبیت اور دشمن کی فتحمندی کو دیکھنے رہنے کے لئے زندہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شکست کے بعد اس کی زندگی کا ہر لمحہ فاتح کی کامیابیوں میں ایک اضافہ ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے کوئی نہیں کہ اپنی جان دیکر دشمن کو اس فائدہ سے محروم کردیا جائے اسی کے ساتھ خودکشی کرنے والا یہ بھی سمجھتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد لوگوں کا خیال فوراً اس کی طرف مبذول ہوجائے گا اور بجائے حقارت و تنفر کے لوگوں کا جذبۂ عزت و رحم اس سے متعلق ہوجائے گا اور یہ ایک بہترین صورت دشمن سے انتقام لینے کی ہے۔

مغرب میں اس قسم کے واقعات خودکشی کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ ایک اطالوی شخص اپنے وطن سے ہجرت کرکے نیویارک آیا اور بیس سال کی تگ و دو کے بعد اس نے غیر معمولی جاہ و ثروت حاصل کرلی اس کا انتہائی نقطۂ نظر صرف یہ تھا کہ وہ دولتمند ہونے کے بعد اپنے وطن واپس جائے گا اور وہاں اپنے ہمسروں کے مقابلہ میں اپنی کامیابی

مظاہرہ کرے گا۔ جہاز نیویارک سے ٹھیک نو بجے صبح کو روانہ ہونے والا تھا۔ روانگی سے چند منٹ قبل یہ تختہ پر پہونچا اور اپنا ٹکٹ دکھا کر مطمئن ہوگیا۔ لیکن ٹھیک اُسی وقت اس کا پروانہ راہداری طلب کیا گیا جو غلطی سے اس نے حاصل نہیں کیا تھا۔ جہاز کے کپتان نے اس سے کہا کہ بغیر پروانۂ راہداری کے اس کو سفر کی اجازت نہیں دیجا سکتی اسنے انتہائی کوشش کی کہ بغیر پاسپورٹ کے اس کو سفر کی رخصت مل جائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ بس فوراً اس کے دماغ میں نفسیاتی ردِّ عمل شروع ہوا۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی کا جایزہ لیکر سوچا کہ کامل بیس سال اس نے اسی لئے عرقریزی کی تھی کہ وہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس جائے اور اب اس کو اک نہایت نامعقول عذر کی بنا پر اس سے باز رکھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا وہ جہاز سے واپس جانے کی ذلت اختیار کرے؟

اس کا جواب اس کے جذبۂ انانیت کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ "کیا تو نے خود اپنی ذاتی محنت وقابلیت سے اتنی غیر معمولی دولت حاصل نہیں کی اور کیا تیری تنہا تمنا یہ نہ تھی کہ تو اپنے وطن واپس جائے، اور اب آخری لمحہ میں تیری یہ آرزو خاک میں ملائی جارہی ہے، تجھ کو یقیناً انتقام لینا چاہئے"

وہ فوراً جہاز کے کنارے تک پہونچتا ہے اور اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کرکے ہمیشہ کے لئے دنیا سے غائب ہوجاتا ہے۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے اس کا دماغ خراب تھا، کوئی کہتا ہے یہ کسی ایسی بیماری کا شکار تھا جس سے شفا پانے کی خود بھی اسے اُمید نہ تھی، کسی نے کہا کہ یہ کوئی مجرم تھا، کسی نے کوئی وجہ بتائی اور کسی نے کچھ، لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہ گئی کہ جو کچھ اس نے کیا وہ صرف اپنے جذبۂ انانیت وخودداری کی بنا پر کیا اور اس سے بہتر انتقام وہ جہاز کے کپتان یا پروانۂ راہداری کے قانون سے نہیں لے سکتا تھا۔

کسی ایک مقصد کو مرکزِ زندگی قرار دیدینا، کسی ایک تمنا کو حیات کا مقصود بنالینا انسان میں ایک خاص قسم کا تفرد (Individualism [1]) پیدا کردیتا ہے اور ایسا شخص اپنی دنیا الگ بناکر اس میں تنہا زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے اسی لئے انسانی حیات کے اس پہلو میں جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اجتماعیت سے ہے خودکشی کی مثالیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں۔

تفردی (Individualist) جماعت میں جن لوگوں کا شمار ہوتا ہے ان میں خاص خاص

---

[1] (Individuality) کا ترجمہ اکثر حضرات "انفرادیت" کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ انفراد وانفرادیت کا مفہوم تنہائی (Loneliness) ہے میں نے (تفرد) کیا ہے اس سے ہم اصطلاحی مشتقات بھی زیادہ حاصل کرسکتے ہیں مثلاً (Individualize) کا ترجمہ (افراد) (Individualist) کا (تفردی) - اور (Individualism) کا (تفردیت)۔

یہ ہیں :- صناع، نقاش، مصنف، موسیقار، اداکار، صحافی، سرمایہ دار- اور واقعات خودکشی انھیں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پیشہ ور طبقوں میں بھی چونکہ جذبۂ تفرد زیادہ قوی ہوتا ہے اس لئے ان میں بھی اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں سوائے مذہبی واعظوں اور رہنماؤں کے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو خدا کی مرضی میں تحلیل کر کے اپنا تفرد کھو بیٹھتے ہیں اور اسی لئے مذہبی لوگوں میں خودکشی کا جذبہ بھی مفقود ہو جاتا ہے۔ الغرض انسان کا جذبۂ انانیت یا اس کا تفرد اصل باعث خودکشی کا ہے اور جس جماعت میں یہ جذبہ ضعیف ہوگا اتنی ہی کم مثالیں خودکشی کی اس کے اندر ملیں گی۔ چنانچہ حبشیوں میں کم، وحشی قوموں میں ان سے کم اور جانوروں میں کوئی ایک مثال بھی اس کی نہ ملیگی۔

تجارتی حلقوں میں جب بازار کی حالت خراب ہو جاتی ہے تو خودکشی کے واقعے زیادہ دیکھے جاتے ہیں چنانچہ ۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۸ء میں جب امریکہ انتہائی تجارتی مشکلات میں مبتلا ہوا تو بہت لوگوں نے خودکشی کر لی، لیکن اس سلسلہ میں مطالعہ کا یہ پہلو بہت دلچسپ ہے کہ آپ جسقدر زیادہ ساحل پیسیفک کی طرف بڑھتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ میلان خودکشی کی طرف لوگوں میں بڑھتا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ان لوگوں میں جذبۂ تفرد زیادہ قوی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ ان میں کیوں اسقدر شدید ہے؟ اس کی علمی توجیہہ بھی پوشیدہ نہیں۔

تقریباً ایک صدی قبل کلفورنیا تقریباً غیر آباد تھا اور جدید آبادی کے لئے کھلا ہوا۔ چونکہ اس قطعۂ زمین کی زرخیزی مشہور تھی اس لئے تمام اطراف وجوانب سے لوگ کھنچ کھنچکر وہاں پہونچنے لگے۔ لیکن ہجرت کر کے کسی دوسرے ملک میں جانا آسان نہیں ہے، اس کو وہی لوگ انجام دیسکتے ہیں، جو صحیح و توانا ہیں، مضبوط عزم و ارادہ کے ہیں اور غیر معمولی محنت و جفاکشی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جو جماعتیں وہاں پہونچیں وہ وہی تھیں جن میں یہ صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ یہ وہاں پہونچے، بنجر زمینوں کو ہموار کیا، پہاڑوں کو کھودا، چشمے جاری کئے، کھیتیاں لیں، معدنیں دریافت کیں اور انتہائی مردانہ عزم کے ساتھ ان تھک کوشش کے ساتھ فراہمی زر میں مصروف ہو گئے، پھر ان لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی سوال تھا یعنی کامیابی اور اگر یہ حاصل نہ ہو تو فنا ہو جانا کیونکہ وہ ناکامی کی صورت میں اب اپنے اصلی وطن مشرق کی طرف تو جا نہ سکتے تھے۔ پھر چونکہ موجودہ نسل انھیں کا سیاب افراد کی ہے جن کی کوششوں نے ان میں غیر معمولی تفرد پیدا کر دیا تھا، اس لئے یہ جذبہ نسلاً بعد نسلٍ برابر منتقل ہوتا رہا۔

یوروپین ممالک میں بھی یہ جذبۂ انانیت بہت پایا جاتا ہے لیکن نہ اتنا جتنا امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ تاہم جنگ کے بعد یوروپ میں بھی خودکشی کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جنگ کے دوران میں جو توقعات لوگوں نے قایم کی تھیں وہ جنگ کے بعد پوری نہ ہو سکیں اور اس طرح ان کے جذبۂ انانیت کو بہت صدمہ پہونچا۔ مثلاً کاشتکاروں کو لیجئے جو زیادہ آزادی کے خواہاں تھے وہ جنگ کے بعد اور زیادہ پابند ہو گئے۔ پہلے اگر صورت ایک منظم مرکزی حکومت کی تھی تو اب اس نے حکومت افراد کی صورت اختیار کر لی ہے اور جماعتوں کے اختلافات رائے نے

ایسی سیاسی تفریق باہم گر پیدا کر دی ہے کہ جذبۂ تفوق و انانیت فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کی سیاسی حالت، بہترین آلہ جذبات خودکشی کی پیدائش کا ہے۔ مگر یہ مقولہ ممالک مغرب پر صادق آتا ہو تو آتا ہو۔ مشرق اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں پندارِ غیرت اس قدر محو ہو گیا ہے کہ یہاں سوال تفوق و برتری کا پیدا نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ غلامی و محکومیت کی کونسی صورت زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔

خودکشی کا ایک سبب محبت بھی ہے، لیکن یہاں بھی وہی جذبۂ انانیت کارفرما ہے، کیونکہ ایک عاشق کلیتاً اپنے محبوب پر مستولی ہو جانا چاہتا ہے اور جب یہ اس کی خواہش (جو اس کی زندگی کی تنہا خواہش ہے) پوری نہیں ہوتی تو وہ خودکشی کر لیتا ہے اس خیال سے بھی کہ اب اس کی زندگی بالکل بے معنی ہے اور اس یقین کی بنا پر بھی کہ خودکشی کے بعد وہ ایک مستقل نقش محبوب کے دل پر چھوڑ جائے گا۔

حال ہی میں ایک عجیب واقعہ آسٹریا میں پیش آیا۔ ویانا کا ایک خوبصورت نوجوان کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا جو بہت معزز خاندان کی تھی اور جو ایک بار شادی کا اقرار کر کے اس سے پھر گئی تھی۔ اس نوجوان کو جب اس انکار کی اطلاع ہوئی تو اس نے آخری ملاقات کی خواہش ظاہر کی جس کو لڑکی نے منظور کر لیا۔ جب یہ وہاں پہونچا تو اپنی وہ انگوٹھی واپس مانگی جو اس نے پیمان محبت و ازدواج کی صورت میں تحفتاً پیش کی تھی، لڑکی نے فوراً بلا تامل واپس کر دی۔ اس نے اس انگوٹھی کو اپنے قلب پر رکھا اور اسی جگہ ریوالور رکھ کر داغ دیا۔ انگوٹھی دل کے اندر پیوست ہو گئی اور وہ فوراً مر گیا۔ یہ حرکت اس نے صرف اس لئے کی تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کی توجہ (اور شاید محبت بھی) حاصل کر سکے چنانچہ اس واقعہ کا اس پر بہت اثر ہوا اور وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر خوب روئی۔

جنسی جذبہ کے سلسلہ میں جو جذبۂ انانیت و تفرد پیدا ہوتا ہے اس میں کبھی کبھی اخلاقی انحطاط کی بھی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً حال ہی میں لکھنؤ کے ایک اسکول میں نہایت افسوسناک واقعہ قتل و خودکشی کا ایسا دیکھنے میں آیا جس کے اندر اخلاقی انحطاط بدرجۂ اتم نمایاں تھا۔

ایک نوجوان لڑکا جو دسویں درجہ میں پڑھتا تھا وہ ایک دوسرے لڑکے سے محبت کرتا تھا۔ یہ لڑکا بہت معزز خاندان کا تھا اور کہا جاتا ہے کہ بہت خوبصورت تھا۔ ان دونوں کے واقعۂ محبت کی کوئی تفصیلی داستان تو معلوم نہ ہو سکی لیکن نظریہ واقعات و حالات یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کمسن لڑکے کو اس کی طرف کبھی میلان نہ ہوا تھا یا اگر کسی وقت ہوا تھا تو اب باقی نہ رہا تھا۔ بہر حال یہ محبت ناکامی کی نہایت سخت مثال تھی جو نوجوان عاشق کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ایک دن وہ کمسن لڑکے کے درجہ میں گیا اور وہاں سے اسے بلا کر اسکول کی پشت پر ایک گلی میں لے گیا۔ یہاں بہ پہ نگران دونوں میں کیا باتیں ہوئیں اس کا علم کسی کو حاصل نہیں ہو سکا لیکن دفعتاً ایک چیخ کی آواز نے لوگوں کو ادھر متوجہ کر دیا اور جب وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ دونوں لڑکوں کی بیجان لاشیں وہاں پڑی ہوئی

تھیں، نوجوان عاشق نے پہلے اپنے محبوب کو زخمی کرکے ہلاک کیا اور اس کے بعد آپنے گلے پر چھری پھیر لی ۔ یہاں بھی اسی جذبۂ انانیت کی کارفرمائی تھی لیکن جنسی خواہش کے شمول نے اس میں اتنی کثافت پیدا کردی، کہ خودکشی کرنے والے نے پہلے اسی کو فنا کر دیا جس نے اس کے جذبات کو ٹھکرایا تھا۔ گویا اب اس کے سامنے سوال محبت کا نہ تھا بلکہ صرف انتقام کا تھا، یعنے اس نے صرف یہی نہیں چاہا کہ وہ اپنی جان دیگر اس عذاب سے چھوٹ جائے بلکہ اپنے محبوب کو قتل کرکے اس نے اس کا امکان بھی نہ رہنے دیا کہ وہ کسی اور سے یا کوئی اور اُس سے محبت کر سکے۔ یہ گویا ایسا جذبۂ انانیت تھا جس کے ماتحت وہ ساری دنیا سے انتقام لینے پر تل گیا تھا۔

محبت کے سلسلہ میں عورتیں بھی خودکشی کرتی ہیں لیکن بہ نسبت مردوں کے کم اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عورتوں میں یہ جذبۂ انانیت و تفرد مردوں سے کم پایا جاتا ہے۔ کسی چیز پر تنہا قابو حاصل کرنا کسی خاص مقصد میں مرکزیت پیدا کرکے تمام دنیا کی مخالفت پر آمادہ ہوجانا یہ صرف مرد کی ذہنیت ہے۔ عورت چونکہ فطرتاً سریع التاثر واقع ہوئی ہے، اور اپنے ہر ماحول سے منفعل ہوجانے کی اہلیت رکھتی ہے اس لئے اس کے جذبات دیرپا نہیں ہوتے عورت کا فطری میلان تقلید ہے، قیادت نہیں، وہ کسی اور کی ہدایت پر عمل کرنا بہ نسبت خود ہدایت کرنے کے زیادہ پسند کرتی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں "جذبۂ انانیت" مرد سے زیادہ قوی نہیں ہوسکتا اور یہی وجہ ہے کہ خودکشی کرنے میں وہ مرد کی طرح جری نہیں۔

جذبۂ "انانیت" رکھنے والوں میں ایک طبقہ اور ہے جس کو اصولاً خودکشی زیادہ کرنا چاہئے اور وہ طبقہ نابغہ[1] (Genius) کا ہے کیونکہ جذبۂ خود پرستی جیسا اس طبقہ میں پایا جاتا ہے کسی اور میں نہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم خودکشی کرتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ایک ذہین شخص کا تخیل جتنا شدید و قوی ہوتا ہے اتنا ہی وسیع بھی ہوتا ہے، یعنی اگر وہ کسی کوشش میں اپنے رقیب کے وجود اور اپنی محرومی و ناکامی کو برداشت نہیں کرسکتا تو اسی کے ساتھ وہ تمام اسباب و علل، نتائج و غایات پر بھی غور کرتا ہے اور اسی طرح اس میں ایک کیفیت تامل اور پس و پیش کی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے جو اس کے جذبۂ "انانیت" کی شدت کو ضعیف بھی کرتی رہتی ہے اور اسی لئے وہ خودکشی کی حد تک نہیں پہونچتا۔

کاؤپر (انگریزی کا مشہور شاعر) شکایت کیا کرتا تھا کہ اس نے بارہا خودکشی کا ارادہ کیا لیکن ہمیشہ غیر متعلق خیالات نے اس کے ذہن میں مجتمع ہوکر اس خیال سے اسے باز رکھا۔ الغرض ذہین لوگوں میں ان کی وسعت خیال، جذبۂ

---

[1] نابغہ عربی لفظ ہے جو نہایت ہی غیر معمولی ذہین شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جسے انگریزی میں Genius کہتے ہیں اُردو میں کوئی ایک لفظ اس کے لئے موجود نہیں ہے اس لئے مجبوراً یہ ثقیل لفظ استعمال کیا گیا۔

انانیت کو اقدام خودکشی کے حد تک نہیں پہونچنے دیتی اور یہی سبب ہے کہ اس طبقہ میں شاذونادر ہی کوئی مثال اسکی ملتی ہے ــــــ خودکشی کی ایک قسم اور بھی ہے جو متذکرۂ بالا تمام صورتوں سے بالکل علحدہ حیثیت رکھتی ہے اور اس کا تعلق جذبۂ انانیت سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف ایک مرض کی حیثیت رکھتی ہے یعنی جس طرح اور بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، اسی طرح دفعتاً بغیر کسی سبب کے ایک احمقانہ جذبہ خودکشی کا انسان میں پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی جان دیدیتا ہے۔ یہ مرض صرف اعصاب کی حس سے تعلق رکھتا ہے اور ذہن و دماغ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کی ایک خاص مثال لارڈ کلایو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کمسن تھا تو اس وقت اس نے بارہا خودکشی کا اقدام کیا لیکن اتفاق سے اس کا کوئی دوست یا عزیز موقعہ پر پہونچ جاتا تھا اور اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکتا تھا۔ بعد کو اس نے فاتح ہندوستان ہونے کی حیثیت سے جو ترقی و شہرت حاصل کی کسی سے مخفی نہیں لیکن اقدام خودکشی کا مرض اس سے کبھی جدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ انگلستان واپس گیا تو اسوقت بھی وہ اس بیماری میں مبتلا تھا چنانچہ جس وقت وہ سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کرنے کے بعد گھر واپس آیا تو دفعتہً اس بیماری کا شدید دورہ اس پر طاری ہوا اور فوراً گولی مار کر مرگیا۔

ڈاکٹر اسٹراہان نے ایک مثال اسی قسم کی پیش کی ہے۔ ایک عورت جو چھ بچوں کی ماں تھی ایک دن دہلیز میں بیٹھی ہوئی اطمینان سے سی پرو رہی تھی کہ دفعتہً اقدام خودکشی کا مرض اس پر مسلط ہوگیا اور وہ قریب ہی کسی خندق میں جاکر ڈوب مری۔ اس نوع کے واقعات تاریخ میں بہت کم ملتے ہیں تاہم ہیں ضرور اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بالکل اعصابی مرض کی ہے اور اس کو کسی جذبۂ نفسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا کرنے والوں کے سامنے نہ کوئی سبب موجود ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی غایت بلکہ اعصاب میں دفعتاً ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے ماتحت ایک انسان اپنے آپ کو ہلاک کرڈالتا ہے اس لئے اس کو اعصابی جنون کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

خودکشی کی ایک صورت اور بھی ہے جس کا تعلق جذبۂ "شہادت و قربانی" سے ہے۔ خودکشی کی دوسری صورتوں کی طرح اس میں بھی "جذبۂ انانیت" کام کرتا ہے لیکن زیادہ بلند صورت میں۔ معمولی صورتوں میں یہ جذبہ صرف اپنی ذات اور اپنی ذاتی خواہش کے حصول سے متعلق ہوتا ہے لیکن اس صورت میں مقصد کی بلندی ملک و قوم یا ابنائے جنس سے وابستہ ہوتی ہے اور صرف دوسروں کی بھلائی کا خیال اس کا سبب ہوتا ہے۔ بہرحال ذہنیت وہی ہے گو اس کا صرف مختلف ہوتا ہے۔

قدیم صقلیہ کی تاریخ میں امپیڈاسلس (Empedocles) کا واقعہ خاص شہرت رکھتا ہے یہ شخص قوم کا اتنا محبوب تھا کہ وہ اس کے سامنے ہر چیز پیش کرنے کے لئے طیار تھی یہاں تک کہ حکومت

دینے پر بھی آمادہ تھی۔ لیکن اس نے ان تمام ہدایا و عطایا کو ٹھکرا دیا کیونکہ وہ شخص حکومت کا سخت مخالف تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قوم اس کی عاشق ہے لیکن اس کا جذبۂ انانیت صرف اس سے آسودہ نہ ہو سکتا تھا، وہ اس سے بھی زیادہ کچھ اور چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ بجائے انسان کے لوگ اسے دیوتا یا پیغمبر سمجھیں۔ پھر چونکہ وہ فلاسفر بھی تھا اور عوام کی ذہنیت کو اچھی طرح جانتا تھا اس لئے وہ ایک دن دسووئیس کے آتش فشاں پہاڑ پر چڑھ گیا اور اس کے دہانے میں اپنے آپ کو گرا دیا۔ بعد کو جو کچھ ہوا وہ عین اس کی خواہش کے مطابق تھا، یعنی لوگوں نے اس کی پرستش شروع کر دی اور اس کے بُت بنا بنا کر پوجے جانے لگے۔ جذبۂ انانیت کی شدت کی یہ انتہائی صورت ہے۔

قدیم روم کے بادشاہ اوتھو (۶۹ء) کو جب جنگ بڈریاکم میں شکست ہوئی تو بجائے واپس جانے کے اس نے اپنے آپ کو ہلاک کرنا زیادہ مناسب سمجھا تا کہ آیندہ خونریزی ختم ہو جائے، چنانچہ اس واقعہ کے بعد لڑائی ختم ہو گئی اور خونریزی بھی موقوف۔ یہ جذبہ بھی جذبۂ شہادت کے تحت میں آتا ہے۔

مسیح کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ بحیثیت معلم اخلاق و فیلسوف ہونے کے ان کا کیا مرتبہ تھا۔ ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور شہرت کی اس منزل پر پہونچ گئے تھے جو مشکل سے کسی کو نصیب ہو سکتی ہے، لیکن اس دوران میں ان کو "روحانی برتری" حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور لوگ ان سے منحرف ہونے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے بارہ حواریین بھی مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی انتہائی تمنا کو یوں برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر ان کے جذبۂ "انانیت" کو تحریک ہوتی ہے اور وہ حصول شہادت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، وہ یروشلم کی طرف جاتے ہیں جہاں وہ اپنی موت یقینی سمجھتے تھے اور آخر کار شہید ہو کر انسان سے خدا کے بیٹے ہو جاتے ہیں۔ سقراط کی داستان پڑھئے تو وہاں بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آئے گا اور یہی وہ بلند نظری تھی جو حسین کو میدانِ کربلا کی طرف کھینچ لے گئی۔

نگار کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو درج کی جاتی ہیں:۔

(۱۹۲۲ء) ستمبر و اکتوبر ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۲۳ء) مئی ۴؍۔ (۱۹۲۴ء) جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، اگست ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر، نومبر ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۲۸ء) اپریل، مئی، جون ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۰ء) مئی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۱ء) مارچ، جولائی، اگست ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) فروری، جولائی، اکتوبر، دسمبر ۶؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۴ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، اکتوبر ۶؍ فی پرچہ (۱۹۳۵ء) فروری، مئی، جون، جولائی، اگست، دسمبر ۸؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۶ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲؍ فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴؍ فی پرچہ۔ منیجر نگار

تاریخ کا ایک ورق مجہول

یہ دسواں مرتبہ ہے کہ اہل عرب طرابلس کا قلعہ فتح کرنا چاہتے ہیں۔ چاروں طرف سے قلعہ گھیر لیا گیا ہے اور نہایت سختی سے جنگ جاری ہے، محصورین بھی کچھ کمزور نہیں ہیں، برابر کا جواب دے رہے ہیں۔ آخرکار اہلِ عرب نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ فی الحال پیچھے ہٹ جانا چاہئے، تاکہ پھر نئی قوت سے حملہ کیا جائے۔

یہ واقعہ ۵۸۱ھ یا ۱۱۸۵ء کا ہے۔ یوسف صلاح الدین ایوبی نے اس بات کی قسم کھالی ہے کہ دو سال کے اندر اندر وہ اپنے ممالک فرنگیوں سے واپس لے لیگا، اور اورشلیم پر جسے صلیب پرستوں نے دوبارہ حاصل کرلیا تھا، اسلامی علم نصب کرکے چھین لیگا۔

سلطان نے یہ طے کیا کہ سب سے پہلے تمام طاقت طرابلس کی طرف صرف کرنا چاہئے کیونکہ اورشلیم تک پہونچنے کا دروازہ یہی تھا اور مغرب کے سارے بیڑے اسی طرف سے ہوکر گزرتے تھے، اس لئے اگر یہ فتح ہوگیا تو تمام بیرونی امداد کا خاتمہ ہوجائے گا اور فرنگی زیر ہوجائیں گے۔

اسوقت طرابلس کا حاکم اور فرنگیوں کا قائد ایک نہایت جری شخص تھا جسے مسلمان "قومس تولوزی" اور یہودی "ریموں نجیم" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

الغرض عربوں اور فرنگیوں کے درمیان نہایت سخت خونریزی جاری تھی اور کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا۔

ٹھیک اسی زمانہ میں، لانبے لانبے اور گھنے سرو کے جنگل میں ایک راہب رہتا تھا، جس نے رات بسر کرنے کے لئے بھدی اور مضبوط چٹانوں کے اندر ایک جھونپڑی ڈال لی تھی، وہ دن رات اسی میں پڑا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں رہتا، معلوم ہوتا تھا کہ اسے غیر معمولی آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کے متعلق کسی کو کچھ علم نہ تھا، وہاں کے قرب و جوار کے رہنے والے اسے "فقیر" کے نام سے یاد کرتے تھے اور خدا رسیدہ بزرگ سمجھتے تھے، انھیں اس کے گزشتہ حالات معلوم کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی، کچھ عرصہ کے بعد آس پاس کی تمام آبادیوں میں اس کا چرچا ہونے لگا، ہر جگہ اسی کا ذکر لوگوں کی زبانوں پر تھا۔ لوگ اسے بہت بڑا ولی سمجھتے

تھے اور لوگ بلاتفریق مذہب اس کے پاس جاتے ہاتھوں کو چومتے اور دعائیں طلب کرتے۔ لوگوں کا جوشِ عقیدت اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ اس "سعادت" کے حصول میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانیکی کوشش کرتے چاہے وہ مسلمان ہو یا نصرانی۔

زائرین میں ایک جوان اور خوبصورت لڑکی بھی تھی، لانبا قد، کشادہ پیشانی، سڈول جسم، بڑی بڑی غزالی آنکھیں، غرضکہ وہ تمام چیزیں جو حسن کے مفہوم کو تعین کرسکتی ہیں اسے حاصل تھیں وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ آتی، اور اس کے ساتھ "ریمون دی تولوز" کا ایک سوار بھی ہمیشہ ساتھ رہتا۔

یہ کون ہے؟ اس کا اس گوشہ نشین راہب سے کیا تعلق ہے؟ کسی کو معلوم نہ تھا جو کچھ لوگوں کو معلوم ہوسکا وہ صرف یہ تھا کہ اس کا نام "میری ٹریز" تھا وہ ایک روز تنہا طرابلس کے حاکم "کونٹ ریمون دی تولوز" کے پاس گئی اور کہا کہ "میرے والد جنگ صلیبیہ میں کام آچکے ہیں اور اب چونکہ میرے خاندان میں کوئی نہیں رہا اس لئے محل میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، تاکہ ان عورتوں کے ساتھ جو اس میں رہتی ہیں اپنا غم غلط کرسکوں"۔

اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ "میں فرانس کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، میں اس مقدس سرزمین میں اپنے والد کے ساتھ ایک نذر پوری کرنے آئی تھی اور ارادہ تھا کہ بیت المقدس کے فریضۂ حج کو پورا کرکے وطن واپس جاؤں گی، لیکن والد نے چاہا کہ وہ بھی جنگ میں حصہ لیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گھر سے بے گھر ہوگئی" کونٹ ایمون بہت مہربانی سے پیش آیا اور اس نے محل میں رہنے کی اجازت دیدی۔ یہ ۱۱۰۵ء کا واقعہ ہے۔

اُس روز سے یہ محل میں رہنے لگی لیکن کونٹ کی اجازت سے یہ ہفتہ میں ایک بار خاص سوار کے ساتھ راہب سے ملنے ضرور جاتی تھی۔

اسی حالت میں دس سال گزر گئے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ لڑکی راہب کے پاس جاتی اور کونٹ بھی کبھی کبھی ساتھ جاتا، دسمبر ۱۱۱۵ء کی ایک صبح کو "کونٹ ریمون دی تولوز" کے قصر کے پاس ایک نوجوان لبنان کا آیا اور اس نے وزیر طرابلس سے یہ کہکر ملنے کی خواہش ظاہر کی کہ وہ راہب کے پاس سے پیغام لایا ہے۔

جب باریابی کی اجازت ملی تو اس نے راہب کی طرف سے سلام کے بعد کہا کہ "مقدس راہب نے جو ہم سب کے نزدیک نہایت ہی محترم اور بزرگ ہستی ہے، مجھے آپ کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں اس کی ایک خواہش آپ تک پہونچا دوں۔ اس کی آرزو ہے کہ آپ اسی وقت "میری ٹریز" کے ساتھ تشریف لائیں، کیونکہ اگر آپ صبح تشریف لے گئے تو غالباً آپ سے ملاقات نہ ہوسکے گی"۔

اس گفتگو کو سنکر کاونٹ نہایت اضطراب و پریشانی کی حالت میں اُٹھا، لڑکی کو آواز دی، اور فوراً گھوڑے پر سوار ہوکر راہب کی اقامتگاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

راہب کی حالت بہت زیادہ سقیم تھی۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ گفتگو کرنا مشکل تھا، اس نے لڑکی کے زانو پر رکھ دیا اور کاونٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آہستہ آہستہ یوں گفتگو شروع کی:۔

"میرے محترم! وقت کا تقاضا ہے کہ میں اپنی حقیقت سے آپ کو مطلع کروں اور ان تمام رازوں سے جو میری زندگی سے متعلق ہیں آپ کو آگاہ کروں، کیونکہ اب میرا آخری وقت ہے، موت سر پر آچکی ہے......"

چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ سانس پھولنے لگی، حلق سوکھ گیا، تھوڑی دیر تک چپ رہا اور پھر طاقت کو مجتمع کرکے سلسلۂ کلام جاری کیا.... "کونٹ! "ہنری دی مونفور" کی باتیں جو اسوقت تم سے گفتگو کر رہا ہو ذرا غور سے سنو۔

"ریمون دی تولوز" نے تعجب سے اس کے جملہ کو دہرایا

— "ہنری دی مونفور؟!!"

— "ہاں!.... ہنری دی مونفور..... آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہئے...... تمام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ فرانسیسی جو اپنی لڑکی کے ساتھ اس مقدس زمین کی زیارت کی غرض سے آیا تھا، جنگ میں کام آگیا جس نے اپنی زندگی سے مایوس ہوکر قصداً اپنے نفس کو خطرے میں ڈالا تھا...."

— "ہاں!.... ہم لوگوں کا ایسا ہی خیال ہے......"

— "مگر تم لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہو...... ہنری دی مونفور مرا نہیں ہے، جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے بلکہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور وہ اس وقت تم سے گفتگو کر رہا ہے.... میری تمام باتوں کو غور سے سنو تا کہ اس واقعہ کو اپنے بعد دوسرے تک منتقل کرسکو...."

راہب نے چند منٹ خاموش رہکر پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا..... "ہم لوگ قدس سے واپس ہوکر ساحل لبنان کی طرف جا رہے تھے، ہمارا قافلہ بیس مرد اور تین عورتوں پر مشتمل تھا، انھیں میں میری یہ لڑکی بھی تھی..... ہم لوگ نہایت اطمینان کے ساتھ نہایت تیزی سے آگے قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے کہ ایک گھنی جھاڑی میں دشمن کے گروہ سے مڈبھیڑ ہوگئی جو پہلے سے چھپے بیٹھے تھے۔ اثنائے قتال میں میری نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو گھائل ہوکر گر پڑا تھا، اور ہم میں کا ایک شخص اس کا کام تمام کرنا چاہتا تھا میں فوراً آگے بڑھا اور اس ارادہ سے اس کو باز رکھا اور مجروح سے مخاطب ہوکر کہا کہ تم اطمینان رکھو! جب تک میں موجود ہوں کوئی تمھیں ہلاک نہیں کرسکتا.... جنگ بہت جلد ختم ہوگئی، ہمیں شکست ہوئی، اور دشمن ہمیں گرفتار کرکے اپنے سردار کے پاس لے چلے۔

— "تم اس کے نام سے واقف ہو؟"

— امیر غالب التہامی..... عربی النسل ہے حال ہی میں "وادی تیم" میں آیا ہے، سلطان کے ملک کا.."

— میں اس امیر سے خوب واقف ہوں۔ نہایت بہادر اور شجاع ہے۔

—— ہاں اس نے اپنی بہادری اور شجاعت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا ہے۔
—— اپنا واقعہ پورا کیجئے،
—— ہم لوگوں کو امیر کے پاس لایا گیا۔۔۔۔ یہ امیر وہی تھا جس کی جان میں نے جنگ کے سلسلہ میں بچائی تھی۔۔۔!
—— پھر تم نے اس سے کچھ کہا نہیں؟
—— قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں اور مجھے آزاد کر دیا جائے۔

اسوقت میں اس بہادر کے سامنے تھا جس نے بڑے بڑے بہادروں کے قدم اکھاڑ دئے تھے، لوگ اسکے نام سے کانپتے تھے، میں نے اس سے کہا "میرے محترم! آپ نے مجھے اس لئے آزاد کیا ہے کہ میں نے اثنار جنگ میں آپ کی جان بچائی تھی، لیکن میں آپ کی اس عنایت کے بجائے اپنی ایک دوسری خواہش کی تکمیل چاہتا ہوں امید ہے کہ مجھے رہا کر کے جس وسعت قلبی کا اظہار کیا گیا ہے اس معاملہ میں بھی اسی سے کام لیا جائے گا، میں چاہتا ہوں کہ میرے بجائے میری لڑکی کو آزاد کر دیا جائے جو ان قیدیوں میں اسیر ہے۔ اور اسکی بیڑیاں مجھے پہنا دیجائیں۔

—— اس نے کیا جواب دیا؟
—— میری طرف اس نے گھور کر دیکھا، اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، اور اسنے انتہائی غصہ کی حالت میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم اپنی لڑکی کے ساتھ جا سکتے ہو۔۔۔" میں نے ہاتھ بڑھایا، اس نے مصافحہ کیا اور کہا "تم جا سکتے ہو"

میں نے کہا کہ "میں نے صرف آپ کی جان بچائی تھی، لیکن آپ نے اس کے بدلہ میں دو نعمتوں سے سرفراز کیا یعنی غلامی اور قید سے دو جانوں کو آزاد کیا۔ کیا مجھے اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ میں اس احسان کا عوض پیش کر سکوں؟"

اس نے جواب دیا کہ اگر تمھاری یہ خواہش ہے تو بہترین عوض یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سے ہمیشہ کیلئے جنگ سے باز آجاؤ، کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ - میں نے اس کا وعدہ کر لیا۔

—— کیا تم نے ایسا ہی کیا؟
—— ہاں! میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا، میں نے وعدہ کر لیا تھا اور اسے میں کسی طرح توڑ نہیں سکتا تھا، اسوقت سے میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنی بقیہ زندگی ان پہاڑوں میں بسر کر دوں گا تاکہ جنگ سے بالکل علیحدہ رہوں!
—— اور تمھاری لڑکی؟
—— میری لڑکی؟! ۔۔۔۔ کیا آپ نے ابھی تک نہیں پہچانا؟ ۔۔۔۔۔ اس نے آپ کے یہاں پناہ لی

اور تقریباً دس سال سے آپ کے قصر میں مقیم ہے !!

—— "کیا میری ٹریز ؟

—— ہاں ! میری ٹریز ! ---- یہی میری لڑکی ہے اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اس نے کسی کو اپنا نام نہیں بتلایا اور نہ اس کا اظہار کیا ۔ وہ راہب جس کی ہر ہفتہ وہ زیارت کرتی ہے فی الواقع اس کا باپ ہنری دی مونفور ہے ۔

لڑکی یہ تمام باتیں بیٹھی سنتی رہی، بالآخر دفور غم سے بیتاب ہو کر باپ کی گردن میں باہیں ڈالکر رونے لگی، فقیر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تسلی دیتے ہوئے کہا :-

—— بیٹی ! اب میں اس عالم سے کوچ کر رہا ہوں، لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے مجھے خوشی ہے کہ مجھے اب تمھاری طرف سے کوئی فکر نہیں رہی -- میں تمھیں نہایت ہی دسیع النظر، عالی ہمت، اور شریف شخص کے حوالے کر کے جارہا ہوں، تم یقیناً اپنے باپ کو کھو رہی ہو لیکن تم "ریمون دی تولوز" کو اپنے باپ سے زیادہ مہربان، اپنے بھائی سے زیادہ خیر خواہ اور اپنے اعزہ واقارب سے زیادہ بہی خواہ پاؤ گی، وہ تمھاری ہر طرح مدد کرے گا"

اس کے بعد وہ کونٹ کی طرف متوجہ ہوا، اپنے بستر سے کچھ میلے کچیلے کاغذ نکالے اور انھیں دیتے ہوئے بولا :-

—— "آپ انھیں حفاظت سے رکھئے، ان سے لڑکی کا حق وراثت ثابت ہوگا ان کے ذریعہ وہ اپنے حق کی مستحق ثابت ہوگی اور ......"

راہب اس حد تک پہونچا تھا کہ آواز بالکل بند ہوگئی، چہرہ زرد پڑ گیا، ایک مرتبہ انگڑائی لی، حسرت بھری نگاہوں سے ایک مرتبہ اپنی لڑکی کو دیکھا اور ایک ہچکی کے ساتھ ختم ہوگیا ۔

اس کے بعد راہب (ہنری دی مونفور) کو کفنا کر اسی غار میں دفن کر دیا گیا اور ہر چہار جانب درخت لگا دئے گئے تاکہ ان کے ذریعہ اس کی حفاظت ہو سکے ۔

۱۱۸۷ء میں میری ٹریز سر دے کے اس جنگل میں آئی تاکہ اپنے وطن فرانس جانے سے قبل ایک مرتبہ اپنے باپ کی زیارت کر سکے ۔

ٹھیک اسی روز جس دن وہ لڑکی اپنے باپ کی زیارت کرنے گئی ہوئی تھی، سلطان صلاح الدین اپنے عزم کے مطابق دو سال کے اندر اندر فاتح کی حیثیت سے اورشلیم میں داخل ہو رہا تھا ۔

یہ ۵۸۳ھ مطابق ۱۱۸۷ء کا واقعہ ہے ۔

جاپانِ جدید

تجارت وصناعت کا ارتقاء

اسّی برس گزرے، جاپان تمام ممالک سے الگ ایک گمنام جزیرہ تھا۔ لیکن اب وہ دنیا کے بہترین صنعتی ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ یہ حیرت خیز انقلاب کس طرح واقع ہوا؟ ہمارے لئے اس کا مطالعہ غالباً دلچسپی کا موجب ہوگا۔

جاپان کا معاشی ارتقاء مغرب کے صنعتی انقلابات سے بالکل مختلف ہوا ہے۔ اس لئے پہلے ہمیں انگلستان اور جاپان کی صنعتی تاریخ کا موازنہ کرنا ضروری ہوگا۔

انگلستان میں صنعتی دور کا آغاز اُسوقت ہوا جب کارخانوں میں الزبتھ کے زمانہ کے مروّجہ سرکاری ضوابط کی جگہ شخصیت اور آزادانہ مقابلہ نے لے لی۔ یہ وہ وقت تھا جب صناعین کا مذہب "آزاد تجارت" ہوگیا اور اُس میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔ دوسرے معنوں میں برطانیہ عظمیٰ کی تجارتی مقاومت ومسابقت کسی حکومت یا قوم کی رہینِ منت نہ تھی۔ بلکہ اُس کی عظمت اور اُس کے فروغ کا باعث انفرادی سرمایہ تھا۔

اس کے بالمقابل جاپان میں "مائجی دور" کے آغاز میں کوئی صاحب ثروت جماعت نہ تھی جو انگلستان کی طرح تجارت وصناعت کی طرف توجہ کرسکتی۔ اور اگر کوئی جماعت تھی بھی تو وہ تجارتی کاموں سے بالکل بے بہرہ اور نابلد تھی۔ دوسرے جاپان میں معیارِ زندگی پست ہونے کے سبب سے عیش وآرام کے سامان کی بہت کم مانگ تھی۔ اس لئے اُن کو جدید طرزِ صناعت کا کوئی خاص تجربہ حاصل نہ تھا اور نہ اُس کے حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی تھی کیونکہ تمام مطالبات گھر میں ہی پورے ہوجاتے تھے۔ تیسرے وہ بوجہ غربت کے کوئی بڑا سرمایہ جو آج کل کی صنعتی مہمات کے لئے اشد ضروری ہے بہم نہ پہونچا سکتے تھے۔ چوتھے صدیوں کی اقطاعی حکومت کی وجہ سے انمیں جذبۂ جدت واختراع جو ہر قسم کی ترقی میں معاون ہوتا ہے، مٹ چکا تھا اور وہ کسی نئے کام کے تجربہ کے لئے طیار نہ تھے۔

اِن وجوہ کی بنا پر شروع ہی سے حکومت کو ہر صنعتی کام میں حصہ لینا پڑا اور آجکل ہمیں اگر جاپان کی صنعتی ترقی حیرت خیز معلوم ہوتی ہے تو ہمیں حکومت کی سر توڑ کوشش کو کم حیرت و استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ حکومت نے اپنے طلبا غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجے تاکہ وہ صناعت و تجارت کے جدید طریقوں میں مہارت حاصل کریں اور اُن قوتوں کو جاپان میں رائج کرنے کی کوشش کریں جو یورپ کی صنعتی ترقی کی پشت پر کارفرما ہیں۔ پھر اُس نے غیر ملکیوں کو اپنے کارخانوں کے انتظام اور اُن کی دیکھ بھال کیلئے ملازم رکھا۔ اسکول اور کالج ملک میں قائم کئے جن میں صنعتی اور سائنٹفک تعلیم دی جاتی تھی۔ خود بھی کئی کارخانے بطور نمونے کے جاری کئے شلاً روئی اور پارچہ بافی کے کارخانے، لوہے اور فولاد کے کارخانے، جہازوں کی ساخت اور ریلوں کے کارخانے پھر اُن کو چلا کر پبلک کمپنیوں کے سپرد کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ جہاں وہ سرمایہ کے ذریعہ سے براہ راست امداد نہ کر سکی وہاں اُس نے صناعین اور تجّار کو محصولوں میں کمی یا ترجیح کے ذریعہ سے امداد دی۔

جاپان میں سرکاری امداد ایک لحاظ سے قابلِ رشک ہے۔ چونکہ وہاں یورپ کی طرح سرمایہ دار موجود نہ تھے اس لئے صنعتی کارخانوں کی ترقی میں کوئی امر حایل نہ ہوا اور نہ وہاں کسی کے مفاد کو نقصان پہونچا برخلاف اس کے جب انگلستان میں صنعتی دور کا آغاز ہوا تو جو لوگ دن کی تجارت کرتے تھے اُن کو فیکٹریوں کی وجہ سے سخت نقصان پہونچا جاپان میں چونکہ اس پیمانہ پر تجارت کرنے والے سرمایہ دار موجود نہ تھے اس لئے کسی خاص جماعت کو نقصان برداشت نہ کرنا پڑا۔

پھر جاپان میں صنعتی انقلاب ایسے وقت میں شروع ہوا جب مغرب میں یہ بہت سے مدارج طے کر چکا تھا اس وجہ سے وہ نہ صرف اچھی باتوں کی نقل کر سکا بلکہ اُن تکالیف اور مصائب سے بھی محفوظ رہ سکا جو بالعموم انقلابات کے آغاز میں لوگوں کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

جاپان اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھا کہ وہاں جب انقلاب شروع ہوا تو بقیہ ممالک "آزاد تجارت" کے خیال کو چھوڑ کر "تحفظات" اور "اقتناعی اصول" کے خیال کی طرف آ رہے تھے۔ جس کا مقابلہ کرنے کے لئے باہمی امداد اور اتحادی ادارے قائم کرنا ضروری تھے۔ جاپان پہلے ہی اپنے مخصوص معاشرتی نظام کی وجہ سے ان باتوں میں ماہر تھا اس لئے اُسے کمپنیوں اور کارخانوں کے اتحاد و تعاون میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔

بیان سابق سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جاپان کا صنعتی ارتقا کیونکر شروع ہوا، لیکن اس کی تفصیل جاننے کے لئے جاپان کی صنعتی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کرنا چاہیئے:-

(۱) ۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۴ء تک
(۲) ۱۸۹۴ء سے ۱۹۱۴ء تک
(۳) ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۷ء تک
(۴) ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۶ء تک

دورِ اول اس زمانہ میں حکومت نے اپنی ساری کوشش "جاپان جدید" کی طیاری میں صرف کردی۔ اس دور میں پہلی ریلوے لائن تیار کی گئی اور سب سے پہلا بنک قائم کیا گیا۔ صنعتی تعلیم کو رواج دیا گیا اور تجارتی اُصول پر جہازرانی کی ابتداء ہوئی۔ متعدد کارخانے ریشم، روئی، اون، کاغذ اور شیشہ وغیرہ کے قایم کئے گئے اور یہ تمام کام مغربی طرز پر شروع کیا گیا۔ جہازوں کی ساخت اور کان کنی بھی سرکاری انتظام کے ماتحت کی جانے لگی۔ الغرض اس زمانہ کو ہم "سرکاری تنظیم صنعت کا زمانہ" کہہ سکتے ہیں۔

لیکن باوجود ان سب باتوں کے جاپان ابھی تک زرعی ملک تھا اور اُس میں صناعت و تجارت زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ تا حال دھاتیں، کپڑے وغیرہ درآمد کرتا تھا اور اُس کی برآمد ریشم، چائے، تانبہ، بانس اور اسی طرح کی دوسری اشیاء خام تک محدود تھیں۔

چونکہ ۱۸۶۸ء کے بعد جاپان کا تعلق غیر ممالک سے ہوگیا تھا اس لئے اس زمانہ کو جاپان کی بین الاقوامی تجارت کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ تجارت زیادہ تر برطانوی جہازوں کے ذریعہ سے کی جاتی تھی۔ امریکہ کے ساتھ ریشم کی تجارت بڑھ گئی، پارچہ بافی کے کارخانے چلانے کے لئے ہندوستان، امریکہ اور چین سے روئی خریدی جانے لگی اور اپنی زمین اُس نے امریکہ کے بڑھتے ہوئے مطالبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ریشم کی کاشت کے لئے وقف کردی۔

۱۸۹۴ء میں چین کے ساتھ جنگ نے اُس کی صنعت کو بہت فروغ دیا۔ لیکن اُس کے بعد قدرتی طور پر کساد بازاری پیدا ہوگئی۔ تاہم بالعموم نئی کمپنیاں اور نئے کارخانے جاری ہوتے گئے اور کاشت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔

ایک مشکل یہ ہوئی کہ دوسرے ممالک کی روش کے خلاف، جاپان نے باہر سے آنے والی اشیاء پر صرف پانچ فیصدی محصول لگایا جس کی وجہ سے اُسے خارجی اشیاء کا مقابلہ کرنا پڑا اور اس میں اُس کو نقصان بھی ہوا۔

بہرحال یہ زمانہ جاپان کے لئے قدرے ترقی اور خوشحالی کا تھا جس کے تین سبب ہیں :-

۱ـــ تجارت و صناعت کی سرکاری طور پر امداد
۲ـــ چین کے ساتھ جنگ
۳ـــ غیر ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات۔

دوسرا دور اس دور کا اہم ترین واقعہ جاپان اور اُس کی جنگ ہے جس میں جاپان کو فتح حاصل ہوئی اور ملکی تجارت چمک اُٹھی، جاپانی گورنمنٹ نے اپنی نوآبادیوں سے دھاتوں کے نکالنے کے ادارے قائم کئے اور اس کام کو اعلیٰ پیمانہ پر چلایا گیا۔ ریلوں کو ۱۹۰۶ء میں سرکاری بنا لیا گیا۔ اور تمباکو نمک اور کافور کی تجارت کے لئے بھی سرکاری اجارے قائم کئے گئے۔ انھوں نے پوری طرح محسوس کر لیا کہ اگر جاپان کو سیاسی و تجارتی ترقی حاصل کرنا ہے تو ملک میں آہنگری اور مشین سازی کے کارخانے قائم کرنے ضروری ہونگے چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء میں سب سے پہلا لوہے اور فولاد کا کارخانہ جاری کیا گیا۔ لیکن بوجہ فقدانِ مواد کے وہ کامیابی سے نہ چل سکا۔ اس کے علاوہ حکومت نے اہم صنعتوں کو تحفظات اور ترجیحی محاصل کے ذریعہ سے امداد دی۔

اس کے بعد کئی صنعتوں میں انقلاب پیدا ہوا خصوصاً پارچہ بافی کی صنعت کو کافی فروغ دیا گیا اور مشین سازی۔ آہنگری، برقی رو، اور صنعت و حرفت کی تعلیم کو بہت ترقی دی گئی۔

تیسرا دور یہ دور ترقی جدید کا آغاز تھا۔ اس زمانہ میں غیر معمولی طور پر متعدد نئی اور پرانی صنعتوں کو فروغ ہوا۔ مثلاً روئی، اون، ریشم کی پیداوار بڑھ گئی اور آہنگری، مشین سازی اور جہاز رانی کے کارخانے زیادہ ہوگئے، کوئلہ بھی کافی مقدار میں نکالا جانے لگا اور برقی رو کا استعمال بڑھ گیا۔

اس غیر معمولی ترقی کی وجہ زیادہ تر ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم تھی۔ جب دوسرے ملک برسرِ پیکار تھے تو جاپان خاموشی سے اس جنگ سے فایدہ اُٹھانے میں مصروف تھا۔ یعنی تمام جنگجو اقوام کو اسلحہ اور دیگر اسبابِ حرب بہم پہونچا کر کثیر نفع حاصل کر رہا تھا۔

اس عرصہ میں خارجی تجارت کی نوعیت بھی بدل گئی، یعنی اب بجائے مصنوعات کے وہ صرف موادِ خام درآمد کرنے لگا اور برآمد میں اشیائے خوردنی کے علاوہ تانبہ اور چائے کی اہمیت بڑھ گئی۔ تجارت کے رُخ میں بھی تبدیلی واقع ہوگئی یعنی بجائے یورپ کے مال زیادہ تر امریکہ اور مشرقی ایشیا میں جانے لگا۔ اور یہی ملک آج کل جاپان کی بہترین منڈیاں ہیں۔ امریکہ میں نہ صرف خام ریشم، چینی کے برتن اور چائے وغیرہ کی زیادہ کھپت ہے جو غیر اہم اشیا ہیں بلکہ وہاں مشینری، دھات کی اشیاء اور روئی کی بھی کافی نکاس ہے۔ ہندوستان اُسے روئی بہم پہونچاتا ہے اور اس کے بدلہ میں سوت اور کپڑے خریدتا ہے۔ مشرقی ایشیا سے وہاں چاول، لکڑی اور کچا لوہا بھیجا جاتا ہے اور اس کے بدلہ میں روئی کے کپڑے اور دیگر اشیاء خریدی جاتی ہیں

جیسا کہ قاعدہ ہے اس غیر معمولی ترقی کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں جاپان کو کساد بازاری بھی برداشت کرنی پڑی لیکن یہ عارضی تھی اور صرف لوہے اور فولاد کی مشین سازی جہاز رانی اور اُون کی صنعتوں کو کچھ عرصہ کیلئے

نقصان پہونچا۔ لیکن سب سے بڑا نقصان ۱۹۲۳ء کے شدید زلزلہ سے پہونچا جس نے ملک کے تمام معاشی ڈھنچر کو ہلاکر رکھدیا۔

چوتھا دور یہ عرصہ عالمگیر کساد بازاری اور معاشی انتشار کا تھا، لیکن جاپان نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اُس کا مقابلہ کیا وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے باوجودیکہ مواد خام کی قیمتیں تمام دنیا میں بڑھ گئی ہیں اور صنعتی مصارف بھی زیادہ ہوگئے ہیں لیکن جاپان تاحال اپنی اشیاء تمام دنیا سے سستی بیچ رہا ہے اور خصوصاً ہندوستان میں باوجود غیر معمولی ڈیوٹی کے کامیابی کے ساتھ غیر ملکی اشیاء کا مقابلہ کر رہا ہے۔

مختصر طور پر اس کے چند اسباب یہ ہیں:-

۱- جاپان میں محنت و مزدوری سستی ہے اس لئے خرچ کم بیٹھتا ہے۔

۲- جاپان نے اقتصادی انحطاط کو پیش نظر رکھ کر اپنی کرنسی کی قیمت کو کافی سے زیادہ گرادیا جس کی وجہ سے اُسکا زرِ غیر ملکی کرنسیوں کے مقابلہ میں سستا ہوگیا اور لوگوں کو اشیاء خریدنے کے لئے کم روپیہ دینا پڑتا ہے۔

۳- حکومت کا نظریہ ملک کی مصنوعات کے متعلق ہمدردانہ ہے اور وہ نہ صرف نقد روپیہ یا سرمایہ وغیرہ کے ذریعہ سے بھی اُن کی سرپرستی کرتی ہے بلکہ امدادی ٹیکس کے ذریعہ سے بھی ان کی سرپرستی کرتی ہے۔ یہ جذبۂ سرپرستی اس حد تک ترقی کرچکا ہے کہ جاپان نے مقابلہ کی خاطر بعض دیہاتوں کے نام بدلنے بھی منظور کرلئے ہیں۔ مثلاً ایک گاؤں کا نام اُس نے برمنگھم صرف اس غرض سے رکھا ہے کہ ولایت کی بائیسکلوں سے خاطر خواہ مقابلہ ہوسکے۔

۴- جاپان کی خود اپنی ضروریات وہ نہیں ہیں جو غیر ملکیوں کی ہیں۔ مثلاً جو کپڑا اُن کے یہاں باہر بھیجنے کے لئے بنایا جاتا ہے وہ اُن کی ملکی منڈیوں میں نہیں بکتا۔ کیونکہ وہاں کے لوگ اپنے مذاق کے مطابق ایسے کپڑے پہنتے ہیں جو گھروں میں قلیل سرمایہ سے بنائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری چیزوں کا حال ہے اس لئے وہ اپنا تمامتر سرمایہ اشیاء برآمد کی خاطر لگا سکتے ہیں۔ اور اس طرح اُن کے ابتدائی مصارف بہت کم ہوتے ہیں جسکی وجہ سے مجموعی قیمتیں قلیل ہوجاتی ہیں۔

پس جاپان کے موجودہ صنعتی ارتقاء کا ایک راز یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کی اپنی ضروریات غیر ملکیوں کی ضروریات سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے جو لوگ برآمد کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنی تمامتر توجہ اشیاء برآمد کی تیاری میں صرف کرسکتے ہیں۔

۵- اگر غور کیا جائے تو جاپان اس مقصد کے حصول کے لئے ہر واجب و ناواجب طریق استعمال کرتا ہے مثلاً ارزاں فروشی کا جنون اس حد تک ترقی کرچکا ہے کہ اشیاء کی خصوصیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی آپ ایک جاپانی بائیسکل خریدیے وہ چند دنوں کے اندر اندر ذرا سا حادثہ پہونچنے پر بگڑ جائیگی، لیکن ولایت

کی بائیسکل میں برسوں خراب ہونے کا احتمال نہیں۔ بعض مصنفین کے الفاظ میں جاپان اپنے مقصد کے حصول کے لئے غیر ایماندارانہ طریق بھی استعمال کر رہا ہے۔

۶ - جاپان کا معاشری نظام بھی اس مقصد کے حصول کے لئے اُس کی امداد کرتا ہے۔ مثلاً مقابلہ کی خاطر کسی ملک کا بہترین ہتھیار کمپنیوں اور کارخانوں کی امداد باہمی اور آپس کا تعاون و اتحاد ہے۔ جاپان میں انگلستان کے برعکس اشتراکِ خاندانی اور جائنٹ فیملی سسٹم کا رواج ہے جس کی وجہ سے وہ بہت جلد متحد ہو کر غیر ملکی اشیاء کا دساور میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ یوروپ میں شخصیت پسندی کی وجہ سے آپسمیں مقابلہ ہو جاتا ہے لیکن جاپان میں یہ ہونا ناممکن ہے کیونکہ خونی رشتہ کی وجہ سے مقابلہ سے احتراز کیا جاتا ہے پس وہ مشترک مقصد کے حصول کیلئے متحدہ محاذ قایم کر سکتے ہیں جو مغربی اقوام کو میسر نہیں۔

اس عرصہ میں جاپان کو چین اور روس دونوں سے برسرپیکار ہونا پڑا جس کی اصل وجہ جاپان کی بڑھتی ہوئی صنعتی کارروائیاں تھیں جن کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کے لئے اُس کو ایک کثیر علاقہ درکار تھا۔

پارچہ بافی کے متعلق ہندوستان اور جاپان کا معاہدہ

ایک اور مشہور واقعہ اس زمانہ کا یہ ہے کہ ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کا جاپان کے ساتھ پارچہ بافی اور سوت وغیرہ کے متعلق ایک اہم معاہدہ ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

جاپان کے بڑھتے ہوئے ہتھکنڈوں کو پیشِ نظر رکھ کر ۱۹۳۳ء میں حکومتِ ہند نے جاپانی پارچہ جات کے خلاف محصول کو پچاس فیصدی سے بڑھا کر پچہتر فیصدی کر دیا۔ جاپان نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اور ہندوستان کی روئی کا مقاطعہ کر دیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اس پالیسی پر قایم نہ رہ سکا کیونکہ امریکہ اور مصر کی روئی نسبتاً مہنگی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں جاپان نے سوادا کی قیادت میں ایک وفد بھیجا تاکہ وہ حکومتِ ہند کے ساتھ کسی تجارتی مفاہمت پر پہونچ سکے۔ چنانچہ اُسی سال ایک تجارتی معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے جاپان کو اجازت ہو گئی کہ وہ ہر سال بارہ کروڑ پچاس لاکھ گز کپڑا ہندوستان کی منڈیوں میں بھیج سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کے بدلہ میں ہندوستان سے کچھ خریدنے پر مجبور نہیں ہو گا اگر کپڑے کی مجموعی لمبائی بتیس کروڑ پچاس لاکھ گز ہو جائے تو وہ ہندوستان سے دس لاکھ گٹھریاں روئی کی خریدنے پر مجبور ہو گا۔ لیکن باہمی تجارت کی آخری حد چالیس کروڑ گز کپڑا جاپان کی طرف سے اور پندرہ لاکھ گٹھریاں ہندوستان کی طرف سے مقرر کی گئیں۔

اس معاہدہ کی رُو سے جاپان نے روئی کا مقاطعہ ترک کر دیا اور ہندوستان نے بھی محصول پچہتر کی بجائے پچاس فیصدی کر دیا۔

ہندوستانیوں نے اس معاہدہ کو مستحسن نہیں سمجھا۔ وہ اس کے خلاف تین اعتراض کرتے ہیں:-

۱- معاہدہ سے قبل جاپان صرف بتیس کروڑ میں لاکھ گز کپڑا ہندوستان میں بھیجا کرتا تھا لیکن اب وہ معاہدہ کی رو سے چالیس کروڑ گز کپڑا بھیجا کرے گا۔ اسی طرح معاہدہ سے قبل وہ پندرہ لاکھ ستر ہزار گٹھریاں روئی کی ہندوستان سے خریدا کرتا تھا لیکن اب وہ صرف پندرہ لاکھ خریدا کرے گا۔ پس دونوں لحاظ سے نفع سراسر جاپان کو ہے

۲- ہندوستان نے خرید کے لئے قیمت مقرر نہیں کی بلکہ صرف گز مقرر کئے ہیں۔ پس جاپان عمدہ عمدہ کپڑے بھیج کر قیمت کے لحاظ سے فائدہ میں رہے گا۔

۳- جاپانی مال کی تعداد موجودہ ین کی قیمت کو مدنظر رکھ کر مقرر کی گئی ہے اور ین کی قیمت آجکل بہت گری ہوئی ہے۔ پس ہر حال میں یہ معاہدہ ہندوستانی مفاد کے خلاف ہے۔

عبدالرحیم شبلی - بی - کام

جنوری ۳۷ء کا نگار

حسب معمول کافی ضخیم ہوگا اور اس کا کل یا اکثر حصہ وقف ہوگا صرف اڈیٹوریل مضامین کے لئے اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ

ڈرامہ اصحاب کہف

جو طویل ڈرامہ ہے اس میں مکمل شایع کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اور متعدد مضامین اڈیٹر کے قلم کے ہوں گے جن میں ایک فسانہ بھی ہوگا کوشش کی جائے گی کہ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ جتنا دلچسپ ہو اتنا ہی مفید بھی ہو۔

مینیجر نگار

ڈرامہ اصحاب کہف

چونکہ کتابی صورت میں علحدہ شایع نہیں ہوگا بلکہ جنوری ۳۷ء کے نگار میں شامل کیا جائے گا، اس لئے جن حضرات نے اسکی قیمت پیشگی روانہ فرمادی ہے ان سے استصواب کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو واپس لینا چاہتے ہیں یا نگار کے حساب میں جمع کرانا پسند فرماتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو کوئی اور کتاب طلب کر سکتے ہیں۔

مینیجر نگار

اگر آپ، ہندی شاعری پر سیر حاصل تاریخی و تنقیدی مقالات اور اُس کا انتخاب دیکھنا چاہتے ہیں تو "نگار" جنوری ۳۶ء ملاحظہ فرمائیے - حجم ۱۶۸ صفحات قیمت ۱۲؍ علاوہ محصول -

مینیجر نگار

باب الاستفسار

عقل و مذہب

(جناب سید خلیل الرحمان صاحب - جونپور)

علم و مذہب کی باہمی مخالفت بہت مشہور چیز ہے، علم و مذہب کے بیانات کو غلط ٹھہراتا ہے کیونکہ وہ اس کے اصول پر صحیح نہیں اُترتے، مذہب علم کو برا کہتا ہے کیونکہ وہ خدا کے وجود کو معطل کر دینے والا ہے۔ علم کے دلایل تو خیر علمی ہونا ہی چاہئیں لیکن اب مذہب کو بھی مجبوراً علمی نقطۂ نظر سے جواب دینا پڑتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب اس میں کامیاب ہو سکتا ہے اور کیا واقعی وہ عقلی دلایل ایسے رکھ سکتا ہے جو اہلِ علم کو خاموش کر سکیں میں ممنون ہوں گا اگر اس باب میں آپ اپنے خیالات قلمبند فرما کر نگار میں شایع کر دیں۔

(نگار) یوں تو آپ کے استفسار کے جواب میں اختصاراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "اس وقت تک مذہب اپنی حفاظت میں کوئی علمی دلیل ایسی پیش نہیں کر سکا جو اہل علم کے نزدیک قابل قبول ہو"، لیکن چونکہ حکایت لذیذ ہے اس لئے میں اسکو ذرا دیر تک بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ہر چند میں اس سے قبل "اعتقاد و یقین" کا عنوان قایم کر کے بہ سلسلۂ ملاحظات اس مسئلہ پر کافی بحث کر چکا ہوں لیکن اس وقت میں ایک دوسرے پہلو سے اس پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور ایک آدھ مثال پیش کر کے بتاؤنگا کہ مذہب کے علمی دلایل کی نوعیت کیا ہوا کرتی ہے اور اہل علم اسے کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

قبل اس کے کہ نفس موضوع پر اظہار خیال کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذہب و علم کے حدود متعین کر دئے جائیں کیونکہ بغیر اس کے فیصلہ دشوار ہوگا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس جگہ مذہب سے میری مراد کسی جماعت و قوم کی تہذیب (کلچر) نہیں ہے بلکہ صرف وہ معتقدات ہیں جنکا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے یا اُن روایات

وہ واقعات سے جن کو الہام و معجزہ کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اسی میں خدا و رسول کے مفہوم کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مذہب کا وہ پہلو حریف علم نہیں ہے جو صرف وضع قوانین یا تعیین اُصول معاشرت سے وابستہ ہے، بلکہ اس کے وہ بیانات جو حدودِ علم و تحقیق کے اندر آتے ہیں اور جن پر عقل انسانی اچھا یا بُرا ہونے کا نہیں بلکہ صحیح یا غلط ہونے کا حکم لگاتی ہے۔ پھر اگر مذہب نام ہوتا صرف اصلاح اخلاق کا تو یقیناً اس میں اتنی لچک ضرور ہوتی کہ وہ ہر ملک و زمانہ کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر دیا کرتا اور اس صورت میں علم کے ساتھ اس کا اجتماع کسی نہ کسی مرکز پر بالکل ممکن تھا، لیکن چونکہ مذہب حقیقتاً نام ہے مخصوص معتقدات کا جن پر صرف اس لئے ایمان لایا جاتا ہے کہ وہ خدا کے کسی خاص بندے یا کسی خاص کتاب کے ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں۔ بنابراں علم انھیں حدودِ عقل کے اندر لا کر سمجھنا چاہتا ہے اور جب وہ سمجھ میں نہیں آتے تو انکار کر دیتا ہے اور یہ صورت مذہب و علم کے مناقشہ کی ایسی ہے جو کسی صورت سے دور نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس طرف مذہب کو اصرار ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے خدا کا بتایا ہوا کہتا ہے اس میں غلطی کا امکان نہیں اور ادھر علم کہتا ہے کہ خدا نے کچھ نہیں بتایا یا ایک مخصوص انسان نے اپنے ہی ذہن و عقل کے لحاظ سے بتایا ہے اور اسلئے بلا تحقیق اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر مذہبی معتقدات اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسے ہوتے کہ علم کو اُنکی طرف توجہ کی ضرورت نہ ہوتی تو اس نزاع کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن مشکل تو یہی ہے کہ مذہب بھی انھیں مسایل پر گفتگو کرتا ہے جن پر علم کی تحقیق جاری ہے اور اس لئے دونوں کا تصادُم ناگزیر ہے۔ مثلاً مذہب کہتا ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا، علم کہتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ کائنات نتیجہ ہے تدریجی ارتقاء کا۔ مذہب کا بیان ہے کہ زمین کی پیدایش پر زیادہ سے زیادہ چند ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے، علم کہتا ہے کہ طبقات الارض کا مطالعہ اس کی تردید کرتا ہے اور وہ کروروں بلکہ اربوں سال کی مدت متعین کرتا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا کا ایک نیک بندہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن تک زندہ رہا، علم اس کو غیر ممکن بتاتا ہے کیونکہ حیات کے لئے مخصوص اسباب حیات کا پایا جانا ضروری ہے جو مچھلی کے پیٹ میں میسر نہیں آ سکتے تھے۔ مذہب مدعی ہے کہ خدا کے کسی برگزیدہ بندہ نے ہاتھ کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر دئے اور وہ پھر مل گئے علم اس کی تردید کرتا ہے کہ یہ خرق والتیام ممکن نہیں، الغرض اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو مذہب کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں اور علم ان کے ماننے پر راضی نہیں۔

اب سے کچھ زمانہ قبل جب علوم جدیدہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور اس کی تحقیق بھی اتنی زیادہ مکمل نہ تھی، مذہب کی طرف سے عام طور پر جواب کی یہ صورت ہوا کرتی تھی کہ کیا خدا کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ ایسا کر دے کیا جس نے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں وہ کسی ایک اُصول کی پابندی پر مجبور ہے اور کیا انسان کا علم اتنا وسیع

سکتا ہے کہ وہ قدرت کے نظام اور اس کے اُصول پر حاوی ہو سکے - جواب کی یہ صورت بہ الفاظ دیگر گویا یہ حیثیت رکھتی تھی کہ ہم عقل و نقل کچھ نہیں جانتے اور بلا کسی دلیل کے ہر اس بات کو صحیح باور کرتے ہیں جو مذہب کی طرف سے بتائی گئی ہے، پھر چونکہ علمی تحقیق بھی زیادہ وسیع نہ ہوئی تھی اور انسان کے ذہن سے اس کے عجز کا احساس بھی پوری طرح محو نہ ہوا تھا، یہ بات آگے بڑھنے نہ پاتی تھی اور مذہب اس کو اپنی فتحمندی سے تعبیر کیا کرتا تھا، لیکن اب کہ علوم تکمیل کی حد تک پہونچ گئے ہیں، ہر مسئلہ مشاہدہ کی صورت اختیار کر چکا ہے اور یقین کی ان حدود میں انسان نے قدم رکھا ہے جہاں تذبذب کی گنجائش ہی نہیں ہے - مذہب نے اپنی مناظرانہ روش بدل دی ہے اور اب وہ اپنے معتقدات کے ثبوت میں صرف خدا کی مرضی کو دلیل نہیں ٹھہراتا بلکہ علمی نقطۂ نظر سے بھی ان کی صحت پر گفتگو کرنے لگا ہے اور میرے نزدیک مذہب کی سب سے پہلی شکست یہی ہے کہ جن علوم کی صحت کا وہ پہلے منکر تھا اب انھیں کے دامن میں پناہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے -

مشرق کا ذکر نہیں، یہاں مذہب کیا، علم بھی قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد نہیں، بلکہ مغرب کو دیکھئے کہ وہاں کے اہل مذہب اب اپنے معتقدات کی پیروی میں کیسی کیسی عجیب و غریب علمی دلیلیں پیش کرتے ہیں، درانحالیکہ ان کا یہ علمی دلائل پیش کرنا ہی حقیقتاً ان کے مذہب کی بنیاد کو متزلزل کر دینے والا ہے -

غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس کی ایک مثال پیش کر کے اپنے مدعا کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کروں - روایات توریت و انجیل میں ایک مشہور روایت طوفان و کشتی نوح کی بھی ہے، یعنی کہا جاتا ہے کہ جب طوفان کے آثار شروع ہوئے تو نوح نے ایک کشتی طیار کی جس میں دنیا کے تمام جانوروں کے ایک ایک دو دو جوڑے رکھ لئے چنانچہ موجودہ نسلیں انھیں سے چلی ہیں -

اس روایت پر علمی نقطۂ نظر سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام وحوش و طیور کے جوڑے ایک کشتی میں سما سکیں اور اسی کے ساتھ ان کے لئے ایک سال کی غذا بھی اس میں موجود ہو، چونکہ یہ اعتراض علم ریاضی سے متعلق ہے جس کی صحت کی طرف سے اہل مذہب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اس لئے انھوں نے جو جواب اس کا دیا ہے وہ بھی ریاضی ہی کے ماتحت ہے - ملاحظہ ہو:

صحیفۂ مقدسہ میں جو پیمائش کشتی نوح کی درج ہے وہ لمبائی، چوڑائی اور عمق کے لحاظ سے علی الترتیب ۳۰۰، ۵۰ اور ۳۰ ہاتھ ہوتی ہے - یعنی موجودہ اُصول پیمائش کے لحاظ سے وہ ۴۵۰ فٹ لمبی، ۷۵ فٹ چوڑی اور ۴۵ فٹ گہری تھی - چونکہ روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے تین درجے تھے اس لئے ایک ایک فٹ درمیانی تختوں کی دبازت نکال کر ہر درجہ یا منزل کی بلندی ۱۴ فٹ ہوئی - اب آپ ۴۵۰ فٹ لمبائی کو ۷۵ فٹ چوڑائی سے ضرب دیجئے تو معلوم ہوگا کہ ساری کشتی کا رقبہ ۱۰۱۲۵۰ مربع فٹ تھا اور ہر ہر درجہ کا رقبہ ۳۳۷۵۰ مربع

فٹ گویا دو ایکڑ سے کچھ زیادہ جگہ کشتی میں پائی جاتی تھی۔ اب اسی کے ساتھ موجودہ جہاز سازی کے اصول کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جہاز کا ہر مربع فٹ ایک ہزار پونڈ وزن کو سنبھال سکتا ہے۔ اس لئے نوح کی کشتی ۳۲۰۰۰ ٹن کا وزن لیجا سکتی تھی۔

جانوروں کی جغرافی تقسیم حسب بیان ڈاکٹر الفرڈ رسل یہ ہے کہ دنیا میں ۱۶۰۰ اقسام چوپایوں کی پائی جاتی ہیں، ۱۰۰۸۷ طیور کی، ۹۸۷ حیوانات سافلہ کی اور ۱۰۰۰۰۰ کیڑے مکوڑوں کی۔ بائبل کا بیان ہے کہ ہر قسم کے دو دو جوڑے کشتی میں تھے اس لئے اب سوال یہ ہے کہ وہ اس میں کیونکر سما سکے؟

وہ اسٹیمر جو جانوروں کو لیجاتے ہیں، ہر گائے کے لئے ۲۰ مربع فٹ جگہ کا انتظام کرتے ہیں لیکن تمام چھوٹے بڑے جانوروں کو ملا کر اوسط ہر جانور کے سائز کا [illegible] کے برابر ہوتا ہے، اچھا اب فرض کیجئے کہ سب سے نیچے کی منزل چوپایوں کے لئے وقف تھی تو اگر ۱۰ مربع فٹ کا اوسط ہر جانور کے لئے قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوئے کہ اس میں تقریباً ۳۳۰۰ چوپایوں کی جگہ موجود تھی، رہا ان کی غذا کا سامان سو اس کا سوال یہ ہے کہ چودہ فٹ کی بلند منزل میں جانوروں کی اونچائی کے لحاظ سے اوپر چھت تک کافی جگہ نکل سکتی ہے کہ اس میں چارہ رکھا جائے۔ اب درمیانی منزل کو لیجئے اور فرض کیجئے کہ وہ حشرات اور حیوانات سافلہ کے لئے تھی، تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اتنی جگہ میں ۲ لاکھ کیڑے مکوڑے اور ۱۹۷۴ دوسرے حیوانات رکھے گئے۔ پھر بھی کافی جگہ بچ سکتی ہے اگر فی جانور ۴۲ مربع انچ جگہ کا اوسط رکھا جائے اور یہی باقی جگہ ان کی غذا رکھنے کے لئے کام آئی ہوگی، بالائی منزل طیور کے لئے وقف تھی جس میں نوح نے بھی مع اپنے ساتھیوں کے قیام کیا تھا اگر ہر طائر کے لئے اوسط ڈیڑھ مربع فٹ کا رکھا جائے تو یہاں کم از کم ۲۰۱۷۴ جانور رہ سکتی تھیں۔

آپ نے جواب کی صورت دیکھی کہ ریاضی کے حساب سے کتنی مکمل ہے اور نوح کی کشتی میں ہزاروں وحوش وطیور کے سما جانے کو کتنی خوبصورتی سے ثابت کیا ہے۔ جو ایک ناقص مذہبی ذہنیت یقیناً اس کو اپنی فتحمندی قرار دیگی اور بائبل کے اس بیان کو ابہام کی صورت سے پیش کرنے میں مطلق تامل نہ کریگی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک علمی میلان رکھنے والا انسان اس جواب سے مطمئن ہو سکتا ہے اور یہ بیان سنکر کیا اسے واقعی یقین آگیا ہوگا کہ نوح کی کشتی میں ضرور تمام دنیا کے جانور پائے جاتے تھے؟ ہرگز نہیں۔

جواب دینے والے نے اس مسئلہ میں صرف کشتی کی وسعت کے مسئلہ کو لے لیا لیکن یہ نہ دیکھا کہ من حیث الکل اس روایت میں اور کتنی باتیں ایسی ہیں جو عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ اگر اسے تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ نوح نے واقعی اتنی بڑی کشتی بنائی تھی جس میں تمام دنیا کے جوڑے وحوش وطیور کے آسکیں تو بھی یہ سوال بدستور اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ وہ تمام دنیا کے وحوش وطیور کو ایک جگہ فراہم کیونکر کر سکا

کہدیجئے کہ کیا انسان جانوروں کو سدھا نہیں سکتا اور کیا سرکس میں ہم اس طرح کے تماشے روز نہیں دیکھتے کہ صرف ایک آواز پر جانور دوڑے چلے آتے ہیں۔ یقیناً یہ جواب بھی قرینِ عقل ہے۔ اب تیسرے اعتراض کو لیجئے اور وہ یہ کہ دنیا میں بہت سے ایسے جانور پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ سب ایک جگہ امن و آشتی کے ساتھ رہ سکیں۔ جواب کی اسی ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ انسان میں اتنی قوت مقناطیسی علوم جدیدہ کی رو سے ثابت ہو چکی ہے کہ وہ اپنی قوت ارادی سے کام لیکر دوسرے کو کسی خاص میلان کی طرف مجبور کر سکے اس لئے اگر نوحؑ نے جانوروں سے انکی طبعی خصوصیات کو چند دنوں کے لئے معطل کر دیا ہو تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے۔ پہلے قصہ ختم ہوا اور کشتی نوحؑ کی روایت دلایل عقلی سے ثابت ہو گئی۔ لیکن آیئے ان دلایل کی بنا پر ایک بار پھر غور کریں کہ جواب کی صورت کیا ہوئی؟ صرف یہ کہ:-

۱- حضرت نوحؑ بہت بڑے عالم حیوانات تھے اور ان کو معلوم تھا کہ دنیا میں اتنی قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔

۲- حضرت نوحؑ بڑے زبردست ریاضی داں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اتنے جانوروں کے لئے اتنی جگہ کافی ہوگی اور اسی حساب سے انھوں نے کشتی تیار کی

۳- حضرت نوحؑ جانوروں کے سدھانے میں کمال رکھتے تھے یہاں تک کہ کشتی میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے درندوں، چوپایوں، چڑیوں اور کیڑے مکوڑوں کو بلا لیا۔

۴- حضرت نوحؑ ایک ماہر مسمریزم تھے کہ انھوں نے تمام جانوروں کو اپنی مقناطیسی قوت سے مغلوب کرکے ان کی طبعی خصوصیاتِ درندگی کو چھین لیا تھا۔

یقیناً ہمیں اس جواب پر یہ اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں کہ حضرت نوحؑ نے یہ تمام علوم کبھی اور کہاں حاصل کئے تھے، کیونکہ بہرحال انسان ہی یہ سب کچھ حاصل کرتا ہے، لیکن اس اعتراض کا جواب اہل مذہب کے پاس کیا ہے کہ اگر ہم حضرت نوحؑ کی ان تمام کامیابیوں کو صرف علمی کامیابی قرار دیں تو پھر انکی نبوت کے ثبوت میں کیا چیز پیش کی جائے گی اور ان کی مذہبی برگزیدگی ثابت کرنے کے لئے کس دلیل سے کام لیا جائے گا۔ کیونکہ اگر محض علم یا سائنس کی مدد سے کسی عجیب امر کا ظہور، نبوت کا ثبوت ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس زمانہ میں ہم اڈیسن کو سب سے بڑا پیغمبر قرار دیں۔ در انحالیکہ کوئی اہل مذہب اسے ایسا سمجھنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔

اس سے قبل میں نے عرض کیا تھا کہ موجودہ اہلِ مذاہب کی یہ ذہنیت کہ وہ اعتراضات کا جواب علمی نظریوں کو سامنے رکھ کر دینا چاہتے ہیں، مذہب کی اتنی بڑی شکست ہے کہ اس کے بعد وہ کسی طرح

جائز ہو ہی نہیں سکتا، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کشتی نوحؑ کی روایت ثابت کرنے کے لئے اہل مذاہب نے جو علمی دلائل پیش کئے ہیں ان سے ممکن ہے روایت تو ثابت ہوگئی ہو، لیکن جناب نوحؑ کی رسالت و نبوت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

ایک رسول کی رسالت کا تعلق صرف اس عقیدہ سے ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے منجانب اللہ کرتا ہے اور اس میں کسی اکتساب یا جد و جہد کا دخل نہیں ہوتا پھر چونکہ علمی توجیہات میں اس اکتساب کا ماننا ضروری ہے اس لئے علوم اکتسابیہ اور علم نبوت کا اجتماع تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ایک پیغمبر دنیا کے تمام علوم کی مہارت ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے تو بیشک یہ صورت ایک مخصوص امتیاز کی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اس دعوے کو کس علمی توجیہہ سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر اہل مذاہب ایسا کہیں بھی تو اسے مانتا کون ہے اور وہ اسے منوا بھی کیسے سکتے ہیں۔

مذہب نام ہے صرف کورانہ و جاہلانہ انقیاد و اطاعت کا، اس لئے اس کا وجود، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری مفید ہو یا غیر مفید، صرف اسی طرح قایم رہ سکتا ہے کہ وہ اسی جہل و لاعلمی کی دنیا میں رہے۔ علم کے میدان میں اسکی تگ و دو حد درجہ نامقبول جسارت ہے کیونکہ یہیں آکر سب سے پہلے اس کے پائے لنگ کا حال لوگوں پر کھلتا ہے اور وہ ایک مضحکہ خیز چیز بن جاتا ہے۔

میں ان اہل مذاہب کو اچھا سمجھتا ہوں جو کسی علمی برہان و حجت کو اپنے پاس آنے ہی نہیں دیتے اور خدا کو صرف "بلا دلیل" پہچاننے کے مدعی ہیں، کیونکہ اس کے اندر ایک ایسا عزم راسخ پنہاں ہے کہ اس کے مقابلہ میں علم کو بھی خاموش رہجانا پڑتا ہے۔ لیکن وہ حضرات جو اپنے عقاید کی صحت میں عقلی دلایل پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں، وہ حقیقتاً وہی ہیں جو مذہب کی طرف سے مطمئن بھی نہیں ہیں اور اس کے ترک کر دینے کی جرأت بھی اپنے اندر نہیں پاتے۔ یہ مذہب کے نہایت خطرناک دوست ہیں اور ایک نہ ایک دن انھیں دوستوں کی بدولت دنیا سے مذہب کو ختم ہو جاتا ہے۔

مشرقی عظمت کا علمبردار

"جاپان"

مصنفہ۔ جناب چمن لال صاحب جرنلسٹ (سیاح جاپان) مترجمہ منشی محمود علی صاحب (جامعی) آج سے صرف ۸۰ برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے۔ بالکل گمنامی میں پڑا تھا، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا ہے۔ اس انقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجئے۔ یہ کوئی سفرنامہ نہیں کہ چند واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہو بلکہ ایک مبصرانہ تصنیف ہے جس میں تمام حالات کا غائر مطالعہ اور جاپان کے عروج پر مفصل بحث ہے مصنف نے ساری کتاب میں یہ بات پیش نظر رکھی ہے کہ ہمارا ملک جاپان سے کیا سیکھ سکتا ہے۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۲۲۵ صفحات کاغذ ۳۴ پونڈ، کتابت طباعت عمدہ، سرورق خوبصورت۔ ۱۱ تصاویر غیر مجلد قیمت ۸/۔ ۳۰ تصاویر مجلد قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی

باب المراسلۃ

ذیل کا مکتوب جمیل میرے ایک نہایت عزیز دوست کا ہے جن سے میں صرف اس لئے محبت کرتا ہوں کہ اگر کبھی اپنی مولویت کی "صراطِ مستقیم" سے ہٹنے کی توفیق ان کو میسر آگئی تو وہ اُس بلند قسم کے "رندِ مجرد" ثابت ہوں گے جنھیں عراقی اپنی زبان میں "خاصگانِ مائی" سے تعبیر کرتا ہے۔

ایک سال سے زاید زمانہ گزرا کہ ان کی بیوی چند چھوٹے بچے چھوڑ کر انتقال کر گئیں، ہر چند ایک مولوی کی نگاہ میں بیوی اور "ماملکت ایمانہم" ایک ہی سلسلۂ نشاط کی دو کڑیاں ہیں اور اس باب میں اس کا نظریہ "اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا" سے آگے نہیں بڑھتا، لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہمارے عزیز دوست میں چونکہ "جراثیم رندی" بھی کافی پائے جاتے ہیں، خواہ وہ فی الحال کتنے ہی ساکن (Inactive) کیوں نہ ہوں، اس لئے انھیں اس حادثہ سے سخت صدمہ پہونچا اور انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب اپنی زندگی سے بھی بیزار ہیں چہ جائیکہ "نشاطِ زندگی"۔ میں نے لکھا کہ یہ تاثرات عارضی ہوا کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ زمانۂ شباب میں کہ اس وقت تو ان کی پایداری گریۂ شبنم سے بھی زیادہ بے حقیقت ہوتی ہے اس لئے آپ فوراً دوسری شادی کر لیجئے، انھوں نے اسے "خیالِ محال" سے تعبیر کیا اور اعلان کر دیا کہ اپنی بقیہ عمر وہ "مرحومہ" کی یاد میں بسر کر دیں گے اور اس "جاںہاری" کے ان وداعی الفاظ کو کبھی فراموش نہ کریں گے جن میں نہایت حسرت کے ساتھ ان کے جدید حیاتِ ازدواجی کا ذکر کیا گیا تھا۔

بات آئی گئی ہوئی، میں بھی اپنی الجھنوں میں پڑ گیا اور وہ بھی "جبرِ حیات" کے مشاغل میں مصروف ہو گئے کبھی کبھی اگر خیال بھی آتا تھا تو میں اس کو ٹال دیا کرتا تھا کیونکہ ان کی سوگوارانہ زندگی کا تصور میرے لئے باعثِ اذیت تھا

اتفاق سے حال ہی میں ان کی ایک تحریر اور آئی اور یہ غیر متوقع خبر لیکر آئی کہ انھوں نے دوسرا نکاح کر لیا ہے، خط کے الفاظ سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں غیر معمولی مسرت و انبساط حاصل ہے اور گزشتہ عہد و پیمان کی یاد تک باقی نہیں رہی۔ میں نے اُن کو اس "نشاطِ جدید" پر مبارکباد دی، انھوں نے شاید اس میں ایک طعن بھی محسوس کیا اور مجھے دوسرا مفصل خط بھیجا۔ چونکہ اس تحریر سے نہ صرف نفسیاتِ شباب و ازدواج پر روشنی پڑتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جذباتِ جنسی کس حد تک انسان کی ذہنیت بدل دیتے ہیں۔ اس لئے

ہاں کبھی کبھی تذکرہ آتا ہے اور دونوں اُن کو یاد کرکے آنسو کے چند قطرے ٹپکا لیتے ہیں - دل ہلکا ہو جاتا ہے، بچوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک ہے، پہلے جس لفظ سے بچے پکارتے تھے اب بھی وہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے، مرحومہ کی یاد پر رشک و رقابت کی جگہ یاس و حسرت کا اظہار ہوتا ہے، مجھے بڑی حد تک اطمینان حاصل ہے۔

لکھنؤ - ۱۵ اپریل ۳۶ء

صدیقی الاغر - آپ کا جواب مجھے اسوقت ملا جب میں قطعاً اس کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اور اپنی اس مایوسی پر قانع بھی تھا کیونکہ جب ایک شخص زندگی کے اس دور سے گزر رہا ہو جسے

جہانے مختصر خواہم کہ در وئے ہمیں جائے من و جائے تو باشد ——— کہتے ہیں

تو ایسے وقت میں اس کو چھیڑا ہی کیوں جائے - میں سمجھتا تھا کہ میں نے بالکل بے محل تقاضۂ جواب کیا ہے اور اگر آپ اب بھی خاموش رہتے تو میں کبھی آپ کو ملامت نہ کرتا، کیونکہ نتیجہ معلوم -

دیشد درّ من قال :- اجد الملامۃ فی ہواک لذیذۃ

حبا لذکرک فلیلمنی اللیوم

آپ کی اس تحریر کو پڑھکر اپنی اور دوسروں کی زندگی کے بہت سے وہ تجربات سامنے آگئے جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو "فریب نفس" سے زیادہ اور کچھ نہیں ٹھہرتے - انسان اور خصوصیت کے ساتھ ایک پڑھے لکھے ذہین انسان کی یہ خصوصیت کہ وہ معصیت کے باب میں بھی "اطمینان ضمیر" کی کوشش سے باز نہیں آتا، گو خالص مذہب کی پیداوار ہے، لیکن ہے نہایت پُرلطف - آپ کو معلوم ہے کہ میں کیوں اسے "پُرلطف" کہتا ہوں؟ اسلئے نہیں کہ گناہ کو "صواب" سمجھ کر کرنا کوئی معقول بات ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اس طرح "ارتکاب گناہ" میں جو ایک کیفیت "دزدیدہ نگاہی" کی پیدا ہو جاتی ہے وہ بڑی جمیل چیز ہے - خیر یہ تو میں نے اس لئے لکھدیا کہ آپ پر اسوقت مجھے معلوم نہیں کیوں، تھوڑا سا رشک آگیا ورنہ میں کہ اب گناہ کو "گناہ" سمجھ کر کرنے کا عادی ہوں اور وہ بھی پوری طرح ضمیر کا خون کرنے کے بعد - اب اس قسم کی لذتوں سے اس حد تک بیگانہ ہو چکا ہوں کہ سوائے اپنے سب کو "گناہگار" سمجھنے لگا ہوں -

مرد و عورت کے تعلقات جنسی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ غیر شاعرانہ چیز شادی یا نکاح ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب اس میں "مولویت" بھی شامل ہو کہ اس صورت میں تو وہ بالکل بازار کا سا سودا ہو کر رہجاتی ہے یوں تو ایک رند کی بیوی بھی عورت ہونے کے لحاظ سے کوئی خاص چیز نہیں، تاہم بہ لحاظ احترام رندی وہ اس کو محبوب سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے، لیکن ایک مولوی جو اپنی بیوی سے بجز اس کے کوئی توقع نہیں

رکھتا کہ نماز سے جو وقت بچے وہ شوہر کی خدمت میں صرف ہونا چاہئے، کیا خاک اس کی قدر کرسکتا ہے۔ اگر اولاد ہونے سے قبل وہ مرجاتی ہے تو ایک خادمہ کے چلے جانے کا رنج ہوتا ہے اور اولاد چھوڑ گئی تو ایک دایہ مرضعہ کی حیثیت سے اس کے اُٹھ جانے کی تکلیف ہوتی ہے۔

ہرچند مولوی نہ ہونا، رند ہونا نہیں ہے، لیکن جو رند نہیں ہے وہ مولوی یقیناً ہے، اسی حیثیت سے میں آپ کو مولوی سمجھتا ہوں، اور اسی بنا پر میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ فوراً دوسرا عقد کرلیجئے کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ صدمہ و تاثر جس کا تعلق بیوی نہیں بلکہ بچوں کی ماں کے اُٹھ جانے سے ہے بالکل عارضی چیز ہے اور ہمیشہ اسکا مداوا "نکاح ثانی" سے کیا جاتا ہے خواہ وہ کامیاب ثابت ہو یا ناکام۔

آپ نے اس کا جواب ایک ایسی "رندانہ خودسری" سے دیا کہ جی خوش ہوگیا، حالانکہ اس پر عزم وثبات کا زیادہ یقین مجھے نہ تھا۔ ایک زمانہ گزر گیا اور میں یہی سمجھتا رہا کہ ممکن ہے آپ کی سوگواریاں بدستور قایم ہوں، لیکن حال ہی میں آپ کی تحریر نے اس پردہ کو بھی اُٹھا دیا اور مجھے یہ سنکر کہ آپ نے دوسری شادی کرلی اطمینان بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی۔ اطمینان اس لئے کہ یہ زمانہ "عشق وجنون" کے لئے سازگار ہی نہیں، گو آپ کی عمر اس کی مقتضی ہو اور حیرت اس لئے کہ آپ کے لب ولہجہ سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ یہ محض نکاح ہی نہیں ہے بلکہ رومان بھی ہے۔

میں نے آپ کو اس "نشاط تازہ" پر مبارکباد دی، لیکن آپ نے غالباً اس میں کچھ طعن بھی محسوس کیا اور اس کے جواب میں کافی تامل اور پس وپیش کے بعد یہ "اعتماد نامہ" روانہ فرمایا۔

باور کیجئے کہ آپ کے نکاح ثانی سے جتنی مجھے خوشی ہوئی کسی اور کو نہیں ہوسکتی، کیونکہ میں اس کی پیشین گوئی کرچکا تھا، آپ کو مشورہ دے چکا تھا اور حقیقتاً آپ کے لئے ضروری بھی جانتا تھا۔

آپ نے اپنی موجودہ حیات ازدواج کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ہرچند ان سے ایک خاص قسم کا نشہ ضرور ٹپکتا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں کچھ "اندیشہ نیش" بھی شامل ہے۔ اگر پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اتنا زمانہ حسرت ویاس میں بسر کردینا خلاف عقل تھا تو اب نکاح ثانی کے بعد اس کی خلش کو باقی رہنے دینا اس سے زیادہ بُرا ہے۔ آپ کی زندگی کے پہلے حصہ میں جب دوسری بیوی شریک نہ تھی تو دوسرے حصہ میں پہلی بیوی کیوں شامل ہو۔ کیا آپ اپنے دو ٹکڑے برابر کے ایسے نہیں کرسکتے کہ ان میں کمی وبیشی کا سوال ہی نہ پیدا ہوسکے۔

ہرچند آپ نے وضاحت کے ساتھ تو نہیں لیکن اجمالاً ضرور اس تفاوت کو ظاہر کیا ہے جو آپ کی اور اُن کی عمر میں پایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ایسی صورت میں دلداریوں

کی ذمہ داری زیادہ تر آپ ہی پر عاید ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ — غنچہ تا شگفتنہا قدر عافیت معلوم! کا احساس نہایت تکلیف دہ ہے لیکن زن و شو کے باب میں اس کا تشائم پہلو بھی عورت ہی کے احساس سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ مرد اپنی کمزوریوں کے چھپانے میں کمال رکھتا ہے اور اس حد تک جری واقع ہوا ہے کہ اگر پھول کی خوشبو ان کو محسوس نہ ہوگی تو غصہ میں آکر اسی کو "بے بو" کہکر مسل ڈالیگا اور اپنے ضعف شامہ کو کبھی نہ ظاہر ہونے دیگا — آہ، آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ہندوستان کی عورت کتنی مظلوم ہے ۔ اس سے مطالبہ جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا خون بھی کرے اور مسکراتی بھی رہے!

باور کیجئے کہ اس جدید تعلق سے جو تغیر آپ کے جذبات میں پیدا ہوا ہے اس کو معلوم کرکے میں خوش ہوا، اس لئے نہیں کہ آپ اب بجائے میر و درد کے داغ و ریاض کی دنیا میں آ گئے ہیں، بلکہ صرف اس بنا پر کہ سنِ فوت میں "سگہے طفلے شود مستانہ می رقص" اس بات کی علامت ہے کہ انسان زیادہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں آپ کو کم از کم اس وقت تک ضرور زندہ رکھنا چاہتا ہوں جب تک میں موت کے خیال کو بھلائے ہوئے ہوں ۔

یہ درست ہے کہ "انسان کا ہر حال خواہ وہ غم انگیز ہو یا طرب انگیز اس کی ناپائداری مسلم ہے" لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اس فکر میں اپنا سر کیوں کھپائے ۔ طلوع ماہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا صرف اسلئے کہ اسے غروب بھی ہونا ہے یقیناً کوئی فطری مطالبہ نہیں ۔ غالب نے اس فلسفہ کو ایک نہایت لطیف و نازک طرز ادائی پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے :-

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

انسان خواہ کتنی ہی عمر لیکر آئے لیکن وہ زندہ رہتا ہے زیادہ سے زیادہ پندرہ سال بیس سے پینتیس تک۔ پھر فطرت کے اس بخل سے انتقام لینے کی صورت یہی ہے کہ اس کی طرف سے یکسر روگردانی اختیار کر لیجائے — "القارعۃ" پڑھ پڑھکر آنسو بہاتے رہنے اور "اذا زلزلت الارض زلزالہا" کے خیال سے کانپتے رہنے کی عمر ابھی آپ کی نہیں آئی ہے ۔ اور پھر یوں بھی طاعت و عبادت یا حسن اخلاق کا یہ مفہوم میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ خدا کو نعوذ باللہ "بیچا" سمجھ لیا جائے ۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا خدا صرف "رحمان و رحیم" ہے، میں شراب پیتا ہوں وہ مسکرا کر منھ پھیر لیتا ہے، میں بدمستی کرتا ہوں وہ ٹالجاتا ہے، میں جتنا اس کی طرف سے بے پرواہ رہتا ہوں اتنی ہی زیادہ پرواہ وہ میری کرتا ہے ۔

او خود مگر بہ لطف خداوندی کند
ورنہ زما چہ بندگی آید پسند او

آپ نمازیں پڑھئے لیکن نماز کا "سوگ" اپنے اوپر کبھی نہ طاری ہونے دیجئے۔ آپ جتنی زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں اتنا ہی زیادہ حق آپ کو خدا کے بھلا دینے کا حاصل ہے ۔۔ خدا کو بھلا دینے کے معنے اس کے قہر و غضب سے مطمئن ہو جانے کے ہیں ۔۔ آپ داڑھی بڑھائیے لیکن صرف چہرہ پر، سینہ کے اندر نہیں کہ اسکی سیاہی قلب پر چھا جائے۔ خیر تو مدعا یہ کہنا تھا کہ جب ہر چیز کی ناپائیداری مسلم ہے تو مسرت کی گھڑیوں کو فکر غم سے تباہ کرنا فطرت کا اقتضا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے شب وصل کی شوخیوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ کا "غمکدہ اور آہ" کو یاد کرنا مجھے پسند نہیں آیا۔ چونکہ آپ پر کبھی رندی کا دور نہیں آیا اس لئے آپ "رندانہ اخلاق" کی بلندی سے بھی واقف نہیں، میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں رندی کی ابتدا ہوتی ہے اپنے آپ کو بھلا دینے سے اور اس کا اختتام ہوتا ہے اپنے آپ کو مٹا دینے پر دوسروں کے لئے۔ آپ کو معلوم ہے اسوقت وہ دوسرا کون ہے جو آپ سے اس "رندانہ رواداری" کا طالب ہے۔ آپ کی بیوی! ۔۔ اگر میں نے آپ کی موجودہ زندگی کو "عہدِ نشاط" کہا تو یہ میرا اک نوع کا ایعاز و اشارہ (Suggestion) تھا نہ کہ طنز و استہزا۔ آپ نے کیوں وہ باتیں لکھیں جن کو میں سننا پسند نہیں کرتا۔ ابھی تو ابتدا ہے، اگر ابھی سے آپ نے کراہنا شروع کیا تو آئندہ کیا کیجئے گا۔

مسرت کے اسباب پیدا ہوئے ہیں تو ان میں غرق ہو جائیے اپنے لئے نہ سہی کسی اور کے لئے جسکی مسرتیں صرف آپ سے وابستہ ہیں۔ یہی ہے اصلی رندی اور یہی ہے اُس کی وہ بلندیِ اخلاق جو آپ کو محراب و منبر میں نظر نہیں آسکتی۔

جہاں نگاہ ہو وہیں دل بھی ہونا چاہئے ۔۔۔ دل جائے دیگرست و نگہ جائے دیگرست ۔۔ ہمارے کیش میں حرام ہے۔ "بہوش باش" مناسب ہے، لیکن صرف اس حد تک کہ "ساغر زدست مگزاری"

یہاں تک تو خطاب تھا صرف آپ سے اور وہ بھی نصائح کی صورت میں، کیونکہ جانتا ہوں مرد مسلمان ہونے کے لحاظ سے آپ کو نصیحت ہی کی زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن ایک نہایت مختصر سی بات ان سے بھی کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی تنہا فتح صرف اس فلسفہ میں پنہاں ہے کہ

عہد تو شکست و من ہمانم!

ضرورت ہے

رشتہ کی ایک معزز خاندان کی ناکتخدا لڑکی کے لئے جو امسال میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئی ہے۔ اپنے سلیقہ و تمیز، ذہانت و ذوق کے لحاظ سے بہترین رفیق زندگی بننے کی اہل ہے۔ صرف وہ اصحاب خط و کتابت کریں جو خود اپنی کوئی معقول ذاتی آمدنی رکھتے ہوں۔

ا ۔ ح ۔ ذریعہ مینیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

آرام جان۔

تمھیں شرم آنی چاہئے کہ تمھاری طرف سے اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد بھی میں تمھیں "آرام جاں" کہتا ہوں۔ اگر میں تمھیں اصل راز سے آگاہ کردوں تو تم خفا تو خیر کیا ہو گے لیکن خفگی کا اظہار ضرور کرو گے اور یہ مجھے پسند نہیں کہ جس نے ہمیشہ ہنس ہنس کر مجھے اذیت پہونچائی ہے وہ اب "چین پیشانی" کے ساتھ خنجر آزما ہو۔

آج تمھارا وہ خط جو تم نے یعقوب صاحب کو لکھا ہے اتفاق سے دیکھنے کو ملگیا ۔۔ ماشاءاللہ، کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں، کیا کیا "برشِ تیغِ جفا" پر ناز فرمایا ہے۔ کیوں نہ ہو، شاعر ہو، خوبصورت ہو، نوجوان ہو، اور اپنی اس قوت سے واقف کہ

کرشمہ کن ویک شہر را خراب انداز

اچھا تو سنو، میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تمھیں کسی نہ کسی طرح یہ یقین دلادوں کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ پورا ہوگیا۔

کل شام کو ایسی سخت آندھی آئی کہ میرے مکان کی چھتیں گر پڑیں، در و دیوار سرنگوں ہوگئے، اس کے بعد دفعتاً ایک گوشہ سے شعلہ بلند ہوا اور میری ایک ایک چیز کو خاکستر کرگیا، میں گھر سے باہر نکل کر بھاگا تو لوگوں نے پتھر مارنا شروع کئے، میں گھبرا کر ایک کنویں میں کود پڑا اور وہیں ختم ہوگیا ـــــ تمھیں خوش کرنے کے لئے اس سے زیادہ میرے امکان میں نہ تھا۔

بولو اب کیا کہتے ہو۔ کہو گے کیا۔ اور کہو گے بھی تو سنو گے کیا؟ میں تمھارا کشتہ ٹھہرا اور

برنیاید ز کشتگان آواز

کا حال تم کو معلوم ہی ہے ـــ یہ آخری اور بالکل آخری خوشخبری ہے جو میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ میں مرچکا ہوں اور احساس بعد الموت کا قایل نہیں ہوں اس لئے جو چاہو کہو۔ جو چاہو کرو۔ میری طرف سے اب کسی شکایت کا اندیشہ ہی نہیں۔

خدا حافظ

بندہ نواز - کرمنامہ ملا، الطاف و عنایات کا شکریہ ادا کرنا فرض ہے، لیکن اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ یہ آپ ہی بتایئے۔

اول تو احسان کے عوض میں احسان کرنے کا خیال ہی سرے سے ایک نامعقول بات ہے لیکن اگر میں اس نامعقولیت پر راضی ہوجاؤں تو بھی بیدست و پائی اور بے برگ و باری کا کیا علاج جس نے سوائے "شرمندۂ احسان" رہنے کے مجھے اور کسی کام کا رکھا ہی نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کی فطرت اس سے بہت بلند ہے کہ آپ کسی کو ممنون بنائیں اور اس کے اعتراف کی بھی خواہش رکھیں۔ لیکن میں اپنی فطرت کے انحطاط کو کیا کروں جو خواہ مخواہ اُس بات پر مجبور کرتی ہے جس پر آپ راضی نہیں ــ بہرحال سوائے خاموش دعاؤں کے میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ جب تک زندہ ہوں دعاگو ہوں اور اس احساس کے ساتھ کہ یہ سب لغو و بیکار ہے۔

آپ کا یہ احسان صرف ایک قریشی صاحب پر نہیں ہے، بلکہ ان کی بیوی بچوں پر ہے، ماں بہن پر ہے اور اسی کے ساتھ مجھ پر بھی کہ میں ان کی پُرتکلیف زندگی کی کوفت سے آزاد ہوگیا۔ کل وہ غریب ملے تھے اس حال میں کہ آپ کا ذکر زبان پر تھا اور آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔ ان میں تو اتنی بھی جرأت نہیں کہ آپ کے سامنے اعتراف کرم کی کوئی ناکام کوشش بھی کر سکیں۔ آپ نے تو ان سے ہمیشہ کے لئے قوت گویائی چھین لی ہے۔ میں یہ خدمت ان کی اور اپنی طرف سے انجام دے رہا ہوں لیکن جانتا ہوں جو حقیقت اسکی ہے۔

خوش رہیئے اور کیا کہوں۔

فراموشکار من -

عرفی کا شعر ہے:-

مرا فریب دہد نالہ و بہ غم گوید
زمن ترانہ شنو با اثر چہ کار مرا

آپ کو معلوم ہے کہ محبت کی کس منزل کی طرف اس میں اشارہ ہے؟ یاس و ناامیدی کی وہ آخری حد جب محبت کرنے والا اپنے آپ کو فریب دینا چاہتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں فریب دے رہا ہوں۔ لیکن ایک منزل اس سے آگے اور بھی ہے جب اس احساس کے بعد یک لخت خاموشی شروع ہوجاتی ہے۔ سو میں آپ کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اس تحریر کے بعد ہی میں اس منزل میں قدم رکھنے والا ہوں "من و تو" کا جھگڑا انتہائے قرب نہیں بلکہ انتہائے بعد و ہجراں کی صورت میں ہمیشہ کے لئے مٹ جاتا ہے۔

آپ ایک امر کا عزم فرماتے ہیں، میں اسے پسند نہیں کرتا، اس کے بعد آپ کا اصرار شروع ہوتا ہے اور میں صرف اس لئے کہ آپ کی دلآزاری نہ ہو، کہدیتا ہوں ــــ "خیر آپ کی مرضی"۔ ۔ دو مہینے اس طرح کی بات ہے ۔ اس کے بعد میں اشارتاً و کنایتاً یاد دہانی کراتا ہوں، کوئی جواب نہیں ملتا، صراحتاً تقاضہ کرتا ہوں، آپ خاموش رہتے ہیں، طعن و تشنیع پر اتر آتا ہوں، آپ ٹال جاتے ہیں ۔ یہ آخر کیا وضع ہے؟ کم از کم آپ نے یہ تو خیال کیا ہوتا کہ آپکے وعدہ پر اعتماد کر کے ایک شخص ہر طرف سے کٹ کے آپ ہی کا ہو رہا ہے، پھر اس سکوت کے کیا معنی؟ میں تو اس قدر محجوب ہوں کہ جس وقت وہ آتے ہیں تو ملنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی اور آپ کی "بے جگری" کا یہ عالم کہ خط کا جواب تک دینا گوارا نہیں ۔ بہر حال میں تو مایوس ہو ہی چکا ہوں، وہ بھی ہفتہ عشرہ میں صبر کر کے بیٹھ رہیں گے۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں کبھی آپ سے ملاقات ہوئی (جس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے) تو آپ نہیں بلکہ میں کیونکر آپ سے آنکھیں چار کر سکوں گا۔

تخیل کی جادوگری

جب نگاہیں پی کے اُٹھتی ہیں تخیل کی شراب
دیکھتی ہے آنکھ پراسرار نظاروں کے خواب

کشتِ جاں پر شبنمِ وجدان کی گرتی ہے پھوار
تیز ہو جاتی ہے محسوسات کی باریک دھار

شاہدِ فطرت اُلٹ دیتی ہے چہرے سے نقاب
ٹوٹتا ہے عقل کی محدود نظروں کا حجاب

غفلتوں کے خواب سے بیدار ہو جاتا ہے دل
زندگی کی لہر سے سرشار ہو جاتا ہے دل

زیرِ لب کچھ گنگناتی ہے گلستاں کی ہوا
گونجتی ہے ان سنے نغموں کی کانوں میں صدا

بخشتی ہیں سوز میں ڈوبی ہوئی بینائیاں
زندگی کی سادگی کو حسن کی رعنائیاں

شوق کی آنکھوں میں لہراتا ہے جب حسنِ خیال
سادگی میں بھی نظر آتا ہے فردوسی جمال

دور ہو جاتی ہے دل سے بےحسی کی تیرگی
آنکھ کو ملتا ہے نظارے میں ذوقِ آگہی

طائرانہ جن مناظر سے گزر جاتے ہیں روز
وہ مناظر حسن سے عاری جنھیں پاتے ہیں رعذ

دلکشی کا بھول کر جن پر نہیں ہوتا گمان
اُن میں شاعر دیکھتا ہے حسن کی باریکیاں

روح کو بیدار کر دیتا ہے وجداں کا اثر
حسن کی گہرائیوں تک ڈوب جاتی ہے نظر

مسکراتی ہے نئے انداز سے بزمِ حیات
حسن نو سے جگمگا اٹھتی ہے ساری کائنات

ذوقی - بی - اے

خانہ بدوش

میں آج شہر کے باہر ہوں ہمکنارِ خوشی — نظر نواز ہے، اک خوشنما "دیارِ خوشی"
زمیں پہ خیموں میں بیٹھے ہوئے ہیں خانہ بدوش — ہوائے دشت کی آزادیوں سے ہم آغوش
نظر میں اپنی لئے سقفِ آسماں کا جلال — رگوں میں گرمیٔ خوں، دل میں شورشِ جمال
ہر ایک مردِ جواں ان میں ہند کا سہراب — بلند مرتبہ، رفعت میں آسماں کا جواب
خود اعتمادیاں ان کی، ہیں ان کا سرمایہ — ہے ان کے عزم پہ عزّ و وقار کا سایہ
نہ ان کو ناز ہے جلسوں میں خودستائی کا — نہ ان کو فخر ہے ملت کی رہنمائی کا
نہ ان کو پوجتے ہیں ناخدائے اخباری — نہ ان کی جیبوں پہ کرتی ہے قوم زرباری
نہ ان کو چاہیے جرعاتِ خونِ انسانی — نہ مفلسوں کی کمائی سے خوانِ ایوانی
بساطِ دہر پہ ان کا کمال، نامحدود — نظر میں وسعتِ ممکن، خیال نامحدود
دل ان کے قوم پرستی کو مانتے ہی نہیں — وطن کے بھوت کو یہ لوگ جانتے ہی نہیں
قیودِ مذہب و ملت یہ لوگ کیا جانیں — فرشتے ہیں یہ خوشی کے، یہ سوگ کیا جانیں
نہ ان میں شیخ و برہمن کی مکر و عیاری — نہ ان میں جذبۂ قومی کی پست خونخواری
نہ ان کو جھگڑوں کا بیڑا اٹھانا آتا ہے — نہ ان کو شہروں کو ویراں بنانا آتا ہے
نہ کانپور کو یہ آگ سے جلاتے ہیں — نہ لکھنؤ کو قیامت نما بناتے ہیں
یہ خود ہی دشت کو آباد کرتے رہتے ہیں — خوشی کا چشمہ ہیں، جوشِ خوشی میں بہتے ہیں
ازل سے لائے ہیں آزادِ زندگی یہ لوگ — یہ جانتے ہیں تعصب ہے ایک روحی روگ
زمانہ بھر ہے انھیں کا وطن جہاں جائیں — ملیگا ان کو خوشی کا چمن جہاں جائیں
فلک پہ دیکھتے ہیں یہ بہارِ جلوۂ فن — زمیں پہ دیکھتے ہیں اپنی زندگی کا چمن
گلوں سے ملتے ہیں یہ اپنی دلکشی کی عید — خموش رات میں سنتے ہیں نغمۂ ناہید
یہ دیکھتے ہیں گھٹاؤں میں رقص کا اعجاز — ہوا کی موجوں میں سنتے ہیں ساز کی آواز
فضا کی گود میں یہ رازدارِ فطرت ہیں — خودیٔ حسن ہیں، خودداریٔ محبت ہیں
وجود ان کا ہے اس کائنات سے بالا — حیات ان کی ہے رنجِ حیات سے بالا

شعاعِ دیر و حرم ہے نگاہ میں ان کی
کہ یہاں ہے خدا، بارگاہ میں ان کی

حریمِ زیست میں عشرت نصیب ہیں یہ لوگ
خودی سے دور، خدا سے قریب ہیں یہ لوگ

ہے ان کے حصے میں جو چیز و رفیع و عظیم
ہے انکی نظروں میں روحانیاتِ عظیم

حسین حوریں ہیں، ان کی حیات کی پریاں
یہ مستِ ناز ہیں، اس کائنات کی پریاں

لباسِ سادہ میں ان کے ہے شانِ آرائش
سروں پہ سرخ کسائے ہیں جانِ آرائش

سروں پہ ان کے دوپٹے نہ پاؤں میں پاپوش
نہ ان کو خواہشِ منصب، نہ زینتوں کا ہوش

خرد فروز تقدس نظر نظر میں سے لئے
گناہ سوزیٔ دل حسنِ بے خبر میں سے

کھڑی ہیں خیموں کے باہر شباب میں مدہوش
نہ ان کا حسن مقید ہے اور نہ پردہ بدوش

جمال ان کا، جوانی کی رات ان کی ہے
شباب ان کا ہے، برقِ حیات ان کی ہے

خوشی کی صبح، محبت کی شام ان کی ہے
ضیائیں ان کی ہیں، تاب و دوام ان کی ہے

حسین جلووں میں رقصاں ہے موجِ برقِ خضاب
ابل رہا ہے نگاہوں کے ساتھ کیفِ شراب

عروسِ زیست نے پہنا ہے حسن کا گہنا
فروغِ مستیٔ خانہ بدوش کیا کہنا

یہ فرطِ عیش، یہ مستی، یہ حسن و رعنائی
یہ ان کی باتوں میں اندازِ نغمہ پیرائی

فضا میں گونج رہی ہے نوائے بربط و چنگ
بسی ہے دامنِ صحرا میں بزمِ رامش و رنگ

ہیں ان کے مرد بھی رقص و سرود میں مصروف
ہے انکی تازگیٔ زیست عیش میں ملفوف

غرض کہ خانہ بدوشوں کی دلکشی نے آج
دکھا دیا ہے نگاہوں کو عشرتوں کا سوراج

خوشی کے دور میں ہر انقلاب ہے دھوکا
سمجھ رہا ہوں، خیالِ سراب ہے دھوکا

مجھے یقینِ قیامِ بہار ہے اب تک
فریب خوردہ مرا اعتبار ہے اب تک

تغیرات کے امکاں مگر نمایاں ہیں
یہاں سے کوچ کے میں دیکھتا ہوں ساماں ہیں

اٹھا کے خیمے، قیامت بلائی جاتی ہے
مری نگاہ کی دنیا سلائی جاتی ہے

ہر اک امید میں اک انقلابِ پیہم ہے
ہر ایک عشق میں رنگِ نمودِ شبنم ہے

یہ وقت روح پہ بجلی گرانے والا ہے
یہ وقت آج گزر کر نہ آنے والا ہے

مری حیات کو بیدار کرنے والو! رکو
سکون و صبر کو دشوار کرنے والو! رکو

فطرت واسطی بی۔ اے

عشق

دیکھنا یہ کون اُٹھا کیف برساتا ہوا
بربطِ مہتاب پر کچھ گیت سے گاتا ہوا

برق کے مانند روشن، صورتِ مستی رواں
ہر نفس کو نکہتِ تازہ سے مہکاتا ہوا

دوش پر کچھ تیر، دستِ مرمریں میں اک کماں
کائناتِ حسن کی موجوں میں لہراتا ہوا

بڑھ گیا آگے شفق کی جنتِ گلرنگ سے
اپنے زعمِ تیر اندازی پہ اتراتا ہوا

آگیا رنگینیٔ عالم کی بزمِ خاص تک
شاہراہِ کہنۂ عالم کو ٹھکراتا ہوا

ڈالکر اپنی نگاہیں انجمن در انجمن
اور کچھ آگے بڑھا پھولوں سے کتراتا ہوا

گرمیاں بنکر مسلط ہوگیا جذبات پر
ہستی و مستی کے ہنگاموں کو لچکاتا ہوا

کھو گیا صبحِ جوانی کے تبسم زار میں
مسکراہٹ کا سنہرا نور چمکاتا ہوا

لی کماں اور ہوگیا آمادۂ تیر افگنی
سامنے آیا دلوں پر تیر برساتا ہوا

آدمیت کو بناکر آشنائے درد و سوز
سینۂ ہر ذرہ کی طاقت بتاتا ہے بل کھاتا ہوا

"عشق" کہتے ہیں اسے فطرت کا یہ انعام ہے
عرش سے تا فرش اس کی حکمرانی عام ہے

نبی احمد بریلوی

مجھے ضرورت ہے

ایک ایسے معاون کی جو "نگار" کی ترتیب و تحریر میں مجھے پوری مدد دے سکے، انگریزی و عربی سے بے تکلف ترجمہ کرنے کی اہلیت ضروری ہے اور اسی کے ساتھ ادب و انشاء کا ذوق۔ جو حضرات اس کے لئے آمادہ ہوں وہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔

نیاز فتحپوری
اڈیٹر نگار

طور

جسے زبانِ محبت میں "طور" کہتے ہیں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۱)

جہاں سکون بھی ہنگامہ ساز ہوتا ہے
جہاں سرور میں سوز و گداز ہوتا ہے
جہاں نیاز ہم آغوش ناز ہوتا ہے
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۲)

جہاں فلک کی ہے رفعت، زمیں کی پستی میں
جہاں خدا کی عبادت ہے بت پرستی میں
جہاں ہے زہد بھی مصروف مے پرستی میں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۳)

جہاں کے نور سے خورشید جگمگاتا ہے
جہاں کا رنگ ہر اک گلستاں پہ چھاتا ہے
جہاں کا حسن محبت کے گیت گاتا ہے
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۴)

جہاں تبسم رنگیں میں پھول ہنستے ہیں
جہاں تکلم شیریں میں راگ بستے ہیں
جہاں نگاہ سے انوارِ دل برستے ہیں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

—— (۵) ——

جہاں بہشت کے آثار پائے جاتے ہیں
جہاں نگاہ سے جادو جگائے جاتے ہیں
جہاں چراغِ محبت جلائے جاتے ہیں

وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

—— (۶) ——

جہاں کی موت میں پوشیدہ زندگانی ہے
جہاں کی زیست میں معراجِ نوجوانی ہے
جہاں سکون بھی اقدامِ پرفشانی ہے

وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

—— (۷) ——

جہاں کی خاک پہ مہر اور ماہ رہتے ہیں
جہاں کی ارض پہ دربائے قدس بہتے ہیں
جسے زبانِ محبت میں "طور" کہتے ہیں

وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش (عثمانیہ)

شاعر

مرے تبسم تخئیل سے عبارت ہے — ضیائے نیر رخشاں فروغ ماہِ تمام

مرے خیال کی جنبش پہ رقص کرتی ہے — ادائے خاص سے سلمائے گردشِ ایام

مری نگاہ میں ہے لف ونشر ہر ذرہ — مرے خیال میں کونین صنعتِ ایہام

مرا پیام ہے روح القدس کی اک آواز — مرے ضمیر پہ ہوتی ہے بارشِ الہام

مرے نقوش میں آثارِ نیم ربانی — مرے کمال کو بخشی گئی حیاتِ دوام

بطرزِ مطربِ بدمست پھوٹتی کونپل — سنا رہی ہے مجھے نغمۂ درود و سلام

کبھی نگاہ میں موجوں کے نرم ہلکورے — کبھی خیال میں جذبِ توازنِ اجرام

کبھی وہ جوش کہ دشمن بھی آنکھ کا تارا — کبھی یہ حال کہ بیگانۂ ذوی الارحام

کبھی حیات کو ٹکرا دیا چٹانوں سے — کبھی حباب سے کمزور زندگی کا نظام

کبھی یقین کی ... میں رموزِ لوح و قلم — کبھی وہ شک کہ ہر اک چیز پیکرِ اوہام

کبھی خیال کی زینت حرم کی محرابیں — کبھی نگاہ شہیدِ تبسمِ اصنام

اک انقلابِ مکمل کا پیش خیمہ ہے — مرے خیال و تصور کا مضمحل اقدام

وہ کیف بار ہے میرے خیال کی دنیا — جہاں تصورِ زہد و ورع گناہ و حرام

جہاں شراب کی موجوں پہ رقص کرتے ہیں — حسن ناز و ادا شاہدانِ گل اندام

جہاں ذریعۂ عرفاں، وسیلۂ بخشش — گناہ، نام ہے جس کا بہ اصطلاحِ عوام

جہاں ہے جنبشِ ساغر اشارۂ غیبی — جہاں ہے قلقلِ مینا ضمیر کا پیغام

جہاں کا مسلکِ عالی ہے رندی و مستی — جہاں کا ضابطہ اشعارِ حافظ و خیام

جہاں طواف کا مرکز ہے خشتِ میخانہ — جہاں ہے غرقِ مئے ناب جامۂ احرام

جہاں طرب کے فسانے سنائے جاتے ہیں — حدیثِ مطرب و ساغر جہاں کا علم کلام

جہاں کی خاک ہے اک رودِ آتشِ سیال — جہاں فضا میں برستا ہے بادۂ گلفام

جہاں شراب سے تطہیرِ روح ہوتی ہے — جہاں ہے پیرِ مغاں کی نوازش و اکرام
جہاں کی صبح پہ صدقے سحر بنارس کی — جہاں کی شام پہ قربان ہے اودھ کی شام

مرے خیالِ جہاں گیر کے ہیں چند نقوش — فسانۂ چہ بابل، قدامتِ اہرام[1]

وہ فلسفہ کہ جو تہذیبِ عقل کرتا ہے — مری نگاہ میں اک ہیئتِ جنونِ خام
لطیف تر ورقِ گل سے ہے مرا احساس — مرے لئے ہے تبسم کلی کا اک پیغام

مرے فسانۂ رنگیں کا ماحصل یہ ہے
کہ ہوں میں اہلِ محبت کا بندۂ بے دام

ماہر القادری

---

[1] اہرام مصری

قطعات

چاندنی راتیں

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی!! کبھی ہنسا، کبھی آہیں بھریں، کبھی رویا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں میں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

شبِ بہار

گھٹائیں جھوم رہی ہیں، ہوائیں رقصاں ہیں فضا ہے مست، زمانہ اسیرِ غفلت ہے
ان آنسوؤں کی مرے دوست! وجہ کچھ بھی نہیں شبِ بہار میں رونے کی مجھ کو عادت ہے

خلش

کیا کہوں کیا ہے دل کی حالت آج بس یہ محسوس کر رہا ہوں میں
ننھے ننھے نکیلے کانٹوں کا ایک گچھا نگل گیا ہوں میں

شگفتگی

غم سے پُر ہے اگرچہ قلبِ حزیں کبھی ہوتا نہیں میں چیں بجبیں
اس طرح ہنس کے بات کرتا ہوں جیسے غم کو میں جانتا ہی نہیں

کیفِ برشگال

رات کا وقت ہو، گھٹائیں ہوں بھیگی بھیگی خنک فضائیں ہوں
چوٹ کھایا ہوا ہو دل اختر اور برسات کی ہوائیں ہوں

اختر انصاری بی، اے

غزل

مجھے حیرت نہیں ہے، آئینہ خانے کو حیرت ہے
کہ جلوہ پیدا کر لینا مری نظروں کی فطرت ہے

جہاں اک بار تو چمکا تھا برق زندگی بن کر
اسی پردہ سرائے دل میں پھر تیری ضرورت ہے

وہ کوئی ماورائے کفر و ایماں نذر تو مانگیں
ہمارے پاس بھی اک چیز ہے، اور وہ محبت ہے

نیازِ عشق رسمِ عام ہو کر رہ گیا آخر
انھیں اک سجدہ کرنے کی مجھے اب تک ندامت ہے

نظر آتا تو ہے اک عکس صورت خانۂ دل میں
مگر یہ کہہ نہیں سکتا کہ وہ تیری ہی صورت ہے

بقید ہوش ساز بیخودی دو دن سُنا تو کیا؟
ذرا دیوانہ ہو جاؤں تو پھر فرصت ہی فرصت ہے

بسر ہوگی لحد میں حشر تک کیونکر خدا جانے
کہ مجھ کو تو تمھارے سامنے رہنے کی عادت ہے

فضل اثر بی۔اے۔(آگرہ)

جلد (۲۹)	فہرست مضامین جون ۳۶ء	شمارہ (٦)

ملاحظات ——— ۲
ہماری قومی زبان ——— میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) ——— ۹
مغربی صحافت کے نوادر ——— ۲۸
اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام ——— ۳۳
دنیا کی عجیب و غریب لیس ——— ۳۴
غریب لڑکی ——— سید احمد بہاری ——— ۴۰
سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی چند خصوصیات ——— ڈاکٹر سید جعفری بارایٹ لا ——— ۴۵
مکتوبات نیاز ——— ۵۲
اسپتال ——— اختر انصاری بی اے (آنرز) ——— ۵٦
بات میں بات ——— ۵۸
موجودہ لاسلکی عہد کا ابو الآباء ——— ۵۹
باب الاستفسار ——— ٦۳
چینی صحافت کی ذہنیت ——— ٦۷
یہاں وہاں سے ——— ٦۸
مطبوعات موصولہ ——— ۷۱
نثر اختر — نظم اختر ——— مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی۔ اے ——— ۷۷

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۹	جون سنہ ۳۶ء	شمار ۶

ملاحظات

۱۲ر مئی سے ۳۰ر مئی تک

۱۲ر مئی ——— روانگی لکھنؤ سے
۱۴ر ۱۵ر ” ——— ڈیرہ اسماعیل خاں
۱۶-۱۷-۱۸ر ” ——— رزمک
۱۹- ۲۰ر ” ——— کوہاٹ
۲۱- ۲۲ر ” ——— پارہ چنار
۲۳-۲۴ر مئی ——— کوہاٹ
۲۵ر ” ——— بنون
۲۶-۲۷ر ” ——— ڈیرہ اسماعیل خاں
۲۸ر ” ——— روانگی ڈیرہ سے
۳۰ر ” ——— واپسی لکھنؤ

آج مئی کی ۳۱ر ہے اور بارہ بج رہے ہیں۔ گویا لکھنؤ واپس آکر پورے ۲۴ گھنٹے اطمینان و سکون کی حالت میں مجھ پر گزر چکے ہیں، لیکن باور کیجئے کہ اس وقت تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا کہ ملاحظات کی ابتدا کیونکر کروں اور کس طرح

اُن جذبات کو سمیٹ کر چند صفحات میں محدود کردوں، جن کی وسعت حقیقتاً ایک دفتر بے پایاں کی محتاج ہے۔ پھر طرفہ تماشہ یہ کہ دل کی تمنا کا وہ عالم اور اِدھر دماغ کا یہ حال کہ سرحدی زبان کے وزنی الفاظ اور تشنج آمیز لب و لہجہ کی گونج ہنوز اس کو سُن کئے ہوئے ہے اور جب قریب کی سڑک سے کوئی پرانی شکستہ حال لاری گھڑگھڑاہٹ پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ تو میں اب بھی چونک پڑتا ہوں کہ کوئی شخص پشتو تو نہیں بول رہا۔ دنیا کی ہر زبان اس میں شک نہیں مخصوص جغرافی ماحول کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں شائستگی و آراستگی پیدا ہو جاتی ہے۔

پشتو، ایک کوہستانی زبان ہے اور یقیناً اس میں کچھ نہ کچھ وہ خصوصیات پائی جانی چاہئے جو اُس کی سنگستانی ماخذ کو کسی نہ کسی حد تک ظاہر کر سکیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس زبان کے واضع کا مقصود یہ تھا ہی نہیں کہ وہ آیندہ کوئی ترقی کرے اور اسی لئے جتنے ثقیل حروف کسی زبان میں پائے جا سکتے ہیں وہ سب یکجا کر کے اُنسے ایک زبان بنالی جس کا اُصولِ فصاحت و بلاغت شاید اس سے زیادہ نہیں کہ جو لفظ جسقدر دقت و اشکال کے ساتھ ادا ہو سکے اور جس کے تلفظ کے وقت جتنی بھیانک شکل و صورت بن سکے وہ پشتو کا اتنا ہی زیادہ فصیح لفظ ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ باوجود اس اختلاف زبان کے جو شمالی ہند کے ایک انسان کیلئے اسدرجہ دماغ آزما ہے، باوصف اس اختلاف ذوق و معاشرت کے جو بلاشبہ اس طرف کے رہنے والے کیلئے بڑی حد تک گھبرا دینے والا ہے، جب کبھی مجھے سرحد جانے کا موقعہ میسر آجاتا ہے تو میں نہایت بیصبری کے ساتھ اس سے فایدہ اُٹھانا چاہتا ہوں چنانچہ اس مرتبہ بھی یہی ہوا اور بغیر اس خیال کے اس شدید گرمی میں میری کبرسنی و آرام طلبی اتنے دور دراز سفر کی متحمل کیونکر ہو سکتی ہے۔ میں نے عزیز محترم جناب اخوند فیض محمد صاحب فاروقی کے دعوت نامہ کو بغیر کسی تامل کے فوراً قبول کر لیا اور آخر کار ۱۲ مئی کو یہاں سے چل پڑا۔

میں قدرت کی طرف سے بہت تنوع پسند واقع ہوا ہوں اور جو تلون و تنوع معمولات زندگی کے لحاظ سے جتنا زیادہ غیر متوقع عسیر الحصول اور خطرناک ہوتا ہے، میری دلچسپیاں اس سے اتنی ہی زیادہ وابستہ ہو جاتی ہیں۔ میں تقریباً ہندوستان کے ہر گوشہ سے واقف ہوں، لیکن دامن ہمالیہ ہی ایک ایسی جگہ ہے، جس کے خیال سے میرے ضربات نبض میں فوراً نمایاں تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ شاید مجھے ابھی دنیا میں چند دن اور زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

وہ حضرات جنھوں نے سرحد کے قبایل اور اُن کی غیور و آزاد زندگی کا مطالعہ نہیں کیا، وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان وحشیوں میں وہ کونسی چیز ہے جس پر کوئی بڑی سی بڑی متمدن قوم رشک کر سکتی ہے اور ان کے غیر متمدن احساس کا وہ کونسا پہلو ہے جس پر مہذب و شایستہ دنیا کے ہزاروں لطیف حسیات قربان کئے جا سکتے ہیں۔

میں ۱۲ مئی کو ایک بجے لکھنؤ سے روانہ ہوا اور صبح لاہور پہونچا، گرمی شدید تھی اسلئے ارادہ یہی تھا کہ ویٹنگ روم میں دن بسر کردوں گا لیکن ایک صاحب جن سے میرے تعلقات قرابت بھی ہیں اصرار کرکے اپنے گھر لے گئے اور جوں توں تڑپ تڑپ کر دن ان کے مکان پر بسر ہوا۔ ۸ بجے شام کو پھر لاہور اسٹیشن آیا اور ۹ بجے اس گاڑی پر سوار ہوگیا جو مجھے دریا خاں تک پہونچانے والی تھی۔ ۱۴ کی صبح کو آٹھ بجے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ کندیاں جنکشن آگیا ہے جہاں مجھے گاڑی بدلنا تھی یہاں سے دریا خاں تین گھنٹے کی مسافت پر ہے اور ریل ریگستان کے اندر سے ہوکر گزرتی ہے۔ مئی کی گرمی، بادسموم کے تیز و تند جھونکے، ریگزار کی آنکھوں کو تلملا دینے والی تپش؛ بس یوں سمجھئے کہ اسوقت دنیا ایک عالم "العطش" نظر آرہی تھی اور اس ریگستان کے اندر کبھی کبھی جو اسنے کی جو سبز جھاڑیاں نظر آجاتی تھیں تو گمان ہوتا تھا کہ کہیں عربوں نے اسی چیز کو تو خضرہ سے تعبیر نہیں کیا۔

گیارہ بجے خدا خدا کرکے دریا خاں اسٹیشن کی صورت نظر آئی جہاں اخوند صاحب معہ اپنے دونوں صاحبزادوں سردار احمد نواز خاں صاحب (خان بہادر سردار محمد نواز خانصاحب کے صاحبزادے) اور شاہزادہ فضل داد خانصاحب (خان بہادر صاحب کے بھانجے) کے موجود تھے۔ خان بہادر صاحب اسوقت اپنے وطن ڈیرہ اسماعیل خاں سے بہت دور اپنی جاگیر ملازمت پر قبایل کے بعض اُلجھے ہوئے مسایل سلجھانے میں مصروف تھے ــــــــــــــ دریا خاں اسٹیشن اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے درمیان دریائے سندھ حایل ہے جس کا عرض یہاں ۱۲ میل ہوگیا ہے۔ آج کل چونکہ دریا خشک ہے اس لئے بحالت موجودہ اسے صرف ریگستان کہنا چاہئے یا بقول غالب۔ بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔ جابجا مختلف دھاروں پر کشتیوں کے پُل بنے ہوئے ہیں جن سے گزرنے کے لئے ہر موٹر کو دو روپیہ ٹول؟ ادا کرنا پڑتی ہے۔

خان بہادر صاحب نے میران شاہ سے جو اُن کا مستقر ہے اور ڈیرہ سے تقریباً ایک سو میل دور ہے، اپنا موٹر بھیج دیا تھا۔ اسی پر میں دریا خاں سے ڈیرہ اسماعیل خاں پہونچا اور انھیں کی کوٹھی پر قیام کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لنچ پر یہاں کے بعض اکابر سے بھی ملاقات ہوئی جن میں ڈاکٹر عبدالرحیم خاں صاحب ام۔ اے۔ پی۔ اچ۔ ڈی، چودھری خلیل الرحمٰن صاحب بی، اے ال ال بی، خان مصطفیٰ نواز خانصاحب بی، اے۔ ال ال بی، اور میرے قدیم کرمفرما سردار احمد خانصاحب سابق سول جج پشاور جن کے مہمان ہونے کا شرف مجھے پشاور میں ایکبار حاصل ہوچکا ہے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بہت ذہین اور وسیع المطالعہ انسان ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کو اپنے اکتسابات علمیہ پر اتنا ناز نہیں ہے جتنا اس عدم اکتساب پر کہ وہ اُردو سے نابلد ہیں، مادری زبان بولنے پر غالباً اس لئے مجبور رہیں کہ ڈیرہ میں یا خود ان کے گھر کے اندر "روح القدس" کہاں میسر آسکتے ہیں جو باوجود "ہمزبان" نہ ہونے کے ان کے "کلام کی داد" دے سکیں۔

چودھری صاحب حد درجہ کھُلے ڈُلے انسان ہیں اور اس خصوص میں غالباً وہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے اندر

اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میرے کانوں میں یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ نوابؔ وہ احمدی عقاید کی طرف مایل ہیں، لیکن دوسرے عام احمدی افراد کی طرح انھوں نے تبلیغ "احمدیت" کی کوشش نہیں کی اور مجھے اس ابتلا و آزمایش سے بچا لیا کہ میں اپنے ایک مخلص دوست کا دل دکھانے پر مجبور ہوتا۔ خان مصطفیٰ نواز خانصاحب یہاں کے کامیاب نوجوان وکلا میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پیشہ میں چونکہ فطرت انسانی کا ہمیشہ تاریک پہلو سامنے رہتا ہے اس لئے انسان کا احساس لطیف رفتہ رفتہ مردہ ہو جاتا ہے، لیکن مصطفیٰ نواز خانصاحب کی پاکیزگی ذوق و خیال کی طرف سے میں مطمئن ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر کسی وقت ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کے اختیار کرنے کا سوال پیدا ہوا تو وہ اپنے ذوق کی قربانی کبھی گوارا نہ کریں گے۔

سردار احمد خانصاحب کو البتہ میں نے عجیب رنگ میں پایا۔ وہ آجکل روحانیات کی علمی و عملی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور فلسفۂ اہمسا، یوگ یا ویدانت میں سے کوئی ایسی چیز اخذ کرنا چاہتے ہیں، جو دوسروں کو زیادہ اور اپنے آپ کو بہت کم یا بالکل متاثر نہ کر سکے۔ امن و سکون کی جستجو ان کو بھی ہے، مجھے بھی ہے اور دنیا میں وہ کون ہے جو اس کا طلبگار نہیں، لیکن میرے اُن کے زاویۂ نگاہ میں بڑا فرق ہے وہ اس کو پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا قرار دیتے ہیں اور میں اس کو اس انتہائی جد و جہد سے تعبیر کرتا ہوں جو آخر میں پاؤں توڑ کر بٹھا دے۔ اس میں شک نہیں کہ سردار احمد خانصاحب نہایت ذہین شخص ہیں اور وہ دنیا میں ہر انقلاب انگیز کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، لیکن عام طور پر ایسے ذہین افراد میں جو عیب پایا جاتا ہے وہ ان میں بھی ہے۔ ایک غیر معمولی طباع انسان غیر معمولی طور پر عجلت پسند اور مضطرب الخیال واقع ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ جلد تھک کر مایوس ہو جانے والا۔ ایسے طبائع بالکل برق صفت ہوا کرتے ہیں کہ اگر بجلی کسی پر گری تو اسی لمحہ میں دوسرے کو تباہ کر گئی، ورنہ آن کی آن میں خود فنا ہو گئی۔ چونکہ بعض مخصوص حالات کے ماتحت ہمارے سردار صاحب کی عالمانہ ذہنیت نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی اس لئے وہ اب صرف خیال کی دنیا سے لطف اُٹھانا پسند کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ایک زمانہ ہوا بیدلؔ اس کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کر گیا ہے۔

بیدل من و بیکاری و معشوق تراشی
جُز شوق برہمن صنمے نیست درانیجا

دوسرے دن صبح کو جناب ملک خدا بخش صاحب بی۔ اے ال ال بی جو یہاں کے نہایت کامیاب وکیل ہیں اور لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی، مجھ سے ملنے تشریف لائے اور شام کی چاء پر مدعو فرمایا۔ ملک صاحب ان چند منتخب افراد میں سے ہیں جنھیں صوبۂ سرحد کی قومی زندگی کا سرچشمۂ حیات کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ آپ کا سب سے آخری یادگار کارنامہ سرحد میں شریعت بل کا پاس ہونا ہے۔ اسوقت تک یہاں تقسیم ترکہ بالکل رسم و رواج کے ماتحت عمل میں آتی تھی اور لڑکیاں بالعموم محروم الارث رہتی تھیں، لیکن اب اُن کی سعی و کوشش سے یہ لعنت صوبۂ سرحد کی دور ہو چکی ہے اور شریعت اسلام کے مطابق تقسیم جایداد کا مسئلہ قانونی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ملک صاحب نہایت سنجیدہ، خوش مزاج، خوش فکر اور صحیح الدماغ انسان ہیں۔ مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ یہاں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو بالکل ذاتی اغراض کی بنا پر اُن کی مخالف ہے، لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں، ہر وہ شخص جو قایدانہ صلاحیت رکھتا ہے، محسود بھی ہوا کرتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو حقیقت یہ ہے کہ کام کرنے کا کوئی لطف بھی نہیں ہے۔ شام کو چاء پر انھوں نے علاوہ طبقۂ وکلاء کے ڈیرۂ اسماعیل خاں کے اکثر معزز افراد کو مدعو کیا تھا جن میں خانصاحب محمد صفدر صاحب اسسٹنٹ کمشنر ڈیرۂ اسماعیل خاں، ڈاکٹر عبد الرحیم صاحب ام۔ اے۔ پی ایچ ڈی، جناب عبد الحمید صاحب سپرنٹنڈنٹ تار و ٹیلیفون خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اس صحبت میں مجھے جناب عبد الحمید صاحب سے زیادہ گفتگو کا موقعہ ملا اور اُنکے خیالات سے کافی لطف اندوز ہوا۔

اسی دن شب کو میرے میزبان خصوصی (جناب خان بہادر سردار محمد نواز خانصاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور اسسٹنٹ پولٹکل افیسر میران شاہ ایجنسی) کے دولتکدہ پر ایک پرتکلف و وسیع ڈنر دیا گیا اور اس طرح بیک وقت مجھے ان تمام افراد سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی جنھیں اس ضلع کا دل و دماغ کہنا مناسب ہوگا۔ چونکہ خان بہادر سردار محمد نواز خانصاحب کے طیار کردہ پروگرام کے مطابق مجھے ۱۶ کو رزمک پہونچ جانا چاہئے تھا اور سفر بھی سو میل سے زاید کا تھا اس لئے ٹھیک ۶ بجے صبح کو اخوند صاحب کے ساتھ موٹر پر سوار ہوکر روانہ ہوگیا۔ راستہ میں جن قابل ذکر مقامات سے گزر ہوا وہ ٹانک، منزئی اور جنڈولہ ہیں، یہ سب انگریزی چھاؤنیاں ہیں جو آزاد سرحدی قبایل کے سرفروشانہ جذبہ کی مقاومت کے لئے قایم کی گئی ہیں۔ ڈیرہ سے تقریباً تیس میل آگے چلکر ٹانک پر برطانوی علاقہ ختم ہوجاتا ہے اور محسودوں کی سرزمین شروع ہوجاتی ہے جو رزمک تک وسیع ہے۔۔۔ یوں تو محسودوں کے جنگجویانہ خصایل سے اہل ہند ایک حد تک واقف ہیں کیونکہ کبھی کبھی جراید میں ان کی شورش اور برطانوی افواج کے اضطراب کے افسانے نظر آتے رہتے ہیں، لیکن جب تک کوئی شخص خود یہاں آکر "قضیۂ زمین برسر زمین" سمجھنے کی کوشش نہ کرے نہ وہ یہاں کی سیاسیات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس حقیقت کو کہ برطانیہ ایسی صاحب اقتدار حکومت اس وقت تک قبایل کو زیر کرنا نہیں چاہتی یا کر ہی نہیں سکی۔ اس سلسلہ میں غالباً یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اب سے دس بارہ سال جب محسودوں اور وزیریوں میں باہدگر خونریزی کا بازار گرم تھا اور بدامنی اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ محسودی جماعتیں انگریزی علاقہ میں بھی تاخت سے باز نہ آتی تھیں، تو حکومت برطانیہ کے لئے لازم ہوگیا کہ ٹانک سے آگے بڑھکر محسودوں کے علاقہ میں چھاؤنیاں قایم کرے تاکہ وزیریوں اور محسودوں کی یہ باہمی جنگ اور اسی کے ساتھ انگریزی علاقہ میں ان کی تاخت و تاراج کسی طرح ختم ہو۔ اس اقدام کے لئے ضروری تھا کہ ٹانک سے آگے سڑک بڑھائی جائے اور کسی ایسے مقام پر چھاؤنی قایم کی جائے جو وزیریوں اور محسودوں کے درمیان حد فاصل کا کام دے، اس کے لئے رزمک کا مقام تجویز کیا گیا جو ایک پہاڑی نالہ کے کنارے واقع ہے۔ لیکن سرحدی قبایل کی زمینوں سے صرف ایک سڑک لیجانے کے لئے جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف سو میل کی سڑک طیار کرنے میں کامل ۶ سال تک انگریزوں کو محسودوں سے جنگ کرنا پڑی اور لاکھوں روپیہ کا گولہ بارود صرف کرنے اور ہزاروں جانوں کی قربانی چڑھانے کے بعد وہ بمشکل تمام سنہ ۲۲ یا سنہ ۲۳ء میں کامیابی حاصل کرسکے۔

اب اس وقت رزمک سرحد کی نہایت زبردست چھاؤنی ہے جہاں دو بریگیڈ ہر وقت موجود رہتے ہیں اور تقریباً ۱۸ ہزار نفوس پر مشتمل ایک نہایت صاف ستھرا قصبہ ہے جو موسم کے لحاظ سے بالکل کشمیر کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ ہم جس وقت ڈیرہ اسماعیل خاں سے روانہ ہوئے تو صبح ۶ بجے کا وقت تھا اور گرمی کافی تھی لیکن جب دس بجے رزمک پہونچے تو دنیا بالکل بدلی ہوئی تھی، آدمی نئے، زبان نئی، آبادی کی صورت نئی، موسم نیا اور سوائے ایک خان بہادر سردار محمد نواز خانصاحب کے ہر شخص میرے لئے نیا تھا۔ رزمک بالکل عسکری آبادی ہے اور چونکہ یہ وزیریوں اور محسودوں کے درمیان حد فاصل کی صورت سے واقع ہے اس لئے ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں کس وقت ان کی تاخت شروع ہوجائے اور اسی لئے یہاں نہ بغیر پاسپورٹ کے کوئی داخل ہوسکتا ہے اور نہ کوئی شخص بیوی بچوں کو ساتھ رکھ سکتا ہے۔ آبادی کے چاروں طرف خاردار تار کھنچا ہوا ہے اور شام کو ۶ بجے تمام دروازے جن پر گوروں کا مسلح پہرہ رہتا ہے صبح ۶ بجے تک کے لئے بند ہوجاتے ہیں۔۔۔ یہ مقام ایک شاداب وادی میں واقع ہے لیکن خود اس کی بلندی چونکہ تقریباً ۶ ہزار فٹ ہے اس لئے موسم نہایت لطیف و خنک ہے۔ بارش بھی اکثر ہوتی رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں ہر شخص پر ہر وقت ایک خواب آور نشہ کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے حتے کہ اس وادی کے اصل باشندوں کے متعلق بھی یہی سنا گیا ہے کہ وہ سوتے بہت ہیں۔ اس وادی النوم میں ہمارا قیام تین دن رہا اور پوری کوشش کے ساتھ سو سو کر ان تمام بیداریوں کا انتقام لیا گیا جن سے

اس سے قبل اس موسم گرما میں ہم کو دوچار ہونا پڑا تھا ۔۔۔ رزمک جس وادی میں واقع ہے وہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں بڑے بڑے چار شہر آباد ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ کسی وقت رزمک ایک وسیع آبادی کی صورت اختیار کرے۔ لیکن فی الحال یہاں کے نشیب و فراز میں ہر چہار طرف صرف وزیری قبایل کے گاؤں نظر آتے ہیں جن کے مکانوں کے برج و مینار گویا ہر وقت اُس حزم و احتیاط کا اعلان کرتے رہتے ہیں جو ان لوگوں کو اپنے فریق کے مقابلہ میں اختیار کرنا پڑتی ہے ۔۔۔ خان بہادر صاحب مجھے ایک وزیری گاؤں میں بھی لے گئے اور مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ چند سال کے اندر ہی ان میں اس تمدن کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے ہیں جس کا تعلق زیادہ تر تعیش و آرام طلبی سے ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح لکھنؤ میں شریر بچوں کو سنجیدہ بنانے کے لئے افیون کھلائی جاتی ہے، اسی طرح وحشی قبایل کی جنگجویانہ فطرت کو مٹانے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ انھیں آرام و سکون عیش و راحت کا عادی بنا دیا جائے۔ اسوقت لاکھوں روپیہ قبایل کو صرف اس لئے تقسیم کیا جاتا ہے کہ خون بہا کر روپیہ کمانے کی عادت وہ محو کر بیٹھیں اور آہستہ آہستہ اُن میں وہ جراثیم پیدا ہو جائیں جو جذبۂ حماست و خودداری کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ حکومت برطانیہ یہاں امن و سکون پیدا کرنا چاہتی ہے لیکن وہ امن و سکون حقیقتاً موت کا امن و سکون ہے اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ قبایل میں تمدن و تہذیب کا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اپنی غیرت و حمیت کو کھونے کے بعد۔ قربانیاں دونوں طرف سے ہو رہی ہیں لیکن ایک روپیہ دیکر انسانیت لیتا ہے اور دوسرا انسانیت کھو کر روپیہ حاصل کرتا ہے ۔۔۔ رزمک کے دوران قیام جن حضرات سے ملاقات ہوئی اور جن کے الطاف و عنایات کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر فرض ہے ان میں سے ایک مخصوص ہستی خان محمد اسلم خاں پولٹکل تحصیلدار کی ہے اور دوسری ٹرنری آفیسر صاحب کی جو باوجود نہایت سُرخ و سفید رنگ رکھنے کے کالے خاں کے نام سے موسوم ہیں۔

۱۹ر کی صبح کو میں رزمک سے روانہ ہوا اور میران شاہ میں ایک گھنٹہ قیام کرنے کے بعد سیدھا بنوں ہوتا ہوا کوہاٹ ایک بجے دن کو پہونچ گیا۔ یہ سفر بھی سو میل سے زاید کا تھا۔ رزمک چھوڑنے کے بعد گرم موسم کی تابناکیاں سخت ناگوار تھیں، لیکن بہر حال ان کو جھیلنا تھا سو جھیلیں۔ خان بہادر صاحب نے پہلے ہی کوہاٹ تار بھیجکر میرے قیام کا انتظام جناب پیر کمال شاہ صاحب جیلانی کے دولتکدہ پر کر دیا تھا۔ اول اول تو میں اس نام اور اس نسبت درویشی کو سُنکر بہت گھبرایا کہ "اُس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے"۔ لیکن جب نگاہیں چار ہوئیں تو معلوم ہوا کہ یہ تو عراقی کے "خاصگانِ الٰہی" سے تعلق رکھتے ہیں۔ پیر صاحب کا خاندان نہ صرف کوہاٹ بلکہ تمام صوبۂ سرحد میں خاص دینی عزت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور جاہ و ثروت کے لحاظ سے بھی اک نمایاں امتیاز اسے حاصل ہے اس میں شک نہیں کہ اس خانوادۂ علم و تصوف کی شہرت کا سبب وہی سلسلۂ ارادت و بیعت تھا جس کے اثرات نہ صرف یہاں ہندوستان کے ہر گوشہ میں پائے جاتے ہیں، لیکن اب پیر کمال صاحب اور اُن کے برادر معظم جناب پیر جمال صاحب نے (جو پنشنر ڈپٹی کلکٹر ہیں اور نہایت ہی نیک نفس بزرگ ہیں) پیری مریدی کا سلسلہ بالکل بند کر دیا ہے اور اُن کی اس دینی سیادت نے قومی و وطنی قیادت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

۲۱ر کی صبح کو ہم لوگ (پیر صاحب موصوف کی سرکردگی میں) پارہ چنار کی طرف روانہ ہوئے جو قرم ایجنسی کی جان ہے۔ یہ سفر بھی سو میل سے زیادہ کا تھا اس راستہ میں سب سے پہلے ہنگو ملتا ہے اس کے بعد ٹل جس پر امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں نادر خاں نے بہ حیثیت سپہ سالار کابل، قبضہ کر لیا تھا۔ دس بجے ہم لوگ پارہ چنار پہونچ گئے جہاں کا موسم رزمک سے زیادہ خوشگوار و خنک ہے اور شیر افضل خانصاحب اسسٹنٹ پولٹکل آفیسر کے مکان پر قیام کیا۔ پارہ چنار بالکل کرمنفید

دامن میں واقع ہے جہاں سے صبح و شام برف پوش چوٹیوں کا نظارہ عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس ایجنسی میں زیادہ تر آبادی شیعوں کی ہے اور جتنے شاداب حصے اس وادی میں نظر آتے ہیں وہ سب شیعوں کے قبضہ میں ہیں۔ کوہاٹ سے چلکر ۹ میل کے بعد ان کی آبادی شروع ہوکر ۲۶ ویں میل پر ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد ۴۵ ویں میل سے پارہ چنار بلکہ آٹھ دس میل اور آگے تک شیعہ آباد ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں چند سال اس طرف سنی و شیعہ قبایل میں سخت خونریز جنگ ہوئی تھی اور شیعہ قبایل کو سنی قبایل نے نکال باہر کیا تھا۔ حکومت ہند چونکہ شیعہ قبایل کی طرفدار تھی اس لئے اس نے بہت کوشش کی کہ سنی قبایل شیعوں کو پھر ان کی زمینیں واپس دیدیں لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئی آخرکار ہمارے میزبان خصوصی خان بہادر سردار محمد نواز خانصاحب کو مامور کیا گیا اور انھوں نے انتہائی سعی و کاوش کے بعد اس مسئلہ کو حکومت ہند کی مرضی کے مطابق طے کرا دیا۔

اس جوار میں ایک مثل مشہور ہے:۔ سنگ ملانا۔ آب زیراں۔ برنج کرماں و دختر شلوزاں۔ چنانچہ ہم لوگ ۲۲ کی صبح شلوزان گئے جو پارہ چنار سے ۸ میل آگے واقع ہے اور اس میں شک نہیں کہ اپنی تازگی و شادابی کے لحاظ سے عجیب و غریب جگہ ہے۔ چنار کے درختوں کی فراوانی اور ان کے خنک سائے، جیبہ جیبہ پر برفانی چشموں کی کثرت اور ان کی مترنم روانی یوں سمجھ لیجئے کہ ایک قطعۂ فردوس تھا جس میں غلمان تو ہم کو بہت نظر آئے لیکن حوریں "مقصورات فی الخیام" ہونے کی وجہ سے خال ہی خال دکھائی دیں۔ یہاں سے ہم پیواڑ بھی گئے جو بالکل کوہ سفید کے نیچے واقع ہے اور جہاں سے کابل صرف ۸۰ میل رہجاتا ہے۔ اس کے بعد خرلاچی پہونچے جہاں ایک طرف حکومت برطانیہ کی چوکی ہے اور دوسری طرف کابل کی، گویا یہاں سے افغانستان کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

۲۳ کو پھر کوہاٹ واپس آئے اور ۲۵ کا دن وزیرزادہ لطف اللہ خانصاحب رئیس بنوں کے مکان پر بسر کرکے ۲۶ کو پھر ڈیرہ اسماعیل خاں واپس آگئے۔ یہاں دو دن قیام کرنے کے بعد ۲۸ کی دوپہر کو جب ڈیرہ اسماعیل خاں میں پارہ ۱۱۹ ڈگری تک پہونچا ہوا تھا لوہ کے طمانچے کھاتا ہوا، موٹر میں سوار ہوا اور اس تمازت آفتاب میں دریائے سندھ کا تیرہ میل کا ریگستان طے کرکے دو بجے درباخاں اسٹیشن پہونچا۔ اور وہاں سے روانہ ہوکر ۳۰ کو ۱۲ بجے لکھنؤ آگیا۔ اس سفر میں جتنی تکلیف گرمی کی میں نے محسوس کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت میں لکھنؤ سے چلا تو میرا وزن دو من دو سیر تھا اور واپس آیا تو ایک من ۳۸ سیر رہگیا تھا۔ ہرچند میں اب سرحد سے بہت دور لکھنؤ میں ہوں لیکن دل و دماغ دونوں احباب سرحد کے نقوش محبت و خلوص سے مالامال ہیں اور مطلق میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا اعتراف کن الفاظ میں ممکن ہے۔ اخوند فیض محمد صاحب ذاتی کا اپنے تمام مشاغل ترک کرکے کامل پندرہ شب و روز تک میری معیت میں صرف کر دینا اتنا بڑا بار کرم ہے کہ میں کبھی اس سے گردن اٹھا ہی نہیں سکتا۔ رہگئے خان بہادر سردار محمد نواز خانصاحب جن کا مکان، جن کا موٹر، جن کے ملازم اور جن کی ہر ہر چیز میری آسایش کے لئے وقف تھی، سو ان کا ذکر ہی فضول ہے کیونکہ ایک میں ہی نہیں بلکہ خود صوبۂ سرحد کا ہر ہر شخص بلا تشبیہ ان کے "فرشتۂ رحمت" ہونے پر ایمان لائے ہوئے ہے۔

ہماری قومی زبان

اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ہمارے ملک کی کوئی قومی زبان ہے یا ہوسکتی ہے تو وہ اُردو ہے۔ مدتوں سے واقعات کا گویا فطری طور پر یہ میلان رہا کہ اُردو اس ملک کی قومی زبان بنے، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کچھ مدت سے یہ بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ ملک کی قومی زبان کونسی ہو اور واقعات کو گویا مصنوعی طور پر اس طرح ڈھالا جا رہا ہے کہ اُردو سے اُس کا رتبہ چھین کر کسی دوسری زبان کو دے دیا جائے بلکہ ہوسکے تو بتدریج اُردو کو مٹانے اور ملیامیٹ کرنے کی تدبیریں عمل میں لائی جائیں ہندوستان کی جماعتوں میں جو قسم قسم کے اختلافات ہیں معلوم ہوتا ہے وہ کافی نہ تھے کہ وہاں یہ ایک اور نیا شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا ہے تاکہ قومی اتحاد اگر ممکن تھا بھی تو اُسے ناممکن بنانے کی ایک اور صورت پیدا ہو جائے۔

جو ہندو اس ملک کو آریا ورت بنانا چاہتے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی موجودگی سے "پوتر" نہیں رہا جو صرف بھیم اور ارجن، کورو اور پانڈو کے قصے سنسکرت اور سنسکرت نما ہندی بھاشا میں سُننا سُنانا چاہتے ہیں اور جو مسلمان اس ملک کو عربستان کی محض ایک زرخیز وادی تصور کرتے ہیں اور جو صرف مہلہل اور ابوالعتاہیہ اور نظامی، اور نظیری کے عربی و فارسی اشعار ہی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں وہ نہ صرف ہندوستان کا بھلا نہیں چاہتے بلکہ وہ آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ اُردو صحیح ہندو مسلم مفاہمت کی ایک بولتی چالتی تصویر ہے جسے دونوں فریق اپنے دل میں رکھ سکتے ہیں کہ "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی"۔ اکبر مرحوم کی آواز ہر نیک نیت ہندو مسلمان کے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے کہ

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں   اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرُ القیس بنیں   پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

اُردو کوئی مسلمانوں کی زبان نہ تھی۔ مسلمان جب پہلے پہل ہندوستان میں آئے تو اُن کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ہندو مسلمانوں کا میل جول شروع ہوا تو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں میں عربی فارسی کے الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے اور اس سلسلہ میں اُردو

وجود میں آئی۔ جہاں جہاں مسلمان گئے انھوں نے بالعموم فارسی کو درباری اور دفتری زبان قرار دیا لیکن جوں جوں یہاں کے باشندوں سے اُن کے تعلقات بڑھے انھوں نے روزمرہ کے استعمال کیلئے ایک ایسی زبان اختیار کی جس کی بنیاد ہندوانی اور جس کی باقی ساخت کچھ ہندوانی اور کچھ مسلمانی تھی، اس زبان کا رسم خط فارسی تھا لیکن اس کے قواعد اور اس کے لفظوں کا بیشتر ذخیرہ ہندوستان کی پیداوار تھی سلیم مرحوم کے لفظوں میں گویا یہ نہ ہندو زبان تھی نہ مسلمان زبان بلکہ ایک ہندلمان یعنی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی اور ہندلمانیت کا سب سے بڑا مظاہرہ۔ اُردو مسلمان حکمرانوں کی رواداری کی ایک روشن مثال ہے اور اُردو ہی ہے جس کی فطری بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کی شاندار عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے اکثر ملکی بھائی اس حقیقت سے روز بروز دور ہوئے جا رہے ہیں اور اُس زبان سے جس سے انھیں اور ہمیں فطری طور پر لگاؤ ہونا چاہئے مصنوعی طور پر بیگانگی برت رہے ہیں۔ ہر سچے محبِ وطن کے لئے یہ امر انتہائی تاسف اور رنج کا باعث ہے۔

ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اُردو کو چھوڑ کر جوق درجوق ہندی بھاشا کے حلقے میں داخل ہو رہی ہے، مسلمان اس کے جواب میں یہ کر سکتے تھے کہ وہ پھر اپنی تمدنی زبان فارسی کی طرف منھ پھیر لیتے لیکن ایسا کرنا ایک خلافِ فطرت مصنوعی فعل ہوتا۔ وہ بدستور اُردو کے حامی رہے اور رہیں گے۔ اگر بعض ہندوؤں کو اس سے انکار ہے کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے تو مسلمان ایک طرف اس بات پر اصرار کریں گے کہ اُردو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زبان ضرور ہے اور دوسری طرف اس زبان کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھیں گے تاکہ ہندو جب چاہیں بلا اجازت بخوشی پھر اس کے حلقے میں آشامل ہوں اور مدت کے بچھڑے ہوئے پھر مل جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے ہندوستانیوں کی ایک مضبوط اور منظم قوم پیدا ہو۔ اس قومیت میں ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب کے اجزا شامل ہوں بلکہ حال کی مغربی تہذیب کا بھی ایک جزو ضروری حد تک اُس میں موجود ہو لیکن اگر ہمارے ملکی بھائی ہمیں ہمارا مناسب حصہ دینے پر راضی نہ ہوں یا اُن کی اکثریت ہماری تہذیب کی روایات کو محض اجنبی سمجھ کر ملک بدر کرنا چاہے تو بدقسمتی سے ہمیں اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم تصور کرنا پڑے گا جس کا مذہب جُدا بعض روایات جدا اور زبان بھی ایک حد تک جدا ہوگی۔ خدا کرے یہ جدائی تھوڑے عرصے کے لئے ہو۔ خدا کرے جلد ہی ہم اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اور وہ ایک دوسرے کے پڑوسی اور بھائی بھائی ہیں ہم ایک ہی سرزمین کے رہنے والے اور ایک ہی میٹھی سی بولی بولنے والے ہیں[1]۔

---

[1] اس کے بعد فاضل مقرر نے اُردو کی ابتدا اور اُس کی مختصر تاریخ بیان کی ہے جس کو ہم نے حذف کر دیا ہے۔ (اڈیٹر)

اُردو ادب کے جدید دور میں پہلے ہیں اُنیسویں صدی کے چار بڑے ادارے کام کرتے نظر آتے ہیں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج، سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، اورنٹیل کالج لاہور، ترجمہ و تالیف کا کام شروع ہوا، علمی اصطلاحات وضع ہونی شروع ہوئیں، سنجیدہ مضامین لکھے جانے لگے۔ زبان میں سلاست اور روانی کے اوصاف پیدا ہوئے۔ سرسید احمد خاں کی علیگڑھ تحریک اور تعلیمی ادارے نے ادب میں عمل کی رو پیدا کی اور گو ان مختلف کام کرنے والے اداروں میں باہمی ربط نہ تھا ان کی مسلسل کوششوں سے اُردو میں مغرب کے علوم جدیدہ کی ترویج کے لئے رستہ صاف ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی آزاد کی تحریک پر پنجاب میں ایک نئی ادبی زندگی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اُدھر انجمن ترقیٔ اُردو، جامعۂ عثمانیہ وغیرہ کے شاندار ادارے رونما ہوئے۔ اخبارات و رسائل کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا جس سے بہت سا مفید اور غیر مفید مواد جمع ہوگیا۔ اس کے علاوہ جا بجا مصنفوں مترجموں اور شاعروں نے اپنی سرگرمی کے جوہر دکھائے۔ انجمنیں، مشاعرے، سبھائیں قایم ہوئیں، بنیں بگڑیں ٹوٹیں، بہت سی کہنے کو زندہ کچھ واقعی سرگرم، مختلف اطراف میں مختلف قسم کے لوگوں نے کام کیا۔ دہلی لکھنؤ لاہور، حیدر آباد اور کئی اور مقامات میں بعض جگہ گرمجوشی اور بعض جگہ خاموشی سے کام ہوا۔

غیر ملکی حکمرانوں نے اُردو کی عام سرپرستی کی۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، اورنٹیل کالج اسی طرح ظہور میں آئے۔ اُردو بہت سے صوبوں کی عدالتی زبان قرار پائی۔ عیسائی پادریوں نے بھی اسی کے ذریعہ سے اپنی مذہبی تعلیم کی اشاعت کی۔

ہندوؤں نے بھی اسے اپنی زبان سمجھ کر اس کی نشر و اشاعت میں دریا دلی سے حصہ لیا۔ نول کشور پریس نے جو کام کیا وہ ظاہر ہے۔ دیاشنکر نسیم، سرشار، پیارے لال، سرور، سری رام، چکبست، پریم چند وغیرہ اور معاصروں میں سرسپرو، دیا نرائن نگم، کیفی اور کئی اور قابلِ احترام بزرگ ہیں۔

اُردو نہ کسی خاص قوم کی میراث تھی نہ کسی خاص شہر کی پیداوار۔ مقابلہ فضول ہے، رقابت بے معنے ہے، دعوے لاحاصل ہیں، اسے کسی طرح سے بھی محدود کر دینا غلطی ہے اس سے روگردانی کم فہمی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی قدامت پسند جدت طراز صوبے شہر یہ ہر قوم اور ہر سمت کی زبان ہے اور اگر نہیں ہے تو یہی ہے جو ہمہ گیر بنائی جا سکتی ہے۔

دو باتیں اُردو ادب کی تاریخ کے ضمن میں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ہمارے ملک کے دورِ انحطاط کی پیداوار ہے اسی لئے اس میں یاس و حرماں اور غفلت اور فرسودگی کے آثار جا بجا پائے جاتے ہیں۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اُردو ادب ہماری پس ماندہ قوم کے زوال کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ شاید یہی اک قوت تھی

جس کے بل پر وہ زندہ رہی۔ اک بیمار نادار ہستی اپنی فصاحت اور مبالغے اور حسن پرستی میں سرشار غنیمت تھا جو کچھ کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُردو ادب بغیر کسی منظم کوشش کے خود بخود ترقی پا گیا۔ جو کچھ بھی ہوا ل کر سوچے سمجھے بغیر ہوا۔ زبان میں اک فطری حسن تھا، لوگوں میں ابھی سیاسی جوڑ توڑ کا مرض نہ تھا، یہ اُن کی طرف بڑھتی چلی آئی وہ اس کی طرف کھچے چلے گئے، بُری بھلی باتیں پیدا ہوئیں، کچھ باقی رہنے کے لئے کچھ جلد فنا ہوجانے کے لئے کسی نے نہ دیکھا کہاں کیا ہو رہا ہے کسی نے نہ پوچھا کیوں ہو رہا ہے؟

لیکن اب حالات اور ہیں، اب زمانے کا انداز کچھ اور ہے، اب اگر ہم اپنے خیالات میں انقلاب پیدا نہ کریں گے تو مٹ جائیں گے، پس جائیں گے، نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اب ترتیب و تنظیم کا زمانہ ہے۔ معاشی دنیا میں، سیاسی دنیا میں، ہر طرف منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ laissez faire یعنی چیزوں کو اور واقعات کو اپنے حال پر چھوڑ دینا اور فطرت کو خود بخود کام کرنے دینا یہ خیال اب فرسودہ ہوچکا ہے۔ اب واقعات کو کسی خاص تصور یا نصب العین کے ماتحت ڈھالا جاتا ہے اب واقعہ ہو نہیں جاتا اب اُسے "بنایا" جاتا ہے وہ محض وقوع میں نہیں آتا بلکہ اُسے وضع کیا جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے کہ کہاں تک حقیقت میں ایسا ہوتا ہے یا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ آج کل کی دنیا میں یہ خیال اکثر لوگوں کے نزدیک یقین کی حد تک پہونچ چکا ہے کہ منصوبے سے، ایک خاص نصب العین کے سامنے رکھنے اور ایک خاص مقررہ پروگرام پر عمل کرنے سے جس طرح جو چاہیں ہم کر سکتے ہیں، ان تدبیروں سے ہم تقدیر کو پلٹ سکتے ہیں، ہمارے قومی شاعر نے کیا نہیں کہا؛

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

یہی عام حالت ہماری قوم کی ہے یہی ہماری زبان کی، زندگی کے ہر شعبے میں ہمیں تنظیم کی ضرورت ہے، پہلے سے سوچنے کی ایک مخصوص راہِ عمل بنانے کی اور پھر مل کر اُس پر چلنے کی ضرورت ہے۔ برسوں سے ہمارے رہنما یہ آواز بلند کر رہے ہیں، اُدھر عوام ہیں کہ پہلے سے اب عمل پر زیادہ آمادہ نظر آتے ہیں۔ ضرورت کسی ایسی زبردست شخصیت کی ہے جو اُدھر رہنماؤں کے حسد اور خودغرضی کو اور ادھر عوام کی قدامت پسندی اور سہل انکاری کو اپنی حیات انگیز تحریک سے تعاون اور گرمجوشی میں تبدیل کر دے۔ کیا ایسا ہوگا؟

دوسروں کو دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں؟ مقررہ طے شدہ باتوں کو وہ تہ و بالا کر رہے ہیں اور ایک نئی تعمیر کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔ زبان کے شعبے کو لو۔ تیس چالیس سال ہوئے اُردو کے مقابل میں ہندی کا نام بہت کم سننے میں آتا تھا۔ بنگالی، گجراتی، سندھی کی طرح ایک زبان یہ بھی تھی کہ ایک مخصوص گروہ کی زبان تھی۔ الوی جی نے ایک منصوبہ تیار کیا جس کے ماتحت اُن ہندوؤں کو جو اُردو لکھتے پڑھتے تھے اُردو کو چھوڑ کر ہندی لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی۔ اُنھیں بتایا کہ وہ ہندو ہیں تو اُنھیں صرف ہندوستان کی

اپنی، دیسی چیزوں کو اختیار کرنا چاہئے، قدیم ہندوانی تہذیب ہندی زبان، ہندی رسم خط ہی صحیح ہندویت اور یہی صحیح حب الوطنی ہے۔ یہ وہ بھول گئے کہ قدیم ہند کی طرف رجوع کرنے میں وہ پورے ایک ہزار سال اور کم از کم آٹھ دس کروڑ مسلمانوں، عیسائیوں پارسیوں وغیرہ پر سے گویا پھاند رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں کہ یہ لوگ کبھی یہاں آئے ہی نہ تھے، صدیوں سے ہندوؤں کے ہم وطن اور ہمسائے نہیں رہے، یہ نہ تھے اور نہ ہیں۔ اگر یہ طرز خیال درست ہے تو پھر یہ طرز خیال بھی درست ہے کہ ہندو زیادہ تر وہ آریائی نسل والے لوگ ہیں جو باہر سے آکر ہندوستان پر قابض ہو گئے ہندوستان ان کا ملک نہ تھا بلکہ اُن بھیلوں گونڈوں کا وطن تھا جن کو انھوں نے پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف مار بھگایا یا اُن دراوڑی قوموں کا وطن تھا جن کو انھوں نے جنوب کی طرف ڈھکیل دیا جن کی زبانیں تامل، تلیگو، ملیالم آریائی سنسکرت سے اتنا واسطہ بھی نہیں رکھتیں جتنا فارسی بلکہ اُردو بھی۔ اس آریائی کوتاہ اندیشی کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ ہے کہ ہندو قوم ایک اعلیٰ درجے کی قدیمی تہذیب کی مالک تھی۔ حالات ایسے ہوئے کہ مسلمان اس ملک پر حملہ آور ہوئے اور صدیوں تک یہاں حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ اُن میں زوال کی علامتیں ظاہر ہوئیں اور ایک اور اجنبی قوم سات سمندر پار سے آکر ہندو مسلمانوں پر مسلط ہو گئی۔ ہندو کچھ دیر کے بعد اُبھرے مسلمانوں پر ابھی غفلت طاری تھی۔ خیالی جمہوریت کی آوازیں سُنائی دینے لگیں، معلوم ہوا کہ اب کثرت کی حکومت آنے والی ہے۔ ہندوؤں کی کثرت تھی، اُن کے پاس روپیہ تھا، وہ نئی تعلیم پا رہے تھے ایک مشترک قابل حصول نصب العین کا احساس کرتے ہوئے وہ منظم بھی ہو رہے تھے اُس کے مقابل میں مسلمان ابھی خواب خرگوش میں تھے۔ اس حال میں قدرتی بات تھی کہ ہندوؤں کی اکثریت کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ ہمارا ملک ہے، صدیوں ہم اجنبیوں کے زیر اثر رہے، اب ہم زیادہ قابل اور زیادہ ہوشیار ہیں اور اسلئے ہم ہی خوشحالی اور ترقی اور حکومت اور آزادی کا زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔ یہ مان لیا کہ ایسا محسوس کرنا ایک قدرتی بات تھی لیکن غور کرو تو واضح ہو جائے گا کہ یہ عقلمندی نہ تھی، دور اندیشی نہ تھی، اس میں ہندوستان کی بلکہ بالآخر خود ہندوؤں کی بہتری نہ تھی۔ آٹھ کروڑ انسانوں کی طرف سے آنکھ کان بند نہیں کئے جا سکتے خواہ وہ کاہل یا نادار ہی کیوں نہ ہو۔ دنیا کا مستقبل قومیت کے ہاتھوں میں نہیں، بین الاقوامیت اور انسانیت کے ہاتھوں میں ہے۔ ہندوستان کو یہ زریں موقع حاصل ہے کہ یہاں ایک نہیں کئی قومیں پہلو بہ پہلو آباد ہیں، کئی تہذیبیں ہیں، کئی زبانیں ہیں۔ ان حالات میں رواداری اور بلند نظری برتنی چاہئے تاکہ یہ ملک قومیت کی خطرناک منزل کو پھاند کر صحیح انسانیت کی راہ پر لگ جائے۔ یہاں کی تہذیب اور یہاں کی زندگی میں اسلامی اور ہندوانی اور مغربی تہذیب کا ایک شاندار ملاپ ہو جسے دنیا رشک کی نظروں سے دیکھے!

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال (خدا کرے عارضی طور پر) صورتِ حالات کچھ اور ہے، فی الحال ہمارے ملکی بھائیوں کی اکثریت بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت بھی ایک ایسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہندی والے اُردو کے دائرے میں برسوں سے اپنی نشر و اشاعت کے سلسلے میں چھاپے مار رہے ہیں اور اپنے حلقہ کو وسیع کئے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک حد تک کامیاب ہو رہے ہیں کیونکہ وہ منظم ہیں اور ایک خاص جذبے کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ ہماری حالت بُری نہیں بعض باتوں میں ہم اُن سے آگے ہیں پیچھے نہیں لیکن صرف بعض میں، بعض اور باتوں میں وہ ہم سے آگے ہیں اور آگے بڑھے چلے جاتے ہیں، سو اگر کچھ عرصہ ہم اسی طرح سوئے رہے، الگ الگ رہے، منظم نہ ہوئے تو ہم بلاشبہ سخت خطرے میں پڑ جائیں گے۔

آج کل سب سے دلخراش سوال رسمِ خط کا در پیش ہے۔ اُردو والے اپنے خط کی خوبیاں بیان کرتے ہیں ہندی والے اپنے خط کی۔ اُردو والے اپنی زود نویسی اور خوبصورتی پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو سارے مغربی ایشیا اور شمالی و وسطی افریقہ کا رسم خط یہی ہے اور ناگری حروف صرف ہندوستان تک محدود ہیں۔ اُدھر ہندی والے کہتے ہیں کہ ہمارا خط آسان ہے، زیادہ علمی شان لئے ہوئے ہے، خالص ہندوستان کی چیز ہے۔ ایک تیسرا گروہ اس لڑائی جھگڑے سے گھبرا کر یا اُکتا کر لاطینی حروف کا شیدائی ہو رہا ہے اور عقلی نقطۂ نظر سے لاطینی حروف کو ترجیح دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس طرح ادھر ہماری رقابتیں ختم ہو جائینگی اُدھر ساری دنیا کے ساتھ ہمارا ایک نیا تعلق پیدا ہو جائے گا۔ وہ ترکی کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس کل صبح اُٹھتے ہی بسم اللہ کر کے بسم اللہ اور اوم دونوں لاطینی حروف میں لکھنا شروع کرو۔ جھگڑا ختم ہو جائے اور ہم دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر فریق کی بعض دلایل پُر زور ہیں مگر افسوس کہ نری دلایل سے کم از کم زندگی کی بعض باتوں کا فیصلہ نہ ہو سکتا ہے نہ کبھی ہوگا۔ مجھے ایک شئے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے آپ اس پر زور دے رہے ہیں اور دلیلیں پیش کرتے ہیں کہ نہیں فلاں شئے اُس سے بہتر ہے۔ مجھے اپنا بچہ پیارا معلوم ہوتا ہے آپ کو اصرار ہے کہ آپ کا بچہ زیادہ محبت کے قابل ہے۔ اب فیصلہ ہو تو کس طرح سے اور کرے تو کون؟ ایک تیسرا آدھمکتا ہے کہ ان دونوں بچوں کو گولی سے مار دو اور ایک زیادہ سمجھدار نوجوان کو مل کر متبنیٰ بنا لو۔ ممکن ہے اس سے آیندہ نسل کا فایدہ ہو لیکن اس سے ہم دونوں کی موجودہ زندگی روکھی پھیکی ہو جائے گی، سلف کا خون جو ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے منجمد ہو جائے گا، ہم بھول جائیں گے ہم کون تھے؟ ہم یہ بھی پوری طرح نہ سمجھیں گے کہ ہم اب کون ہیں؟ دوسرے کا چہرہ لگا کر نہ ہم اپنے آپ کو پہچان سکیں گے نہ کوئی ہمیں پہچانے گا۔

مشہور انگریزی جملہ ہے -

(کیا فائدہ اگر انسان ساری دنیا کو بھی پا لے ۔۔۔ اور اپنی روح کو کھو دے؟)

یہی وجہ ہے کہ ہم اہلِ اُردو کبھی اپنا رسمِ خط نہیں چھوڑ سکتے - ہمارا رسم خط ہماری تہذیب کا علمبردار ہے اُس کی ایک ایک نوک پلک میں ہمارے لئے ہمارے تمدن کے ہزاروں اشارے موجود ہیں - کوئی پوچھے گا کیسے؟ ہماری صرف یہ گزارش کافی ہوگی کہ حضرت ہمارا دل یہی گواہی دیتا ہے، آپ ہمارا دل ہم سے چھینتے ہیں! یہ ہم دینے کو تیار نہیں - لیکن ہاں اب محض دل کی دلداریوں کا زمانہ نہیں رہا - اب دل کے ساتھ اگر دماغ بھی شریک کار نہ ہو تو دل بے کار ہے بلکہ ناہنجار اور مردود - ترکی کی مثال غلط ہے، وہاں ایک آزاد متحد منظم قوم ہے جو ایک تجربہ کر رہی ہے، اُسے جب تک چاہے جاری رکھے جب چاہے چھوڑ دے - ہمارے حالات اور ہیں، ہمارے پاس لے دے کے ہماری چند روایات ہیں - مانا کہ ہم میں تو ہمات بھی ہیں قدامت پسندی بھی ہے لیکن یہ کہاں کا ایسا گناہ ہے کہ ہم اپنے ادب کو اپنے قدیمی، خوبصورت، مختصر، ہمہ گیر رسمِ خط میں زندہ رکھنا چاہیں لیکن آپ کسی سیاسی دلیل کے ماتحت اُس کا گوشت پوست کھینچ دینا ضروری تصور فرمائیں اور سمجھائیں کہ اصلی چیز تو روح ہے، جسم کو مسخ کر دینے سے روح بدستور قائم رہیگی - آخر انگریزوں نے ابھی تک اپنے Although میں سے ugh (اُگھ) کیوں خارج نہیں کر دیا؟ آخر اُنھوں نے ابھی تک اپنی Psychology کا سر کیوں نہیں کاٹ دیا؟ وہاں ہزاروں ایسی اصلاحات کی ضرورت ہے، اُنھیں کیوں دور کی نہ سوجھی؟ چند روز ہوئے کانگریس کے ایک ممتاز لیڈر نے رسمِ خط کی بحث کے سلسلے میں مجھ سے کہا کہ میں نے پیرس میں چند یورپینوں کو ثابت کر دکھایا کہ ہندی رسمِ خط دنیا میں سب سے زیادہ سائنٹیفک ہے - یہ درست ہوگا لیکن صاحبو! ہمیں انتظار کرنا چاہئے یہاں تک کہ اس طبیعی ثبوت کا اثر یورپ کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور سب مغربی قومیں یہ طبیعی رسمِ خط اختیار کر لیں سیدھی بات یہ ہے کہ ہم اُردو والوں کو ہندی والوں سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں، اگر وہ اس پُرانے قومی سمجھوتے کو جس کا نام اُردو ہے برقرار رکھنے کے لئے تیار نہیں تو ہمیں بحث مباحثہ میں وقت ضائع کرنا چاہئے، نہ اُن کے خلاف اظہار نفرت کرنا چاہئے، نفرت محض کمزوری کی دلیل ہے اور مزید کمزوری کا سبب بنتی ہے - ہمیں چاہئے کہ ہم اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے رسمِ خط کی اصلاح اور اپنی زبان کی عام ترقی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں - ہم نہیں کہتے محض ہمارے ہندو بھائی ہی قصوروار ہیں، محض وہی متعصب اور تنگ خیال ہیں بدقسمتی سے وہ اسلام جو رواداری کا آئینہ دار تھا اُس کے بعض پیرو بھی آج تنگ نظری کا شکار نظر آتے ہیں لیکن ہم اپنے ہموطنوں کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلمان میں ہزار کمیاں ہوں اُس میں ایک

صاف گوئی کی خوبی ضرور ہے، جاہل اور متعصب مسلمان کے بھی زبان و دل ایک ہیں اور ہیں ادب کے ساتھ یہ عرض کرتا ہے کہ ہمارے ہم وطنوں میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو منھ سے ہندوستانی ہندوستانی اور اُردو اُردو تک پکارتی ہے، اس کی زبان پر غالب و اقبال کے شعر رواں رہتے ہیں لیکن در پردہ وہ ہر ممکن ذریعے سے اُردو کی بیخ کنی پر تلی رہتی ہے۔ میں پنجاب کے ایک مشہور ہندو لیڈر کو جانتا ہوں جو کسی مسلمان کو دیکھتے ہی عموماً فارسی اور اُردو کے بیسیوں شعر ایک دلکش انداز میں پڑھنے لگ جاتے ہیں لیکن جنھوں نے اپنے قابل فرزند کو اُردو کی تعلیم سے عمداً قطعی طور پر بے بہرہ رکھا ہے، ایسی ہی سیکڑوں ہزاروں مثالیں اور بھی ہیں۔

مجھے رنج ہوتا ہے کہ ایک مجھ سے غیر سیاسی شخص کو اس قسم کی سیاسی باتیں کہنی پڑتی ہیں۔ بحیثیت ایک اُردو رسالے کے مدیر کے میں نے کبھی ملی اختلافات سے کوئی واسطہ نہیں رکھا، کیونکہ اُردو کے باب عالی پر اُردو حروف میں صرف بسم اللہ اور اوم لکھا ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ نہیں لکھا، یہ لفظاً ہر ایک مسلمان کے دل میں منقوش ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ادب سے تعلق رکھنے والے شخص کو اس طرح کی سیاسی گفتگو کرنی پڑی؟ اس کی وجہ محض یہی ہے کہ اُردو کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور بہ حیثیت اُردو کے ایک شیدائی کے میرا فرض ہے کہ میں تمام مسلمانوں سے اور اُن انصاف پسند اور محب وطن لاکھوں ہندؤں سے بھی جو ابھی اُردو کے حلقے میں داخل ہیں درخواست کروں کہ اردو ہندی کے اس فتنے کو روکئے اور اس کو ملی سیاسیات کے میدان سے نکال کر پھر قومی ادبیات کی چوٹیوں پر پہونچا دیجئے۔ اس ضمن میں رام نریش ترپاٹھی (ہندی مندر پریاگ ۱۹۲۶ء صفحہ ۷۱) کا یہ قول دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ "ہر ہندو کو اُردو سیکھنی چاہئے اور ہر مسلمان کو ہندی۔ میرا تو راسخ عقیدہ ہے کہ بغیر اُردو جانے کوئی شخص بھی ہندی کا اچھا انشا پرداز نہیں ہو سکتا۔" دیوی داس گاندھی نے ۱۹۳۴ء میں ہندی پرچار سبھا کے سالانہ جلسے میں کہا کہ "ہر ہندو کا فرض ہے کہ وہ اُردو سیکھے اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ہندی کی استعداد بڑھائے"، بلکہ سنسکرت اور فارسی کی طرف بھی دونوں قوموں کو توجہ کرنی چاہئے۔ شکر ہے کہ ہمارے بھائیوں میں ابھی ایسے آدمی موجود ہیں جو دل سے ایک پایدار مفاہمت کے خواہشمند ہیں۔ یہ مفاہمت اسی طرح ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کی چیزوں کی قدر کریں تاکہ رواداری سے محبت اور محبت سے نہ حل ہونے والے سوالوں کا حل مل جائے۔

اُردو کی ضروریات اس وقت چار عنوانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں، لسانی، ادبی، طباعتی، اشاعتی سب سے پہلے لسانی ضروریات کا درجہ ہے کیونکہ یہی ہیں جو اُردو کو اُردو بناتی ہیں۔ اس سلسلے میں میں پنڈت برج موہن صاحب کیفی کی بیش بہا تصنیف "منشورات" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے

سیکڑوں ملکی جو اردو کو نقصان پہونچا رہے ہیں اُن کے مقابل میں ہمارے لئے ایک حضرت کیفی کے قیمتی مخلصانہ مشوروں کی سودمندی کافی اور پوری طرح باعثِ اطمینان ہے۔ اسی طرح اس باب میں مولانا سلیم مرحوم اور مولوی عبدالحق صاحب کی جدت طرازی اور معاملہ فہمی ہمارے ہزاروں خیال پرست رومانی انشا پردازوں کی مستانہ پرواز سے زیادہ مفید اور زندگی بخش ہے۔

سب سے بڑی ضرورت زبان کو عام فہم بنانے کی ہے۔ اس کا یہ مدعا نہیں ہے کہ ہر قسم کے مطالب ایسی زبان میں ادا ہوں جسے ہر پرائمری کا طالب علم باسانی سمجھ سکے۔ ایسی زبان بنانے کی کوشش نادانی بلکہ دیوانگی ہوگی۔ مختلف مطالب ادا کرنے کے لئے مختلف قسم کے الفاظ کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ آج کل کے بہت سے انگریزی نواز مسلمان نوجوان بھی اُردو کتابوں اور رسالوں کی ہر سطر پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اُن کے لئے Atmosphere آسان لفظ ہے فضا مشکل Environment آسان ہے ماحول مشکل Contradiction آسان ہے تضاد مشکل بلکہ مہمل Mind کا ترجمہ وہ بجائے نفس کے "دل" کرنا چاہتے ہیں Construction کی اُردو تعمیر کیوں ہو "عمارت" کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ مسٹر جونز کے دوست ہیں لیکن یوسف صاحب کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے ہیں۔ اُن کی تعلیم و تربیت ایک مغربی ماحول میں ہوئی ہے، اُن کا بھی قصور نہیں، آزادی چھن جاتی اور خود دار نہ رہنے کے یہی تو فوائد ہیں۔ اُدھر سنسکرت پسندوں اور عربی پسندوں کی علمیت غضب ڈھاتی ہے۔ سلیم مرحوم نے تینوں قسم کے اصحاب کی عبارتوں کے نمونے پیش کئے ہیں:-

مسٹر فلاں فرماتے ہیں:-

"جب ہم شام کو واک کرکے آئے تو بہت ٹائرڈ معلوم ہوئے فوراً ایک چیئر پر بیٹھ گئے۔ ہماری طبیعت کو سموک کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میچز نہ تھی۔ سگار کو کنڈل سے لایٹ کر لیا اُس نے مائینڈ پر سودنگ ایفکٹ کیا۔"

ایک پنڈت جی لکھتے ہیں:-

"ست سنگتی مُدا منگل کا مول ہے اور سنجم نیم جوگ بیراگ وغیرہ سب سادھن پھول ہیں اور سدھی پھل ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

ایک مولانا رقمطراز ہیں:-

"تمام نام نہاد علوم و فنون جدل و خلاف و تعمقاتِ وہمیہ و خیالیہ و صناعاتِ تشکیکیہ و مطالبِ شرعیہ وغیرہ وغیرہ۔"

سلیم مرحوم اس پر کہتے ہیں کہ "یہ اُردو کی توسیع نہیں تخریب ہے"
کیفی صاحب کا خیال ہے کہ اُردو جس خوبی اور عمدگی سے بنی اُسی خوبی اور عمدگی سے اسکی ساخت کے مطابق اُس میں اب بھی تصرف کرنا اور اُسے ترقی دینا ضروری ہے۔ متقدمین نے تصرف لسانی سے کیسے کیسے الفاظ وضع کئے مثلاً بخشش سے بخشنا، خریدسے خریدنا، آزمائش سے آزمانا، بدل سے بدلنا۔ اب بھی بے دھڑک ایسے ہی لفظ بنانے چاہئیں۔ اُدھر صحیح پسندوں کا یہ ظلم ہے کہ خودرفتہ اور رہائش اور عرصہ کو غلط بتاتے ہیں۔ اگر سرگزشت درست ہے تو خودرفتہ کیوں غلط سمجھا جائے۔ اُردو وہ ہے جو مستعمل ہو خواہ اصل کے خلاف ہو۔ پھر وہ الفاظ جو کسی وہم میں آکر متروک قرار دے گئے اُن پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ پر (بمعنی لیکن) یاں، واں، (نظم میں) لیجے، دیجے، سدا، عادی، مشکور، وغیرہ ان کو خواہ مخواہ کیوں بارہ پتھر باہر کیا جائے؟

مولانا سلیم نے اپنی مشہور کتاب میں ثابت کردیا ہے کہ اُردو میں الفاظ سازی کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ رسالہ ہمایوں کی طرف سے چودہ سال ہوئے اس مضمون پر سو روپیہ انعام دئے جانے کا اعلان کیا گیا تھا کہ اُردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؟ مولانا مرحوم کا مضمون بہترین قرار پایا اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ جس طرح اُردو میں یہ لفظ بنے۔ باگ ڈور، شادی مرگ، وعدہ خلاف، گھڑچڑھا گھرپھونک، پت جھڑ، خدالگتی بات، بالشتیا، گاڑی بان وغیرہ اُسی طرح ہزاروں اور لفظ بھی بن سکتے ہیں۔ زرپھینک، گھراجاڑ، تقریرپلٹ، جی اُچاٹ، کاغذداب، پگڑی بدل، برقانا (Electrify) برقانا (Electrocute) سردانا، سرخانا، نمکینا وغیرہ۔

لیکن اس کے مقابل میں سیکڑوں بھاری بھرکم الفاظ اور فقرے اور فارسی عربی کی غیر ضروری ترکیبیں ترک کردینی چاہئیں مثلاً علی التواتر، بالالتزام، بہ اقتضائے زمانہ، ازراہِ تملق، مابہ الامتیاز اور بہت سے اور الفاظ جو ان سے بھی زیادہ دماغ شکن اور خوفناک ہیں۔ یہ مانا کہ ایسی زبان کے استعمال سے تھوڑے سے لفظوں میں بہت سا مطلب ادا ہوجاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اکثر ایسا کیا جائے۔ اگر فقرہ ذرا لمبا ہوجائے تو کیا حرج ہے۔ پڑھنے والا آپکا مطلب تو بہتر سمجھے گا وہ پھر ڈر ڈر کر آپ کو ترچھی نظروں سے دیکھنے پر مجبور نہ ہوگا۔ بعض زبانوں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اُن میں الفاظ زیادہ پھیلانے پڑتے ہیں اور اسی طرح اُس زبان کا حسن قائم رہتا ہے مثلاً فرانسیسی۔ اُردو کو اس نقطۂ نظر سے اعتدال کی راہ پر چلنا چاہیئے کچھ عرصہ سے مشکل الفاظ لکھنے کا مرض بعض ادیبوں کے ذریعے سے خوفناک طور پر اُردو کی دنیا میں پھیل رہا ہے اور ہم میں سے اکثر اُس کا شکار ہورہے ہیں۔ خود راقم کو اس کا احساس ہے کہ کچھ عرصہ ہو

اُسے مشکل الفاظ سے پرہیز کرنے میں اتنی دقت نہ ہوتی تھی۔ ہمارے ارد گرد دن رات موٹے موٹے لفظوں کی بوچھار ہوتی رہے تو قدرتاً ہم بھی گویا ترکی بہ ترکی جواب دینے لگتے ہیں۔ آسان لفظوں سے ناآشنا ہو کر ہم بآسانی انھیں استعمال نہیں کر سکتے۔ پھر آسان لفظوں کا استعمال مشکل اور مشکل لفظوں کا استعمال گویا آسان ہو جاتا ہے لیکن ایسا ہونا ایک غیر فطری امر ہے اور عوام کی عام تعلیم اور آگاہی کے خیال سے نقصان دہ ہے۔ ہم سب کہتے ہیں لائحۂ عمل لیکن انصاف سے کہو یہ لفظ تمہارے گلے میں اٹک نہیں جاتا ہے پروگرام اس سے بہتر ہے۔ غالب کے اس شعر کو پڑھ کر کوئی مسکرائے گا کوئی ڈر جائے گا ؎

سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

خدا ایسے برخوردار سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ اسی غالب کے آسان شعروں کو لیجئے کہ سنتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اور سنو پہلے ہمارے ہاں اڈیٹر کا لفظ تھا پھر مدیر بنا پھر مدیر مسئول کا چرچا ہوا، پھر رئیس التحریر آ دھمکے۔ اُردو میں انگریزی الفاظ لکھی پڑھی جا سکتی ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ اکیڈیمی کو اکادمی لکھا جائے اور کلیوپیٹرا کو قلوبطرا۔

اصطلاحات کا سوال دوسرا ہے وہاں ہمیں بہت کچھ مدد عربی فارسی سے لینی چاہئے لیکن اُن کے علاوہ اُردو میں ایک طرف اس کی ضرورت ہے کہ جیسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اُس میں دریا دلی سے دوسری زبانوں سے ضروری الفاظ بجنسہ لے لئے جائیں مثلاً سٹیشن، تھرما میٹر، ٹکٹ، واسکٹ، سکیم، ریزولیوشن، کونسل، وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف ایسے الفاظ کو رائج کیا جائے جو نسبتی عام فہم لفظ ہوں یعنی جو نہ سنسکرت لفظ ہوں نہ عربی فارسی کے مسٹر سنہا نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ مفید تجویز پیش کی ہے کہ ایسے الفاظ کا ایک لغات تیار کیا جائے۔

اُردو کی صحت اور توسیع میں سب کو حصہ لینا چاہئے۔ دلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد وغیرہ ان سب کا اپنا اپنا مرتبہ اور اپنا اپنا دائرۂ عمل ہے۔ مصنف "منشورات" نے اُردو کے لئے پنجاب کے عظیم الشان کام کی تعریف کر کے اُدھر اہلِ زبان کو مشورہ دیا ہے کہ پنجاب کی زبان میں بعض وہاں کی مقامی خصوصیات ہیں آپ اُن پر چیں بجبیں نہ ہوں اور اِدھر پنجاب والوں کو یہ زریں نصیحت کی ہے کہ یاد رکھو کہ اہلِ زبان ہی سے روزمرہ اور محاورہ سیکھنا اچھا ہے۔ ہاں فن اور قاعدہ میں کسی کو کسی پر شرف نہیں۔ آخر میں دلاسا دیا ہے

ضروری ہے۔ ہمارے حروف تہجی وسیع ہیں لیکن اُن میں کئی نئی اصوات یا آوازوں کے اظہار کی دقت ہے مثلاً Small کو ہم "سمال" یا "اسمال" کیوں پڑھیں؟ "پیاس، دھیان" (تی زبر) پر ایسا نشان کیوں نہ لگایا جائے جس سے اُس کی مخصوص آواز کا اظہار ہو؟ اعراب کی عدم موجودگی سے اُردو تلفظ میں وہ گڑبڑ پڑ رہی ہے کہ خدا کی پناہ۔ جب تک کوئی عربی فارسی ہندی کا عالم نہ ہو جائے ناممکن ہے کہ اُردو کی عبارت کو درست پڑھ سکے۔ کوئی طلبا کہتا ہے کوئی طلبا کوئی نکہت کوئی نکہت کوئی مترجم کوئی مترجم کو...... کوئی مسرت کوئی مسرت اور پھر کسی ناواقف کے سامنے انسٹیٹیوٹ یا کانسٹیٹیوشن کے سے ریل نما الفاظ آجائیں تو اُس کی حالت نہ پوچھیے، ایسی ہی ہزاروں او مثالیں ہیں۔ علامات وقف کے لئے قامہ مقررہ نقطہ یعنی کامے سیمی کولن فل سٹاپ وغیرہ ایک مخصوص قاعدے کے مطابق رائج ہونے چاہئیں۔ اب یہ حالت ہے کہ سوائے بعض محتاط مصنفین یا بعض رحمدل کاتبوں کے کوئی نہیں سوچتا کہ الفاظ کے جم غفیر میں جو دھکم دھکا ہو کر ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں بیچارے پڑھنے والے مسافر کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ پھر حروف کی اتصال یا اخراج اور رسم الخط کی اصلاح کا کٹھن سوال ہے۔ کیا کوئی طریقہ ہے جس سے ہر حرف کی تین تین صورتیں کسی طرح کم کی جا سکیں یا صرف ایک صورت رہ جائے؟

لیکن سب سے اہم اور دشوار مسئلہ لیتھو اور ٹائپ کا ہے۔ یہ امر اب مسلمہ ہو چکا ہے کہ اُردو کی طباعت کا طریقہ غایت درجہ ناقص اور ناتسلی بخش ہے۔ کاتب کی نابرداری اور غلط نویسی پھر پتھر، روشنائی، کاغذ، سنگسازی کی مشکلیں، بلاکوں کا نہ چھپ سکنا، لاگت زیادہ آنا، پوری صفائی نہ ہو سکنا، سرعت کے ساتھ کام کا نہ ہونا یہ اور ایسی ہی بہت سی اور دشواریاں ہیں جن کی وجہ سے اُردو کو سخت نقصان پہونچ رہا ہے۔ ۱۸۰۰ء سے لیکر آج تک کئی بار ماہرین فن نے کوشش کی کہ نستعلیق ٹائپ طیار ہو جائے، بہت وقت صرف کیا، بہت سا روپیہ لگوایا، محنت شفقت کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ حال میں حیدرآباد میں نستعلیق ٹائپ یعنی عام اُردو خط کا ایک خوشنما ٹائپ بن گیا ہے چنانچہ لاہور میں بھی اس کا ایک نمونہ "دورِ جدید" کے دفتر میں موجود ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک تجارتی طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس صورت میں فی الحال یا لیتھو کا طریقہ باقی رہ جاتا ہے یا نسخ ٹائپ یعنی عربی نما ٹائپ جس میں ہمارے ہاں امتحانوں کے خوفناک پرچے چھپتے ہیں۔ خود نسخ ٹائپ کچھ اتنا ڈراؤنا نہیں جتنا کہا جاتا ہے کہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نستعلیق خط زیادہ خوبصورت ہے لیکن کیا کیا جائے نری خوبصورتی کو عمر بھر کے لئے دل دینے سے دنیا کے کام نہیں چلتے۔ اس کے علاوہ نئی بات سے ہمیشہ جی گھبراتا ہے اس لئے ہم نسخ کو پسند نہیں کرتے لیکن اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں قدامت پسند نہ بننا چاہئے بلکہ ضرورت وقت کے مطابق اپنے رویئے کو تبدیل کرنے پر تیار ہو جانا چاہئے

ذرا مسلمانوں کی خطاطی کی تاریخ پڑھئے۔ پہلے کوفی خط رائج تھا لیکن عہد عباسیہ میں جب توسیع علم ہوئی تو اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُس وقت کے مسلمان اتنے قدامت پسند نہ تھے جتنے ہم اس جدت طراز زمانے کے رہنے والے۔ چنانچہ خطِ نسخ ایجاد ہوا۔ عرصہ تک دونوں کوفی اور نسخ خط رائج رہے یہاں تک کہ بتدریج نسخ خط عام طور پر اختیار کر لیا گیا۔ مسلمانوں میں خطاطی کو کیوں ترقی ہوئی یہ بھی دلچسپ بات ہے۔ موسیقی منع ہوئی تو انھوں نے قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنا شروع کیا۔ تصویر کشی منع ہوئی تو انھوں نے عربی نقش و نگار اور خوش نویسی کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ خوش نویسی ایک اعلیٰ درجے کا فن بن گیا۔ خطِ نستعلیق غالباً چودھویں صدی کے شروع میں ایجاد ہوا اور مقبولِ عام ہوا۔ لیکن نستعلیق میں گولائی بہت سے اور جوڑ مختلف اونچائی پر ملتے ہیں اور وہ کسی ایک مخصوص قاعدے کے تابع نہیں اس لئے اُس کا ٹائپ بننا بہت مشکل ہے۔ ان حالات میں گو نستعلیق خط اور لیتھو کو بعض چیزوں کے لئے برقرار رکھنا نہ صرف جائز بلکہ خوبصورتی اور خوبی کا باعث ہوگا لیکن ابھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں طباعت کا کام زیادہ تر نسخ ٹائپ کے ذریعے سے کرنا لیتھو سے بہت زیادہ مفید رہے گا۔

اخیر میں ہمیں اُردو کی اشاعتی ضروریات کی طرف توجہ کرنی ہے۔ نشر و اشاعت کے بغیر آج کل دُنیا کا کوئی کام نہیں چلتا۔ مجھے یاد ہے کہ چند سال ہوئے میں نے علامہ اقبال سے شکایت کے طور پر کہا کہ آج کل کی دُنیا میں بغیر پروپیگنڈا کے قدر نہیں ہوتی۔ اس پر انھوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ "تم بیچارے انسانوں کی کیا شکایت کرتے ہو خود خالقِ اکبر سب سے بڑا پروپیگنڈا کرنے والا ہے۔ کائنات ساری کی ساری محض اُسکے پروپیگنڈے کی ایک صورت ہے کہ ایک ایک چیز سے اُس کی جمالی و جلالی شان ظاہر ہوتی ہے۔" آج کل اگر کوئی یہ سمجھے کہ میں نیک ہوں اور قابل ہوں یا میری کوئی چیز نہایت قابلِ قدر ہے اور یہ سمجھ کر وہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہے تو دنیا ساری کی ساری اُس کی یا اُس کے کام کی قدر کرنے کو اُس کے گھر میں آ حاضر نہ ہوگی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم دنیا میں ترقی کریں اور زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں تو لازم ہے کہ ہم مل کر ترقی کی تجاویز سوچیں، مل کر محنت اور توجہ سے مفید کام کریں اور کچھ نشر و اشاعت سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو دکھائیں کہ ہم کیا کچھ کر رہے ہیں۔

ہمارے پاس ادب کا جو ذخیرہ موجود ہے سب سے پہلے اُسے بہترین شکل میں پیش کرنے کی ضرورت ہے اُردو کی بہترین تصنیفات کو مختلف قسم کے سیریز یا سلسلوں میں خوبصورت اور ارزاں کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے کہ اُردو کی تمام مطبوعات کی ایک مکمل فہرست مضمون وار شائع کی جائے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے پاس کیا کچھ ہے اور کیا نہیں ہے؟ اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ دنیا کی بہترین مشہور کتابوں کو اردو

میں منتقل کر دیا جائے اور ہمارے انگریزی کے عاشق زار نوجوانوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اُردو پڑھیں اور اُردو ادب سے دلچسپی لیں۔ یہ ایک بڑی اہم ضرورت ہے جس کی طرف پوری توجہ کرنی چاہئے۔ ہمارے اکثر نوجوان اپنی بیشتر چیزوں سے یا ناواقف ہیں یا بلاوجہ اُنھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ بچپن ہی سے ان مغرب زدہ نوجوانوں کی گھٹی میں اُردو کا ایک جزو ڈال دیں تاکہ بڑے ہو کر وہ اپنی روایات سے اجنبی اور متنفر نہ رہیں۔

اس بات کی پوری کوشش کی جائے کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اُردو کا شعبہ کھولا جائے اور اُسے کما حقہ فروغ دیا جائے۔

ملک میں جابجا گشتی کتب خانے قایم ہوں تاکہ ایک طرف اگر اُردو زبان اور اُردو ادب ہر دلعزیز ہو تو دوسری طرف ہر کہ ومہ کی شایستگی اور تعلیم و ترقی کا رستہ نکل آئے۔

مشاعرے اُردو زبان کا ایک خاص ادارہ ہیں ہندی والے بھی اس کی نقل اُتار رہے ہیں۔ مشاعروں کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کرنی چاہئے، اُن کے ربط وضبط سے ہم اُردو کو اور زیادہ ہر دلعزیز بنا سکتے ہیں لیکن یہ لازم ہے کہ فرسودہ و پامال اور اخلاق سوز مضامین سے پرہیز کیا جائے اور امید افزا اور زندگی پرور خیالات کو رواج دیا جائے۔

مستند، عام فہم اُردو سیکھنے سکھانے والی کتابیں شائع ہونی چاہئیں نہ صرف ایسی جن کے ذریعے سے بتدی زبان کو آسانی سے سیکھ سکیں بلکہ ایسی بھی جن کی مدد سے اخبار نویس اور انشاپرداز بلکہ انگریزی زدہ لوگ بھی اُردو میں آسانی سے اپنے اپنے مطالب ادا کر سکیں۔ مثلاً الفاظ اور محاورات اور اصطلاحات کو الگ الگ مضمون وار جمع کیا جائے تاکہ بوقت ضرورت اُنھیں استعمال کیا جا سکے۔ آج کل کی مصروف دنیا میں اکثر لوگوں کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ زبان پر پورا عبور حاصل کرنے کے لئے وہ عمر کا ایک حصہ وقف کر دیں۔ زبان میں نامانوس الفاظ کے رواج کا بھی ایک سبب یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر اپنے محاوروں اور آسان لفظوں سے کافی واقفیت نہیں رکھتے۔

بہت سی باتیں رہ گئی ہیں لیکن یہاں گنجایش نہیں کہ سب کا ذکر کیا جائے۔ نشر و اشاعت کے ضمن میں ایک آخری بات قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اُردو زبان کی گزشتہ اور موجودہ حالت کے متعلق صحیح اور مکمل معلومات جن سے اُس کے مستقبل کا ایک مناسب پروگرام بنایا جا سکے۔ اُردو زبان کے بہت بڑے محسن مولوی عبدالحق صاحب ستائش اور شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے "جایزۂ زبان اُردو" کے نام سے اس نہایت ضروری کام کو شروع کر دیا ہے۔

یہ ہے چند لفظوں میں اُردو زبان کی ابتدا، اس کی حالت اور اُس کی موجودہ ضروریات!

سو یہ ہے جو ہمیں کرنا ہے لیکن کرے کون اور کس طرح؟ یہ نہیں کہ سمجھتا کوئی نہیں، یہ نہیں کہ کرتا کوئی نہیں، یہ نہیں کہ ہو کچھ نہیں رہا۔ بعض شعبوں میں بہت اچھا کام ہو رہا ہے، بعض میں خاصا، بعض میں غیر تسلی بخش اور بعض میں صفر! بعض غیر ضروری کام ہو رہے ہیں اور بعض ضروری کام برسوں سے یا ادھورے پڑے ہیں یا کسی کا اُن کی طرف دھیان ہی نہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب، اُس فاضلانہ خطبے میں جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈمی کے سامنے پڑھا۔ لکھتے ہیں "اس زبان میں جو ادارے زبان و ادب کی ترقی و اشاعت کا کام کر رہے ہیں اُن کا کام کسی اصول پر نہیں ہو رہا۔ گویا ہم اندھیرے میں چاند ماری کر رہے ہیں لگا تو تیر نہیں تکا۔" پھر فرماتے ہیں کہ "ان اداروں میں باہمی کوئی اتحاد و ارتباط نہیں ہے، ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا رکھی ہے۔ جب مقصد ایک ہے اور کام ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کبھی کبھی سر جوڑ کر نہ بیٹھیں، اپنے کاموں پر نظر ڈالیں اور آیندہ کے لئے اپنے کام کا کوئی ایسا نقشہ تیار کریں جو حقیقی طور پر ہمارے ادب کے حق میں مفید ہو۔"

فرانس کی اکیڈمی جو فرانسیسی زبان کی توسیع و تصحیح کے لئے مدتوں سے بے حد مفید کام کر رہی ہے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اسی اجلاس میں حاضرین کو بتایا کہ جون ۱۹۳۵ء میں جب انھوں نے اکیڈمی کے تیسرے صد سالہ جلسے میں شرکت کی تو انھوں نے دیکھا کہ "اس اکیڈمی کے کتب خانے اور نمائش کے دیکھنے کے لئے ایک دن میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے ٹکٹ خریدے تھے" اور یہ کہ "فرانس کے ایک ایک مرد و زن کو اکیڈمی کے وجود و ہستی پر فخر و ناز تھا۔"

انجمن ترقی اُردو، جامعہ عثمانیہ، دارالمصنفین، جامعہ ملیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انجمن حمایت اسلام لاہور، اُردو کے رسالے اور اخبارات، قسم قسم کی علمی انجمنیں اور ادبی سبھائیں اور ملک کے مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے اُردو کے شیدائی! کیا یہ سب ایک عظیم الشان سلسلے میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ بلکہ حیرت ہے کہ آج تک یہ کیوں منظم نہیں ہوئے؟ شاید اس کا یہ جواب ہے کہ اُردو سے زیادہ دلچسپی مسلمانوں کو رہی ہے اور یہ لوگ، کچھ عرصے سے تنظیم اور باہمی اتحاد کے ناقابل ہو رہے ہیں۔

اُردو تری مسلمانوں کی زبان نہیں لیکن مسلمانوں پر اس کی ضروریات کے پورا کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ کیا ہم یہ الزام سنکر خاموش رہیں گے کہ ہم تنظیم نہیں کر سکتے؟ کیوں نہ آج ہی اس کی ابتدا کر دیں؟ اُردو کی انجمنوں اور دوسرے اداروں کا ایک دائرہ ہو جس کا مرکز "انجمن ترقی اُردو" قرار دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی اُردو کی صدر انجمن کہلانے کی مستحق ہے۔ ملک کے تمام دوسرے علمی و ادبی و تعلیمی اداروں کو

جہاں تک اردو کی ترقی و توسیع کا تعلق ہے۔ اس مرکزی انجمن سے ملحق ہونا چاہیئے۔ اس انجمن کی خصوصی سب کمیٹیاں ہوں اور ہر صوبجاتی انجمن یا دوسرے اداروں میں بھی اسی نوع کی سب کمیٹیاں ہوں جن کے سپرد زبان و اشاعتِ زبان کے مختلف شعبے ہوں۔ یہ کمیٹیاں ہوں صحتِ زبان کی، اشاعت زبان کی، مشاعرہ کمیٹی، ریڈیو کمیٹی، کمیٹیاں اخبارات کی، رسائل کی، اعداد و شمار کی، اصطلاحات کی وغیرہ وغیرہ۔ یوں تقسیم کار بھی ہوگی اور تعاون بھی اور بہت سے قابل اشخاص ایک حد تک ایک دوسرے سے الگ الگ رہ کر بغیر رشک و حسد کے جو ہماری ایک قومی خصوصیت سی ہوگئی ہے ذمہ داری کے ساتھ کام کر سکیں گے بلکہ اگر کسی جگہ کسی ناگزیر وجہ سے مل کر کام نہ بھی ہو سکے تو ممکن ہے کہ کوئی ایک شخص مختلف اصحاب کو اس طرح علٰحدہ علٰحدہ کام کرنے کی ترغیب دے سکے کہ اس سے بغیر تعاون کے تقسیم کار کی صورت پیدا ہو جائے۔ سال میں ہو سکے تو دو بار ہر صوبے کا ایک جلسہ ہو اور ایک سالانہ اردو کانفرنس مرکزی انجمن کے ماتحت مختلف مقامات میں ہوا کرے جس میں ایک عام اجلاس ہو اور ایک مجلس شوریٰ کا خاص اجلاس۔ صدر انجمن کو اطلاعات ملتی رہیں اور صدر دفتر سے ہدایات و اشارات جاری ہوتے رہیں گو عموماً بہیئت مجموعی ہر صوبہ یا علاقہ ایک حد تک خود اپنے کام کا ذمہ دار ہو۔

ان تمام باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ:-

اُردو اس ملک کی عام زبان ہے اور اُسے ایسا ہی بننا چاہیئے۔

اُردو نے گزشتہ صدی میں خاصی ترقی کی ہے جو قابلِ فخر ہے۔

لیکن ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے، ابھی ہمیں ایک حیات انگیز ادب پیدا کرنا ہے۔

اس میں اور بہت سی کمیاں ہیں اقرأت کی، طباعت کی، انھیں پورا کرنا ہے۔

اپنوں میں، غیروں میں، ہر کہیں اس کی نشر و اشاعت کرنی ہے۔

اور اگر یہ الگ الگ بہت کچھ ہوتا رہا اور ہو رہا ہے لیکن اب شد ضرورت کام میں تطابق اور تنظیم کی ہے۔

آج شمال جنوب سے ملتا ہے، پنجاب حیدر آباد سے، وہ پنجاب جہاں کے لوگوں میں صدیاں ہوئیں اردو کا چرچا تھا، وہ حیدر آباد جہاں صدیاں ہوئیں بادشاہوں نے اُردو کی سرپرستی کی، پنجاب جہاں کے لوگوں کی زندگی کا تار و پود آج بھی اُردو ہے، حیدر آباد جہاں کے دوراندیش حکمران نے آج اُسے ایک علمی مرتبہ عطا کرکے اس قابل بنا دیا ہے کہ اگر اہل اردو نے ہمت دکھائی تو ایک روز اُن کی زبان دنیا کی عظیم ترین زبانوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کا حق حاصل کرلے گی۔

ہماری حالت امید افزا ہے صرف ہمیں تنظیم کی ضرورت ہے۔ اُردو جسے دس گیارہ کروڑ لوگ بولتے اور

سوا سترہ کروڑ سمجھتے ہیں، کیا ہم اُسے کمزور اور ملیامیٹ ہو جانے دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ بھائیو! اپنی روایات اور ایک باوقار زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اپنی زبان کو پُرانی بنیادوں پر قائم رکھ کر اُن پر ایک نئی سے نئی عمارت بناتے چلے جاؤ۔ ہندی والوں کا گھر نہ بگاڑو اپنا گھر سنوارو۔ کیا حرج ہے دو خوبصورت گھر پاس پاس ہوں اگر ایک نہیں ہو سکتا۔ محنت، تعاون، احتیاط، مدافعت، امید و ہمت ان کو ساتھ رکھو ۔۔۔ خود اپنے آپ کو عزت کے قابل بناؤ تو ہر ایک آپ سے آپ تمھاری عزت کرے گا!

بشیر احمد

(نگار) اس وقت جبکہ نہ صرف ہندی و اُردو رسم الخط، بلکہ ہندی و اُردو زبان کی مستقل نزاع ملک میں رونما ہو گئی ہے، ہمارے فاضل دوست میاں بشیر احمد صاحب بی اے کا یہ مقالہ جو انھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں گزشتہ ماہ پڑھا تھا بہت اہمیت رکھتا ہے اور غور سے پڑھنے اور عمل کرنے کے قابل ہے۔ میں آیندہ اشاعت میں بالتفصیل اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا۔ نیاز

مغربی صحافت کے نوادر

۱۔ ۱۸۹۳ء میں جنگی جہاز وکٹوریا طرابلس شام کے قریب دوسرے جنگی جہاز کمبرڈون سے ٹکرا کر غرق ہوگیا۔ اس غرقابی کی خبر کو لندن اور نیویارک کے جرائد نے شائع کیا لیکن نہایت اختصار کے ساتھ کیونکہ حادثہ کی تفصیل جلد معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ نہ تھا البتہ قیاساً یہ ضرور ظاہر کردیا گیا کہ جانیں بہت تلف ہوئی ہیں۔

لندن میں ایک امریکی اخبار کا نمائندہ (فلپس) رہا کرتا تھا۔ اس کے پاس مالک اخبار نے تار بھیجا کہ "اس حادثہ کی تفصیل فراہم کرو جس طرح ممکن ہو"۔ یہ غریب چاروں طرف دوڑا، لندن میں ایک ایک شخص کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اخبار والے اس پر ہنستے تھے کہ جب ہمیں کو مفصل حالات غرقابی کے معلوم نہیں ہوسکے تو یہ امریکی اخبار کا نمائندہ کیا کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ الغرض لندن کے تمام اخبار والے مایوس ہوکر بیٹھ رہے تھے اور جانتے تھے کہ جب تک نظارۂ خارجیہ سے کوئی اطلاع نہ ملے مفصل حالات معلوم ہونا ممکن نہیں۔ بحری تار گھر کا اسٹیشن ... میل دور ... اس لئے وہاں سے بھی کوئی پتہ نہ چل سکتا تھا۔

لیکن فلپس مایوس نہیں ہوا اور رات کو بحری تار گھر کے مہتمم کے مکان پر پہونچا اور اس سے تمام حالات بیان کرکے کہا کہ اگر وہ اس کی مدد پر طیار ہوجائے تو ہر ممکن معاوضہ اس کا دیا جا سکتا ہے۔ مہتمم نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو، اس نے کہا کہ میں سوا اس کے کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں جہاز ڈوبا ہے وہاں سے قریب تر بحری تار کے اسٹیشن پر جو آدمی ہامور ہیں ان میں سے کسی ایک کو راضی کردیا جائے کہ وہ مفصل حالات ذریعۂ تار روانہ کردے۔ مہتمم نے جواب دیا کہ اول تو یہ بہت مشکل ہے اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا اور بیکار روپیہ ضائع ہوگا۔ فلپس جب ادھر سے بھی مایوس ہوا تو اس نے رات ہی رات طرابلس کے تار گھر کے افسر کو ایک تار بھیجا کہ "وکٹوریہ جہاز کی غرقابی کی تفصیل بھیجو اور اس کی اجرت جو طلب کرو گے دیجائے گی"۔ اس کا جواب صبح کو یہ ملا کہ "ہمارے پاس کوئی تفصیل حادثہ کی نہیں ہے"۔ اس نے

پھر تار بھیجا کہ "ایک کشتی یا جہاز اُجرت پر لیکر بیدوا اور حادثہ کی تفصیل معلوم کرو۔ میں سو اشرفیاں دوں گا"
اس کا جواب آیا کہ "پہلے اُجرت بھیجدو"۔ اس سوال وجواب میں دوپہر ڈھل گئی تھی اور صرف دو گھنٹے
بنکوں کے بند ہونے میں رہ گئے تھے مگر اس نے کسی نہ کسی طرح ایک بنک کے ذریعہ سے سو اشرفیوں کا
ڈرافٹ ذریعۂ تار روانہ کردیا اور اس طرح حادثہ کے چوتھے دن اس کو مفصل حالات غرقابی کے معلوم
ہوسکے۔ اس نے فوراً امریکہ یہ تفصیل بھیجدی اور یورپ وامریکہ کا یہی پہلا اخبار تھا جس نے غرقابی کے
تفصیلی حالات سے پبلک کو مطلع کیا۔

---

۲ --- جب افریقہ کی جنگ بوئیر میں صلح ہوئی اور بوئیر سردار بوتھا اور ڈلاری لندن آئے تو اخباروں
کے نمایندوں نے انھیں گھیر لیا تا کہ ان کے خیالات معلوم کریں، لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک اخبار
نے نہایت جد وجہد کے ساتھ ان بوئیر سرداروں کی نقل وحرکت اور آمد ورفت کی جانچ شروع کی اور اسے
معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک سردار فلاں درزی کی دوکان پر فلاں دن جایا کرتا ہے۔ اس اخبار نے
اپنے نمایندہ کو ہدایت کی کہ وہ درزی کی دوکان پر جائے اور وہاں بوئیر سردار کے خیالات معلوم کرنے کی
کوشش کرے، چنانچہ یہ وہاں پہونچا اور چونکہ درزی مالک اخبار کا دوست تھا اس لئے باہم مشورہ کے
بعد طے ہو گیا کہ جب بوئیر سردار آئے تو وہ بھی ایک کاریگر کی حیثیت سے یہیں موجود رہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر
کے بعد بوئیر سردار آیا اور ایک نئے سوٹ کی طیاری کا حکم دیا۔ درزی نے اپنا فیتہ اُٹھایا اور بانہیں ناپ کر
با آواز بلند کہا۔ "۲۵" اخبار کے نمایندہ نے جو کاریگر کی حیثیت سے موجود تھا اس نے کاغذ پر "۲۵" لکھ لیا۔
درزی نے کاغذ اس سے لیکر خود دیکھا گویا کہ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس نے صحیح لکھا ہے یا نہیں۔ اس
کاغذ میں یہ عبارت درج تھی کہ "مسٹر چمبرلین کے متعلق اس کی رائے دریافت کرو"۔ درزی نے باتوں
ہی باتوں میں یہ سوال اُٹھایا اور بوئیر سردار نے اپنی رائے ظاہر کردی۔ اس کے بعد درزی نے کمر، گردن
سینہ وغیرہ کی پیمایش کی اور ہر بار کاغذ پر لکھوا کر اس کو دیکھا اور یکے بعد دیگرے متعدد سوالات کرکے اسکے
جوابات حاصل کرلئے۔
دوسرے دن جب اس اخبار نے بوئیر سردار کے بیانات شایع کئے تو لندن کے اور اخبارات حیران رہ گئے

---

۳ --- سنہ ۱۹۰۲ء میں جب جنوبی افریقہ کی جنگ میں صلح کرنے کا فیصلہ ہوا تو سب سے پہلے ڈیلی ٹیلیگراف
نے اس خبر کو شایع کیا، دوسرے اخبار اس کی تکذیب کررہے تھے کیونکہ حکومت نے اسوقت تک کوئی

بیان شایع نہ کیا تھا۔ ڈیلی ٹیلیگراف کو اس میں کیونکر کامیابی حاصل ہوئی، اس کا بیان بہت دلچسپ ہے
ڈیلی ٹیلیگراف کے نمایندہ نے جو جنوبی افریقہ میں مامور تھا عید عنصرہ Whit Sunday
کے موقعہ پر ایک تار پریٹوریا سے روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "عید عنصرہ کی تہنیت پیش کرتا ہوں"
اخبار کے اڈیٹر کو غصہ آیا کہ اس جنگ کے زمانہ میں لڑائی کی خبروں کی ضرورت ہے کہ تہنیت و مبارکباد
کی، لیکن اسی کے ساتھ اسکے ذہن میں ایک بات آئی اور وہ یہ کہ مشرق کے کنایس، عید عنصرہ کو فاختہ
سے منسوب کرتے ہیں اور فاختہ علامت صلح بھی سمجھی جاتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس پیغام میں صلح کی
خبر دی گئی ہو لیکن محض اس قیاس پر یہ خبر شائع کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ اڈیٹر نے انجیل نکلوا کر عید عنصرہ
کی دعاؤں کو دیکھا تو اس میں بھی امن و سکون و صلح و آشتی کا ذکر پایا گیا اس کے بعد ہی نمایندہ کا ایک خط
اس کے بھائی کے نام آیا کہ "میں واپس آ رہا ہوں خبر کر دو" اور آخر کار ڈیلی ٹیلی گراف کے اڈیٹر نے ان
تمام باتوں سے یہی نتیجہ نکالا کہ جنوبی افریقہ میں صلح کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس خبر کو شایع کر دیا۔ تمام اخبارات
ہنستے تھے لیکن جب بعد کو حکومت نے بھی اس کی تصدیق کر دی تو سب حیران رہ گئے۔

---

۴ — امریکہ اور انگلستان کے درمیان کشتیوں کی دوڑ ہونے والی تھی۔ انگلستان کی طرف سے جس کشتی
کا انتخاب ہوا اس کا نام شیمراک تھا لیکن امریکہ کو دو کشتیوں (کانسٹی ٹیوشن اور کولمبیا) میں سے کسی ایک
کا انتخاب کرنا تھا اور ابھی تک یہ امر ظاہر نہ ہوا تھا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے گا۔ امریکہ و انگلستان
دونوں بے چینی سے نتیجہ کے منتظر تھے۔

نیویارک کے ایک اخبار کے پاس انتخاب سے دس دن پہلے ایک تار آیا جس میں لفظ کولمبیا لکھا ہوا تھا
اڈیٹر نے خیال کیا کہ ممکن ہے اس کے کسی دوست کو انتخاب کا حال معلوم ہوا اور اس نے قبل سے اطلاع
دیدی ہو۔ الغرض اس نے یہ خبر شایع کر دی کہ شیمراک کے مقابلہ میں امریکہ نے کولمبیا کا انتخاب کیا ہے۔

جس دن جلسہ انتخاب کا فیصلہ کرنے والا تھا ایک آدمی اس اخبار کے دفتر میں آیا اور اڈیٹر سے بگڑ کر
کہا کہ اس کے استقبال کو کیوں کوئی آدمی مامور نہیں کیا گیا۔ اڈیٹر نے جواب دیا کہ "آپ نے کوئی اطلاع نہیں
دی تھی کہ کس جہاز سے تشریف لا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اب سے دس دن پہلے میں نے تار کے ذریعہ
سے اپنے جہاز کولمبیا کا نام لکھدیا تھا۔ یہ سنکر اڈیٹر کو ساری حقیقت کا علم ہوا کہ وہ تار کس نے کیوں بھیجا تھا
اور بعد کو بالکل اتفاق سے کولمبیا کشتی کا انتخاب بھی دوڑ کے لئے عمل میں آگیا۔ اس راز کو اخبار نے کامل
دو سال کے بعد ظاہر کیا۔

۵۔ مسٹر اڈگر ولس جنگ بوئر میں ڈیلی میل کے نمایندہ کی حیثیت سے جنوبی افریقہ میں مامور تھے۔ جب انگریزوں اور بوئیروں میں صلح کی گفت و شنود شروع ہوئی تو ان کے نمایندے جانسبرگ میں جمع ہوئے جو محاذ جنگ سے ۵۰ میل دور تھا۔ یہاں کسی اخبار کے نمایندہ کو آنے کی اجازت نہ تھی اور تمام تار سنسر ہوکر جاتے تھے، چنانچہ مسٹر اڈگر کا بیان ہے کہ میں نے اڈیٹر اخبار کے مشورہ سے پیام رسانی کے لئے خاص الفاظ ایسے مقرر کئے کہ سنسر کو شک پیدا نہ ہو تجارتی خبروں کے تار بجنسہ چلے جاتے تھے اور ان پر سنسر نہ ہوتا تھا چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۹۰۲ء کو ہم نے ایک تار لندن بھیجا کہ ۔ "اس زمین کے خریدار کی طرف سے جس میں سونے کی کان ہے میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ ہر دو فریق پریٹوریا چلے گئے کیونکہ اور بہت سے آدمی سمجھوتے کے لئے طیار ہوگئے ہیں لیکن مالک زمین یقیناً فروخت پر مایل ہے۔

اخبار کے اڈیٹر نے حسب قرار داد اس خبر کا ترجمہ یوں کیا کہ "صلح کی گفت و شنید میں فریقین پریٹوریا کی طرف متوجہ ہیں اور لارڈ الفرڈ ملنر کوشش کر رہے ہیں کہ بہترین شرائط کے ساتھ صلح ہو جائے۔ بوئر یقینی طور پر صلح پر مایل ہیں" اسی طرح مقررہ الفاظ میں خبریں پہونچتی رہیں۔ شرائط صلح طے پانے یا نہ پانے کے متعلق انھوں نے حسب ذیل عبارت طے کی تھی :-

شرائط صلح طے پانے کی صورت میں :-

"میں نے آج تمھارے لئے ہزار حصے خرید لئے ہیں"

شرائط صلح طے نہ پانے کی صورت میں :-

"میں نے آج تمھارے ہزار حصے فروخت کر دئے ہیں"

یہ انتظام تو خیر انھوں نے خبر رسانی کے متعلق کر لیا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ جانسبرگ سے مندوبین کی کارروائی کی اطلاع کیونکر ملے۔ اس کے لئے انھوں نے لشکر کے ایک شخص کو ملایا اور طے پایا کہ صرف رومال کے رنگ سے اطلاع دیا کرے، چنانچہ اخبار کا نمایندہ روزانہ جانسبرگ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر مخبر کو دیکھتا ہوا گزر جاتا تھا، زرد رومال اس امر کا اشارہ تھا کہ صلح موقوف ہوگئی ہے، سُرخ رومال اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ صلح قریب اور سفید رومال صلح طے پا جانے کے لئے تھا۔ چنانچہ اس نمایندہ کو سیکڑوں بار جانسبرگ اسٹیشن سے گزرنا پڑا اور جب اس کو سفید رومال نظر آیا تو اس نے اپنے اخبار کو اطلاع دی کہ

"میں نے آج تمھارے لئے ہزار حصے خرید لئے ہیں"

۶۔ جب مارٹینگ میں کوہ آتش فشاں پھوٹا اور شہر سان پیر تباہ ہوا تو نیویارک میں یہ خبر شایع ہوئی کہ

چار آدمی جو ہلاکت سے بچ گئے ہیں لیکن بہت مجروح ہیں نیویارک آرہے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں نے آتش فشاں کے مناظر کو خود دیکھا تھا اس لئے جب جہاز آیا تو اخباروں کے نمائندے وہاں پہونچے تاکہ ان سے ملکر حالات معلوم کریں۔ ایک اخبار کے نمائندے نے عجیب ترکیب کی، اس نے دوسرے اخبار کے نمائندوں سے کہا کہ وقت کم ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی کشتی میں ان آدمیوں کو اتار لیں اور راستہ میں ان سے سارا حال دریافت کرلیں۔ اس پر سب راضی ہوگئے۔ چنانچہ یہ ان مجروحین کے پاس گیا اور ان کو کشتی میں لے آیا، دوسرے اخباروں کے نمائندے بھی پیچھے پیچھے آرہے تھے تاکہ وہ بھی اسی کشتی میں سوار ہوں، لیکن جس وقت وہ سوار ہونے لگے تو ایک شخص نے ان کو روکدیا اور کہا کہ حکومت کی کشتی ہے اس پر اخبار کے نمائندے نہیں جاسکتے حالانکہ یہ سب اخبار کے نمائندے کی اختراع تھی اس طرح ایک اخبار کے نمائندے نے دوسرے اخبار والوں کے نمائندوں کو دھوکا دیکر سب سے پہلے اپنے اخبار کیلئے خبریں حاصل کرلیں۔

---

۷ ـــ ۱۸۹۸ء میں امریکہ اور اسپین کے درمیان جنگ ہونے سے قبل امریکہ کا ایک جہاز (مائن نامی) بندرگاہ ہوانا میں دفعتہً غرق ہوگیا اور یہ پتہ نہ چلا کہ اس کے غرق ہونے کا کیا سبب تھا۔ یعنی کسی تارپیڈو نے اسے غرق کیا یا خود اتفاقاً ڈوب گیا۔

نیویارک کے ایک اخبار نے اس کا سراغ لگانا چاہا اور معلوم کرنا چاہا کہ جو کمیشن اس تحقیق کے لئے بیٹھا ہے اس نے کیا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے اس نے اپنا نمائندہ بھیجا اور اس نے پتہ بھی چلا لیا کہ جہاز کے پہلو میں سوراخ ہوگیا تھا جو تارپیڈو سے پیدا ہوا تھا لیکن وہ اس خبر کو بھیجتا کیونکر سنسر روک دیتا اس لئے اس نے اخبار کے ڈیٹر کو ان الفاظ میں اطلاع دی کہ:۔

"جہازیاں غرق ہونے کے بعد ایک شخص نے غوطہ لگایا تو اسے ایک بڑا سوراخ جہاز کے پہلو میں نظر آیا وہ اس سوراخ میں داخل ہوگیا لیکن جب نکلنا چاہا تو نکل نہ سکا کیونکہ سوراخ کے کنارے آپس میں ملنے لگے۔ اس کا ایک ساتھی باہر انتظار کررہا تھا جب وہ دیر تک اوپر نہ ابھرا تو اس کو تشویش پیدا ہوئی اور اس نے غوطہ لگا کر اس کو نکالا"

نمائندہ نے خیال کیا کہ اڈیٹر صاحب اس سے سمجھ جائیں گے کہ جہاز کو تارپیڈو نے سوراخ کرکے ڈبویا ہے لیکن وہ ایسے صاحب عقل تھے کہ انھوں نے اس کو مزاح تصور کرکے نکات کے کالم میں درج کردیا۔

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام

سرودِ زندگی

(مسلسل)

گزشتہ تین اشاعتوں میں سرودِ زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ صرف جارحانہ پہلو رکھتا تھا یعنی اس وقت تک ہم نے ان کا صرف وہ کلام پیش کیا جو یکسر لغو و بے معنی ہے یا وہ جس میں کوئی مفہوم تو ہے لیکن شاعرانہ ادا نہیں کر سکا اور نظم کے اسقام نے اسے پایۂ اعتبار سے گرا دیا ہے۔ اب ہم اس حصۂ کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو نقائص سے تو ایک حد تک پاک ہے لیکن تغزل سے اسے کوئی واسطہ نہیں یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جس میں تصوف کے زیادہ عمیق جذبات زیادہ الجھے ہوئے الفاظ میں بیان نہیں کئے گئے ہیں۔ مثلاً

جو سلے اڑا اسے مجھے مستانہ وار ذوقِ سجود   بتوں کی صف سے اٹھا نعرۂ "انا المعبود"

شعر صاف ہے، اچھا ہے لیکن "انا المعبود" نے تغزل سے ہٹا کر اس کو تصوف میں داخل کر دیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں "اڑا" بے محل استعمال ہوا ہے۔ اڑنا بلندی کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے جس کا شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ مستانہ وار کی رعایت سے بجائے "اڑا" کے "لیجلا" کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اس سے زیادہ بلند اڑنے کی ضرورت نہ تھی۔

مذاقِ سیر و نظر کو کچھ اور وسعت دے   کہ ذرہ ذرہ میں ہے اک جہانِ نامشہود

ہر چند یہ شعر بھی تغزل سے بالکل علحدہ ہے اور وہی "قطرہ و دریا" اور "ذرہ و صحرا" والا فرسودہ و پامال متصوفانہ اندازِ بیان اس میں بھی پایا جاتا ہے، تاہم صاف ہے اور ذہن کو اسکے سننے سے تشویش پیدا نہیں ہوتی۔

اسی رنگ کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:-

تمام دفترِ حکمت الٹ گیا ہوں میں　　مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں

اڑا ہوں جب تو فلک پر لیا ہے دم جا کر　　زمیں کو توڑ گیا ہوں جو رہ گیا ہوں میں

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں　　سارا ڈبو دیا مجھے موجِ مئے طہور میں

اس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مے اچھال کر　　آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برقِ طور میں

ذرا تکلیفِ جنبش دستِ نگاہِ برق ساماں کو　　جہاں میں منتشر کر دے مذاقِ سوزِ پنہاں کو

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن پیدا　　لیے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی　　لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے　　اہلِ تپش کو آتشِ سینا نہ چاہیے

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب　　وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا　　اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی　　جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن　　آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

نالۂ دلخراش میں آہِ جگر گداز میں　　کون ستم طراز ہے پردۂ سوز و ساز میں

گم ہے حقیقت آشنا بندۂ وہم بے خبر　　ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

اس ہلکے رنگِ تصوف کے اشعار بھی سرودِ زندگی میں تقریباً اتنے ہی پائے جاتے ہیں، جتنے تصوفِ عمیق کے نہ سمجھ میں آنے والے اشعار اور اس لئے ان دونوں کو الگ کرنے کے بعد ایک بڑا حصہ مجموعہ کا ایسا نکل جاتا ہے جو حدودِ تغزل سے باہر ہے، لیکن کہیں کہیں اصغر صاحب نے فلسفۂ تصوف کی سماوی دنیا سے نیچے اتر کر اس عالمِ آب و گل کی بھی شاعری کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ خوب کی ہے مثلاً

کہاں خرد ہے کہاں ہے نظامِ کار اس کا　　یہ پوچھتی ہے تری نرگسِ خمار آلود

ترا جمال ہے، ترا خیال ہے، تو ہے　　مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

خیرگیِ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں　　اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت　　میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

نہیں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو ذوقِ عریانی　　کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

شکوہ نہ چاہیے کہ تقاضا نہ چاہیے　　جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیے

اب[1] جو کچھ گزرنا ہو جان پر گزر جائے ... جھاڑ کر اٹھے دامن اس کے آستانے سے
ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی ... نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
طبیعت خود بخود آمادۂ وحشت تھی اے اصغر ... ہوائے فصل گل نے اور بھی اسیر قیامت کی
جسے لینا ہو آ کر اس سے اب درس جنوں لے لے ... سنا ہے ہوش میں ہے اصغر دیوانہ برسوں سے
یکایک توڑ ڈالا ساغر مے ہاتھ میں لے کر ... کہ ہم بھی مزاج نرگس رعنا سمجھتے ہیں
دل پہ لیا ہے داغ عشق کھو کے بہار زندگی ... اک گل تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۱۰۲ صفحات پر شایع ہوا ہے لیکن باوجود اس قدر مختصر ہونے کے قیمت اس کی دو روپیہ رکھی گئی ہے جو بہت زیادہ ہے۔ کاغذ، طباعت دونوں خوب ہیں لیکن کتابت اچھی نہیں ہے۔ جو صاحب اس کے مطالعہ کا ذوق رکھتے ہوں وہ دفتر ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد کے پتہ پر اصغر صاحب سے طلب کر سکتے ہیں۔

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ۱۰۰۰ صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب، نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً ۲۰۰ مسائل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا، چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:-

مسئلۂ جبر و اختیار - خواب کی حقیقت - معاد و خلود - طبقۂ نسواں اور رنگ نگوئی - برج بابل - فاسست جماعت - سامری کون تھا - باغ ارم کی حقیقت - فلسفۂ محبت - بھوت پریت - اصحاب کہف - سالوشین آرمی - ہالہ کا سبب - معجزہ و کرامات - فرقۂ معتزلہ - مذہب و عقل - طوفان نوح - یاجوج و ماجوج - برہمو سماج - طبقۂ نسواں اور تعلیم - مریخ کی حقیقت - منصور حلاج - چند الفاظ کی تحقیق - اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے للعہ - غیر خریداران سے ۲ ؎

---

[1] اس شعر میں لفظ "جو" دبتا ہے اور یہ کوئی معمولی نقص نہیں۔

دُنیا کی ایک عجیب و غریب گیس

ہلیوم

جو پانی کو برف پر کھولا دیتی ہے

کئی سال اس طرف کی بات ہے کہ امریکہ کی وزارت بحریہ کا ایک چھوٹا سا غبارہ اپنے اسٹیشن پر اتر رہا تھا کہ ہوا کا رُخ تبلانے والے ستون سے اُلجھ گیا اور اس کا غلاف پھٹ کر ہلیوم گیس جس کی مقدار ۲۵۰۰۰ مکعب فٹ تھی نکل گئی۔

اگر یہ حادثہ اور دس سال قبل واقع ہوتا تو آپ کو معلوم ہے کہ وزارت بحریہ کا کتنا نقصان ہوتا؟ ستر لاکھ گنی کا! کیونکہ یہ گیس اُس وقت تقریباً نایاب تھی اور سوائے ان تجربہ گاہوں کے جہاں تحلیل کیمیاوی کا کام ہوتا ہے کہیں اور نہیں پائی جاتی تھی۔ اُسوقت غبارہ میں ہائیڈروجن گیس بھری جاتی تھی جو ہوا سے زیادہ ہلکی ضرور ہے لیکن اس میں سخت عیب یہ ہے کہ فوراً مشتعل ہو جاتی ہے۔

لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں کیونکہ ہلیوم گیس بکثرت پیدا ہونے لگی ہے اور اتنی ارزاں ہے کہ چند سکوں میں پیپہ کا پیپہ بھر سکتا ہے، چنانچہ اب غباروں میں اسی سے کام لیا جاتا ہے۔

اول اول اس گیس کا وجود صرف آفتاب میں معلوم ہوا تھا لیکن بعد کو خود اس کی معدنیں یہیں زمین پر دریافت ہو گئیں اور نہایت آسانی سے اس کی بڑی مقدار حاصل ہونے لگی۔ لیکن یہ خوش قسمتی صرف امریکہ کی قسمت میں لکھی تھی کیونکہ اسوقت یہی تنہا ملک ایسا ہے جہاں یہ گیس پیدا ہوتی ہے اور جس کی برآمد کے متعلق سخت قوانین وضع کئے گئے ہیں۔

ہلیوم لفظ ہلیوس سے مشتق ہے جس کے معنی یونانی زبان میں آفتاب کے ہیں۔ اس گیس میں نہ کوئی بُو ہے نہ کوئی رنگ و مزہ۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ آگ کو قبول نہیں کرتی اور وزن

اُٹھانے میں بھی ہیڈروجن گیس سے ۹۲ فی صدی زیادہ بہتر ثابت ہوئی ہے۔

سب سے پہلے ۱۸۶۸ء میں تحلیل طیفی (مثلثی شیشے کے ذریعہ سے نور آفتاب کی تحلیل) کے ذریعہ سے پتہ چلا تھا کہ اس گیس کا وجود آفتاب میں پایا جاتا ہے، لیکن ۱۸۹۵ء میں کرۂ ارض پر بھی اس کا پایا جانا ثابت ہوا اور معدنیں دریافت ہو گئیں۔

چونکہ یہ گیس ہیڈروجن سے زیادہ ہلکی ہے اس لئے غباروں اور فضائی[1] جہازوں میں اب اسی سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے غیر مشتعل ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس میں انگارہ بھی ڈال دیا جائے تو اشتعال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے قبل جب ہیڈروجن گیس سے کام لیا جاتا تھا تو حد درجہ احتیاط آگ کی کیجاتی تھی چنانچہ جب گراف زپلین نے جرمنی سے امریکہ کا سفر کیا تو اس کے اندر سوار ہونے والوں کو سگریٹ تک پینے کی ممانعت تھی اور کھانا پکانے کے لئے بھی صرف بجلی کی حرارت سے کام لیا جاتا تھا۔ جسوقت یہ اسٹیشن لکہرسٹ پر اترا تو لوگوں کا بڑا ہجوم دیکھنے کے لئے موجود تھا لیکن ہر جگہ بڑے بڑے تختوں پر جلی حرفوں سے یہ ہدایت لکھی ہوئی تھی کہ "کوئی صاحب سگریٹ یا سگار نہ پئیں" اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کے اندر ہیڈروجن گیس بھری ہوئی تھی۔

ہلیوم گیس سے اور بھی بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ ریڈیو کے قمقموں نیز ان بڑے بڑے برقی قمقموں کو جو آلات بحری یا دیگر آلات علمی میں استعمال ہوتے ہیں اسی گیس سے بھرتے ہیں۔ ڈائنا مو اور دوسرے تیز حرکت کرنے والے آلات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی اسی گیس سے کام لیا جاتا ہے، کیمیائی طور پر چیزوں کو خشک کرنے میں بھی یہ گیس کام دیتی ہے، ایک اہم خدمت اس سے اس تشنج کے دور کرنے میں بھی لیجاتی ہے جو غوطہ خوروں پر سمندر کی تہ سے اوپر ابھرنے کے وقت ان پر طاری ہوتا ہے۔

چونکہ ہلیوم گیس کسی رقیق چیز میں حل نہیں ہو سکتی اس لئے غوطہ خوروں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہوا میں نیٹروجن گیس بھی شامل ہے اور غوطہ خور کے خون میں وہ بھی پانی کے دباؤ سے ہوا کے ساتھ پہونچتی رہتی ہے اس لئے جب غوطہ خور سطح پر آتا ہے اور پانی کا دباؤ کم ہوتا ہے تو نیٹروجن دفعتاً باہر نکلنا چاہتی ہے اور اس طرح اس کے جسم میں سخت تشنج پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ ہلیوم کسی رقیق چیز میں حل نہیں ہوتی اس لئے اب آکسیجن کے ساتھ ہلیوم گیس ملا کر غوطہ خوروں کے خون میں تنفس

---

[1] فضائی جہاز سے مراد وہ جہاز ہیں جو گیس کی مدد سے غبارہ کی صورت میں پرواز کرتے ہیں اور ہوائی جہاز سے مراد وہ جہاز ہیں جو پٹرول کی مدد سے چلتے ہیں اور عام طور پر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔

کے ذریعہ سے پہونچائی جاتی ہے اور اس طرح نیٹرجن کے عذاب سے انھیں نجات حاصل ہوگئی ہے۔

ابھی ہم نے بیان کیا ہے کہ بعض علمی آلات میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے چونکہ اس گیس میں چپکی یا لزوجیت بھی بہت ہے اس لئے اُن آلات کے لئے جو مقیاس کا کام دیتے ہیں بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مقیاسوں یا میٹروں کی سوئیاں اسقدر نازک توازن کے ساتھ قایم کیجاتی ہیں کہ وہ ذراسی ہوا کے دباؤ سے دیر تک جنبش کرتی رہتی ہیں اس کے بعد کہیں وہ اس خط پر جاکر ٹھہرتی ہیں جہاں انھیں ٹھہرنا چاہئے۔ لیکن اب ہلیوم کے دباؤ سے یہ نقص دور ہوگیا ہے اور میٹر کی سوئیاں بہت جلد صحیح خط یا نشان پر قایم ہو جاتی ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن[1] (لاسلکی آنکھ) کے قمقموں میں بھی ہلیوم گیس بھری جاتی ہے، کیونکہ اس کی مدد سے ایک فایدہ تو یہ ہے کہ برقی رو ایک ہی سمت میں جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے برقی قمقموں کا اشتعال بہت قوی ہو جاتا ہے۔

یہ گیس حرارت کو بھی نہایت تیزی سے منتقل کرتی ہے یعنی ہوا سے چھ گنا زیادہ۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے کمرے میں پہونچ جائے جو ہلیوم گیس سے بھرا ہو تو وہ شدید جھٹکا محسوس کرے گا، کیونکہ گیس کپڑوں کے اندر داخل ہو کر جسم کی حرارت کو دفعۃً باہر لے آئے گی۔ یہ گیس خود بھی بہت حرارت کھینچتی ہے یہاں تک کہ خارجی حرارت اس کے اندر جذب ہونے کے بعد بھی اس کا درجۂ حرارت نہیں بڑھتا اس لئے ڈینامو وغیرہ نہایت تیز حرکت کرنے والے آلات کی گرمی کم کرنے کے لئے اسی گیس سے کام لیتے ہیں کیونکہ یہ خارجی حرارت کو جذب کرلیتی ہے اور خود زیادہ گرم ہوتی نہیں۔

یہ چیزوں کو خشک بھی بہت جلد کر دیتی ہے کیونکہ پانی اور دوسری سیال چیزوں کو فوراً بخار بنا کر اُڑا دیتی ہے۔

اس گیس کی ایک عجیب و غریب خاصیت یہ بھی ہے کہ سردی پہونچنے پر بجائے گیسی حالت سے رقیق ہو جاتی ہے چنانچہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ جب حرارت کم ہو کر صفر سے ۴۵۰ درجے نیچے تک پہونچ جاتی ہے تو ہلیوم پگھل جاتی ہے۔ اور برودت کا یہ درجہ وہ ہے جہاں پارہ بھی جم کر لوہے کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔

---

[1] ٹیلی ویژن (Television) سے مراد ہے دور کی چیزوں کا مشاہدہ۔ یعنی جس طرح لاسلکی سے دور کی آواز سنائی دیتی ہے اسی طرح دور کی صورت بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا نام میں نے "عین لاسلکی" یا "لاسلکی آنکھ" تجویز کیا ہے

جب سٹر برڈ سرزمین قطبیہ جنوبی کی تفتیش میں مصروف تھے تو رقیق ہیلیوم کی کچھ مقدار برف پر گر پڑی اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ گرم پانی کی طرح ابلنے لگی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کی برودت کے مقابلہ میں برف اتنا گرم ثابت ہوا کہ وہ جوش میں آگئی۔

یہ گیس خود ایک مستقل عنصر ہے جو دوسرے عناصر کیمیاوی سے نہیں ملتا۔ البتہ ایک بار پروفیسر کامٹن کے تجربہ میں یہ بات ضرور آئی کہ جس وقت انھوں نے پارہ اور ہیلیوم کو ایک نلکی کے اندر رکھ کر فوق البنفسجی شعاعیں ڈالیں تو دونوں ایک ذات ہوگئے

جنگ عظیم سے قبل سنہ ۱۲ء میں ہیلیوم کی مقدار صرف ۱۵ مکعب فٹ پائی جاتی تھی اور لیڈن کے ایک سائنس داں پروفیسر نسٹن کے پاس پائی جاتی تھی، اسوقت اس کی قیمت کا اندازہ ۶ ہزار گنی کیا جاتا تھا۔

دول یورپ اور امریکہ کو جس واقعہ نے اس گیس کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا وہ یہ ہے کہ دوران جنگ میں ایک انگریز ہوا باز نے جرمنی کے زپلین جہاز کا تعاقب کیا اور اس پر مشین گن چلائی لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب غبارہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر اڑتا رہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جرمنی نے عجیب غبارے بنائے ہیں جن پر گولی اثر نہیں کرتی۔ اس کی خبر جب ان کے افسر کو معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا کہ غبارہ میں ہیلیوم گیس بھری ہوگی اور اسی وقت تمام دول یورپ کو اس طرف توجہ ہوگئی اور تلاش شروع ہوئی کہ یہ گیس کہاں مل سکتی ہے۔ امریکہ کے علماء طبقات الارض نے ڈھونڈھ کر پتہ چلایا کہ صوبہ ٹکساس کے اندر اسکا وجود پایا جاتا ہے چنانچہ کام شروع کر دیا گیا اور ۵۰ بیپے اس کے فرانس روانہ کئے گئے تاکہ جاسوس غباروں میں ان سے کام لیا جائے لیکن خود امریکہ میں سنہ ۲۰ء تک اس سے غبارے بھرنے کا کام نہیں لیا گیا۔ اس کے بعد شہر ڈکسٹر (صوبہ ٹکساس) میں بالکل اتفاق سے اس کی معدن ایک اور دریافت ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں دو مزدور تیل کے معدن میں زمین کھود رہے تھے کہ ۵۰۰ فٹ کی گہرائی پر انھیں دفعۃً ایک گیس کثیر مقدار میں نظر آئی لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ اس سے ایندھن کا کام لینا موزوں ہوگا اس کو مشتعل کرنا چاہا لیکن وہ مشتعل نہ ہوئی، آخر کار جب امتحان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں دو فیصدی ہیلیوم گیس پائی جاتی ہے چنانچہ اسی جگہ ایک اور کارخانہ قائم کر دیا گیا، جو روزانہ پندرہ ہزار مکعب فیٹ ہیلیوم گیس وہاں سے نکالتا ہے۔ اور اس کے بعد اور بہت جگہ اسی کے قرب وجوار میں اسکے چشمے دریافت ہوگئے۔ ہیلیوم گیس زیادہ تر معمولی گیس کے ساتھ ملی ہوئی پائی جاتی ہے اور اسکے نکالنے کی ترکیب یہ ہے کہ معمولی گیس کو بڑے بڑے برتنوں میں بھر کر اس پر دباؤ ڈالا جاتا ہے یہاں تک کہ درجۂ حرارت صفر سے ۳۰۰ درجے نیچے پہونچ جاتا ہے۔ برودت کے اس درجہ میں تمام گیسیں پانی ہو جاتی ہیں اور صرف ہیلیوم اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا ہے جس کو وہ علحدہ کر کے پیپوں میں بھر لیتے ہیں اور پرواز گاہوں تک پہونچا دیتے ہیں۔

غریب لڑکی

ہاں اُس شام کی یاد میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی جب میں آدھے گھنٹے تک سراپا اضطراب بنا ہوا اس طرح لرزہ براندام تھا جیسے کوئی کسی معدن کا ہولناک راستہ طے کر رہا ہو، اس لئے کہ میں نوع انسانی کی انتہائی مصیبتوں سے دوچار ہو رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ بعض حالات میں انسان پاک زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

رات آدھی سے کچھ زیادہ ختم ہو چکی تھی، ایک جماعت چھتریاں لگائے ہوئے گزر رہی تھی اور میں بھی پیچھے پیچھے جا رہا تھا، بارش موسلا دھار ہو رہی تھی جو برقی قمقموں کے لئے نقاب کا کام دے رہی تھی، اور سڑکوں کو دہشتناک بنائے ہوئے تھی، فٹ پاتھ چمک رہا تھا، اور نمی کی حد سے گزر چکا تھا، لوگ بغیر کسی طرف دیکھے، آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

پیشہ ور لڑکیاں اپنے دامنوں کو اٹھائے ہوئے اپنے ٹخنے دکھا رہی تھیں اور ان کے سفید موزے رات کی دھیمی دھیمی روشنیوں میں چمک رہے تھے، یہ دروازوں پر کھڑی انتظار کر رہی تھیں بعض مرد بلا رہی تھیں اور بعض جو دلیر تھیں آ آ کر چلنے والوں سے دھینگا مشتی کرتیں اور ان کے کانوں میں اخلاق سوز باتیں کہکر ان کو پوری طرح مشتعل کرتیں، یعنے راہ چلنے والوں کا کچھ دور تک پیچھا کرتیں، انہیں دھکا دیتیں اور اپنی ناپاک سانسیں ان کے چہروں تک پہونچاتیں اور جب وہ دیکھتیں کہ ان کی شوخیاں بے سود ہیں تو وہ یکایک ان کو چھوڑ کر کمر لچکاتی ہوئی واپس آ جاتیں۔

میں چلا جا رہا تھا اور بعض لڑکیاں مجھے پکار رہی تھیں بعض آستینیں پکڑ کر کھینچ رہی تھیں اور میں سخت پریشان تھا، اچانک میں نے دیکھا کہ تین سہمی ہوئی لڑکیاں آپس میں جلد جلد گفتگو کر رہی ہیں دوسری لڑکیاں بھی اپنے لبادوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے بھاگنے لگیں، غالباً اس دن پولیس پر کوئی خاص آفت آئی تھی۔

یکایک میں نے اپنے بازوؤں میں کسی کا ہاتھ محسوس کیا، اور ایک وحشت زدہ آواز کان کے قریب کہتے ہوئے سنائی دی، "مجھے بچائیے! مجھے چھوڑ دیئے نہیں"۔ میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا، اس کی عمر

بیس برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی میں نے اس سے کہا "اچھا میرے ساتھ ہو" اور اس نے دھیمی آواز میں کہا "شکریہ!" آگے چل کر پولیس کا سامنا ہوا اور وہ مجھ سے الگ ہو گئی آگے بڑھکر وہ مجھ سے پھر ملی اس نے کہا "کیا آپ میرے مکان چل سکتے ہیں؟" میں نے کہا "نہیں" اس نے کہا "کیوں نہیں! آپ نے تو مجھ پر وہ احسان کیا ہے جسے میں بھول ہی نہیں سکتی" میں نے کہا "چونکہ میں شادی شدہ ہوں اسوجہ سے تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا" اس نے کہا کہ "اس میں مضائقہ ہی کیا ہے" میں نے کہا "اے لڑکی، بس یہ کافی ہے کہ میں نے تجھے مصائب سے بچا دیا اب مجھے جانے دے"

سڑک سنسان، تاریک، اور دشوار گزار تھی، یہ عورت جو میری باہوں کو تھامے میرے احساس غم کو شدید تر بنا رہی تھی چاہتی تھی کہ مجھے لپٹا لے لیکن میں ڈر سے سکڑا جاتا تھا۔ آخر ش اس نے سخت لہجہ میں کہا کہ "تم کہنا کیوں نہیں مانتے" اور اس کے بعد ہی رونے لگی، میں کچھ نہیں سمجھ سکا کہ معاملہ کیا ہے میں نے پوچھا "کہو، صاف صاف بتاؤ تم کیا چاہتی ہو" اس نے جواب دیا "کاش تم جانتے کہ میری موجودہ زندگی اچھی نہیں ہے" میں نے کہا "تو تم نے اسے اختیار ہی کیوں کیا" وہ بولی کہ "یہ میرا قصور نہیں ہے" میں نے پوچھا "پھر کس کا ہے" اس کے جواب میں اس نے اپنی سرگزشت مجھے سنائی۔

"میں سولہ برس کی تھی جب میرے والدین کا انتقال ہوا اور چونکہ میرا کوئی سرپرست نہ تھا اسی لئے میں نے ایک شخص مسٹر لیر بیل کے یہاں جو غلہ کی تجارت کرتے تھے نوکری کر لی، میں نے دیکھا کہ میرا مالک مجھے خاص انداز سے دیکھتا اور کبھی کبھی میرے گالوں کو بھی چھو لیتا تھا میں سمجھتی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ چونکہ مسٹر بیل ایک بوڑھے متقی اور ہر اتوار کو گرجا جانے والے آدمیوں میں سے تھے اس لئے مجھے یقین نہ آیا کہ وہ بھی ایسے ہونگے لیکن ایک دن ایسا بھی آیا جب مجھے اس کا یقین کرنا پڑا۔

سامنے ہی ایک پنساری مسٹر ڈنسٹن کی دوکان تھی ان کے یہاں انٹونی نامی ایک نہایت خوشرو لڑکا رہا کرتا تھا میں اس کو دیکھ کر مجبور ہو گئی کہ اسے محبت کرنے کا موقع دوں اور یہ ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، کیا یہ جھوٹ ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس کے لئے شام کے وقت دروازہ کھلا رکھنے لگی تاکہ وہ اندر آسکے۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ مسٹر لیر بیل آہٹ پاکر میرے پاس پہونچے اور انٹونی کو دیکھ کر اسے مار ڈالنا چاہا اور دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی اور میں موقع پاکر باہر بھاگ گئی اور اس طریقہ سے باہر رہنا سیکھا۔

میں ڈر رہی تھی اور مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ان میں سے ضرور کوئی مارا گیا ہے اور پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے میں لندن کے راستہ پر جا پہونچی اور میں نے خیال کیا کہ وہاں پہونچ کر میں چھپ سکوں گی۔

رات اتنی اندھیری تھی کہ میں گڑھوں کو نہ دیکھ سکتی تھی البتہ کتّوں کو کھلیان میں بھونکتے سن رہی تھی، غالباً آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ رات میں کیسی کیسی آوازیں سنائی دیتی ہیں، پرندے اس طرح بولتے ہیں جیسے کوئی آدمی قتل کیا جا رہا ہو، جانور بھی بھیانک طور پر چیختے ہیں، میں بہت خایف تھی اور ہر ہر قدم پر سینہ کے اوپر صلیب کا نشان بناتی جا رہی تھی۔ جب صبح ہوئی تو پولیس کا خیال میرے سامنے تھا اس لئے مجھ سے جہاں تک بن پڑا دوڑتی رہی، کچھ دور دوڑنے کے بعد مجھے بھوک معلوم ہونے لگی لیکن میرے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی اور اپنی ساری پونجی اٹھارہ فرنک کی مکان ہی پر بھول آئی تھی۔

گرمی کافی تھی دوپہر کا وقت بھی گزر چکا تھا لیکن میں چلتی رہی، اچانک میں نے چند گھوڑوں کی آواز سنی، پلٹ کر دیکھا تو پولیس کے چند سوار تھے، میرا دوران خون تیز ہوگیا اور میں نے سمجھا کہ وہ پکڑ لیں گے، کیونکہ وہ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے ان کے افسر نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کہاں جا رہی ہوں میں نے کہا کہ رؤن میں مجھے ایک نوکری ملی ہے اور میں اسی غرض سے وہاں جا رہی ہوں اس نے پھر دریافت کیا کہ کیا میں اسی طرح ٹہلتی ہوئی جاؤں گی میں نے کہا کہ ہاں

میرا دل اتنا دھڑکنے لگا کہ میں کچھ اور نہ کہہ سکی، میں یہ سمجھنے لگی کہ یہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے اس لئے بھاگ جانے کی خواہش اتنی قوی ہوگئی کہ میرے پاؤں رقص کرتے معلوم ہونے لگے لیکن میں اس خیال سے نہ بھاگی کہ وہ لوگ مجھے فوراً پکڑ لیتے۔

اس نے کہا "ہم لوگ بھی اسی راستے چل رہے ہیں اس لئے برنیٹن تک ساتھ چلیں تو بہتر ہے"، میں نے جواب دیا کہ بخوشی۔

ہم لوگ آپس میں بات چیت کرتے رہے اور میں اپنے کو جتنا خوش مزاج بنا سکی بنایا حتی کہ جھوٹی باتوں کو بھی انھوں نے باور کیا، جب ہم لوگ ایک جنگل سے ہو کر گزرے تو افسر نے کہا کہ بہتر ہوتا ہم لوگ یہاں ٹھہر جاتے اور گھاس پر آرام کر لیتے، میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا کہ جیسی مرضی۔

وہ سپاہی گھوڑے سے اترا اور اپنا گھوڑا دوسرے ساتھی کے حوالہ کیا اور ہم دونوں جنگل میں چلے گئے اب میں کیا کہہ سکتی تھی اگر آپ ہی میری جگہ ہوتے تو کیا کر لیتے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ "مجھے اپنے ساتھی کو بھولنا نہیں چاہئے"، یہ کہکر وہ تو گھوڑوں کے پاس چلا گیا لیکن دوسرا مجھ تک آگیا مجھے اتنی شرم معلوم ہوئی کہ اب میں کیا کہوں، لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ اس کے بعد ہم لوگ پھر چلنے لگے مجھے اتنا غم تھا کہ راستے میں کوئی بات نہ کی، مجھے بھوک بھی اتنی لگی تھی کہ ایک قدم چلنا دشوار تھا، لیکن ایک گاؤں پہونچکر انھوں نے مجھے ایک گلاس شراب پلائی اور مجھ میں تھوڑی دیر کے لئے ایک نئی قوت پیدا ہوگئی تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں

گھوڑوں کو ایڑ لگا کر روانہ ہو گئے اور میں ایک گڑھے کے پاس بیٹھ کر اتنا روئی کہ آنسو خشک ہو گئے۔
تین گھنٹے اور چلنے کے بعد میں روئن پہونچی، جب میں وہاں پہونچی تو شام ہو چکی تھی، پہلے پہل روشنیوں کی وجہ سے میری آنکھیں خیرہ ہونے لگیں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آرام کرنے کے لئے کہاں بیٹھوں راستے میں تو خیر کم سے کم گھاس تھی جس پر پڑ کر سو بھی سکتی تھی لیکن یہاں اس کی بھی امید نہ تھی۔

میرے اعضاء میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ میں کھڑی رہ سکوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گری اور تب گری، اس کے بعد بارش ہونے لگی، میں سڑک پر چل رہی تھی اور ہر گھر کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہتی جاتی تھی کہ ان مکانوں میں تو نرم نرم گدے اور اچھے اچھے کھانے ہیں اور میں بد قسمت ایسی کہ خس و خاشاک کا بستر اور سوکھی روٹی میسر نہیں۔

میرا گزر ایسے راستے سے ہوا کہ جہاں چند عورتیں مردوں سے باتیں کر رہی تھیں، میں بھی مجبوراً دوسری عورتوں کی طرح مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگی، لیکن کسی نے التفات نہ کیا۔ غالباً آدھی رات گزر چکی تھی کہ ایک آدمی میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں رہتی ہوں اب جھوٹ بولنا ضروری تھا میں نے کہا کہ "میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں اس لئے تمھیں میں اپنے گھر نہیں لیجا سکتی ہاں یہاں اور تو کوئی ایسی جگہ ضرور ہوگی جہاں ہم لوگ جا سکیں" اس نے کہا "میں تو آئے دن اس طرح کے کمروں کے لئے خرچ کرتا ہی رہتا ہوں چلو میں تمھیں ایک پر سکون جگہ لے چلوں۔ اس نے مجھے ایک پل سے ہو کر گزرنے کے لئے کہا اور اس کے بعد شہر سے دور ایک سبزہ زار میں جو ندی کے کنارے واقع تھا لے گیا، میرے لئے سوائے اس کے کہ پیچھے پیچھے چلی چلوں چارۂ کار ہی کیا تھا، اس نے مجھے بیٹھایا اور چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ چونکہ میں بہت تھکی ہوئی تھی اس لئے سو گئی وہ مجھے بغیر کچھ معاوضہ دئے ہوئے چلتا بنا، جب اٹھی تو آنکھ تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور چونکہ رات بھر گیلی زمین پر سوتی رہی تھی اسلئے آجتک بعض لاعلاج امراض میں مبتلا ہوں۔

آخر کار وہاں سے مجھے پولیس کے دو افسروں نے اٹھایا اور جیلخانہ لے گئے مجھے وہاں آٹھ روز رہنا پڑا اور اسی اثنا میں وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں، میں نے برے انجام کے خوف سے انھیں کچھ نہ بتایا لیکن انھیں واقعات معلوم ہو ہی گئے اور مجھے بے گناہ سمجھ کر رہا کر دیا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ معاش کی فکر کروں، میں نے چاہا کہیں نوکری مل جائے لیکن میں قید سے چھوٹی تھی اس لئے یہ ممکن نہ ہوا، آخر یاد آیا کہ جج جس نے مقدمہ کا فیصلہ کیا تھا وہ بھی مسٹر ل ہی کی طرح کا آدمی معلوم ہو رہا تھا، میں اس کی تلاش میں چل پڑی اور میرا خیال صحیح نکلا اور اس نے چلتے وقت مجھے سو روپیہ دئے اور کہا کہ تم جب آؤگی اتنا ہی ملا کرے گا، لیکن ہفتہ میں دو بار سے زیادہ نہ آنا،

میں سمجھ گئی کہ یہ پابندی صرف اس کی کہن سالی کی وجہ سے ہے ۔

جناب! آپ نے سمجھا کہ میں کیا کرتی تھی؟ میں فکر معاش میں سڑکوں پر گھوما کرتی تھی۔ میں منچلے لوگوں کو پہلی ہی نظر میں تاڑ لیتی اور سمجھ جاتی تھی کہ اب یہ پھنسیگا یہ نزدیک آکر یوں کہنا شروع کرتے :-

"مس صاحبہ سلام"

میں کہتی — "سلام صاحب سلام"

وہ کہتے — "اس طرح کہاں جا رہی ہو؟"

میں کہتی — "گھر واپس جا رہی ہوں"

وہ کہتے — "کیا تمھارے گھر والے دور رہتے ہیں؟"

میں کہتی — "ہاں کچھ دور تو ضرور رہتے ہیں"

اس کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے اور میں بھی اپنی چال کو ذرا دھیمی کرلیتی تاکہ وہ کچھ کہہ سکے۔ اسکے بعد وہ میری تعریف کرتا اور اپنے ساتھ گھر جانے کی دعوت دیتا، میں پہلے انکار کرتی بعد کو راضی ہو جاتی، اس طرح روزانہ صبح کے وقت میں دو تین شکار پھنسا لیتی اور شام کو آزادانہ زندگی بسر کرتی یہ تھا میری زندگی کا بہترین حصہ — لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انسان زیادہ عرصہ تک اطمینان کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، یہ میری بدقسمتی تھی کہ دنیا کے ایک متمول شخص سے میری ملاقات ہوئی یہ ایک بوڑھا پریذیڈنٹ تھا، اس کی عمر تقریباً بچھتر سال تھی شام کے وقت وہ مجھے قریب ہی کے ہوٹل میں کھانا کھلانے لیگیا اور وہاں جاکر اسنے حد سے زیادہ وحشت شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھانا ختم ہوتے ہوتے وہ مرگیا — چونکہ میرا کوئی پرسان حال نہ تھا مجھے تین ماہ قید خانے میں کاٹنے پڑے اس کے بعد میں پیرس آئی لیکن جناب یہاں مشکل کا سامنا ہے زندگی دوبھر ہے، کھانا ملنا آسان نہیں یہاں بہتیری پڑی ہیں اور اسی وجہ سے زیادہ خرابی ہے، لیکن ہر شخص اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہے، ہے کہ نہیں؟

وہ خاموش ہوگئی میرا دل دکھ رہا تھا لیکن میں اسکے ساتھ چل رہا تھا، یکایک وہ مجھ سے کہنے لگی "تو کیا میرے ساتھ گھر نہ چلوگے؟" میں نے کہا "نہیں میں نہیں جاؤنگا، میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں" اسنے کہا "اچھا خدا حافظ مجھے تم سے کچھ رنج نہیں بلکہ میں تمھاری شکرگزار ہوں لیکن اتنا بتائے دیتی ہوں کہ تم غلطی پر ہو" یہ کہکر وہ بارش میں جو کہ تعاقب کا کام دیرہی تھی چلتی بنی میں نے اسے ایک برقی قمقمے کے نیچے گزرتے اور بعدہ اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھا، غریب لڑکی!

(ڈی ماپاساں)

سید احمد بہاری

یہ ترجمہ ہے "ڈی ماپاساں" کے ایک مختصر سے افسانہ کا جس میں اسنے بتایا ہے کہ عورت کی اخلاقی خرابی کی ذمہ داری کس حد تک مرد پر عاید ہوتی ہے اور اس باب میں وہ کتنی مظلوم واقع ہوئی ہے، چونکہ ہندوستان کی عورت بیدار ہو رہی ہے اس لئے قبل اس کے کہ وہ تقصیر کا جواب تقصیر سے دے، یہاں کے مردوں کو بھی اپنے اخلاق کا جائزہ لے لینا ضروری ہے کیونکہ اپنی اور دوسروں کی صحیح ذمہ داری کا احساس انسان میں اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ پہلے احتساب نفس کی منزل سے گزر جائے۔ نیاز

سوئٹزرلینڈ کے وفاق کی چند خصوصیات

(Federation)

سوئٹزرلینڈ کا آئین حکومت اصول فیڈریشن کی صحیح ترین عملی تفسیر ہے۔ عوام یا دوسرے لفظوں میں انتخاب کنندگان خود ہی اپنے ملک کے حکمراں ہیں۔ بعض ملی ضرورتوں کی بنا پر انھوں نے ایک مرکزی حکومت بنائی اور اس حکومت کو بہت سے فرائض سونپ دئے۔ مرکزی حکومت کے علاوہ انھوں نے ملک کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا اور ان صوبجاتی حکومتوں کو بھی اہم آئینی ذمہ داریاں تفویض کیں۔ مرکزی اور صوبہ کی حکومتیں اپنے اپنے طور پر ذمہ دارانہ طریق سے حکمرانی کرتی ہیں مگر وہ خود اپنے ووٹ دینے والوں کی رائے کی محتاج ہیں۔
پھر مرکزی حکومت اور صوبہ کی حکومتوں کے مابین ایک مخصوص قسم کا تعلق ہے۔ صوبوں کو جنھیں سوئٹزرلینڈ کی آئینی اصطلاح میں کینٹن کہتے ہیں حکمرانی کے وہ تمام حقوق و اختیارات ([illegible]) حاصل ہیں جو ملک کے دستور اساسی کی رو سے مرکزی حکومت کو نہیں دئے گئے۔ مرکزی حکومت ان معینہ اختیارات کو استعمال کرتی ہے جو ملکی دستور نے اسے تفویض کئے ہیں اور کینٹنوں کی حکومتیں ان تمام اختیارات (——) پر دسترس رکھتی ہیں جو کینٹنوں کے باشندوں نے دئے ہیں اور جو فیڈرل آئین نے [illegible] نہیں۔ اس طرح قوم اور مرکزی حکومت دونوں میں سے کوئی ایک بھی مطلق العنان نہیں رہا۔ البتہ دونوں اپنی جگہ آئینی طور پر ذمہ دار ضرور ہوگئے — جہاں تک کینٹنوں کے اختیارات کی وسعت کا تعلق ہے، سوئٹزرلینڈ کا آئین انھیں ذاتی مملکت، ان کا اختیار حکمرانی، ان کا دستور، ان کی آزادی اور [illegible] کے عام حقوق دیتا ہے۔ کینٹن اس کے مجاز ہیں کہ وہ فیڈریشن سے اپنے اپنے دستور اساسی کے تحفظ کا مطالبہ کریں اور یہ آئینی طور پر مسلم ہے کہ فیڈریشن کی طرف سے اس قسم کے مطالبوں کے جواب میں ہر اس دستور اساسی کا تحفظ کیا جائے گا جس میں فیڈریشن کے دستور کے متضاد کوئی چیز نہ ہو، جس کی رو سے جمہور کو سیاسی حقوق کے استعمال کی آزادی ہو، جو عوام کی طرف سے منظوری پا چکا ہو اور جس میں ان کی مرضی کے مطابق ہر وقت ترمیم و تنسیخ ہو سکے۔

ایک اور اہم چیز یہ بھی ہے کہ فیڈریشن بدامنی کے موقعوں پر ریاستوں میں دخل اندازی کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتی ہے۔ کینٹونوں کی طرف سے کسی درخواست کا انتظار کئے بغیر وہ کسی وقت بھی امن و امان بحال کرنے کے لئے مداخلت کر سکتی ہے۔ اس خیال سے کہ خانہ جنگی کا کوئی امکان باقی نہ رہے، کینٹونوں کو آپس میں سیاسی معاہدے کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ گو وہ دیگر امور پر معاہدے کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان معاہدوں میں کوئی بات فیڈریشن کے آئین کے خلاف نہ ہو۔ تنازعہ فیہ امور فوراً فیڈریشن کے آگے رکھے جاتے ہیں اور انفرادی طور پر کینٹونوں کو کوئی عملی قدم اُٹھانے کا حق نہیں رہتا۔

آئین کے ادارے

کینٹون

سوئٹزرلینڈ کی آئینی حکومت کی بنیاد کینٹونوں کے سیاسی اُصولوں اور ان کے طریق کار پر قایم ہے ظاہر ہے کہ فیڈریشن کی مشینری اور اس کے کام کو سمجھنے کے لئے کینٹونوں کے سیاسی نظام کی جزئیات سے واقفیت شرط ہے۔

کل بائیس کینٹون ہیں۔ جن میں سے تین کینٹون نصف آزاد کینٹونوں میں بھی منقسم ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سوئٹزرلینڈ کی جمہوریت کل پچیس کینٹونوں پر مشتمل ہے جو اپنی اپنی جگہ پر اپنا اپنا آزاد نظام رکھتے ہیں اور فیڈریشن کے ماتحت اُسے چلاتے ہیں۔ یہ بات کس قدر تعجب انگیز ہے کہ ایک ایسا مختصر سا ملک جو رقبے کے لحاظ سے آئرلینڈ کے نصف سے بھی کم ہے، اتنے سیاسی حصوں میں بٹا ہوا ہے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں مگر جو اختلاف کے باوجود بھی ایک مرکزی حکومت کے تحت میں آئین کی مشینری کو پُرامن طریق سے حرکت میں رکھتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ملکی دستور کی رو سے ہر کینٹون حکمرانی کے وہ اختیارات رکھتا ہے جو فیڈریشن کو تفویض نہیں ہوئے ہیں جیسے محصول عائد کرنا، تعلیم عامہ کا بندوبست اور صنعتی ترقی کی تدبیریں وغیرہ۔ بعض امور ایسے بھی ہیں جو مستقل طور پر تو فیڈریشن ہی کے اثر و نفوذ میں ہیں مگر ان میں کینٹونوں کی حکومتیں بھی اس حد تک دخل دے سکتی ہیں جس حد تک وہ فیڈریشن کے آئینی راستے میں حائل نہ ہوں جیسے قانون فوجداری یا تجارت یا مزروعہ زمینوں کے ٹھیکے وغیرہ۔

تاہم ایک کینٹون کی حکمرانی کا دائرہ عملی طور پر بہت وسیع ہوتا ہے۔ فیڈریشن کی نگرانی میں وہ بڑے بڑے تعلیمی ادارے قایم کر کے انھیں چلا سکتا ہے۔ مذہبی اور سیاسی اداروں کے درمیان رشتہ قائم کر سکتا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے قوانین وضع کر سکتا ہے۔ مزدوروں کی اُجرتوں اور ان کے اوقات

مزدوری کا تعین کرسکتا ہے۔ شاہراہیں بنا سکتا ہے، ہسپتال اور محتاج خانے کھول سکتا ہے۔ شراب وغیرہ کی درآمد برآمد پر حسب منشا محصول عائد کرسکتا ہے۔ صحت عامہ اور زراعت کی ترقی کے لئے آزادانہ طور پر قوانین کی تشکیل کرسکتا ہے۔ اور دیہاتی علاقوں کی بہتری کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب قدم اُٹھا سکتا ہے

کینٹون دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں باشندے اجتماعی طور پر حکومت چلاتے ہیں، دوسرے وہ جن میں نمایندہ اسمبلی کے ذریعے آئین پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ ان چھ کینٹونوں میں جو اجتماعی طور پر حکومت کرتے ہیں، ہر سال ایک اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع میں ہر بالغ مرد شریک ہوسکتا ہے اور ملکی معاملات میں رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ عموماً یہ اجتماع اپریل کے آخر یا مئی کے پہلے اتوار کو ایسے کھلے مقام پر ہوتا ہے جہاں درختوں کا گھنا سایہ اور پانی کا قرب ہو۔ مردوں کے ساتھ اُن کے بچے اور ان کی عورتیں وغیرہ بھی چلی آتی ہیں اور سالانہ اجتماع آئینی اہلیت کے علاوہ ایک سالانہ میلے کی شکل بھی اختیار کرلیتا ہے۔

یوں اس سالانہ اجتماع میں ہر وہ بالغ مرد شریک ہوسکتا ہے جسے رائے دینے کا آئینی حق حاصل ہو مگر عام طور پر وہی لوگ شامل ہوتے ہیں جو شمولیت کے اہل اور معاملات میں حصہ لینے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان چھ کینٹونوں میں سے جو اس وضع کا طرز حکومت رکھتے ہیں، فرداً فرداً ہر ایک کینٹون کا دستور ہر بالغ مرد کے لئے اس سالانہ اجتماع کی شرکت کو ناگزیر بناتا ہے۔ اس سالانہ اجتماع کے آئینی فرائض میں سے ایک نمایاں فرض یہ ہے کہ پانچ یا پانچ سے زیادہ ممبروں کی ایک کمیٹی منتخب کرے جس میں ایک صدر بھی شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشاورتی جماعت بھی ہوتی ہے، جس میں ایگزکٹو کونسل کے ممبروں کے علاوہ اضلاع کے چند نمایندے بھی شامل کئے جاتے ہیں۔

سالانہ اجتماع کے موقع پر منتخب کمیٹی کا صدر کرسیٔ صدارت کا آئینی طور پر حقدار ہوتا ہے اور مشاورتی کمیٹی کی بھیجی ہوئی تجویزیں پیش ہوتی ہیں اور ان پر بحث ہوتی ہے۔ کبھی ایک شہری یا چند شہریوں کی طرف سے تجویزیں اُٹھائی جاتی ہیں اور ان کے حسن و قبح پر بحث و تمحیص کی روشنی میں غور و خوض کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تجویزیں اول تحریری شکل میں مشاورتی کمیٹی کو بھیجی جاتی ہیں وہ انھیں سالانہ اجتماع کے لئے منظور کرتی ہے اور یہ بتانے کے لئے بھی تیار ہوتی ہے کہ آیا انھیں کلیتاً منظور کرلیا جائے یا ان میں ترمیمات کی جائیں یا انھیں بالکل نامنظور کردیا جائے۔

سالانہ اجتماع کے فرائض جسے ہم سالانہ اسمبلی کہہ سکتے ہیں، مختلف کینٹونوں میں مختلف ہیں مگر یہ چیز سب میں مشترک ہے کہ سالانہ اسمبلی کینٹونوں کی تنہا ذمہ دار حکمراں جماعت ہے اور ہر وہ قدم اُٹھانے کا حق رکھتی ہے جو آئینی طور پر متعلقہ کینٹون کے حیطۂ اقتدار میں ہو۔ چنانچہ اسمبلی کینٹونوں کے لئے دستور اساسی

ترتیب دیتی ہے اور اس میں ترمیم کرتی ہے۔ قانون بناتی ہے اور اس کو رواج دیتی ہے۔ محصول عائد
کرتی ہے اسامیاں اور تنخواہیں مقرر کرتی ہے۔ سیاسی معاہدات کو توثیق دیتی اور منسوخ کرتی ہے۔ اور ان
افسران کا تقرر کرتی ہے جو سال بھر تک کینٹنوں میں حکومت کی نیابت کیا کرتے ہیں۔

ان چھ کینٹنوں کے علاوہ جن میں مذکورہ بالا طریق حکمرانی رائج ہے، باقی سب میں نمائندہ اسمبلی کے
ذریعے سے حکومت کا کام چلایا جاتا ہے جسے گریٹ کونسل کہتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ نے فیڈریشن کے زیر اثر رہتے
ہوئے اپنے لئے ایک نمائندہ حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ یہ نمائندہ حکومت باشندوں کی مرضی کے
تابع ہوتی ہے اور جب کبھی وہ چاہیں اس میں تغیر و تبدل کر سکتے ہیں گو ان کی مرضی کو فیڈرل گورنمنٹ کی
سند قبولیت پہلے حاصل کرنی ضروری ہے۔ ہر کینٹن میں یہ دستور ہے کہ باشندوں کی ایک مقررہ جماعت
نظر ثانی کے لئے درخواست پیش کرتی ہے۔ یہ درخواست یا تو گریٹ کونسل کی جانب سے قدم اٹھایا
جاتا ہے۔ خاص کام کے لئے ایک جماعت کا انتخاب عمل میں آتا ہے اور مسودہ قانون کی منظوری کے لئے
مشتہر کر دیا جاتا ہے۔ خاص خاص ترمیمات کے لئے بھی رائے عامہ کی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے۔
سات کینٹن ایسے ہیں جو اپنے رائے دہندگان کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ ایک مقررہ اکثریت سے وہ
گریٹ کونسل کے برخاست یا دوبارہ منتخب کئے جانے کا دعوے پیش کر سکتے ہیں، اگر گریٹ کونسل صحیح طور
پر عوام کی نمایندہ نہ رہے۔

گریٹ کونسل کے ممبران ان مرد شہریوں کے بلاواسطہ ووٹ سے منتخب کئے جاتے ہیں جن کی عمر بیس
سال کی ہو۔ ممبروں کی مدت ممبری بالعموم تین یا چار سال ہوتی ہے۔ عموماً گریٹ کونسل سال میں دو
دفعہ اپنا اجلاس کرتی ہے۔ مگر بعض کینٹنوں میں دو سے زیادہ اجلاس بھی ہوتے ہیں۔ گریٹ کونسل کے
ممبروں کو بہت ہی قلیل رقم دی جاتی ہے۔ جہاں تک اس جماعت کی سیاسی اہمیت کا تعلق ہے عوام اس پر
کلی اعتماد رکھتے ہیں گو کثرت رائے سے وہ توڑ ڈالنے کے مجاز بھی ہیں۔ گریٹ کونسل تمام انتظامی معاملات
پر قابو رکھتی ہے۔ بجٹ پر رائے دیتی ہے، قوانین بناتی ہے اور نظام حکومت کی نگرانی بھی کرتی رہتی
ہے۔ غرض منظوری عامہ کے زیر اثر یہ ساری حکومت چلائی جاتی ہے۔ جہاں منظوری عامہ (ریفرینڈم)
لازمی ہے، اس کے تمام افعال مشروط ہوتے ہیں۔ لیکن جن کینٹنوں میں ریفرینڈم کی قید لازمی نہیں ہے
یا اختیاری ہے وہاں گریٹ کونسل کے فیصلے حتمی سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ماہر آئین ساز لکھتا ہے کہ جہاں تک
ان کے فیصلوں کی صحت اور ان کے تدبر کا تعلق ہے گریٹ کونسلوں کا پایہ بہت بلند ہے اور ہم انھیں
امریکہ اور انگلستان کے ایوانوں کا ہم رتبہ قرار دے سکتے ہیں۔

ان انتظامی امور کو سرانجام دینے کے لئے جو آئینی حیثیت سے اتنے وزنی نہیں ہوتے کہ گریٹ کونسل کے سامنے رکھے جاسکیں ایک اور ایگزکٹو کونسل ہوتی ہے جسے ہم چھوٹی کونسل کہہ سکتے ہیں۔ اس کونسل میں پانچ سے تیرہ تک ممبر ہوتے ہیں۔ ان کی مدت ممبری ایک سے پانچ برس تک ہوتی ہے۔ چھوٹی کونسل قانوناً گریٹ کونسل کے ماتحت ہے جو اسے طریق عمل اور دیگر آئینی کارگزاریوں کے سلسلے میں ہدایات دے سکتی ہے اور اسکے فیصلوں کو منسوخ کرنے کا حق بھی رکھتی ہے۔

اپنی حیثیت کی اہمیت اور معلومات کی بنا پر چھوٹی کونسل قابل لحاظ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس جماعت میں ایسے افراد شامل ہوتے ہیں جو ایک عرصہ تک نظام حکومت کو چلانے اور بار بار ذمہ دار عہدوں کے لئے منتخب ہوتے رہنے کی وجہ سے پختہ کار ہوجاتے ہیں۔ ان کے پاس وہ قوت انتظامی اور دوراندیشی ہوتی ہے جو صرف سیاسی تجربات سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ صورت حال ہر کینٹون میں اور ہمیشہ ممکن نہیں۔ کیونکہ بعض جگہ پارٹیوں کا توازن سدا یکساں نہیں رہتا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نئے انتخاب کے بعد نئی پارٹی برسراقتدار ہوجاتی ہے اور وہ اپنے ہی آدمیوں کو ذمہ دار عہدے تفویض کرتی ہے۔

تاہم یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ چھوٹی کونسل ایک ایسا معاملاتی بورڈ ہے جو قدرتے قلیل سیاسی طاقت رکھتے ہوئے بھی نظام حکومت کافی کامیابی کے ساتھ چلا سکتا ہے۔ چھوٹی کونسل ہر اعتبار سے کینٹون کی صحیح نمائندہ بھی ہوتی ہے۔ گو عام انتخاب کے طریق سے ہر کینٹون میں اقلیت کا ایک نمائندہ ضرور آجاتا ہے تاہم اقلیتوں کی نمائندگی کے متعلق زیادہ مطمئن کن رویہ اختیار کرنے کے لئے بہت سے کینٹونوں نے ایسا طریق انتخاب وضع کیا ہے جس میں نمائندگی کا تناسب قایم کردیا گیا ہے تاکہ آبادی کے ہر اہم جزو کا ترجمان چھوٹی کونسل میں موجود ہو اور وہ اپنے حصے کی ذمہ داری حاصل کرسکے۔

اب سے پہلے چھوٹی کونسل کے ممبران گریٹ کونسل ہی کی طرف سے منتخب کئے جاتے تھے مگر اب یہ طریقہ صرف دو کینٹونوں میں باقی رہ گیا ہے۔ باقی سب کینٹونوں میں چھوٹی کونسل کے ممبروں کا انتخاب عوام کی آرا سے عمل میں آتا ہے۔ چھوٹی کونسل قوانین پر عملدرآمد کرانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ امن وامان قایم کرتی ہے۔ گریٹ کونسل کی لیجسلیٹو برانچ کی درخواست پر مسودات تحریر کرتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے رقبوں کے حکومتوں کی نگہداشت کرتی ہے۔ اور بہر صورت اپنے کینٹون کے مفاد کا تحفظ کرتی رہتی ہے۔

انتظامی امور کو باسانی سرانجام دینے کے لئے محکمے فرداً فرداً ممبران کے سپرد کردئے جاتے ہیں جیسے محکمہ مالیات، تعلیم، انصاف، پولیس، صفائی، تجارت، صنعت وحرفت، زراعت وخیرات وغیرہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ہر چند آج کل دو کینٹونوں کو چھوڑ کر باقی سب میں چھوٹی کونسل کے ممبر خود عوام کی طرف سے

منتخب کئے جاتے ہیں اور گریٹ کونسل کا ان کے چناؤ میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا - تاہم گریٹ کونسل سے چھوٹی کونسل کے تعلقات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے فیڈرل کونسل کے فیڈرل اسمبلی سے - یعنے تمام عملی صورتوں میں چھوٹی کونسل ایک ایسی جماعت کی طرح امورِ انتظامی کی غور و پرداخت کرتی ہے جس کے ذمہ گریٹ کونسل کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہو - اور جملہ معاملات میں اسکے بنائے ہوئے آئینی راستے پر چلنے پر مجبور ہو - چھوٹی کونسل کے ممبران گریٹ کونسل کے اجلاس میں بیٹھ سکتے ہیں اور مختلف انتظامی معاملات پر اپنے خیالات بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن انھیں موافق یا مخالف رائے دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا - لوکل انتظامات کی ضرورتوں کے پیشِ نظر تمام کینٹونوں کو ضلعوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے - ہر ضلع کا ایک افسر ہوتا ہے - یہ افسر عام اس سے کہ وہ گریٹ کونسل کا منتخب کردہ ہو یا چھوٹی کونسل نے اسے چنا ہو یا عوام کی رائے سے اس کا انتخاب عمل میں آیا ہو، ہر اعتبار سے کینٹون کی حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے - بعض کینٹونوں میں افسرِ ضلع کی امداد و اعانت کے لئے ضلع کی کونسل بھی ہوتی ہے لیکن عام طور پر علاقے کی ذمہ داری تنہا اسی کے سر ہوتی ہے -

چھوٹے سے چھوٹا انتظامی رقبہ کمیون کہلاتا ہے جسے ہم بآسانی ذہن نشین کرنے کی غرض سے میونسپلٹی کہہ سکتے ہیں - آئینی اعتبار سے ہر کمیون کسی رقبے کے ان بالغ شہریوں پر مشتمل ہوتا ہے جو کمیون مذکور کی حدود میں ایک معینہ عرصے تک رہ چکے ہوں - یہ معینہ عرصہ عموماً تین ماہ کا ہوتا ہے - کمیون اپنی وسعت کے لحاظ سے مختلف ہیں - بعض کمیون خاصے طویل و عریض شہر ہیں جیسے زورخ جس کی آبادی دو لاکھ نفوس پر پھیلی ہوئی ہے - بعض کمیون دیہاتی رقبے ہیں جن کی آبادی چند سو سے آگے نہیں جاتی - بعض میں تو صرف پچاس یا پچھتر انسان ہی ہیں - کمیون سوئٹزرلینڈ کے منفرد اجزا ہیں - اور لوکل پبلک زندگی کا مرکز ہیں - سوئٹزرلینڈ میں شہری بننے کے لئے ایک شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی کمیون کا ممبر ضرور ہو - اسی سے اسے کینٹون کی اور ملکی شہریت حاصل ہوتی ہے - کمیون مقامی امور کا انتظام کرتے ہیں جیسے تعلیم، پولیس، غربا پروری، اور پانی کی فراہمی وغیرہ - بعض اوقات کمیون کے ذمہ دار کارکن کینٹون کے ذمہ دار افسران سے ان امور پر اشتراکِ عمل بھی کرتے ہیں - عام طور پر ایک کمیون کی کچھ املاک بھی ہوتی ہے - اور دیہی علاقوں میں یہ اپنے حدود کے اندر واقع ہونے والے جنگلات اور چراگاہوں کی حفاظت بھی کرتا ہے -

جرمن زبان بولنے والے کینٹونوں میں کمیون کی حکومت، دیہاتی اور قصباتی علاقوں میں باشندگان کے ایک عام اجتماع کے ذریعے سے چلائی جاتی ہے - اس اجتماع میں ہر اہم اور ضروری مسئلہ پیش ہوتا ہے اور بحث و تمحیص کے بعد اس پر فیصلہ کیا جاتا ہے - جن کمیونوں میں زیادہ باشندے بستے ہیں، وہاں

ایک کمیون کی کونسل منتخب کی جاتی ہے۔ اس کونسل کے ذمّے جملہ انتظامی اُمور ہوتے ہیں اور اس کا صدر بعض مخصوص اختیارات رکھتا ہے اور کسی حد تک آزادانہ قدم رکھ سکتا ہے۔

بڑے شہروں میں کمیون کارپوریشن کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کی ایک کونسل ہوتی ہے جو آئینی طور پر تین سال کے لئے منتخب ہوتی ہے اور شہر کے جملہ معاملات پر کل قابو رکھتی ہے۔ اس کونسل کا ایک صدر ہوتا ہے جسے ہمارے شہروں کی کارپوریشنوں کے میئروں کی حیثیت کا آدمی سمجھا جا سکتا ہے۔ بعض جگہوں پر اسے چند اختیارات دئے جاتے ہیں جو انتظامی معاملات کے سلسلے میں ہوتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے کمیونوں میں کمیونوں کی کونسلیں اجتماعی طور پر کام کرتی ہیں۔ مگر بڑے بڑے کمیونوں میں ہر ممبر کو ایک ایک انتظامی شاخ کا ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے۔

ہر کینٹون کا اپنا دیوانی و فوجداری نظام بھی ہوتا ہے۔ ججوں کو یا تو رائے عامہ منتخب کرتی ہے۔ یا گریٹ کونسل کی طرف سے اُن کا تقرر ہوتا ہے۔ سول ٹریبونل کی ترتیب یوں ہوتی ہے:۔

(۱) جسٹس آف دی پیس جسے عام طور پر ورمٹر (Vermittler) کہتے ہیں یعنے تصفیہ کرانے والا کیونکہ اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ہر اس مقدمے میں جو اس کے سامنے لایا جائے فریقین کے درمیان تصفیہ کرانے کی کوشش کرے۔

(۲) بزیرکس گریشٹ (Bezirksgricht) یا ڈسٹرکٹ کورٹ جس میں پانچ سے سات تک جج ہوتے ہیں۔

(۳) کانتونس گریشٹ (Kantons gricht) یا کینٹون کی عدالت جس میں سات سے لیکر تیرہ تک جج ہوتے ہیں۔ اور جس کا انتخاب عموماً گریٹ کونسل کی طرف سے عمل میں آتا ہے۔

ضلع کی عدالتوں کی اپیلیں کینٹونوں کی عدالتوں میں سُنی جاتی ہیں۔ ان تمام آئینی عناصر کا یہ فرض ہے کہ قانون کی حسب استطاعت صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کریں۔ انھیں یہ حق کسی حالت میں نہیں پہونچتا کہ قانون کو غیر آئینی قرار دیدیں۔

فوجداری مقدمات فیصل کرنے کے لئے ایک اور سلسلہ ہے۔ یہاں بھی کینٹون کی عدالت آخری عدالت ہے۔

ڈاکٹر سید جعفری بار ایٹ لا

مکتوبات نیاز

سچ کہتے ہو، میں قدامت پرست ہوں، غزلگوئی میں میر و درد، نسیم و مصحفی، مومن و غالب کی یاد میرے دل سے کسی طرح نہیں نکلتی، اور تمہاری جدت پرستی کا کیا کہنا کہ جب تک صبح کو خاک شفا چاٹ کر زمزمی سے دو گھونٹ حلق سے نہ اتارلو کسی کا منھ دیکھنا حرام

تمھیں کس طرح سمجھاؤں کہ یہ زمانہ شاعری کے لئے سازگار ہی نہیں، اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، کیونکہ شاعری ہمیشہ ایک قوم کے دورِ جہل و انحطاط ہی میں ترقی کرتی ہے اور جب علمی ترقیاں شروع ہوتی ہیں تو شعراء کے لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ تم جس قوم و ملک کی تاریخ شاعری کا مطالعہ کروگے اسی نتیجہ پر پہونچوگے۔ پھر کیوں تم ہندوستان کے لئے یہ فال بد اپنے منھ سے نکالتے ہو کہ اس کا موجودہ دورِ شاعری پہلے سے بہتر ہے۔

ہاں، میں نے منشی امیر اللہ تسلیم کو دیکھا ہے، ان سے ملا بھی ہوں اور ان کی شاعری کا بھی معترف ہوں، میرا عنفوانِ شباب ہے، اور ان کا زمانہ شیب یعنی میری مسیں بھیگ رہی ہیں اور وہ "دورِ پرافشانی" سے گزر رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر جھریوں کا یہ عالم جیسے کپڑے کو اتو کر دیا ہو یہ ہے ان کی ہیئت کذائی! بغیر عصا کے سہارے کے ایک قدم چلنا دشوار، سماعت و بینائی تقریباً مفقود، کمر جھکی ہوئی، ریش و بروت سب برف کے گالے کی طرح سفید، ہاتھ پاؤں میں رعشہ، لیکن خوشدلی و خوش مزاجی کا یہ عالم گویا جوانی ابھی آئی ہو۔

رامپور میں، بزمرۂ خوش نویسان ملازم تھے، تیس روپیہ مشاہرہ تھا لیکن خدمت معاف تھی، جوانی کے زمانہ میں کسی خوشرو پنجابی لڑکے سے محبت کرتے تھے جواب خود بھی ضعیف ہو گیا تھا، لیکن وضعداری کا یہ عالم تھا کہ شام کو مغرب سے قبل روزانہ عصا ٹیکتے ہوئے گھر سے چلکر اس کی دوکان پر آکر ایک گھنٹہ بیٹھنا ضرور، جامع مسجد کے قریب اس کی دوکان تھی، مغرب کی اذان ہوتے ہی مسجد چلے جاتے تھے اور یہاں سے پھر وہ عشا کی نماز پڑھکر گھر واپس جاتے تھے، جب تک ان میں ذرا بھی سکت رہی ان کا یہ معمول ترک نہیں ہوا۔ کیا بتاؤں کس قدر دلچسپ انسان تھے، بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھے تو خیر وہ تھے ہی۔ سو سے ایک دو سال کم۔

لکھنؤ سے کئی ماہ کے بعد واپس آئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لکھنؤ میں سخت طاعون پھیلا تھا۔ اور شاید اس میں مبتلا بھی ہو چکے تھے، میں نے پوچھا "حضرت اس مرتبہ وطن میں بہت قیام رہا"۔ فرمانے لگے:۔ ہاں، میاں گیا تو اسی ارادہ سے تھا کہ اب یہاں واپس نہ آؤں گا اور حضرت طاعون سے التجا کروں گا کہ میری مشکل بھی آسان کر دیجئے، لیکن وہاں وہ اس قدر مصروف تھے کہ میری بات بھی نہ پوچھی، مجبوراً واپس آگیا۔ اب ارادہ ہے کہ یہ سیکڑہ پورا کرہی لوں"۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کے بعد پھر اکائی ہے" فرمایا کہ "پھر جینا بے حیائی ہے"۔

ایک بار مشاعرہ میں بھی دیکھا تھا۔ نواب مرحوم کو نیا نیا ذوق مشاعرہ کا ہوا تھا اور کئی کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ منشی امیر اللہ تسلیم کی نوبت آئی تو وہ عصا ٹیک کر کھڑے ہو گئے اور غزل کسی اور نے پڑھنی شروع کی۔ نواب ان کے اشعار کی داد دیتے تھے تو لوگ ان کے کان کے پاس منھ لیجا کر زور سے چیخ چیخ کر کہتے تھے کہ "سرکار آپ کے کلام کی داد دے رہے ہیں" اور وہ جھک جھک کر آداب بجالاتے تھے۔ مثنوی لکھنے میں انھیں کمال حاصل تھا اور کہنہ مشقی کا یہ عالم تھا کہ نواب کی سیاحت یوروپ کے متعلق جو سرکاری بیانات رامپور پہونچتے تھے انھیں وہ اسی وقت نظم کر دیا کرتے تھے، چنانچہ نواب جب واپس آئے تو انھوں نے یہ مثنوی مولوی فرخی صاحب کے ذریعہ سے (جو نواب کے استاد تھے) پیش بھی کی، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس کا کوئی صلہ نہ ملا۔ بعض کا خیال ہے کہ مولوی فرخی نے اسے پیش ہی نہیں کیا کیونکہ وہ خود سفرنامہ مرتب کر رہے تھے (جو بعد کو مسیر حامدی کے نام سے شایع ہوا) اور یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اس موضوع پر کوئی اور شخص کچھ لکھے۔ بہر حال ان کے آخر عمر کا کارنامہ یہ مثنوی ہے جو ممکن ہے اب بھی رامپور میں تلاش سے دستیاب ہو جائے۔

غزلگوئی میں چونکہ یہ خاندانِ مومن سے تعلق رکھتے تھے اس لئے باوجود لکھنوی ہونے کے ان میں لکھنویت بہت کم تھی۔ جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ مومن کی ہلکی ہلکی فارسی ترکیبوں کا بانکپن، ان کے کلام کی بھی خصوصیت تھی۔ ایک بار میں نے خود ان کی زبان سے ایک غزل سنی تھی، دو تین شعر اب بھی یاد ہیں۔

جی میں آتا ہے کہ اک دن مر کے ہم ہمتِ دوشِ عزیزاں دیکھ لیں
التفاتِ جوشِ وحشت پھر کہاں ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں
گر انھیں ہے خوفِ عرضِ آرزو دور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

مگر تمھیں یہ کیوں پسند آنے لگے، تم ٹھہرے مردِ صوفی۔ جب تک مسئلہ وحدت الوجود درمیان نہ آئے اور اسکو فلسفہ کہکر مہمل طور پر پیش نہ کیا جائے، تمھارے نزدیک شعر ہی کیا؟

تم غریب تسلیم کی روح کو کیوں بےچین کر دو گے تمھیں تغزل سے کیا واسطہ، تم کیا جانو کہ مومن کی بازاری شاعری کیا چیز تھی۔ تم ذوق پر لکھو، ناسخ کی تعریف کرو، خواجہ وزیر کے کلام کو پیش کرو۔ اور تسلیم وغیرہ کو ہم ایسے قدامت پرستوں کے لئے چھوڑ دو۔ مجھے بھی اس بات کا اندیشہ نہیں کہ تمھاری صوفیانہ شاعری کی توہین کر کے حور و قصور سے محروم ہو جاؤں گا، اور تم بھی شاید میر و مومن کی برائی کو نجات کے لئے ضروری قرار دیتے ہو اس لئے جانتا ہوں کہ فیصلہ دشوار ہے۔

بہرحال تسلیم کے متعلق جو کچھ میری ذاتی رائے تھی وہ لکھدی ہے۔ کیا کوئی کتاب لکھ رہے ہو، یا مقصود صرف مجھے چھیڑنا تھا۔

صدیقی — میں جس غم کا شکار ہو کر سرد ہو چکا ہوں اس کے آپ ابھی صرف امیدوار ہیں! یوں آپ کی خاطر سے کہنے کو کہدوں کہ سبحان اللہ، کیا عزم و استقلال ہے اور کیا صبر و شکر ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ حقیقی تلخیاں اس زندگی کی ابھی آپ کے پاس سے بھی ہو کر نہیں گزریں، اور نہ اس کا اندیشہ!

غالب کہتا ہے "غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا" یہ اسوقت کی باتیں ہیں جب دلی لٹنے کے بعد بھی دلوں میں حسن و عشق کی گرمیاں باقی تھیں اور شمع گل ہونے پر بھی لگن کی خاک میں کچھ چنگاریاں موجود تھیں۔ لیکن اب کہ آئین دلربائی کے ساتھ انداز جانگدازی و جانبازی بھی بدل گیا ہے، صورتِ حال بالکل دوسری ہے یعنی یہ کہ اگر غم روزگار سے فرصت ہو تو خیر غم عشق بھی گوارا کر لیا جائے۔

اسوقت "اسد اللہ خاں" زمانہ کی شکایت کرتے تھے تو اس حسرت کا اظہار ہوا کرتا تھا کہ

وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

مگر اس وقت تو سوال جز حیات اور نفس زندگی کا ہے۔ جوانی آئے تو اس کے جانے کا افسوس بھی ہو، ولولے پیدا ہوں تو ان کے فقدان پر ماتم بھی کیا جائے۔

سو مقصود کہنے کا یہ ہے کہ اگر آپ اس میں بھی مجھ سے دعوائے ہمسری رکھتے ہیں، تو یہ آپ کی ناانصافی ہے، کیونکہ میرے آپ کے زمانہ میں پوری ایک صدی کا فرق ہے۔ میں انیسویں صدی کی پیداوار ہوں، جب خشک سالیوں میں بھی لوگ تردامنی کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے اور آپ بیسویں صدی کی پیداوار ہیں جب باوجود خوشحالی کے بھی عشق میں کسی کا برا حال دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس وقت لوگ صرف ذکر حسن سے بےچین ہو جاتے تھے اور اب پیکر جمال بھی سامنے سے دامن کشاں گزر جائے تو نبض کی رفتار ۹۰ سے ۹۵ نہیں ہوتی۔ آپ کہ اب افسانوں میں اقتصادی و معاشی مسایل کا حل ڈھونڈھتے ہیں، آپ کو حاتم طائی

اور چار درویش کی دلکشی کا حال کیا معلوم ---" ایک بار دیکھا ہے اور پھر دیکھنے کی آرزو ہے" اور ہائے وہ زمانہ اب کہاں۔ وہ خواب میں کسی صورت کا نظر آنا اور سنگدیپ کے شاہزادہ کا اس کی جستجو میں گھر سے نکل جانا دیکھا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے سنکر لطف اتنا حاصل کرتا تھا گویا میں خود شاہزادہ ہوں۔ آپ ان کو مزخرفات سمجھتے ہیں اور سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ زمانہ علم و حکمت کا ہے، تحقیق و تفتیش کا ہے۔ کوئی حسین عورت سامنے سے گزر جاتی ہے تو آپ فلسفۂ جمالیات پر غور کرنے لگتے ہیں اور عشق کرنے سے پہلے اس کی سائکالوجی کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں دنیا اتنی عقلمند نہ تھی، حسن زیادہ دلکش رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن جوانی ضرور زیادہ اندھی تھی۔ "دیدن ہماں و دلدادن ہماں"

الغرض مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ آپ نے جس درد و کرب کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت مجھے معلوم ہے اور میں آپ سے ہمدردی کرنے کے لئے طیار نہیں، کیونکہ جانتا ہوں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کو یہ سنکر غصہ ضرور آئے گا، لیکن اسی کے ساتھ یقین ہے تکلیف میں بھی کچھ کمی ہو جائے گی۔ آپ جواب میں اس سے انکار کریں گے۔ لیکن آنکھ چار کر کے شاید کہنے کی جرأت نہ ہو!

افسوس ہے کہ میں فی الحال سفر سے معذور ہوں، ورنہ آپ کا یہ نشہ دور کرنے کے لئے بہت سی ترشیاں اور بھی اپنے پاس رکھتا ہوں۔

اسپتال

یوں تو میں بارہا مختلف اسپتالوں میں گیا تھا، لیکن شاید اس سے پہلے میں نے کبھی کسی اسپتال کی دنیا کو، صبح کے وقت جاکر اس طرح سرگرم عمل اور مصروف کار نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال اُس دن جو میں ایک ضرورت سے مجبور ہو کر شہر کے سول اسپتال میں گیا تو میرا بُرا حال ہو گیا۔ کمزور آدمی جو کبھی کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکے، جو ذکی الحس ہو، سریع التاثر ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ اسپتال جائے اور متاثر ہوئے بغیر واپس آجائے، وہاں کے دردناک مناظر کا مطالعہ کرے اور دل و دماغ کا سکون نہ کھو بیٹھے، انسانوں کی جسمانی اذیتیں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور خود روحانی کرب میں مبتلا ہو جائے۔ میں اسپتال گیا تھا۔ حیاتِ انسانی کے سب سے زیادہ مصیبت ناک منظر سے دوچار ہوا تھا، بیماری کے منظر سے، میرا دل لرز گیا، میرے دماغ میں انتشار کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور میری روح کانپ گئی۔

خدا کی پناہ! دُکھی انسانوں کا وہ ہجوم۔ مرد، عورتیں اور بچے، بیمار، پریشان، نڈھال تھکے ہوئے کراہتے ہوئے۔ چہرے زرد، ہونٹوں پر خشکی، آنکھوں میں حلقے، لبوں پر ہائے ہائے۔ کوئی نقاہت سے گرا جاتا ہے، کوئی لکڑی کے سہارے کھڑا ہے۔ کوئی لنگڑا ہے، کوئی اپاہج ہے، کسی کے ماتھے پر دو انگل گہرا زخم ہے، کسی کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ کسی کی آنکھ میں ناسور ہے، کہیں دِق ہے، کہیں سِل، کہیں ہیضہ، کہیں سرسام، تکلیف، تکلیف، ہر جگہ تکلیف۔ راحت کہیں نہیں، آرام کہیں نہیں، جو ہے مصیبت میں ہے، رو رہا ہے، بسور رہا ہے، جینے سے بیزار ہے۔ کچھ مریض وہ ہیں جو اسپتال ہی میں رہتے ہیں، اسپتال جن کا گھر ہے۔ بیسیوں پلنگ برابر برابر بچھے ہوئے ہیں۔ زرد زرد شکلوں والے بیمار سفید سفید بستروں پر پڑے ہیں، سفید سفید چادریں اوڑھے ہوئے ہیں۔ زندگی ہے لیکن کفنائی ہوئی۔ موت سروں پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور اپنا سرد ہاتھ آگے بڑھا رہی ہے۔ سب خاموش ہیں۔ حسرت سے ایک دوسرے کو تکتے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، زبانیں بند ہیں۔ ہنگامے، شورشیں، ولولے، امیدیں، آرزوئیں، ارمان، یہ چیزیں ان کی دنیا سے کوسوں دور ہیں۔ ایک مقام پر عملِ جراحی ہو رہا ہے۔ نشتر چل رہے ہیں۔ خون کے فوارے

چھوٹ رہے ہیں چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ اسپتال میں، بیماروں کی اس دنیا میں، کہیں حسرت ناک خاموشی ہے، کہیں آہیں ہیں اور کہیں چیخیں ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یا پھر دواؤں کی بو ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، جس سے یہاں کی ہوا کثیف ہے، فضا مسموم ہے۔

میں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر گھر آیا، پریشان، مضمحل، دلی تاثرات سے لبریز، دماغ افکار سے گھرا ہوا۔ تھک کر کرسی پر گر پڑا، سوچنے لگا۔ آخر یہ جسمانی آلام کیا ہیں؟ ان کا علاج کیوں نہیں؟ ان کے ہوتے ہوئے زندگی کیا معنی رکھتی ہے؟ آج ہم چلتے پھرتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں، سبزہ زاروں اور گلستانوں کی سیر کرتے ہیں، پرندوں کا نغمہ سنتے ہیں، صبح و شام کا لطف اٹھاتے ہیں، اور کل؟ — کل اسپتال میں پڑے ہیں، تکلیف سے کراہ رہے ہیں، ہائے ہائے کر رہے ہیں، نہ صبح ہے نہ شام ہے، نہ دن ہے نہ رات ہے کڑوی کسیلی دوائیں ہیں اور موت کا انتظار ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیوں؟ کیوں؟

اسی طرح کئی گھنٹے سوچتا رہا۔ طبیعت میں ایک خلش تھی، ایک بے کلی تھی جس کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن کسی طرح اطمینان نہیں ہوا۔ دل کو ہزار سمجھایا، نہیں سمجھا۔ صبح کے مناظر نے بہت گہرے نقوش چھوڑے تھے، آہ!!!

شام کو ناظم صاحب آئے، میں نے جو کچھ اسپتال میں دیکھا تھا، بیان کیا۔ کہنے لگے، "کوئی نئی بات نہیں ہے" جس الجھن میں سارا دن کٹا تھا میں نے اس کا ذکر کیا۔ بولے، یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں، ہر شخص جو تھوڑی سی ذکاوت حس رکھتا ہے، یونہی متاثر ہوتا ہے" میں نے اپنا مطلب ذرا اور واضح کیا، اپنے احساسات کی نوعیت اچھی طرح بیان کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سگرٹ سلگا لیا۔ صوفے پر دراز ہو کر دھواں اڑانے لگے۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ دل نہیں رکھتے، میرے درد کو نہیں سمجھتے، نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے بیزار ہو کر بات جہاں تھی وہیں ختم کر دی۔ اور اپنی بیزاری کو چھپانے کے لئے دوسرا ذکر چھیڑا۔

"ناظم صاحب! کہئے اب آپ کا "فلسفۂ سیاسیات" کس منزل میں ہے؟ کب تک پریس میں بھیج سکیں گے؟" میں نے سوال کیا۔

ناظم صاحب ایک لمحہ خاموش رہے۔ پھر سنبھل کر بیٹھے۔ اور بولے، "ظہیر صاحب! آدمی کو نظر وسیع رکھنی چاہئے — محدود . . . ."

"میرے سوال کا وسیع النظری سے کیا تعلق؟" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

ناظم صاحب نے اپنا سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "محدود نظر ہونا اچھا نہیں۔ آپ ایک چھوٹے

سے ۔ معمولی سے اسپتال میں جاتے ہیں ۔ وہاں چند بیماروں کو دیکھتے ہیں اور سینہ کوبی کرنے لگتے ہیں لیکن ایک اسپتال ہے جو اس اسپتال سے بہت بڑا ہے، جہاں کروروں مریض پڑے سسکتے ہیں، اُس اسپتال کی طرف سے آپ آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں، اُس کا درد آپ کے دل میں نہیں ہے۔"

میں نے دل میں خیال کیا کہ ناظم صاحب بہک رہے ہیں۔ " وہ اسپتال کہاں ہے ناظم صاحب؟" میں نے اُن سے پوچھا۔

" وہ اسپتال؟ " ناظم صاحب نے جواب دیا۔ " وہ اسپتال یہی سرزمین ہے جس پر آپ رہتے ہیں۔ آپ اور آپ جیسے بہت سے مریض۔ افلاس، احتیاج، جہالت، پستی، ذلت اور تعصب کے مریض" یہ کہکر ناظم صاحب پھر صوفے پر دراز ہو گئے اور سگرٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگے۔

اُس روز ناظم صاحب کے دو فقروں نے مجھ پر بصیرت کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔

اب میں کبھی سول اسپتال میں جاکر وہاں کے بدحال مریضوں کو دیکھتا ہوں تو اُس بڑے اسپتال کا تصور کرتا ہوں جس میں لاتعداد مریض ہیں، وہ مریض جن پر زیادہ مہیب بیماریاں مسلط ہیں، جن کے زخم زیادہ گہرے ہیں، جن کے ناسور زیادہ پرانے ہیں، جن کے خون میں زیادہ مہلک جراثیم سرایت کئے ہوئے ہیں، جن پر موت کے آہنی پنجے کی گرفت زیادہ مضبوط ہے — بہت زیادہ !!!

اختر انصاری بی، اے (آنرز)

بات میں بات

خاموشی اتنی زبردست دلیل ہے کہ اس کا جواب ممکن نہیں

کنوارا مرد بیاہے سے زیادہ تکلیف میں رہتا ہے کیونکہ اس کو صرف ایک عورت سے ڈرنا پڑتا ہے اور اُس کو دنیا کی سب عورتوں سے

کیا کوئی شخص دنیا میں ایسا ہوا ہے جو اپنی بیوی سے کہہ سکے کہ " میں نے صرف تمھیں سے محبت کی " سوائے آدم علیہ السلام کے ؟

موجودہ لاسلکی عہد کا ابوالآباء

آپ کسی سے سوال کیجئے کہ یہ زمانہ کس چیز کا ہے تو اس کے مختلف جواب ملیں گے، کوئی اسے "عہد پرواز" کے نام سے موسوم کرے گا، کوئی "دور طبیعیات" کہے گا، کوئی اس کا نام "زمانۂ برق و شعاع" رکھے گا اور کوئی "عصر میکانکی" سے تعبیر کرے گا، لیکن غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ تمام چیزیں عمرانی زندگی کے کسی مخصوص پہلو سے تعلق رکھتی ہیں یا بعض ایسے علوم سے متفرع ہیں جن کو عوام نہیں سمجھ سکتے اور جن کو عام حیات عملی سے کوئی خاص علاقہ نہیں ہے۔ لیکن اگر اس سوال کے جواب میں یہ کہدیا جائے کہ یہ زمانہ "لاسلکی" کا ہے، تو یقیناً یہ جواب ایسا ہوگا جو تمدن و عمران کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگا اور اسکی اس وسعت سے کسی کو انکار کی گنجایش نہ ہوگی۔

طربگاہوں سے رقص و موسیقی کی اشاعت، پروفیسروں اور خطیبوں کے پند و مواعظ، تاجروں کا ایک ہی وقت میں تمام دنیا کے بازاروں کے حالات سے باخبر رہنا اور ہزاروں میل کے فاصلہ سے اپنے کارکنوں کو ہدایت کرتے رہنا، جغرافی و فضائی محققین کا اس حال میں کہ وہ قطب کے برفستان پر اڑ رہے ہیں دنیا کو اپنے تجربات و مشاہدات سے آگاہ کرتے رہنا، ہوائی جہازوں کی سلامتی کا حال لمحہ بہ لمحہ معلوم ہوتے رہنا، دنیا کے حوادث کا گھر بیٹھے مشاہدہ کرنا، اخبار والوں کا آناً فاناً تمام دنیا کے حالات فراہم کرلینا، جہازوں کا سمندر کے بیچ سے خطرات کی خبر دینا، تصویروں اور تحریروں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ آناً فاناً منتقل کردینا، یہ سب لاسلکی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور وہ زمانہ بھی دور نہیں جب آواز کی طرح بجلی کی قوت بھی لاسلکی سے منتقل ہو سکے گی اور موٹر، طیارے اور جہاز سب اسی کی مدد سے چلیں گے۔

سب سے پہلے مارکونی نے لاسلکی سے تلغرافی اشارات یورپ سے امریکہ پہونچائے لیکن اس سے زیادہ وہ کوئی اور ترقی نہ کر سکا کیونکہ مارکونی نے جو آلہ لاسلکی امواج پر قابض ہونے کے لئے بنایا تھا وہ اتنا قوی و سریع الاحساس نہ تھا کہ انسانی آواز کے آثار چڑھاؤ اور گانے کے زیر و بم کو فضا کی اور

تمام آوازوں سے علحدہ کرکے پیش کرسکے۔ لیکن آخر کار انسان نے اس مشکل کو بھی حل کرلیا، لیکن وہ انسان کون تھا اور وہ کیا چیز تھی جس سے یہ کامیابی حاصل ہوئی؟

۱۹۰۱ء میں امریکہ اور انگلستان کے درمیان کشتیوں کی دوڑ کا مقابلہ ہے۔ انگلستان کی طرف سے شیمراک (کشتی) دوڑ میں شریک ہے اور امریکہ کی طرف سے کولمبیا۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان مقابلہ کرنے والی کشتیوں کے ساتھ ساتھ ایک اور چھوٹی سی کشتی بھی ہے جس کے دونوں سروں پر دو مستولوں کے درمیان ایک تار بندھا ہوا ہے، اس میں ایک میز بچھی ہوئی ہے جس کے سامنے ایک دبلا پتلا زرد رنگ کا نوجوان بیٹھا ہوا ہے اور چند آلات سامنے رکھے ہوئے ان کو ادھر اُدھر جنبش دے رہا ہے اور جب کبھی کبھی کہربائی شرارے ان آلات سے پیدا ہوتے ہیں تو اس نوجوان کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے۔

یہ نوجوان ڈاکٹر دے فورسٹ ہے جس نے چکاگو کے ایک حقیر سے، مکان میں بیٹھکر لاسلکی اشارات بھیجنے کا آلہ طیار کیا تھا۔

اول اول جب اس نے یہ آلہ طیار کیا تھا تو اس کے بعد دو سال تک اسنے اپنے وقت کا ہر لمحہ اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ جو ماہوار چھ اشرفیوں سے زیادہ نہ تھا اسی پر صرف کیا۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ بحری کشتیوں کے مقابلہ کا حال کیوں نہ امریکہ کے اخبارات کو اسی آلہ کے ذریعہ سے بھیجا جائے، اس سے اس کی ایجاد مشہور بھی ہوجائیگی اور آیندہ مزید تحقیقات کے لئے روپیہ بھی مل جائے گا۔ اس نے ریل کا کرایہ کسی سے قرض لیا اور نیویارک پہونچا۔ یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ مارکونی اس سے پہلے ہی اسوشیٹیڈ پریس سے لاسلکی کے ذریعہ سے اس دوڑ کی خبریں بھیجنے کا معاہدہ کرچکا ہے۔

یہ دوسرے اخبار والوں سے ملا اور آخر کار ایک کمپنی اس پر آمادہ ہوگئی اور ایک کشتی اس کو فراہم کردی اس نے آزمائش کے طور پر ایک چھوٹی سی دوکان نیویارک میں کرایہ پر لی اور وہاں خبریں حاصل کرنے والا آلہ نصب کیا اور خبر بھیجنے والا آلہ کشتی پر نصب کرکے تجربہ میں مصروف ہوگیا۔ چونکہ دوڑ کا زمانہ بہت قریب تھا اس لئے وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح تمام مراحل تجربات کے بہت جلد ختم ہوجائیں، چنانچہ وہ گھڑی گھڑی کشتی سے اُترکر دوکان میں آتا تھا اور یہاں سے پھر کشتی میں جاتا تھا۔ دو دن دوڑ کے رہگئے تھے کہ وہ بیمار ہوگیا اور ڈاکٹروں نے اسے اسپتال بھیجدیا، لیکن اس کا یہاں رہنا دشوار تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کے مستقبل کا انحصار اسی دوڑ پر ہے اور اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کوئی امید نہیں۔ چنانچہ اس نے

باوجود ڈاکٹروں کی مخالفت کے اسپتال چھوڑ دیا اور اپنی کشتی لیکر پہونچ گیا۔

جب دوڑ ختم ہوگئی تو وہ واپس آیا اور اخبار کے دفتر میں پہونچکر نہایت بے چینی کے ساتھ دریافت کیا کہ آیا دوڑ کی خبریں جو اس نے لاسلکی کے ذریعہ سے بھیجی تھیں پہونچیں یا نہیں، تو مالک اخبار نے جواب دیا کہ "کوئی خبر صاف نہیں پہونچی"۔ اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ دفعتاً پھر بیمار پڑ گیا اور تین ہفتہ تک حیات و موت کی کشمکش میں اسپتال کے اندر پڑا رہا، جب یہاں سے صحتیاب ہوکر وہ باہر نکلا، تو پھر اپنی دُھن میں لگ گیا اور آخرکار اس نے وہ چیز بنالی جس پر اس وقت کی تمام لاسلکی ترقیوں کا انحصار ہے اور وہ چیز شیشہ کا قمقمہ ہے جس کے اندر سے ہوا بالکل نکال لیجاتی ہے۔

اس سے قبل پروفیسر پیوپن نے جو جامعۂ کولمبیا کے پروفیسر تھے کاغذ کی طرح ایک ایسا فلزاتی ورق طیار کرلیا تھا جس کے ذریعہ سے ٹیلی فون پر کئی سو میل تک آواز بھیجی جا سکتی تھی لیکن اول تو اس کے لئے تار کا سلسلہ ضروری تھا اور دوسرے یہ کہ زیادہ دور تک یہ کام بھی نہ دیتا تھا، لیکن دے ورسٹ نے یہ قمقمہ ایجاد کرکے تار کے قصہ کو بھی اُڑا دیا اور سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں نیویارک سے سان فرانسسکو تک تین ہزار میل کے فاصلہ پر لاسلکی ٹیلی فون کے ذریعہ سے اس نے گفتگو کی چنانچہ اب یہی "ہوا سے خالی قمقمہ" ہے جس نے آواز کے باب میں زمان و مکان دونوں کے مفہوم کو بالکل بدلدیا ہے اور جسکے سریع الاحساس ہونے کا یہ عالم ہے کہ ہم اپنے قلب کی ضربات کو دنیا کے جس گوشہ میں چاہیں سنا سکتے ہیں۔

یہ شخص امریکہ کے صوبۂ ایوی میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا (۱۸۷۳ء) اس کا باپ پادری تھا اور چاہتا تھا کہ اسے بھی مذہبی تعلیم دلاکر پادری بنائے۔ چھ سال کی عمر میں اس کو مدرسہ میں داخل کیا جہاں اس نے سب سے زیادہ توجہ میکانکی ریاضی کی طرف صرف کی۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ۱۸۹۳ء میں جامعۂ یائل میں داخل ہوا اور یہاں سے ۱۸۹۶ء میں فارغ ہونیکے بعد تین سال تک ریسرچ کرتا رہا اور ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی۔

اس سے قبل مارکونی نے جو قمقمہ طیار کیا تھا اس میں چاندی اور نکل کا برادہ ہوتا تھا جس کے ذرات لاسلکی امواج سے متاثر ہوکر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور برقی رو کے ساتھ لاسلکی اشارات کو بھی کچھ فاصلہ تک منتقل کرسکتے تھے، لیکن دے ورسٹ اس فکر میں تھا کہ مارکونی کے نظریہ سے بالکل ہٹ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرے اور رات دن اسی فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ چنانچہ جامعۂ یائل سے فارغ ہونے کے بعد یہ چکاگو گیا اور یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لیکر اپنے تجربات میں مصروف ہوگیا۔

سنہ ۱۹۰۶ء کی ایک رات ہے اور وہ گیس کی قندیل کے نیچے میز بچھائے ہوئے بیٹھا ہے جس پر آواز جذب کرنے والا آلہ رکھا ہوا ہے، میز سے آٹھ میٹر کے فاصلہ پر کمرہ کے اندر بیٹری رکھی ہوئی ہے اسنے دفعتاً محسوس کیا کہ جسوقت بیٹری سے برقی رو پیدا ہو کر اس کی میز تک پہونچتی ہے تو کبھی قندیل کی روشنی کم ہوجاتی ہے اور کبھی زیادہ۔ اس نے جستجو شروع کی اور آخر کار علوم ہوا کہ جسوقت فلزاتی ورق گردش کرتا ہے تو روشنی کم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کو بیٹری کے اندر رکھ کر بند کر دیا تو روشنی کم نہیں ہوئی، اس سے اس کو یہ ثابت ہوا کہ تعلق فلزاتی ورق کی آواز اور نور میں ہے، موجات برق و نور میں نہیں جیسا کہ وہ گمان کرتا تھا۔ اسکے بعد سے اس کا دائرۂ تحقیق بالکل بدل گیا اور پانچ سال کی تحقیق و کاوش کے بعد اس نے وہ قمقمہ ایجاد کیا جس کا ذکر ابھی آچکا ہے۔

اس ایجاد کی تکمیل کے بعد اس کو صور متحرکہ کے ناطق بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت تک ناطق تصویریں اس طرح پیش کیجاتی تھیں کہ ایکٹروں کی گفتگو فونوگراف ریکارڈ علحدہ تیار کر لئے جاتے تھے اور جب تصویریں پردہ پر دکھائی جاتی تھیں تو ریکارڈ بھی بجائے جاتے تھے، لیکن اس سے اکثر یہ نقص ہوتا تھا کہ تصویر کی حرکت کوئی اور کیفیت ظاہر کر رہی ہے اور گفتگو جو ریکارڈ سے آرہی ہے نہ کسی اور کیفیت سے متعلق ہے، الغرض آواز و حرکات کا تطابق قایم نہ رہتا تھا اور تماشہ بالکل مسخرہ پن ہو کر رہجاتا تھا۔

دے ورسٹ نے سوچا کہ فلم پر تصویروں کے ساتھ ساتھ آواز کے نقوش بھی روشنی کے ذریعہ سے قایم کرنا چاہئے اور پھر روشنی ہی کے ذریعہ سے اس آواز کو پیدا کرنا چاہئے، چنانچہ سنہ ۱۹۲۴ء میں اس نے سب سے پہلے نیویارک میں اپنے اس جدید تجربہ کا مشاہدہ لوگوں کو کرایا اور اس طرح ناطق فلموں کی بنیاد پڑی۔

الغرض اس وقت دنیا لاسلکی عجائب و غرائب کی جولانگاہ بنی ہوئی ہے اور اس کا انحصار کانچ کے ایک قمقمہ پر ہے، یہی ایک قمقمہ ہے جو اس وقت گھر بیٹھے ہم کو تمام دنیا کی خبریں سناتا ہے ہر جگہ کی موسیقی سے لطف اندوز کرتا ہے، بازار عالم سے باخبر رکھتا ہے اور یہی قمقمہ ایک دن موٹروں کو چلائے گا۔ ہوائی جہازوں کو اڑائے گا، مشینوں کو حرکت دے گا۔ نہ ہم کو ڈرائیور کی ضرورت ہوگی نہ ہوا بازی کی، نہ کپتان کی رہنمائی ہم کو درکار ہوگی نہ کسی انجینیر کی۔

باب الاستفسار

ڈانٹی اور اسلام

(جناب محمد زکریا خانصاحب - کلکتہ)

کئی سال ہوئے، میں نے کسی انگریزی اخبار میں یہ بحث چھڑی ہوئی دیکھی تھی کہ کیا ڈانٹی کی مشہور کتاب (Divine Comedy) روایات اسلامی سے ماخوذ ہے، اور غالباً انگریزی اخباروں نے اس کی تردید کی تھی۔ کیا آپ براہ کرم اس نزاع کے متعلق اپنے خیالات سے مطلع فرماسکتے ہیں۔

(نگار) یہ بحث اب سے گیارہ سال قبل اسوقت شروع ہوئی تھی جب مسٹر سنڈرلینڈ نے ۱۹۲۶ء میں اپنی کتاب (Islam & Divine Comedy) شایع کی تھی یہ کتاب خود مسٹر سنڈرلینڈ کی تصنیف نہ تھی بلکہ ترجمہ تھا پروفیسر اسین پلاسیوس (Palacios) کی کتاب کا جو میڈرڈ یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے۔ پروفیسر مذکور علوم غربیہ کے ماہر ہونے کے ساتھ ہی زبردست مستشرق بھی تھے اور انھوں نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کیا تھا کہ ڈانٹی کی یہ مشہور تصنیف فلسفۂ اسلام و تصوف سے ماخوذ ہے جس کی مخالفت اکثر مغربی علماء نے کی تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر اسین نے جو کچھ لکھا وہ خود ان کا اجتہاد نہ تھا۔ پروفیسر بلاچیٹ (Blachet) اپنے ایک مضمون میں یہ خیال اس سے قبل ہی ظاہر کر چکے تھے، تاہم دلائل و براہین کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کرنے میں پروفیسر اسین ہی کو تقدم حاصل ہے۔

پروفیسر اسین نے سب سے پہلے معراج اور اسراء کی روایتیں لیکر بتایا ہے کہ کس طرح بعد کو یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق سمجھی گئیں اور صوفیہ نے اس واقعہ پر کتنی توجہ کی، اور کیسے کیسے نکات اس سلسلہ میں پیدا کئے۔ خصوصیت کے ساتھ محی الدین ابن عربی جن کا انتقال ڈانٹی کی ولادت سے ۲۵ سال

قبل ہو چکا تھا اور جن کی مشہور کتاب فتوحات مکہ میں دوزخ و جنت وغیرہ کا ذکر اسی طرح پایا جاتا ہے جیسا ڈانٹی کی کتاب میں اسی سلسلہ میں پروفیسر مذکور نے ابوالعلاء المعری کے رسالۂ غفران کا ذکر کرتے ہوئے اسے بھی ڈانٹی کی کتاب کا ماخذ ظاہر کیا ہے۔

علماء مغرب نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ڈانٹی نے جو کچھ لکھا وہ نصرانی تقلید میں لکھا اور اُن روایات سے ماخوذ کر کے لکھا جو قرون وسطیٰ کے یورپ میں رائج تھیں۔ پروفیسر مذکور نے اپنے جواب میں ان روایات سے بھی بحث کی اور آخر کار وہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ ڈانٹی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسلامی لٹریچر سے لیا گیا ہے۔ اس نے جن دلایل سے کام لیا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے:-

۱- جب عربوں کی ملکی فتوحات وسیع ہو گئیں تو ان کی توجہ اشاعت علوم کی طرف ہوئی اور اُن کے بہت سے افکار و خیالات نصرانی قوموں میں پھیل گئے۔ اس اشاعت کا ایک ذریعہ تجارت تھا۔ کیونکہ آٹھویں اور گیارھویں صدی کے درمیان یورپ کے تجارتی تعلقات عربوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے، دریائے والگا کے ذریعہ سے مسلمانوں کی تجارتی کشتیاں شمالی یورپ میں آتی تھیں اور یہاں سے یہ لوگ خلیج فنلینڈ، برطانیہ و دیگر ممالک یورپ تک پہونچتے تھے اور اس کا ثبوت اُن عربی سکوں سے ملتا ہے جو ان مقامات میں اب بھی کہیں کہیں برآمد ہو جاتے ہیں۔ گیارھویں صدی میں منطقۂ بحر متوسط کی طرف سے بھی یہ تعلقات وسیع ہوئے اور براہ جینوا اور وینس تمام یورپ میں پھیل گئے۔

دوسرا سبب باہمی میل و جول کا وہ معاہدہ تھا جو شارلمان اور خلیفہ ہارون الرشید کے درمیان ہوا تھا۔ اس کی رو سے فلسطین میں زائرین یورپ کی بڑی تعداد ہر سال آ سکتی تھی چنانچہ حروب صلیبیہ سے قبل ایک ایک قافلہ بارہ بارہ ہزار نفوس کا یورپ سے یہاں آتا تھا۔ پھر اس کے بعد جنگ صلیبی شروع ہوئی تو عرصہ تک باہمد گر آویزش کی وجہ سے نصاریٰ مسلمانوں کے عادات و خصایل، ان کے فوجی نظام اور معیشت و معاشرت سے بہت متاثر ہوئے اور اُن کی بہت سی روایات ان میں رواج پا گئیں۔

پھر جب جنگ صلیبی میں نصاریٰ کو شکست ہوئی تو دوبارہ حملہ کرنے کے لئے انھوں نے دینی مبلغ کثرت سے مقرر کئے تاکہ وہ یورپ میں مسلمانوں کے خلاف اعلان جہاد کریں، اس سلسلہ میں ان کو عربی زبان سیکھنا پڑی اور اس طرح وہ اسلامی لٹریچر سے متاثر ہوئے۔

مسلمانوں اور نصاریٰ کے باہمی تعلقات صقلیہ اور اسپین میں بھی بہت وسیع ہو گئے تھے، چنانچہ صقلیہ میں روجر ثانی کا دربار ایک ایسا علمی ادارہ تھا جہاں مسلمان اور عیسائی علماء ہر وقت جمع رہتے تھے اور نہایت آزادی سے باہم تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے۔ روجر ثانی خود عربی نہایت اچھی جانتا تھا

اور عربی لباس میں گفتگو کرتا تھا، اس طرح اسلامی لٹریچر صقلیہ کی وساطت سے بھی اطالیہ پہونچا۔

اسپین پانچ سو سال (آٹھویں صدی سے بارھویں صدی تک) مسلمان عربوں کے زیر اثر رہا اور نصاریٰ اس حد تک متاثر ہوئے کہ ان کی معیشت و معاشرت تقریباً عربی ہو کر رہ گئی۔ عربی زبان کے اشعار و روایات اور اسلامی فلسفہ و مذہب کی بہت سی کتابیں نصاریٰ کے دماغ میں محفوظ ہو گئیں۔ یہ اختلاط اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ قرطبہ کے نصاریٰ جنھیں (Mozaraler) کہتے تھے خط و کتابت بھی عربی زبان میں کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ لوگ یوروپ کے دیگر ممالک میں بھی جاتے رہتے تھے اس لئے ان کی وساطت سے اسلامی لٹریچر یوروپ میں اور زیادہ پھیل گیا۔

اسی کے ساتھ یہودیوں، جنگی قیدیوں اور عمال سفارت کے ذریعہ سے بھی عربی تہذیب کی بلاد یوروپ میں کافی اشاعت ہوئی۔

جب اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی اور اہل اسپین اپنے ملک پر قابض ہو گئے اسوقت بھی طلیطلہ اسلامی تہذیب کا نشرگاہ تھا، ارسطو، کندی، فارابی، ابن سینا، غزالی اور ابن رشد کی کتابوں کا عربی زبان سے ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اور الفانس نے اپنے عہد حکومت میں مرسیہ کے اندر (جو ابن عربی کا مسقط الراس تھا) اور اشبیلیہ میں مدارس قائم کئے جہاں نصاریٰ اور مسلمان طلبہ تعلیم پاتے تھے اور ان کے درمیان باہم مذہبی مباحث بھی نہایت آزادی سے ہوتے رہتے تھے۔ اشبیلیہ میں ایک مدرسہ صرف علوم حکمیہ کے لئے وقف تھا جہاں طب بھی پڑھائی جاتی تھی اس مدرسہ کے تمام مدرس عرب مسلمان تھے اور ظاہر ہے کہ نصاریٰ کے لڑکے ان سے تعلیم پانے کے بعد ضرور اسلامی تہذیب و روایات سے متاثر ہوتے ہوں گے۔

الغرض پروفیسر اسپن نے ان دلائل کی بنا پر ثابت کیا کہ اطالیہ، جرمنی، فرانس، اسکنڈینیویا اور آئرلینڈ میں بہت سی روایتیں مسلمانوں کی رائج ہو گئی تھیں۔ چنانچہ قدیس برنڈان (Brandan) کے سفر اور قدیس پولس کے خواب کی روایتیں سب اسلامی روایات سے ماخوذ ہیں۔ معراج کی روایت جس سے ڈانٹی نے استفادہ کیا اور اسی طرح کی اور روایتیں اندلس وغیرہ میں کافی مشہور ہو چلی تھیں سنٹ یولیگس (St. Eulagius) نے ایک کتاب (Apologeticus Martyrum) لکھی تھی جس میں سیرۃ نبوی اور معجزات کا ذکر تھا۔ ۱۱۴۳ء میں رابرٹ نے جو جامعۂ طلیطلہ میں مترجم کی حیثیت رکھتا تھا قرآن کی بہت سی آیتوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور تیرھویں صدی میں الفونس دہم کے حکم سے مارکو (Marco) نامی ایک پادری نے پورے کلام مجید کا ترجمہ کیا۔

راڈرگو یادری نے تاریخ عرب پر ایک کتاب لکھی جس میں معراج و دیگر معجزات رسول کا ذکر ہے۔ اسی طرح ایک اور کتاب (Elmiragi) کے نام سے اسی زمانہ میں لکھی گئی جس میں قصۂ معراج بھی درج تھا اور صحیح مسلم کی احادیث بھی پائی جاتی تھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اسپین میں جو روایات اسلامی رائج تھیں وہ اطالیہ کیونکر پہونچیں اور ڈانٹی کو انسے استفادہ کا موقعہ کیونکر ملا، سو اس کا جواب بہت آسان ہے، کیونکہ نہ صرف اسپین کی وساطت سے بلکہ یوں بھی تجارتی تعلقات کی بنا پر اطالیہ میں عربی روایات کا شائع ہو جانا یقینی تھا۔ خود جامعۂ اشبیلیہ میں جو عربی اثرات کا مرکز تھا اٹلی کے امرازادے اور شعراء وغیرہ آتے تھے اور یہاں کسب علوم کرتے تھے۔ اطالیہ کے ایک فاضل شخص (Brunello) نے دو کتابیں لکھیں، ایک کا نام (Tesoretto) تھا اور دوسری کا (Tesoro)۔ ان کتابوں میں انہے حیات رسول، معجزات نبوی اور فلسفۂ ابن سینا سے بحث کی تھی اور ڈانٹی اس کا دوست بھی تھا اور شاگرد بھی، اسلئے ظاہر ہے کہ اس نے اپنے اُستاد کی ان کتابوں کو پڑھا ہو گا جن میں معراج کا قصہ بھی درج ہے۔

ڈانٹی جس زمانہ میں پایا جاتا تھا وہ عربی تہذیب اور علوم اسلامیہ کی انتہائی ترقی کا زمانہ تھا اور چونکہ وہ خود فطرتاً فلسفی واقع ہوا تھا اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ عربی تہذیب و تمدن اور اسلامی لٹریچر کے مطالعہ سے باز رہتا۔

جہاں تک غور کیا جاتا ہے، ڈانٹی پر سب سے زیادہ اثر جس شخص کی تصانیف کا ہوا وہ محی الدین ابن عربی تھے۔ ابن عربی اور ڈانٹی دونوں کی تصانیف کو سامنے رکھئے تو معلوم ہو گا کہ بہت سے اُمور میں دونوں کی تعبیر ایک ہی ہے۔ مثلاً خدا کو نور سے ابن عربی نے بھی تعبیر کیا ہے اور ڈانٹی نے بھی۔ خالق و مخلوق کے تعلق کو دایرہ و مرکز سے تعبیر کرنے میں دونوں ہم خیال ہیں اور ادنیٰ و اعلیٰ کے باہمی تعلق ظاہر کرنے میں آئینہ کی مثال دونوں نے پیش کی ہے۔

ابن عربی کی طرح ڈانٹی نے بھی اعداد کے خواص کا ذکر کیا ہے اور علم نجوم و صوفیانہ تعبیر خواب میں بھی دونوں ہم خیال نظر آتے ہیں۔ اگر ابن عربی کی کتاب "ترجمان الاشواق" کو سامنے رکھ کر ڈانٹی کی تصنیف کا مطالعہ کیا جائے تو دونوں کتابوں کی مشابہت کا پتہ بہ آسانی چل سکتا ہے، ترجمان الاشواق میں بھی نثر و نظم مخلوط ہیں اور ڈانٹی کی تصنیف میں بھی۔ جس طرح ابن عربی نے ترجمان الاشواق کی بنیاد محبت پر قائم کی ہے، اسی طرح ڈانٹی نے بھی۔

جب ڈانٹی کی محبوبہ بیٹرس (Beatrice) مر گئی تو وہ ایک دن اس مکان

کی طرف نکل گیا جہاں وہ رہا کرتی تھی اور جذبات سے متاثر ہو کر اس نے عشقیہ اشعار لکھے ابن عربی پر اس سے قبل اسی قسم کا واقعہ گزر چکا تھا اور انھوں نے بھی ایک عاشقانہ قصیدہ اپنی مرجانے والی محبوبہ کی یاد میں لکھا تھا۔

الغرض ڈانٹی کی مشہور تصنیف Divine Comedy یقیناً عربی روایات سے ماخوذ ہے، خصوصیت کے ساتھ ابن عربی کی تصانیف کی ان کی تقلید تو اس نے اکثر جگہ کی ہے۔

چینی صحافت کی ذہنیت

اڈیٹر سے مقالہ نگاروں کا تعلق عجیب بیم و رجا کا تعلق ہوا کرتا ہے وہ اپنا مضمون (نظم کا ہو یا نثر کا) اشاعت کے لئے بھیجتا ہے اور جواب کا منتظر رہتا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر جواب کی یہ صورتیں ہوا کرتی ہیں:-

جناب من - آپ کی نظم جس کا عنوان "میں کیوں زندہ ہوں" ملی - اس کے جواب میں مجھے کہنے دیجئے کہ "آپ اس لئے زندہ ہیں کہ یہ نظم آپ نے ذریعہ ڈاک روانہ کی اور خود تشریف لاکر پیش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی"۔

جناب بندہ - آپ کی نظم پہونچی، اس میں شک نہیں کہ میر و مومن کے بعد آپ ہی کا کلام یادگار رہنے والا ہے، لیکن اس وقت تک نہیں جب تک ان کا نام بالکل دنیا سے محو نہ ہو جائے۔

انتہائی تہذیب کا ایک مختصر سا جواب ملاحظہ ہو:-

"مضمون شکریہ کے ساتھ واپس ہے، آیندہ آپ زحمت نہ فرمائیں"

چین کا اڈیٹر اپنے مقالہ نگاروں سے بہت ڈرتا ہے اور جب وہ کسی مضمون کو ناقابل اشاعت سمجھکر واپس کرتا ہے تو اس کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:-

"اے چاند اور سورج کے سب سے زیادہ معزز بھائی!

آپ کا غلام آپکے قدموں کو چھوتا ہے، آپکے سامنے زمیں بوس ہوتا ہے اور التجا کرتا ہے کہ اسے کچھ کہنے اور زندہ رہنے کی اجازت دیجائے — آپکے مقالہ نے اس خاکسار کو غیر معمولی اعزاز بخشا اور میں اپنے تمام آبا و اجداد کی قبروں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ فاضلانہ مقالہ آج تک میری نگاہ سے نہیں گزرا، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ اسکی اشاعت کے بعد پریسیڈنٹ یہ حکم نافذ نہ کرے کہ آیندہ اس سے کمتر درجہ کا مقالہ کبھی نہ شایع کیا جائے اور میرا تجربہ بتاتا ہے کہ ہزار سال سے کم میں کوئی ایک مقالہ اس مرتبہ کا طیار نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے نہایت افسوس کے ساتھ مقالہ واپس کرتا ہوں اور پھر زمیں بوسی کا شرف حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہوں۔

یہاں وہاں سے

انسانی آبادی کی غلط تقسیم

جس وقت ہم کرۂ زمین کے نقشہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑتی ہے وہ پانی ہے جو اس کے اکثر حصہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کے بعد اس چھوٹے سے خشک حصہ پر نگاہ جاتی ہے جس میں کسی جگہ انسانی آبادی زیادہ گنجان، کہیں کم اور کہیں بالکل نہیں پائی جاتی۔

اس وقت تک کرۂ زمین کی انسانی آبادی کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکا لیکن اندازہ کیا جاتا ہے کہ کم از کم دو ہزار ملین (یعنی دو ارب) نفوس اُس پر آباد ہیں۔ اور آباد حصہ زیادہ تر یوروپ، امریکہ، ہندوستان اور چین پر مشتمل ہے۔ علاوہ ان حصوں کے دوسرے مقامات کی آبادی ۶۰۰ ملین (۶۰ کرور) سے زیادہ نہیں ہے، درانحالیکہ صرف ہندوستان اور چین کی آبادی تقریباً ۸۰ کرور ہے ان اعداد سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کرہ کا اکثر حصہ پانی سے گھرا ہوا ہے بلکہ یہ بھی کہ خشکی کے حصہ میں جو آبادی پائی جاتی ہے وہ بھی یکساں نہیں ہے، کہیں کم ہے کہیں زیادہ اور کہیں بالکل نہیں۔ اسکا کیا سبب ہے؟

زمین کے ممالک اپنے اسباب معیشت کی فراہمی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، اب سے بہت پہلے جب کوئلہ اور مشینوں کا زمانہ نہ تھا، انسان صرف زراعت پر زندگی بسر کرتا تھا اور زمین کی زرخیزی اور بارش کی کثرت ایک بڑا سبب اس کے توطن کا تھا چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی قدیم ترین آبادیاں دریاؤں کے قریب ہی قائم ہوئیں۔ اس کے بعد جب کوئلہ کا عہد شروع ہوا تو لوگ وہاں کھنچ کھنچکر جانے لگے جہاں اس کی کانیں زیادہ پائی جاتی تھیں۔ اس لئے دنیا کی آبادی دو جگہ منتشر ہو گئی ایک وہ جہاں زراعت کی زیادہ آسانیاں تھیں جیسے ہندوستان اور دوسری وہ جو کوئلہ کی کثرت کی وجہ سے صنعت کے لئے زیادہ موزوں تھی جیسے انگلستان اور امریکہ وغیرہ۔

زمانۂ قدیم میں مناسب زمینوں کی دریافت و مدنیت کے رواج میں عربوں کو خاص اہمیت حاصل

تھی، لیکن بعد کو اہل یوروپ اس خصوصیت میں ان پر غالب آگئے اور انھوں نے دوسرے ممالک میں بھی ہجرت کرنا شروع کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسوقت اہل یوروپ یوروپ سے باہر دوسرے ممالک میں ۷ کروڑ بیس لاکھ کی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور خود یوروپ میں ان کی تعداد ۵ کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔

ان مہاجرین کی زیادہ تعداد شمالی و جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہے اور اس کے بعد آسٹریلیا، زیلینڈ، ایشیا، افریقہ اور جنوبی جزائر میں۔

بعض کا خیال ہے کہ زمین کے جدید اکتشافات کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور جتنا حصہ اسوقت نظر آتا ہے اس سے زیادہ موجود نہیں ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ ماہرین جغرافیہ برابر غیر آباد حصے زمینوں کے دریافت کرتے جارہے ہیں اور جنگ سے قبل وہاں لوگ جا جا کر کثرت سے آباد بھی ہو رہے تھے، لیکن اب جدید قوانین کے ماتحت ہجرت کو بہت تنگ و محدود کردیا گیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں اب سالانہ ایک لاکھ پچاس ہزار مہاجرین سے زیادہ نہیں جاسکتے اور ان میں بھی تفریق کرکے ہر قوم کی ایک مخصوص تعداد مقرر کردی گئی ہے۔ جو وہاں کی وسعت زمین کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ امریکہ کی آبادی بظاہر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن وہاں کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ۴۰ کس فی میل سے زاید نہیں پڑتی برخلاف انگلستان کے کہ وہاں کی آبادی کا اوسط ۶۸۰ کس فی میل ہوتا ہے۔

کناڈا، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ اور جنوبی افریقہ کی آبادی بھی ان کی وسعت کے لحاظ سے بہت کم ہے اور یہاں بھی مہاجرین کے داخلہ کی ممانعت ہے۔ الغرض انسانی آبادی کی اس غلط تقسیم نے دنیا کی اقتصادی حالت کو بہت متاثر کر رکھا ہے اور جب تک کرۂ زمین کے مختلف حصوں پر وہاں کی زرعی و صناعی اہلیت کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم نہ ہو، اقتصادی سکون کا نظر آنا مشکل ہے۔

انگریزی قوم کے عجائب و غرائب

اہل امریکہ کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اطوار و اخلاق کے لحاظ سے بہت عجیب واقع ہوئے ہیں لیکن انگلستان کے باشندے کچھ اُن سے کم نہیں ہیں۔ طرح طرح کی انجمنیں بناتے ہیں اور عجیب و غریب مقاصد کے ساتھ اُن کو چلاتے ہیں۔

اس قسم کی انجمنیں انگلستان میں ۵۰۰ سے زاید ہیں اور ہر انجمن کا ایک خاص مقصد، خاص حالات کے ماتحت ایک شخص اس کا ممبر بن سکتا ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی شخص قواعد کی پابندی سے انحراف کرسکے۔

مثلاً ایک انجمن یہاں نکٹوں کی ہے اور اس کا ممبر صرف وہی شخص بن سکتا ہے جو ناک نہ ہونے کی عزت رکھتا ہے، ایک انجمن بدصورت لوگوں کی ہے اور اس کے جلسہ میں اگر کوئی شخص شریک ہو تو وہ

دیکھ سکتا ہے کہ کیسے کیسے بدہیئت لوگ وہاں جمع ہیں۔

۱۸۶۹ء میں ایک انجمن جھوٹوں کی لندن میں قایم ہوئی۔ اس کے قایم کرنے والے وہاں کے ایک امیر ہیری بلنٹ تھے۔ اس کے ممبر ہونے کی عزت اُسی شخص کو حاصل ہو سکتی تھی جو جھوٹ بولنے میں اور جھوٹی خبریں گھڑنے میں کمال رکھتا تھا۔ اس کا صدر ہر سال بدلجاتا تھا اور اس عہدہ پر وہی شخص فایز ہوتا تھا جو جھوٹ بولنے میں سب سے بازی لیجاتا تھا اور جس کا کذب عقل انسانی کو متحیر کر دیتا تھا۔

ایک انجمن یہاں پاگلوں کی بھی ہے۔ اس انجمن کے واضعین کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اپنے مصائب کے لحاظ سے ناقابل برداشت ہے اور ان مصائب کو گوارا کرنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ انسان پاگل ہو جائے، چنانچہ اس انجمن میں لوگوں کو دیوانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور عقل انسانی کے خلاف جنگ کرنے کی تدابیر سوچی جاتی ہیں۔

ان سب سے زیادہ عجیب و غریب انجمن "بستہ دہن" لوگوں کی ہے جو جلسہ میں مطلقاً کوئی بات نہیں کرتے اور صرف اشاروں سے کام لیتے ہیں۔ ایک بار اتفاق سے رات کو عین جلسہ کے وقت کچھ چور کھڑکی سے کود کر اندر آ گئے اور وہاں کا سامان چرا کر لیجانے لگے، چونکہ ممبران انجمن منھ سے آواز نہ نکال سکتے تھے اس لئے چوروں کو اور زیادہ آسانی ہوئی لیکن ایک ممبر اس منظر کی تاب نہ لا سکا اس نے شور مچا کر پولیس کر دیا اور چوروں کو گرفتار کرلیا۔ اس سے انجمن کو یہ فایدہ تو ضرور ہوا کہ اس کا مال واپس ملگیا، لیکن جس ممبر نے شور مچا کر چوروں کو گرفتار کرایا تھا وہ ہمیشہ کے لئے اس جماعت سے علٰحدہ کر دیا گیا کیونکہ وہ انجمن کے قواعد کے خلاف اپنے سکوت کو قائم نہ رکھ سکا تھا۔

مولوی کی تصویر ایران کے شاعر علامرادنے اپنی ایک رباعی میں مولوی کے کبر و غرور کی عجیب و غریب تصویر کھینچی ہے۔ لکھتا ہے:۔

اے مولوی از کبر دماغت گندہ　　گاہے کہ کند بر تو سلام ایں بندہ
چنداں حرکت نما کہ از روے قیاس　　معلوم شود کہ مردۂ یا زندہ

مطلب یہ ہے کہ اے مغرور مولوی، جب یہ بندۂ خاکسار تجھے سلام کرے تو اپنے سر کو کچھ تو حرکت دیدیا کر تاکہ مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ ملے کہ تو ابھی مرا نہیں زندہ ہے۔

مطبوعات موصولہ

قرآن مجید اس سے قبل خدا جانے کتنی بار اور کس کس طرح قرآن مجید کی طبع و اشاعت ہو چکی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ اور کیا کیا اہتمام اس باب میں کئے جائیں گے۔ لیکن چونکہ دیگر فنوں کے ساتھ طباعت کا فن بھی ترقی کر رہا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ گزشتہ نسخوں سے حال کے نسخے اور حال کی مساعی سے مستقبل کے مساعی زیادہ کامیاب ثابت ہوں گی۔

چونکہ یہ صحیفۂ پاک کروروں انسانوں کا مسجود ہے اس لئے اس کی مانگ ہمیشہ رہی ہے اور رہیگی، اور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کے حسن طباعت میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ چنانچہ حال ہی میں انجمن حمایت اسلام لاہور نے جو نسخہ شائع کیا ہے وہ یقیناً ماسبق نسخوں سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اسکی طباعت فوٹو لیتھو کے ذریعہ سے ہوئی ہے یعنی پہلے خوشنویس کی تحریر کا عکس فلم پر اتارا اور پھر وہ عکس جست کی پلیٹوں پر منتقل کیا گیا۔ اس لئے انجمن کا یہ دعوے کہ یہ سب سے پہلا نسخہ ہے جو ہندوستان میں آفسٹ مشین پر طبع ہوا ہے، غلط نہیں۔ کتابت لودہیانہ کے مشہور نسخ نگار محمد قاسم اور ان کے بیٹے نے کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت صاف واضح اور خوشنما ہے۔ تقطیع بھی موزوں ہے، نقاشی بھی دلکش ہے اور سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ ہے کہ ترجمہ اس کے ساتھ شایع نہیں کیا گیا۔ کاش مسلمان جتنے ظاہر پرست ہیں اتنے ہی باطن پرست بھی ہوتے۔

اس کی قیمت بلحاظ کاغذ وغیرہ ۲۵ روپیہ، ۵ روپیہ اور تین روپیہ رکھی گئی ہے۔

بیان للناس تفسیر قرآن پاک ہے مولوی خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری کے قلم سے جو پہلے رسالہ بلاغ امرتسر میں شایع ہوتی رہی اور اب علحدہ کتابی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اور سورۃ النساء پر ختم ہو جاتی ہے۔

مولانا موصوف کا تعلق اس جماعت سے ہے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتی ہے اور احادیث سے اعتناء نہیں کرتی۔ اس لئے اس تفسیر میں خاص اہتمام اسی بات کا کیا گیا ہے کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھا جائے

اور تفسیر کے باب میں غالباً اس سے بہتر کوئی اور طریق کار اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ مولانائے ممدوح نے پرستاران روایت مفسرین سے قطعاً کوئی استناد نہیں کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہی ہے جو خود انھوں نے کلام مجید کو سامنے رکھ کر سمجھا ہے۔ شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہے، طباعت وغیرہ بہت پاکیزہ ہے اور حجم ۷۶۰ صفحات، اس لئے چار روپیہ قیمت زیادہ نہیں ہے۔ دفتر امامت، سلطان امرتسر سے خط و کتابت کی جائے۔

مذہب و عقل جناب تمنا عمادی مجیبی پھلواروی کی مختصر سی فارسی مثنوی ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذہب و عقل میں زیادہ قابل اعتماد چیز مذہب ہے عقل نہیں۔ گویا مذہب ایسی چیز ہے جس کا تعلق عقل سے کوئی نہیں ہے اور اگر مذہب و عقل کی جنگ میں کوئی شخص عقل کی پیروی کرے تو وہ ابعقل ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ فاضل مثنوی نگار کے نزدیک سب سے اچھا مذہبی انسان وہی ہو سکتا ہے جو سب سے زیادہ بیوقوف ہے۔

مولانا تمنا صاحب نے اچھا کیا کہ اس کی زبان فارسی رکھی، کیونکہ اردو میں تو اس "حماقت کی اشاعت" پہلے ہی بہت کافی ہو چکی ہے، ضرورت تھی کہ فارسی زبان میں اس کا پرچار کیا جائے۔ مولانا کو چاہئے کہ وہ اس کی اشاعت زیادہ تر ایران میں کریں، کیونکہ اول تو وہاں کی زبان فارسی ہے سمجھنے والے بہت مل جائیں گے اور دوسرے یہ کہ "رضا شاہ" کو اس وقت ضرورت بھی ایسے ہی درس کی ہے۔

مثنوی کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے کہ کسی بزم میں بوعلی اور اخفش ایسے علماء جمع تھے اور عقل و مذہب کے متعلق بحث ہو رہی تھی کہ مولانا تمنا بھی پھلواری سے نکل کر وہاں جا پہونچے (یا ہو سکتا ہے کہ وہیں پھلواری شریف ہی میں ان عقلاء دہر کا اجتماع ہوا ہو)۔ بہرحال جب کافی گفتگو کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو مولانا تمنا سے درخواست کی گئی کہ وہ فیصلہ کریں، چنانچہ انھوں نے طویل گفتگو کے بعد اپنا فیصلہ سنایا اور وہ یہ تھا کہ :-

چوں دغا نیز ست اندر خوئے عقل ۔۔۔ پس نباید تکیہ بر بازوئے عقل
عقل را معیار کل نتواں گماشت ۔۔۔ ایں فرس را بے عناں نتواں گماشت

مدعا یہ کہ عقل سے اسی حد تک کام لینا چاہئے جس حد تک مذہب اجازت دے اور اگر کسی جگہ مذہب اس کا مخالف ہو تو عقل کو ترک کر دینا چاہئے۔

یہ ہے عقل و مذہب کے باب میں ہمارے اکابر مذہب کا فیصلہ جو آج نہیں بلکہ صدیوں سے ہم کو سنایا جا رہا ہے اور جس کو سنتے سنتے ہم اتنے احمق ہو گئے ہیں کہ کیا کوئی دوسری پابند مذہب قوم ہو سکتی ہے۔

یہ مثنوی ارکان مسلم اسوسی ایشن پھلواری شریف کی فرمایش پر لکھی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک مسلم جماعت کے افراد اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے — آہ وخ مسلماں زیستن!

معاش و معاد یہ بھی جناب تمنا عمادی کی فارسی مثنوی ہے۔ اس میں بعض مذہبی و اخلاقی مسایل کو نظم کے پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے اور جا بجا اُن آیات قرآنی و احادیث نبوی کو بھی نقل کر دیا گیا ہے جن سے مولانائے موصوف کی مثنوی کے بعض حصے ماخوذ و مستعار ہیں۔

جہاں تک اخلاق و تعلیم اخلاق کا تعلق ہے، اس کے افادہ سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن مثنوی کے وہ حصے جو عقاید سے متعلق ہیں یا تفسیری شان رکھتے ہیں یقیناً محل نظر ہیں اور بہتر ہوتا اگر شاعر علام انسے بحث نہ کرتے۔ مثنوی کی زبان بیشک بہت صاف ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ اور ملنے کا پتہ۔ مکتبہ دارالادب پھلواری شریف ہے۔

نقشِ دوام مجموعہ ہے جناب عدم کی نظموں کا جو ملک کے مختلف رسایل و جراید میں شایع ہو کر خواص سے بھی داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اور ناظرین نگار تو بارہا ان سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔

جناب عدم زمانۂ حال کے ان چند شعرا میں سے ہیں جو اپنے جذبات ظاہر کرنے کے لئے، الفاظ دوسروں کے استعمال نہیں کرتے بلکہ خود ہی سوچتے ہیں اور جو سوچتے ہیں اس کو خود ہی اپنی زبان سے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ تاثرات کی بلندی اور خیال کا معنوی حُسن بھی آپ اسمیں شامل کر کے غور کیجئے کہ عدم صاحب کا رنگ شاعری واقعی کیا ہوگا۔

اس مجموعہ میں نظموں کے علاوہ غزلیں بھی ہیں اور جس پایہ کی ہیں اس کا پتہ ذیل کے اشعار سے چلسکتا ہے

ہے یہ انداز تغافل تو قیامت ہوگی — کیا کرے گا وہ جسے تم سے محبت ہوگی

لوگ کہتے ہیں مجھے تم سے محبت ہے، اگر — تم جو کہتے ہو کہ وحشت ہے، تو وحشت ہوگی

وہ آتے ہیں تو دل میں کچھ خلش معلوم ہوتی ہے — میں ڈرتا ہوں کہیں اسکو محبت تو نہیں کہتے

جوانی ہو چکی ہے ختم شاید — گناہوں سے جو میں اکتا گیا ہوں

عدم نے تغزل کی خود ہی ایک جگہ نہایت پاکیزہ تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

غزل عشق و محبت کی زباں کا نام ہے یعنی — براہ راست میرے دل نے اُنسے گفتگو کی ہے

اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ہر جگہ تغزل کا بھی احترام قائم رکھا ہے — ۲۰۰ صفحات کا یہ دلکش و رنگین مجموعہ دو روپیہ میں حکیم عبدالغنی صاحب موچی بازار راولپنڈی سے مل سکتا ہے۔

داستانِ زوال تالیف ہے جناب منشی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے کاکوروی کی جس میں بنی اسرائیل کی داستان بربنائے روایات عہد نامۂ عتیق، بیان کی گئی ہے۔

داستان دلچسپ ہو یا نہ ہو لیکن اس کا کیا علاج کہ منشی امیر احمد صاحب کی زبان و انشاء میں پیش کی گئی ہے اور سو فسانوں کا لطف اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ کون ہے جو آج بنی اسرائیل کی داستانِ زوال سے دلچسپی لیگا لیکن کون ہے وہ جو اس کتاب کو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے بند کر دے گا۔ یہ تو میں نے اُن لوگوں کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کہا جنھیں واقعی تاریخ قدیم سے دلچسپی نہیں ہے ورنہ اُن سنجیدہ اہل ذوق کے لئے جو تحقیق علمی کے سلسلہ میں روایات پارینہ کے اندر بھی بہت سے جواہر پارے ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ یہ کتاب عجیب و غریب نعمت ہے اور امیر محل لائبریری کاکوری سے صرف ہر میں ہاتھ آسکتی ہے۔

جاپان ترجمہ ہے مسٹر چمن لال کی کتاب کا جسے محمود علی خانصاحب (جامعی) نے اُردو میں کیا ہے اور مجلد صورت میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے دو روپیہ میں مل سکتا ہے۔

جب کوئی قوم اور خصوصیت کے ساتھ وہ قوم جو حد درجہ حالت انحطاط میں ہو دفعتہً ترقی کر جاتی ہو، تو دنیا کا جذبۂ عجائب پسندی فوراً حرکت میں آجاتا ہے اور اس کی دلچسپیاں اس قوم کے ساتھ بہت بڑھ جاتی ہیں چنانچہ اس کی روشن مثال جاپان ہے کہ اب سے پچاس ساٹھ سال قبل اسے کوئی پوچھتا بھی نہ تھا لیکن جسوقت اس نے روس کے عفریت کو شکست دیکر اپنی قوت کا ثبوت پیش کیا تو تمام قومیں چونک پڑیں اور ہر ایک کو جستجو شروع ہوئی کہ وہ اس پشۂ حقیر کا بھی حال معلوم کرے جس نے زار کی نمرودیت کو یوں دفعتاً خاک میں ملا دیا۔ پھر اس کے بعد تو جس تیزی کے ساتھ جاپان نے اپنی زندگی و نشاطِ زندگی کے ثبوت پیش کئے، انکا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ "ایکبار شیر مغرب" بھی افق بعید سے نمودار ہونے والے اس زرد خطرہ کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھے اور اس تمام جستجو سے کام لے جو ہمیشہ ایک خوفزدہ مگر عقلمند فریق کا شعار رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک انگریزی میں بیشمار کتابیں جاپان پر لکھی جا چکی ہیں، اور جاپانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے بغیر تحقیق کئے ہوئے چھوڑ دیا گیا ہو انھیں کتابوں میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو ہندوستانی اہلِ قلم کا نتیجۂ کاوش ہیں اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مسٹر چمن لال کی کتاب ان سب میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے

اس میں صرف حال کے جاپان اور اس کی تمام عملی سرگرمیوں کو بیان کیا گیا ہے اور نہایت وضاحت سے اس چھوٹی سی قوم کے اس عظیم جذبۂ وطن پرستی و آزادی کا ذکر کیا گیا ہے جس سے ہندوستان ہنوز ناآشنا ہے۔ ترجمہ بھی بہت صاف و سلیس ہے اور دو درجن سے زیادہ تصویریں بھی اسمیں شامل ہیں۔

کسان اُردو ترجمہ ہے چودھری مختار سنگھ صاحب ام۔ اے کی مشہور کتاب (Rural India) کا جسے محمود علی خانصاحب (جامعی) نے اُردو میں منتقل کیا ہے اور مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی نے شایع کیا ہے۔

ہندوستان میں ۷۵ فی صدی زراعت پیشہ انسان آباد ہیں یعنی ملک کا تین چوتھائی حصہ انھیں پر مشتمل ہے لیکن افسوس ہے کہ حکومت کیا خود ارباب وطن دسواں حصہ بھی اپنے وقت کا ان کے حال و مآل پر غور کرنے کے لئے صرف نہیں کرتے۔ اس مشین کی دنیا میں ہمارے ذہن کا یہ رنگ ہوگیا ہے کہ کاشت کا نام سنتے ہی وحشت سی ہونے لگتی ہے اور اس ذکر میں کچھ ایسی فرسودگی محسوس کرتے ہیں کہ طبیعت اس کی طرف مایل ہی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی خوشحالی صرف یہاں کے کسان کی خوشحالی پر منحصر ہے اور یہ اور بات ہے کہ ہم اس طرف متوجہ نہ ہوں اور ملک کو خوشحال دیکھنا پسند کریں۔

چودھری مختار سنگھ صاحب نے جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے وہ تقریباً "علم بلا واسطہ" کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس میں کسان کے افلاس، اس کے تاریخی و سماجی اسباب، اس کی موجودہ مشکلات اور ان کے دور کرنے کی تدابیر پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ یکسر ماہرانہ انداز رکھتا ہے اور ہر اس شخص کو جسے ہندوستان کی سیاسی و معاشی حالات سے دلچسپی ہے، اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ترجمہ بہت شگفتہ و سلیس ہے۔

نفرت کا بیج بعض مصنفوں کا ایسا خاص اثر دل پر قایم ہوجاتا ہے کہ ان کی کتاب دیکھے بغیر تعریف کرنے کو دل چاہ اُٹھتا ہے اور مختصر نصیحت آموز ڈرامے لکھنے میں، اشتیاق حسین صاحب قریشی ام۔ اے کا یہی اثر میرے دل پر قایم ہے۔ میں نے اس ڈرامہ کا صرف اتنا حصہ پڑھا ہے جس سے میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ اس میں "دوستی کے احترام" اور اس کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے، لیکن جانتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہوگا خوب ہوگا۔ میں اس سے قبل متعدد بار ان کے ڈراموں کو غور سے پڑھنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرچکا ہوں اس لئے اگر ایک بار بغیر دیکھے بھالے تعریف کردوں تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔ اس ڈرامہ کو بھی جامعۂ ملیہ دہلی نے شایع کیا ہے اور ۸/ اس کی قیمت ہے۔

تسخیر یاس مولانا شرف الدین یاس ٹونکی کے ابتدائے کلام کا نمونہ ہے۔ مولانا یاس جامعۂ ملیہ میں اُردو و فارسی ادب کے پروفیسر ہیں اور جامعہ کے اُن رفقاء کار میں سے ہیں جنھوں نے اس قومی درسگاہ کی سب سے پہلی آواز پر صدائے لبیک کہی تھی۔ مولانا نہایت خوش فکر شاعر بھی ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں خاص تاثر کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ہر چند یہ مجموعہ بالکل ابتدائی کلام کا ہے لیکن اس میں بھی ہمیں اس رنگ کے اشعار نظر آجاتے ہیں:-

بہت اُکتا کے اب دل سے نکلتا آہ نے چاہا　　　　نہیں معلوم کیا ہونا ہے، کیا اللہ نے چاہا

بات کیا کرتے مجھے صورت دکھا کر چل دئے　　　　کہہ گئے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ کہہ جانے کی بات

پھر خدا وہ دن دکھائے پھر وہ آنکھیں چار ہوں　　　　پھر وہی مجبوریاں ہوں، پھر ہو شرمانے کی بات

رہے بیکسی سلامت، مجھے کیا کسی کی حاجت　　　　شب وعدہ تم نہ آؤ، شب غم اجل نہ آئے

وہ ہماری آرزو تھی، یہ خوشی تھی اپنے جی کی　　　　کہ عزا میں آج آئے، دم نزع کل نہ آئے

اس کی قیمت ۵ر ہے اور ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی

مرقعِ سخن | دورِ آصفیہ کے پچیس ممتاز شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے جو اعلیٰحضرت حضور نظام کے پچیس سالہ عہدِ فرمانروائی کے جشنِ سیمیں کی تقریب میں مرتب کیا گیا تھا۔

اس تذکرہ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور شاہ سراج سے لیکر شاہ تجلی یعنی ۱۰۸۶ھ سے ۱۲۱۵ھ تک ہے۔ دوسرا شیر محمد خاں ایمان سے مہاراجہ چندولال شاداں (م ۱۲۶۱ھ) تک ہے تیسرا دور میر شمس الدین محمد فیض سے شروع ہوتا ہے اور ناجی پر ختم ہوتا ہے (۱۱۹۵ھ - ۱۳۳۰ھ) چوتھے دور میں مائل سے لیکر ماہر تک چند شعراء کا ذکر ہے اور پانچویں دور میں مسرور سے صفی پانچ شاعروں کا۔

یہ تذکرہ کسی ایک شخص کی تالیف نہیں ہے بلکہ جامعۂ عثمانیہ کے متعدد اُستادوں اور منتہی طلبہ کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ حالات کا استقصار، کلام کا انتخاب، نقد و تبصرہ سب بالکل جدید اُصول پر کیا گیا ہے اور ہمارے فاضل دوست پروفیسر محی الدین قادری زور ایم۔ اے جو جامعۂ عثمانیہ میں "ادبیات اُردو" کے روح رواں ہیں، قابلِ مبارکباد ہیں کہ ان کی سعی سے یہ مفید تذکرہ وجود میں آیا۔ خود زور صاحب کے بھی متعدد مقالات اس میں شامل ہیں۔ یہ کتاب مجلد نہایت پاکیزہ طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور ۲۵ تصاویر کے الحاق سے اچھا خاصہ مرقع بھی نظر آتی ہے۔ اس کی قیمت پانچ روپیہ ہے۔

ذیل کی تین کتابیں چونکہ تفصیلی تبصرہ کی محتاج ہیں اس لئے علحدہ باب الانتقاد کے ماتحت ان پر کسی آیندہ اشاعت میں اظہار خیال کیا جائے گا۔

شعلۂ طور — دیوان جگر مراد آبادی —— ناشر — جامعۂ ملیہ دہلی - قیمت تین روپیہ

عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ — مصنفہ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب — ناشر — جامعۂ ملیہ دہلی، قیمت ۸ر

محاربۂ کربلا —— مصنفہ مولانا سید علی نقی صاحب —— ناشر — امامیہ مشن لکھنؤ، قیمت ۴ر

نثرِ اختر — نظمِ اثر

قاضی نذر الاسلام شاعر بنگال کی مختلف نظموں اور دوسرے شعراء کے کلام کا ترجمہ اختر حسین رائے پوری کے قلم سے شائع ہو چکا ہے۔ اب ہمارے فاضل دوست ادیب جلیل جناب مرزا جعفر علی خانصاحب اثر بی۔اے نے اسی نثر کو زیادہ آزادانہ طور پر نظم کر کے نگار کو مرحمت فرمایا ہے۔

(۱)

"مجھے یاد کروگی"

(قاضی نذر الاسلام صاحب کی نظم " ابھشاپ " (بددعا) کا آزاد ترجمہ)

دار فانی سے جہاں داغ لئے میں اٹھا — یاد آؤں گا بہت، دھیان رہے بس اتنا
دل پشیمانِ ستم، آنکھوں میں تصویرِ وفا — کام ہوگا نہ کوئی اور تمہیں، اس کے سوا
پوچھوگی شام کے تارے سے کبھی میرا پتا — موج ساحل سے کہوگی کہ ہو دیکھا تو بتا
دشت کا (جس میں تپش دفن ہے) ایک اک ذرہ — نقش بن جائے گا میرے ہی دھڑکتے دل کا
دوگی جا جا کے فلک بوس پہاڑوں میں صدا — دیں گے آواز پہ آواز، مگر حاصل کیا؟
گنگناتی ہوئی گزرے گی اگر بادِ صبا — ٹوک کے پوچھوگی، "کچھ میرا نشاں بھی پایا"
یاس میں لب پہ مکرر یہ سخن آئے گا — "کیا ہوا، کیا ہوا وہ چاہنے والا میرا"

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو

خواب سے چونکوگی، کہتی ہوئی آیا کوئی — لے کے آہستہ مرا نام، پکارا کوئی
دلِ بیتاب پہ اک سایہ سا لرزا کوئی — دیکھوں کس طرح کہ ہے محو تماشا کوئی
مسکراتا ہوا آغوش میں لے گا کوئی — جانِ مشتاق نہ رہ جائے تمنا کوئی
سونا بستر کہیگا، اب ہے نہ جب تھا کوئی — آکے سینے میں ستاتا ہے، ستایا کوئی
دل یہ بھر آئے گا پھوٹے کہیں سوتا کوئی — اشک یوں امڈیں گے، ہو جوش میں دریا کوئی

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو

ٹوٹ جائے گا یکایک جو کوئی تارِ رباب — سب کہیں گے "اسی بدبخت کے ہے دل کا جواب!"
یاد آجائے گا تم کو کوئی بھولا ہوا خواب — نغمۂ دورِ طرب، ولولۂ عہدِ شباب
صحبتیں جن کا ہر اک لمحہ تھا ہم رنگ شراب — کیف میں ڈوبی ہوئی، حیف مگر برق شتاب

داستاں ہجر کی بن جائے گا ہر اشک خوش آب کوئی حسرت کا مرقع، کوئی حرماں کی کتاب
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو

زیر دیوار بچھاسے گی چنبیلی چادر گوندھنے بیٹھوگی تم پھولوں کا نازک زیور
ہاتھریوں کا پنپنیلے اُسوقت تمھارے تھر تھر ڈر سمائے گا نہ ہوں چوڑیاں ٹھنڈی، لڑکر
شبہ پھر ہوگا یہ مرجھائی ہوئی کلیوں پر کوئی ہے آہ بلب اور کوئی خاک بسر
ہوگا محسوس تمھیں گور کا میری منظر جس کا ہر ذرہ ہے اک نالۂ محرومِ اثر
برگِ آشفتۂ گل، قطرۂ شبنم سے تر ہے بہت آئے جو ہمراہِ صبا، وقتِ سحر
یہ تصور کبھی بندھ جائے گا جب پچھلے پہر تپشِ ہجر سے لو دے اُٹھیگا تارِ نظر
اور اس تار میں پھول اشکوں کے خود بدھ بدھ کر دیں گے پژمردہ تبسم یہ بچھاور کی خبر
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو

مے بدوش آئے گی جسوقت ہوا ساون کی مست و سرشار جوانی سے پئے سرگوشی
آسماں ہوگا یہی اور زمیں ہوگی یہی منزلِ مرگ کا ہوں گا فقط اک بے سفری
یاد آئے گی تمھیں تنگیٔ آغوش مری اپنی ہی بانہوں کو تم آپ یہ دعوت دوگی
ہوگی خواہش کہ ہو بوسوں کی تمنا پوری مستحق جس کی تھی اک دن مری شوریدہ سری
ہونٹ تھرائیں گے ہنسنے میں بناوٹ کی ہنسی میٹھی چٹکی نہ ے گی سیج کی اک ایک کلی
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو

موجیں گنگا کی وہ کھولے ہوئے منھ مثلِ نہنگ کرتی تھیں ناؤ سے اٹھکیلیاں، بے ننگ و درنگ
رات اور ناؤ میں ہم، صلح کبھی اور کبھی جنگ گھپ اندھیرے میں فقط بیم کی روشن مردنگ
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو

زرفشاں بامِ فلک چاندنی سے جب ہوگا سازِ انجم پہ مرے نغموں کی گونجے گی صدا
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں پہ یہ ہوگا دھوکا ڈوبتا کوئی ستارہ ہے کسی کا جویا
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو

رقص کرتا ہوا لپکے گا بھیانک طوفاں برق ادھر قہقہہ زن، رعد اُدھر نعرہ کناں
شور وہ تند ہواؤں کا وہ بادِ وباراں جیسے زنجیر تڑاتا ہو کوئی پیلِ دماں
وہ دڑیڑے، وہ تھپیڑے، کہ بس اللہ کی اماں جھولا جھولے گی اٹاری، وہ قیامت کا سماں

آسپہ وہ رات اندھیری کہ گھٹے جیسے دھواں   واہمہ شکلوں سے آباد کرے گا یہ جہاں
منہ سے اک چیخ نکل جائیگی، دل ہوگا تپاں   تم مجھے ڈھونڈو گی، افسوس نہ پاؤ گی نشاں
عافیت بخش جو بازو تھے وہ ہونگے بے جاں   گرم بوسے وہ کہاں، دور ہو جن سے خفقاں

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

(۲) (آلفرید موسے کی فرانسیسی نظم کا آزاد ترجمہ)

پیشوائی کے لئے مہر کی، دوشیزۂ صبح   سجتی ہو پھولوں سے جب "رنگ محل" کو اپنے
شوق دیدار میں چہرے سے ہٹا کر گھونگھٹ   کبھی پٹ کھولے، کبھی روزن در سے جھانکے

یاد کرلے مجھے اے بھولنے والے میرے

لیلیٰ شب لئے جب رخ پہ روپہلا آنچل   دیکھتی سپنے کا درپن ہو بصد ناز و ادا
زلف مچلی ہو جب اک بوسۂ عارض کے لئے   کارخانہ ہو جب آنکھوں میں کھلا جادو کا

یاد کرلے مجھے اے بھولنے والے میرے

جب مسرت سے بڑھیں پینگ، بہار آئی ہو   شفق شام تصور کو ترے دعوت دے
گھنے جنگل سے (جہاں دھوپ کو غش آ جائے)   سسکیوں کی جو صدا آئے، ٹھہر کر سن لے

یاد کرلے مجھے اے بھولنے والے میرے

جب ہمیشہ کو ہو خاموش دل خانہ خراب   اور "شوریدگیٔ عشق" بنے لوح مزار
اتفاقاً جو ہو اُس سمت گزرنا تیرا   روح بیتاب کو ممکن ہے کہ آجائے قرار

یاد کرلے مجھے اے بھولنے والے میرے

خواب آباد جہاں کا یہی نقشہ دیکھا   آنکھ کھولی تھی کلی نے، کہ ہوئی نذر خزاں
نفس سرد نہیں، نیم تبسم ہی سہی   اور اگر یہ بھی گراں ہو تو کر اتنا احساں

یاد کرلے مجھے اے بھولنے والے میرے

موت گو بیچ میں ہم دونوں کے حایل ہوگی   سجدے کرتی رہے گی روح مری در پہ ترے
رات کا ہو گا شباب اور ستاروں کا سنگار   کیا عجب ڈوبی ہوئی غم میں یہ آواز آئے

"یاد کرلے مجھے اے بھولنے والے میرے"

(۳) (سنسکرت دوہوں کا آزاد ترجمہ)

اُٹ اٹھی وہ سجاوٹ، وہ اینلی چتون   چمپئی رنگ پہ چندن کی وہ بندی کی پھبن

کھل گیا جیسے چمن، یہ تھا ہنسی کا نقشہ ــ تازہ اک پھول کنول کا تھا شگفتہ چہرہ
بسترِ ناز سے اٹھنے پہ یہ تھا جس کا حال، ــ چھوئی موئی کی طرح درد جدائی سے نڈھال

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

جیسے پیغامِ سحر پر کوئی نرگس کی کلی ــ مسکراتی ہے کبھی اور لجاتی ہے کبھی
یہی اُن انکھڑیوں کا نیند میں نقشہ دیکھا ــ خوابِ رنگیں کے تصور کا کرشمہ دیکھا؟

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

دیکھکے آئینے میں اُس کی ادائیں گیسو ــ رُخ پہ جھک پڑتے تھے لینے کو بلائیں گیسو
وہ جوانی کہ نثار اُسپہ لپٹ پھولوں کی، ــ مشک و صندل کی مہک جسکے پسینے میں بھی
پلکیں اُن آنکھوں پہ یوں سایہ فگن تھیں، گویا ــ عشق نے حُسن کو آغوش میں لپٹا لیا تھا

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

وصل کے بعد یہ تھا شرم سے اُسکا عالم ــ سرخی آنکھوں کی نہ تھی رنگ میں عنابی سے کم
اور کندن سے دمکتے ہوئے چہرے پہ عرق ــ گل کے رخسار پہ غازہ ملے جس طرح شفق
یوں پسینے کی تھی اک بوند لبِ نازک پر ــ جھلملاتا ہو ستارہ کوئی، ہنگامِ سحر

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

لاکھ بیتاب تھے گلہائے تبسم کے لئے ــ غنچے منہ کھول نہ سکتے تھے تکلم کے لئے
شاخِ مرجاں سے بھی نازک وہ کلائی اُسکی ــ دانت وہ جن سے کہ بے آب ہو موتی کی لڑی
چال وہ ہنس کی جو چال کو ٹھوکریں اُڑائے ــ دو قدم یوں جو چلے بادِ سحر غش آجائے

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

آہ وہ وقت کہ وہ شوق کے آغوش میں تھی ــ گو اندھیرے میں نظر آتی نہ تھی شکل اُس کی
جوت میں رتنوں کی ناگاہ ہوئیں چار آنکھیں ــ مسکرائی ذرا اور پھیر لیں اک بار آنکھیں
شرم آلودہ تبسم کو بھلاؤں کیونکر ــ اپنے خاموش ترنم کو بھلاؤں کیونکر

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

بھولی صورت پہ غضب اُسکا وہ اندازِ حجاب ــ جس سے مدہوش ہو عالم وہ شراب اُسکا شباب
جیتے جی اس کو جو پھر ایک نظر دیکھ سکوں ــ عیشِ لافانیِ فردوس کو قربان کردوں

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

کیوں کٹھن مجھ کو نہ ہو زیست کا ایک اک لمحہ ــ دور جب اُس سے رہوں لطف نہیں جینے کا
کاش دے موت کہیں جلد گلے کا پھندا ــ صبرِ جاوید و سکونِ ابدی کرے عطا

یاد آتی ہے مجھے، خون رُلاتی ہے مجھے

شاہی
تیار کردہ
طیبی
دواخانہ
یونانی
SHAHI
BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY
شاہی
تیار کردہ
طیبی
دوا خانہ
یونانی
ملیریا اور ٹائیفائیڈ (موتی جھرہ)
کے بعد کمزوری دفع کرنے کیلئے
"شاہی"
لاجواب دوا ہے
ہسٹریا اور استقاط حمل
کے
دفع کرنے میں
"شاہی"
کا مقابلہ کرے
اینیمیا (کمی خون) دمہ
کھانسی و جملہ امراض
سینہ کے لئے
"شاہی"
اکسیر علاج
ہے
مزید معلومات کے لئے
مفت رنگین رسالہ
مفت طلب کیجئے
طیبی دواخانہ یونانی
۶۶ محمد علی روڈ بمبئی
ٹیلیفون نمبر ۹۳
اندور (مالوہ)
تار کا پتہ: "شاہی" اندور